مجاہدِ اعظم

حصہ اول

شاکر حسین امروہوی

مجاہدِ اعظم

حصۂ اول

تحقیقات صحیح و سوانح مستند حضرت سید الشہدا امام الثقلین امام حسینؑ

اور

مکمل حالات و اسباب واقعۂ ہائلۂ کربلا

مصنفہ

مؤرخِ نامور و محقق بے بدل

حضرت مولوی سید شاکر حسین صاحب نقوی امروہوی

ناشرین

ادارہ
کارکنان اردو ادبستان جے پور

مطبوعہ علائی آرٹ پریس دہلی

قیمت
چار روپے

شاہ است حسین بادشاہ است حسین
دین است حسین دین پناہ است حسین
سرداد و نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

دیباچہ

۸۶ء

حسینٌ منّی وانا من الحسینؑ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہ محمد خاتم النبیین وآلہ الطیبین المعصومین سیما علیٰ سید الشہداء الاولین والآخرین وعلیٰ اقربائہٖ وانصارہ الذین بذلوا مہجہم معہ اجمعین

صحرائے کربلا کا پر از کرب وبلا واقعہ اور سامعہ پاش وجگر خراش سانحہ تاریخ عالم کا وہ زریں اور شاندار کارنامہ ہے۔ جس نے اپنی عدیم المثال نوعیت سے نہ صرف اسلام بلکہ تمام دنیا کی تاریخ میں نہایت ہی ممتاز اور قابل رشک درجہ حاصل کیا ہے اور کرۂ ارض کی کوئی قوم احقاق حق اور ابطال باطل کی ایسی تابناک مثال اور استقلال وشجاعت وصبر واستقامت کی ایسی حیرت انگیز نظیر پیش نہیں کر سکتی یہی وہ واقعہ عظمیٰ ہے جس نے انسانی اخلاق انسانی تہذیب اور انسانی روحانیت پر اپنا وہ پائیدار اثر ڈالا کہ ذریت آدم ہمیشہ اس کی رہین منت رہے گی اور یہی وہ شہادت کبریٰ ہے جس کے احیائے ملت اور ابقائے روحانیت کے بار احسان سے گردن اسلام قیامت تک سُبک دوشی حاصل نہیں کر سکتی شہدائے کربلا کا سردار امت محمدیہ کا وہ نوح ہے جس نے کشتی اسلام کی اس وقت ناخدائی کی جب طوفان استبداد کے تھپیڑے اس کو گرداب ہلاکت کے کنارہ پر پہونچا چکے تھے اور ہوائے فسق وارتداد کے تند وتیز جھونکے اس سفینہ کو ڈگمگا رہے تھے اور قریب تھا کہ یہ کشتی تباہ وپاش پاش ہو جائے اس کشتی کا بچانا کوئی آسان کام نہ تھا کوئی سہل مہم نہ تھی اس فلک نجات کی حفاظت بڑی بھاری قربانیاں چاہتی تھی بڑے بڑے فدیوں کی ضرورت تھی قدم کے ڈگمگا دینے والے مصائب کا تحمل درکار تھا لیکن اس کشتی کا ناخدا ان تمام نوائب وشدائد کی دھمکی سے ذرا نہ جھجکا ہجوم مظالم کی دعوت کو بڑی خوشی سے لبیک کہا اور تمام آنے والی مصیبتوں کا تہ دل سے خیر مقدم کیا اور باوجود ایسے دردانگیز صدمات ومصعوبات کے جن کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور جو انسانی طاقت برداشت سے کہیں بالاتر ہیں

آخر دم تک ثابت قدمی کے جادۂ مستقیم سے ایک اِنچ نہ سرکا اگر تمام دنیا کے پُر درد واقعات اور پُر سوز حادثات کو فراہم کرکے کربلا کے سانحۂ ہوش ربا سے موازنہ کیا جائے تو اس کے مقابلہ میں سب ہیچ و لاشے نظر آئیں گے اور سطح ارض کی کسی قوم اور کسی ملک کی تاریخ ایسے حوصلہ شکن انبوہ مصائب اور ایسی تحیر افزا قوتِ ارادی اور ہمتِ مردانہ کی نظیر پیش نہ کرسکے گی لیکن ہادیٔ اسلام علیہ التحیۃ والسلام کے فرزند اور ملتِ بیضائے اسلام کے محسن و مُربّی کا یہ شاندار کارنامہ اور تمام شہادتوں کی سرتاج شہادت کیا ایک ملکی و سیاسی جھگڑا یا اتفاقی حادثہ تھا نہیں ایسا نہیں ہمارے شہید اعظم کا نقطۂ خیال اور مطمح نظر ایسا بلند اور ارفع تھا جہاں تک رسائی کسی دوسرے انسان کا طائرِ وہم و خیال اپنی قوت و بلند پروازی میں نہیں پاتا اس شہادتِ عظمیٰ کی بنیاد صداقت حقانیت کی صیانت و حفاظت تھی اس کی تہ میں احیائے شریعت و حمایتِ ملت کا راز مضمر تھا درحقیقت یہی اس شہادت کا فلسفہ ہے اور یہی علتِ غائی۔

دنیا جب سے آباد ہوئی ہے اور جب تک قائم رہے گی واقعات و حادثات کا سلسلہ بھی لگاتار جاری رہے گا۔ کارکنانِ قضا و قدر ایک پل کے لئے اپنے فرائض سے غافل نہیں واقعات کے اس دائمی اور درد تسلسل میں کوئی حادثہ اتفاقاً وقوع میں آئے یا ارادۃً اپنے پیچھے ضرور کوئی نہ کوئی نتیجہ چھوڑ جاتا ہے لیکن وہ واقعہ جس قدر عظیم الشان ہوتا ہے اسی کی مناسبت سے اس کے عواقب و نتائج بھی بلند پایہ ہوتے ہیں کربلا کا واقعہ جس قدر دنیا کی تاریخ میں ایک جداگانہ نوعیت رکھتا ہے اسی قدر اس کے مقاصد و اغراض بھی دور رس اور مصالح عظیمہ پر مبنی ہیں صرف رونا اور رلانا ہی اس شہادتِ کبریٰ کا مقصدِ اصلی نہیں بلکہ ہمارے مقتول فی سبیل اللہ کا مدعائے حقیقی اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ تھا جس کو ہم سمجھے ہوئے ہیں ہادیٔ اسلام کے فرزند نے اپنے جدِّ بزرگوار کے دین کی حفاظت اپنے دوست اپنے رشتہ دار اپنی اولاد کٹوا کر اپنا خون بہا کر اپنا مال لٹا کر دل ہلا دینے والی مصیبتیں اوٹھا کر کی ہے اس حفاظت کا مقصد صرف علم بلکہ عمل ہے یاد رکھنا چاہیئے کہ حسین کی غلامی کا مستحق صرف وہی ہوسکتا ہے جو ان کے نانا کا غلام ہو اور ان کے نانا کا غلام وہی ہوسکتا ہے جو خدا کا عبد مطیع ہو اور خدا کا عبدِ مطیع وہی ہوسکتا ہے جو اس کے اوامر و نواہی پر خلوص نیت سے عمل کرے ورنہ دعوئے غلامی حسین "کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماءً" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا ہمارا شہید اعظم

عیسائیوں کا سا شہید نہیں ہے جس نے اپنے نام پر بپتسمہ لینے والوں کے گناہوں کا بار اپنی گردن پر لے کر ان کو خلیع العذار کردیا اسلام کی شان اس سے کہیں بالاتر ہے اسلام کا قانونِ الٰہی ببانگ پکار کر منادی کر رہا ہے۔ "مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ" ترجمہ جو شخص ایک ذرّہ کی برابر نیکی کریگا اس کی جزا ملیگی اور جو ایک ذرہ کی برابر بدی کریگا سزا بھگتے گا۔

اس لئے ہمارا فرض ہے کہ تاریخ اسلام کے اس سب سے عظیم واقعہ کو جو ہر پہلو سے ہمارے لئے سبق آموز ہے رطب و یابس کو چھانٹ کر اپنا دستور العمل بنائیں اس شہادت کے واقعات کو سطحی نظر سے نہ دیکھیں بلکہ اس کے اسباب و نتائج کے فلسفہ کو سمجھنے کے لئے ان کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں ہر پہلو پر نظر غائر ڈالیں۔ اسلام کے جن مذہبی اور اخلاقی مکارم کا اظہار ہوا ہے ان پر عمل پیرا ہونا اپنی زندگی کا نصب العین سمجھ لیں کیونکہ ہادیٔ اسلام کی تبلیغ رسالت اور ہمارے مجاہد اعظم کی سب سے بڑی قربانی اور شہادت کا روح و رواں صرف حسن عمل ہے اور یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مذہبی خیال روز بروز مندمل ہوتا جاتا ہے دنیا خدا پرستی چھوڑ کر خود پرستی کی طرف جھکتی جاتی ہے بد تہذیبی، بد اخلاقی یوماً فیوماً روبہ ترقی ہے وضع قطع لباس خور و نوش نشست برخاست ہر بات میں یورپ کا تتبع عین فرض ہے ماکولات و مشروبات حلت و حرمت کا کوئی تعلق نہیں طہارت کے اصول بالائے طاق حلال و حرام طاہر و غیر طاہر کا خیال وسوسہ لاحاصل سمجھ کر لفظ لباس و غذا میں ملکی موسم آب و ہوا سوسائٹی اور حیثیت کا لحاظ غلط ربود خلاصہ یہ کہ الناس علی دین (فیشن) ملوکھم سوسائٹی کا موٹو قرار پاتا جاتا ہے کہ فلسفہ اخلاق یہ رہ گیا ہے کہ

مے مدہ مے لفشان دست بزن پائے بکوب — درخرابات نہ از بہر نماز آمدۂ

روزہ کو قواعد حفظان صحت مانع نماز کو جدید روحانیت بیکار اور غیر ضروری بتانے پر آمادہ زکوٰۃ علم اقتصادی کے خلاف حج ایک غیر مفید اور پر صعوبت سفر خلاصہ یہ کہ جملہ اوامر و نواہی سمٹ کر غالب کے دو مصرعوں

"لاتقربوا الصلوٰۃ" زہیم بہ خاطر است — وز امر باد ماندہ "کلوا واشربوا" مرا

یورپ کا فلسفہ خود یورپ کے لئے کوئی معیار قائم نہ کرسکا تو ہمارے لئے کیا کرے گا ہمارا معیار وحی ہے اور

ہونا چاہیے جو ہمارے لئے قانون الٰہی ہے یعنے قرآن مجید احکام قرآنی کے ساتھ سید المرسلین و ائمہ معصومین کا ہر قول اور ہر فعل ہمارے لئے مشعل ہدایت ہے اگر ہم اس روشنی کے مینارہ سے ہٹ کر جادہ پیما ہوں گے تو اندھوں کی طرح قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں گے "فی وادٍ یہیمون" کا ارشاد ہم پر صادق آئے گا اور ہماری حالت اس زاغ آشیاں گم کردہ کی سی ہو جائے گی جس کو گھر پہونچنے سے پہلے آندھی نے آلیا اور وہ پریشان ہو کر بے مقصد منتہا اپنی قوت پرواز کو بیکار صرف کرتا پھرتا ہو مختصر یہ کہ جس طرح ہادی اسلام کے ہر قول اور ہر فعل کا اتباع ہمارا ایمان ہے اسی طرح ان ذوات مقدسہ کی محبت بھی فرض ہے جن سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو روحانی وجسمانی خاص تعلق تھا۔ حسین آپ کے لاڈلے نواسے تھے جن کے حق میں حسینؑ منی وانا من الحسینؑ فرمایا کرتے تھے۔ تو کیا حسین کی محبت ہم پر فرض نہیں اور کیا ان کے مصائب پر جو صرف احیائے اسلام کے لئے اختیار کئے گئے اثر پذیر ہونا اسلامی شعار کا ایک لازمی جزو نہیں سمجھا جائے گا۔ اسی وجہ سے حسینی شہادت کا سننا یا سنانا باعث اجر جزیل خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ذکر جذبات تاسی وتولا کو ہیجان میں لانے والا ہے لیکن اس قدر افسوس اور تعجب کا مقام ہے کہ اس عدیم المثال سلسلہ مصائب اور تمام شہادتوں کی سرتاج شہادت کے سارے واقعات ابتدا سے انتہا تک اس قدر مختلف ومتضاد ہیں اور ان میں رطب ویابس کا اس قدر ہجوم نظر آتا ہے کہ ایک جویائے تحقیق کا دماغ اس کے تصور سے ہی چکر لانے لگتا ہے اور وہ نہیں سمجھ سکتا۔ کہ کس عالم کے قول کو کس عالم کے قول پر ترجیح دے اور کون سے مورخ کو کاذب اور کون سے کو صادق سمجھے اس میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں کہ ان تمام مختلف بیانات و واقعات کی تصحیح اور روایات وموضوعات کی تنقید کوئی آسان کام نہیں یہ ایک نہایت دشوار اور کٹھن مرحلہ ہے کیونکہ فریقین کی تمام کتب تاریخ کی فراہمی ان کی بالاستیعاب ورق گردانی اختلافی روایات کے ضروری نوٹ ان کی محققانہ چھان بین ہر واقعہ کی تحقیق وتنقیح ہر روایت کو اصول درایت کی کسوٹی پر کسنا ہر روایت کی تائید یا تردید تاریخی شہادتوں سے کرنا راویوں کے ثقہ وغیر ثقہ ہونے کی جرح وتعدیل اور اس جانکاہی ودماغ سوزی کے بعد قابل اطمینان نتیجہ پر پہونچنا نہایت ہی دشوار دقت طلب وقت طلب فرصت طلب اور محنت طلب کام ہے اور ایک شخص واحد اس عظیم الشان کام

کے حوصلہ شکن مشکلات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ جس گروہ میں اصول دین اور عقائد خمسہ میں بھی عدم تقلید اور دلائل عقلی سے تنقید کا حکم دیا گیا کس قدر مقام حیرت ہے کہ اسی طبقہ کے افراد ان واقعات کی جرح وتعدیل پر جن کا سننا سنانا داخل عبادت سمجھتے ہوں بھولے سے بھی توجہ نہ کریں ذاکر منبر یا کرسی پر بیٹھ کر جو کچھ بیان کر دے اس کے رطب ویابس صحیح وغلط مقبول وموضوع میں امتیاز کئے بغیر سر تسلیم خم کر دیں حتے کہ ساقط الاعتبار اور بے سروپا روایات کو بھی جو سراسر بہتان وافترا منافی شان اہلبیت اور باعث توہین خاندان رسالت ہوں رنگ آمیزی اور جدت طرازی کے ساتھ بیان کرنے سے نہ جھجکیں اور ذاکرین وسامعین کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو جائے کہ ابکا و بُکا کے لئے جو کچھ بھی کیا جائے جو کچھ کہا جائے جو کچھ بھی سنا جائے سب کا سب جائز ہے بہ کثرت ایسے ہی حضرات ہیں جن کا مبلغ علم صرف مرثیے غیر مستند اور معمولی کتابیں یا ذاکرین کا زبانی بیان ہے وہ ہر واقعہ کو خواہ وہ من گھڑت ہی کیوں نہ ہو صحیح باور کرنے پر مجبور ہیں۔ میں نہ کوئی مجتہد ہوں نہ عالم البتہ مجھ کو تاریخ سے فطری شغف ہے پچاس سال سے تمام دنیا کی ہسٹری (محیط التواریخ) لکھ رہا ہوں جس کی ضخامت پچیس جلدوں سے زیادہ ہو چکی ہے اس وجہ سے مجھ کو اس فن میں کسی قدر تبصرہ حاصل ہو گیا ہے یہ جلد بھی اسی بسیط تاریخ کا ایک حصہ تھی میری عمر اسی سال کے قریب پہونچ چکی واقعات کا سلسلہ نامتناہی اور اس کا دامن قیامت کے دامن سے ملا ہوا ہے ہر چوبیس گھنٹہ میں کہ آفتاب عالمتاب اپنا دورہ پورا کرے یا زمین اپنے محور پر گردش کر جائے دنیا کے ہر حصہ میں بیشمار حادثات رونما ہو جاتے ہیں میں ایشیا یورپ افریقہ امریکہ کے جن تاریخوں کو مکمل کر چکا تھا ان کی جغرافیائی اور سیاسی حالت کو پچھلی جنگ عظیم نے درہم کر دیا اور اس کے بعد کے نظام کو موجودہ جنگ عظیم اولٹ پلٹ دیگی اس لئے میں اب اس کی تکمیل سے قاصر ہوں اس لئے اس جلد کے متعلق میرے فرزند دلبند قرۃ العین سید طاہر حسین سلمہ۔ ایم اے منشی فاضل ادیب فاضل پروفیسر مہاراجہ کالج جے پور نے اصرار کیا کہ محیط التواریخ کے سلسلہ سے اس کو الگ کر کے شائع کر دیا جائے اونہیں کی تحریک سے میں نے اس کے دو حصے کر دئے حصہ اول جو بطور مقدمہ ہے اس میں مختلف عنوانوں سے اسباب ونتائج پر نقد وتبصرہ ماقبل ومابعد پر ضروری بحث واقعات کی صحت وغیر صحت پر تنقید وغیرہ درج

ہے دوسرے حصہ میں مفصل واقعات ان میں ضروری مقامات پر مورخانہ تنقید وبحث کی گئی ہے یہ کتاب دوسری کتب مقاتل کی طرح بکاوابکا یا مجالس میں پڑھنے کے لئے نہیں لکھی گئی۔ بلکہ جو کچھ لکھا ہے وہ حتی الوسع تاریخی اصول پر ہے۔ بعض جگہ میں حق بات کہنے سے نہیں رکا حق بات کہی ہے اور اس کا کڑوا ہونا ہزاروں برس سے مسلم فریقین کے علمائے معتبر کی مستند کتابیں میری اس کتاب کا ماخذ ہیں جہاں ضروری سمجھا ہے آزادانہ جرح وتعدیل بھی کی ہے۔ تاہم میں اپنی تحقیق وتفتیش کی صحت وصداقت کا حتماً دعویٰ نہیں کرتا ممکن ہے کہ میرا خیال ہے غلط ہو مجھسے جہاں تک ہوسکا ان لوگوں کی نسبت بھی جنکو بعض مسلمان نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مکروہ الفاظ سے پرہیز کیا ہے کیونکہ یہ بات تہذیب ومتانت کے خلاف ہے اب میں نہایت ادب کے ساتھ ناظرین کرام سے مستدعی ہوں کہ اگر کہیں غلطی ہو تو میری عدم قابلیت اور ایک بڑے کام کی طرف مصروفیت کو پیش نگاہ رکھ کر معذور سمجھیں۔ میں نے صرف دینی خدمت سمجھ کر اس کام کو جیسا بھی ہوسکا انجام دیا ہے۔ یہ کتاب شہادت حسینؑ کو پورے تیرہ سو سال گذر جانے کی یادگار کے طور پر ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے میں ایک الیسا روسیاہ اور ننگ بنی نوع بندہ ہوں کہ ساری عمر ہزلیات ومعاصی میں برباد کر کے گناہوں کے پشتارہ کو اس قدر گرانبار کر لیا ہے کہ اس کے وزن کو ہمالیہ جیسا پہاڑ بھی نہ اٹھا سکے میں نہیں جانتا کہ میرا کیا انجام ہوگا۔ اور اس ملک الملوک کے دربار میں جہاں ننگ وبادشاہ وگدا سب برابر ہیں مجھ جیسے عبد ذلیل کی روبکاری کس حیثیت سے ہوگی ہاں اسی غفار وستار کی ذات پاک پر بھروسہ ہے جس نے "سبقت رحمتی علیٰ غضبی" فرمایا ہے کیا عجب ہے کہ یہی چند ورق میرے لئے ذریعہ نجات ہوجائیں اور ارحم الراحمین بطفیل شفیع المذنبین واہلبیت طاہرین اور بتصدق شہدائے کربلا میری اس سعی کو مشکور فرما کر اس گرفت سے جسکا میں مستحق ہوں معاف فرمادے۔

یارب بہ رسالت رسول الثقلین ۔۔۔ یارب بہ غزا کنندۂ بدر وحنین

عصیان مرا دو حصہ کن در عرصات ۔۔۔ نیمے بہ حسنؑ بہ بخش نیمے بہ حسینؑ

جے پور ۔۔۔ خادم قوم وملت

محرم سنہ ۱۳۶۱ھ ۔۔۔ سید شاکر حسینؑ نقوی الامروہوی

مقدمہ

دنیا کا ہر واقعہ اور ہر حادثہ اہل بصیرت کے لئے ایک یاد اور غور کرنیوالوں کیلئے ایک پیغام چھوڑ جاتا ہے اور اس پیغام کو اسکی کیفیات کے ساتھ یاد رکھنے کا نام تاریخ ہے پھر اس کو ضبط تحریر کر کے آئندہ آنیوالی نسلوں کے لئے محفوظ کرنا کس قدر ضروری ہے اس کا اندازہ اس واقعہ کی اہمیت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

عام طور پر ہر واقعہ کسی نہ کسی عنوان سے ضرور یاد رکھا جاتا ہے اور ہر حادثے میں ظالم اور مظلوم کے تصادم کو مورخ کا قلم آہستہ وار دکھانیکی کوشش بھی کرتا ہے مگر حادثے کے بعد ہی ایک خاص صورت پیدا ہونی لازمی ہے یعنی اگر مظلوم کا گروہ کامیاب ہوجائے تو پھر اس ظلم کا کفارہ ہو کر آہستہ آہستہ وہ واقعہ خود بھول جاتا ہے اور اگر ظالم سرفراز ہو تو اس کے حمایتی ہر ترکیب سے اس واقعہ اور اس کے حالات کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اگر نہ چھپا سکیں تو اس میں اس قدر اختلاف شامل کرتے رہتے ہیں کہ بیروں میں گٹھلیاں اور گٹھلیوں میں بیر مل اسکی اہمیت کم بلکہ کمتر ہوجائے اور رفتہ رفتہ بجائے درس عمل کے وہ ایک من گھڑت افسانہ سا معلوم ہونے لگے اور سننے اور سمجھنے کے حد سے بالاتر ہوجائے۔

اسی اصول کی روشنی میں اگر واقعہ کربلا کو جانچا جائے تو معلوم ہوجائیگا کہ تمام دنیا کی تاریخ ایسا ایک واقعہ بھی نہیں دکھا سکتی۔ ویسے تو ہر جگہ آہستہ آہستہ ظلم کا پیالہ لبریز ہو کر ضرور چھلکا ہے اور صدیوں صاحبان ہمت وجرأت کو ظلم کی تصویر کی نقاب کشائی میں لگے ہیں۔ مگر اللہ رے حسینؑ کی جرأت کہ چند گھنٹوں میں وہ کام کر کے دکھا دیا کہ تو میں مل کر بھی سیکڑوں برس میں شاید اتنا کام نہ کر سکیں زیادہ نہیں دن کے ایک مختصر سے حصہ میں اپنے خون سے اپنے عزیزوں اور حبیبوں کے رنگین لہو سے ظلم کی تصویر میں ایسا گہرا رنگ بھر دیا کہ کوسوں دور سے۔ صدیوں کی منزلوں سے ظلم اور ظالم کی صورت ہر متنفس عریاں دیکھ لیتا ہے۔ اور وہ فقط اس لئے کہ حسینؑ کو اپنے نانا اور ان کے لائے ہوئے دین سے محبت نہیں بلکہ عشق تھا۔ اور اس عشق کا کیا کہنا۔

صدق خلیل بھی ہے عشق۔ صبر حسین بھی ہے عشق ✝ معرکۂ وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق

غرضکہ بالکل یہی کیفیت اس واقعہ کے بعد بھی گذری۔ اگرچہ ظالم اور ظلم واقعہ کربلا کے بعد پریشان اور سرگردان ضرور ہوگئے۔ اور اپنی آخری تمنا بھی پوری نہ کر سکے۔ مگر حسینؑ اور حسینؑ والوں کے حالات پر ہر وقت پردے ڈالنے کی کوشش میں لگے رہے۔ حسینؑ کا نام لینا جرم قرار دیا گیا ان شیروں کی آخری آرامگاہ کی زیارت سیاسی عتاب کی وجہ قرار پائی۔ اس تصادم کو بیان کرنے کی کسی کو مجال نہ تھی مگر جسم مقید ہو سکتے ہیں۔ دل اور دماغ قید اور مجبور نہیں کئے جا سکتے عربستان کے جب دو آدمی بھی سر جوڑ کر بیٹھتے تو حسینؑ کے زریں کارنامے دہرائے جاتے اور ظالموں کے لئے نفرین کے

تخت اور تختہ دونوں کو الٹ دیا گیا۔

الفاظ دل کی زبان سے نکلتے۔ آخر انقلاب آیا اور بنی امیہ کا تخت اور تختہ دونوں کو الٹ دیا گیا۔

بنی امیہ کے بعد بنی عباس نے چابکدستی سے بساط سیاست پر قبضہ جمالیا۔ بنی عباس چونکہ انقلاب کرنے والوں میں پیش پیش تھے اور اس واقعہ کی عظمت اور اہمیت کا خوب اندازہ کر چکے تھے۔ اس لئے آئینہ میں ان کو اپنے شیش محل کی بھی شکست نظر آرہی تھی لہذا انہوں نے قوت کے قلم سے ایسی کتابیں لکھوائیں جس میں حق ہیں اور حق کو اس طرح کھویا جائے کہ جادہ حق کو ڈھونڈے بھی نہ پاسکے۔

ادھر سلطنتی مورخ یہ کام کر رہے تھے اور دوسری طرف دردمند زبانی روایتیں بیان کرتے رہتے تھے اور سننے والے دوسروں کو سناتے چلے جاتے تھے۔ اور ہر سنانے والا اپنے الفاظ میں مصوری کرتا چلا گیا۔ اور رفتہ رفتہ واقعات کچھ ایسے صورت اختیار کرنے لگے کہ ایک دوسرے سے بیگانہ معلوم ہوتے تھے۔

آخر یہ دور بھی اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ ظالم اور مظلوم دونوں ظاہری نگاہوں سے چھپ گئے اور کچھ آزادی کے سانس انسانوں نے لئے اور دل کھول کر ذکر حسین۔ کیا گیا۔ لکھا گیا اور پڑھا جانے لگا۔ چونکہ مدتوں کی قید و بندش کے بعد ایسا موقعہ ملا تھا۔ ہر دردمند واقعات کربلا بیان کرنے میں بے دردی تک جا پہنچے اور جس ممکن اور غیر ممکن طریقے سے ہو سکا ذکر حسین کو جاری کرنے لگے۔ اس دوڑ میں اصلی مقصد بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اور نکلا جا رہا ہے۔

آج ہی دیکھئے اور غور کیجئے۔ اس موجودہ دنیا کا کون انسان ہوگا جو حسین کے نام سے نا آشنا ہو۔ اوّل تو سال بھر کسی نہ کسی تقریب سے یہ نام کانوں تک پہنچتا رہتا ہے ورنہ محرم کا چاند دکھائی دیتے ہی زمین و آسمان سے حسین حسین کی آواز بلند ہو جاتی ہے۔ امام باڑوں کے در و دیوار علموں کے پھریرے۔ تعزیوں کے جلوس۔ تعزیت کی مجلسیں اور جلسے ہزاروں پوسٹر۔ لاکھوں اشتہار اور رسالے۔ ذاکرین کی پکار۔ واعظین کے پر عظمت بیان میں حسین اور حسین کے دل ہلانے والے کارنامے سنائی دیتے ہیں۔

مگر کتنے انسان ہیں جو اس قدر پر ہیبت درس عبرت سے کچھ سبق حاصل کرتے ہیں۔ ان سب واقعات اور حسین ع کی زرّیں قربانیوں کے نقشے کھینچتے ہیں اور اپنا مستقل اثر کئے بغیر چلے جاتے ہیں۔ محرم گذر جاتا ہے مجلسیں ختم ہو جاتی ہیں۔ رسالے پڑھ کر زیب الماری کر دیئے جاتے ہیں۔ کان سنتے ہیں۔ آنکھیں پڑھتی ہیں۔ دل اور دماغ کانپ جاتے ہیں مگر جھوٹا سچا نہیں بن سکتا۔ ظالم اپنے ظلم سے باز نہیں آتا خائن امانت داری نہیں سیکھتا۔ رشوت لینے والا تو بہ نہیں کرتا۔ خلق خدا کے حقوق غصب کرنیوالا برابر غصب کئے جاتا ہے آخر یہ دل اور دماغ پتھر کے بن گئے ہیں۔ کیا حسین ع کے دامن سے وابستگی کا اعلان کرنے والے اس قدر بے حس ہو گئے۔ آیئے آیئے اس کو سوچیئے۔ اس مصیبت پر غور کیجئے اور اس اکبر کو خاک میں ملنے سے بچایئے۔ ؎

غور فرمایئے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ ہر بچہ خواہ کسی مذہب و ملت کا ہو۔ کسی رنگ کا ہو۔ وہ دین فطرت پر پیدا

ہوتا ہے۔ یعنے اس میں دین فطرت سمجھنے اور اس پر چلنے کی قابلیت اور صلاحیت ضرور ہوتی ہے اور دین فطرت دوسرے لفظوں میں دین اسلام ہے۔ جس کی پیشانی پر قدرت نے لکھدیا ہے کہ اس چند روزہ دنیا میں جیو اور جینے دو اس دین کو انسانوں اور انسانیت کے سرتاج ہمارے پیارے رسول لائے جن کو خدا نے انسانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ بلکہ دونوں جہان کیلئے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔ اور انہوں نے اس دنیا میں ۶۳ سال زندگی گذار کر بتلا دیا کہ ایک مسلمان کو کس طرح جینا چاہیے اور کس طرح مرنا چاہیئے۔

انہوں نے انسانوں کو پھول بنا دیا۔ جس کو ہر ایک اپنے پاس رکھ کر خوش ہوتا ہے انہوں نے خونخوار انسان کو رحیم اور کریم بنا دیا۔ انہوں نے امیر او رغریب کا فرق مٹا دیا۔ رسول اللہ نے بتا دیا اور کر کے دکھا دیا کہ انسان فقط خدا کے سامنے جھک سکتا ہے اور اسی خدا کے بنائے ہوئے قانون پر چل کر انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ اپنے غریب بھائیوں کو اپنی نعمتوں میں شریک کر لیتا ہے اور انہیں غریب بھائیوں کے سامنے عذر بھی کرتا ہے کہ مجھ سے حق خدمت ادا نہیں ہو سکا۔ ایسے مفصل اور مکمل قانون کا نام دین رکھا۔ اسلام رکھا۔ اسی دین کو اللہ نے اپنی مخلوق کے لئے پسند کر لیا اے کاش کہ اس دین پر دنیا چلتی اور اپنے چلن کے نمونے سے اوروں کو بھی گرویدہ کر لیتی اور یہ دنیا ایک امن کا گہوارہ ہو جاتی۔

مگر افسوس رسول اللہ کے بعد تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ حالت بدلنی شروع ہوئی اور اس ہرے بھرے گلزار کا مالی اور رکھوالا ایک ایسا شخص بن بیٹھا جو کسی طرح بھی اس لائق نہ تھا جس نے اپنی فوجوں کی طاقت سے اپنے خزانوں کے توڑوں سے۔ انسانوں کو دبانا۔ اور خریدنا شروع کر دیا۔

جمہور سے اخلاقی جراتیں چھین لیں۔ نیکیاں برباد ہو گئیں۔ فسق و فجور حرامکاری کا بازار گرم ہو گیا عدل کی جگہ ظلم نے سنبھال لی۔ حق دبنے لگا۔ باطل ابھر کر مسند رسول پر ہو بیٹھا۔

زور بھی تھا ہاتھ میں ظالم کے مال و زر بھی تھا + سلکِ مروارید میں پہنا ہوا خنجر بھی تھا

سب حق پرست سہم گئے۔ ڈر گئے۔ ظالم کے سامنے جھکنے لگے اور غضب پر غضب یہ تھا کہ یزید اپنے آپ کو رسول ص کا حقیقی جانشین بھی منواتا تھا اور کمزور دل انسان جبراً و قہراً مان رہے تھے۔

ہاں مگر بے خوف تھا اک راکبِ دوشِ نبی — دستِ فاسق پر نہ کی بیعت کیا مرنا قبول
جان دے کر سلطنت کے بت کی پوجا روک دی — قوم میں بدعت جو ستی ہونے کو برپا روک دی

آج سے پونے تیرہ سو برس پہلے زمین کربلا پر ایک خونی ڈرامہ کھیلا گیا۔ جس میں رسول کے جان و جگر حسین نے سب سے بڑا خسارہ اٹھا لیا۔ پیارے بیٹے۔ جانثار عزیز۔ وفادار دوست اپنی آنکھوں کے سامنے شہید کرا دیئے۔ اپنا سر نثار کر دیا اپنا گھر لٹوا دیا۔ رسول اللہ کی پیاری نواسیاں قید کرا دیں دنیا کے سامنے ایک عظیم الشان سبق رکھدیا کہ کامل انسان کبھی حق

سے نہیں گذرتا۔ جان سے گذر سکتا ہے اس کی زبان جھوٹ سے آلودہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ظالم کی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتی ہے اس کے ہاتھ ظالموں کے شریک کار نہیں ہو سکتے۔ بلکہ میدان جنگ میں حق پر کٹ کر پامال ہو سکتے ہیں اس کے قدم ناحق کیطرف نہیں بڑھ سکتے۔ اس کا سر کسی ظالم کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ بلکہ اللہ کے سجدے میں کٹ کر نیزے پر بلند ہو سکتا ہے۔ حسین کی بیٹیاں اور بینظیر قربانی ہم کو پکار رہی ہے کہ جاگو جاگو میرے بھولے ہوئے بھائیو جاگو اور اپنے ظاہر و باطن کا جائزہ لو اور حسین نے جو حق و صداقت، جانبازی اور جاں نثاری کا موجیں لیتا ہوا سمندر چھوڑا ہے اس میں سے دو دو گھونٹ پی کر حق کے متوالے بن جاؤ۔ آیئے آیئے میدان میں آیئے۔ ہے کوئی جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے نہیں بلکہ انسان کہلاتا ہے اور آج اپنے ضمیر سے عہد کرے کہ حق پر قائم ہو جائے۔ اسکا سر فقط خدا کے سامنے جھکے۔ اس کی آنکھوں میں عفت کا سرمہ ہے۔ اس کے قلب سے غیر خدا کا خوف نکل جائے اسکی زبان فقط سچائی کی شمشیر برہنہ بن کر چمکے۔ اس کا پیٹ، سود۔ رشوت۔ غصب کے مال۔ حرام اور نجس اور ناپاک چیزوں کے لیے بند ہو جائے۔ اس کا وجود ہر انسان کے لئے محبت اور شفقت کا گہوارہ بن جائے۔ اور اس مقدس عہد کے لئے جان ہتھیلی پر رکھدے کسی نے کیا خوب لکھا ہے

حسین کا سر ہے آسمان پر کبھی رہا تھا سر سنان پر ✤ تو کم سے کم سر بکف تو ہو جا اگر ہے ہونا بلند تجھ کو

مگر یہ سب کچھ اسیوقت ہو سکتا ہے جبکہ واقعات کربلا صحیح تاریخ کے لباس میں ہر شخص کیسامنے پیش کئے جاسکیں ورنہ موجودہ ذکر حسینؑ میں تو عجیب و غریب بے ربطی سی پیدا ہو رہی ہے ایک فریق تعزیہ۔ باجہ۔ اور مختلف کھیل کود کے سامان مہیا کر کے ایک تہوار کی رسم ادا کرتا ہے اور خاموش ہو جاتا ہے مگر اس میں ان کا قصور بہت تھوڑا ہے کیونکہ یہ یادگار ہے اس ظالمانہ دور کی جبکہ واقعہ کربلا اپنے پورے اثرات کیساتھ بیان کرنا جرم تھا۔ اسلئے دور بین حضرات نے اِن رسموں کے پردے ڈال کر عوام کے دلوں میں دماغوں میں حسین کا نام نقش کرنا چاہا اور کر دیا اب یہ ہمارا فرض ہے کہ تصویر کے اس رخ کو بدلیں اور اپنی گفتار، رفتار اور کردار کے ذریعہ اپنے بھولے بھٹکے بھائیوں کو اپنے ساتھ لے کر چلیں اسکے علاوہ دوسرا فریق مجلس ماتم جلوس۔ نذر نیاز کے ساتھ غم حسین کو تازہ ضرور کرتا ہے مگر اسکی اصلی غرض و غایت سے بے نیاز ہو کر وہ ان تمام رسموں اور اخراجات کو سوداگرانہ صواب کے شیشے میں جمع کرتا رہتا ہے۔ اس کے ذمہ دار ہمارے واعظین۔ ذاکرین ہماری کتابیں۔ مرثیے جنہوں نے روایتی ترکیب سے تاریخی حیثیت حاصل کر لی اور ان پر کسی قسم کی نکتہ چینی گناہ اور بد اعتمادی کے مترادف ہو چکی ہے مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ ہمارے ملک میں ہزاروں دل ایسے موجود ہیں جو حسین پر نہیں بلکہ ذکر حسین کے اس طور پر بے اثر کر دینے پر تڑپتے ہیں انکی آنکھیں حسین سے زیادہ قربانی حسین کو افسانہ اور قصہ کہانی بنتے دیکھکر روتی ہیں کبھی کبھی دھیمے سروں میں آواز بھی اٹھتی ہے مگر تقدس کی دھونس ان کو دبادیتی ہے۔

ہزار اور صد ہزار آفرین مولینا شاکر حسین صاحب پر جنہوں نے اس موضوع پر شمشیر قلم سے ایسی کتاب لکھدی کہ جو کچھ ہمارا دل چاہتا تھا اس سے ہزار درجہ زیادہ لکھدیا اس ابر گوہر بار میں تاریخ کی چمک۔ تحقیق کی دمک ہیں۔ حسین کی اس عظیم الشان

قربانی کی ہر گرہ کو اس خوش اسلوبی سے کھولا ہے اور ہر واقعہ بلکہ حسینی کارنامے کی ہر شاخ کو ایسی دماغ سوزی اور چھان بین سے صاف کیا ہے کہ نکتہ نکتہ صاف نظر آتا ہے تمام موضوع اور غیر ثقہ روایتیں مجروح حدیثیں حقیقت واقعات کو تحقیق کے اصول پر کرا ہے۔ اور یوں پر سیر حاصل بحث کر کے اصلی واقعات کو بالکل پاک کر دیا ہے۔

کتاب کی سیر کرنیسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولینا موصوف نے باوجود پیرانہ سالی اور اپنے ضعف و نقاہت کے حبیب ابن مظاہر کیطرح جوانوں کو پیچھے بٹھا دیا اور تاریخ کے بحر ناپیدا کنار سمندر میں غوطہ لگا کر تمام در شہوار اور گوہر شب چراغ جو دبھر کر باہر نکال لائے ہیں اور ساتھ ساتھ مولینا کی بزرگانہ تنقید اور ہدایتیں قومی درد کا نشان دے رہی ہیں حقیقت یہ ہے کہ مجاہد اعظم عوام سے زیادہ خواص کے دستور العمل بننے کے قابل کتاب ہے کاش کہ ہر واعظ اور ذاکر اس کتاب کو پڑھے۔ سوچ سمجھے اور غور کرے مگر نیک نیتی سے غور کرے کیونکہ تاجرانہ ذکر حسین کرنیوالوں کیلئے یہ چابک ہے ان کو اس کتاب کا ایک ایک لفظ کھلیگا۔ خیر مضائقہ نہیں۔ انشاء اللہ یہ عظیم المرتبت کتاب اپنا اثر کئے بغیر نہ رہیگی اور ہمارے دلوں اور دماغوں میں ضرور انقلاب عظیم پیدا کرے گی پڑھنے والے اوروں کو پڑھوائینگے۔ سنائیں گے اور پھر اپنی زندگی کے ہر پہلو پر خود تنقید کریں گے فلسفۂ شہادت اور ذکر شہادت کو نکھرا ہوا دیکھ کر اپنی زندگی کو بدلنے کی کوشش کریں گے انشاء اللہ۔

اس عظیم الشان کتاب کے لکھتے وقت۔ روایتوں اور کتابوں کو چھانتے ہوئے اور چھپوانے کی تگ و دو میں اور آجکل کی غیر متعلق رسموں پر اصلاحی اشارے اور ہدایتیں لکھوانے میں جو محنت اور جانکاہی مولینا کے قرۃ العین پروفیسر سید طاہر حسین صاحب ایم۔ اے نے فرمائی ہے اسکی تعریف نہیں ہو سکتی اگر اس کتاب کے درخشاں نتائج میں ان کو برابر کا شریک کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہو گا خدا کرے کہ وہ اس کا دوسرا حصہ بہت جلد زیور طباعت سے آراستہ فرمادیں کیونکہ اس کتاب کو پڑھکر انسان کا دل اور دماغ بالکل پاک و صاف ہو کر کربلا اور کربلا والوں کے صحیح حالات کا اسقدر منتظر ہو جاتا ہے کہ بیچین سا معلوم ہونے لگتا ہے چونکہ اس احقر کی نظر سے دوسرے حصہ کا مسودہ گذرا ہے میں فخریہ عرض کر سکتا ہوں کہ فضائل حسین میں اسقدر صاف۔ صحیح اور دلچسپ دل ہلا دینے والی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناظر کتاب خود حسینی قافلہ کے ساتھ ساتھ اپنے آقا کی رکاب تھامے چل رہا ہے اور ہر واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے ہر بات اپنے کانوں سے سُن رہا ہے حیران ہوں کہ اس دوسرے حصہ میں مولینا کے قلم میں یہ زور اور یہ رنگینی کہاں سے آگئی یہ کچھ اُدھر کا ہی فیضان معلوم ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ دوسرا حصہ بہت جلد پردہ شہود پر آجائے

آخر میں پھر دعا مانگتا ہوں کہ یا اللہ مولینا موصوف جو درویشانہ انداز میں علم کا چراغ روشن کئے بیٹھے ہیں ان کو اپنے اور فقط اپنے حبیب کے صدقے میں اس سے زیادہ ملک و ملت کی خدمت کی ہمت عطا فرما۔ اور قوم کو اس گراں بہا جوہر سے اپنے اپنے دیئے روشن کرنے کی توفیق دے۔ آمین

دعا کا محتاج

طاہر نبیرۂ حضرت آزاد

یکم مئی سنہ ۴۲ء

فہرست مندرجات

باسمہ سبحانہ

الحمد للہ علی نوالہ والصلوۃ والسلام علی خواص رجالہ السنۃ اقوالہ و مصادر افعالہ ومفاتیح افعالہ واعلی امثالہ علل الوجود واسرار السجود محمد وآلہ

امابعد کثرت مشاغل شرعیہ اور عدیم الفرصتی کے باوجود میں نے اس کتاب لاجواب مجاہد اعظم جلد اول مصنفہ بدر سماء الفضل والافادہ نجم فلک الشرف والسعادہ محرز الشرف والفخار حلیف العز والوقار اسوۃ الاماجد الکرام وصفوۃ الاطائب العظام المتمسک بالثقلین جناب المولوی شاکر حسین صاحب لازال فی ورع الامان من مکارہ الزمان کو مختلف مقامات سے مطالعہ کیا خاص کر عنادین فلسفہ شہادت، تنقید واقعات تاریخ، اصلاح رسوم تعزیہ داری کے متعلق جن براہین قاطعہ اور دلائل ساطعہ سے اسمیں احقاق حق و ابطال باطل کیا گیا ہے وہ عین ہدایت پر مبنی ہے، فلما طالعتہ وجدتہ یا ضح حکمۃ ورضوان سیفا قاطعا لالسنۃ الزیغ والطغیان وبرھانا ناطقا لاھل البرھان ونورا لامعا لاھل القسط والایمان شہابا ثاقبا لشیاطین الانس والجان تنتعش بفھم براھینہ القلوب فی الابدان وترتاح بدرک معانیہ الارواح فی عالم الامکان فیزداد وثوقا فی الدین الاتقان لاھل التقوی والایمان لانہ قد احتوی علی امثلۃ رائقۃ ومطالب فائقۃ بالقوانین القاطعۃ والحجج الساطعۃ فانہ ایدہ اللہ وابدہ اتعب نفسہ فی مرضاۃ ربہ طلبا لمراضیہ جعل اللہ مستقبل امرہ خیرا من ماضیہ وکانی لا اراہ الا مجاھدا ھمہ وغمہ صلاح الناس فی ادیانھم وفلاحھم فی ابدانھم شکر اللہ مساعیہ الجمیلۃ واجزل علیہ من مواھبہ الجلیلۃ فجزاہ اللہ عن حمایۃ الحق حق الجزاء ووقاہ عن شرور الاعداء انما دعاہ الی ذلک بالخصوص مالہ من قوۃ الایمان والخلوص فی تمسک الحق بالنصوص فعلی قاطبۃ المومنین ان یعاونوہ علی ترویج کتابہ ونشرہ انہ ولی التوفیق وھو خیر رفیق

دار الشریعۃ - ادات گنج
لاھور



نمقہ خادم الشریعۃ المطہرہ
علی الحائری (اعلی اللہ مقامہم)

نقل تقریظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شہادت کیا شئے ہے

اصطلاح میں شہادت اس قربانی کو کہتے ہیں جو مذہبی یا ملکی یا معاشرتی امور کی حفاظت وحمایت میں ظاہر ہو۔ یعنی اگر کوئی شخص مذہب یا ملک یا مال یا آبرو کی حفاظت میں جان دیدے تو اُسے شہید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے مذاہب وملل میں بھی شہادت کے لفظ کا کوئی مفہوم باقاعدہ موجود ہو۔ لیکن اسلام نے شہادت کے مفہوم کو نہایت ہی جسم بالشان پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

اسلام نے دنیا میں سب سے زیادہ زبردست زلزلہ خیز اور ولولہ انگیز جو چیز پیدا کی وہ شہادت کا عقیدہ تھا، جو شخص اسلام کے آگے سر جھکاتا تھا۔ اپنے وجود کو شہادت کی قربان گاہ میں فنا کردینے کا متمنی اور طلبگار نظر آتا تھا مسلمانوں کو یقین ہوگیا تھا کہ ایک وجود کی فنا دوسرے وجود کی بقا کے لئے لازمی ہے۔ جب تک ہم اپنے اجسام کو اسلام پر نثار نہ کردیں گے۔ جسد اسلام مستحکم کائنات نہیں بن سکتا۔ لہذا اُن کے جوانوں پر ہی منحصر نہیں، بلکہ بوڑھوں، بچوں، اور عورتوں تک میں شوق شہادت کا جذبہ موجیں مارتا نظر آتا تھا، گو عام جذبۂ شہادت میں مذہب اسلام کا ہر متنفس یکساں حصّہ لینا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ لیکن یہ ذوق شہادت جس گھرانے کا عطیہ تھا۔ خدائے تعالےٰ نے اسی خاندان کو مکمل ترین نمونہ بنا کر دکھا دیا۔ جس سے شہادت کی اصلی شان نظر آگئی

مگر ہم پہلے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کائنات ہستی میں ایک شئے کا وجود، دوسری شے کی شہادت (فنا) سے ہوتا ہے جنس انسان سے قطع نظر کرکے عناصر اربعہ کے اجزا، کو علیحدہ علیحدہ دیکھئے کہ جب تک ایک وجود فنا نہیں ہوتا۔ دوسرا وجود ہستی پذیر نہیں ہوسکتا۔ ایک بھاپ کو لیجئے۔ جس کے بل پر دنیا کے کارخانے چل رہے ہیں۔ ریلیں دوڑتی پھرتی ہیں، جہاز سمندر میں رواں اور دواں نظر آتے ہیں یہ کیا ہے، اور کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ سب جانتے ہیں کہ پانی کی شہادت اور قربانی سے (جو آگ کی تپش سے ہوتی ہے) بھاپ کا طلسمی جسم تیار ہوتا ہے یعنی پانی آتشی حرارت کے خنجر سے ذبح ہوکر جسم کو چھوڑتا اور بھاپ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ دانہ خاک میں ملتا ہے اپنا نام و نشان مٹاتا ہے۔ تو درخت اور غلہ۔ پھل اور پھول کا وجود ظاہر ہوتا ہے۔ روئی اپنے وجود کو قربان کرتی ہے۔ تو سوت تیار ہوتا ہے۔ اور آدمی کی تن پوشی کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ سب برہنہ ہی پھرتے۔ کھانے میں صرف دانے کی مثال پر موقوف نہیں۔ دانہ کے بعد شہادت اور قربانی کا سلسلہ دور تک چلا جاتا ہے۔ دانوں کی شہادت سے آٹا ظاہر ہوتا ہے۔ آٹے کی شہادت سے روٹی نمودار ہوتی ہے۔ روٹی کی شہادت سے پرورش کا ظہور ہوتا ہے۔ تیل نہ جلے تو روشنی کہاں سے پیدا ہو۔ بتی آتشی آرہ سر پر نہ چلوائے۔ تو سب اندھیرے میں ٹکراتے پھریں۔ باغ میں جائے۔ نہر کا پانی درختوں میں اگر جذب و فنا ہو رہا ہوگا۔ باغ کی شادابی اسی شہادت پر منحصر ہے، پانی قربان نہ ہو تو درخت جل کر رہ جائیں۔ المختصر اسی شہادت کی بنیاد پر عالم ہستی کا سب کارخانہ قائم ہے۔

اب یہاں نہایت باریک اور نازک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شہادت کارخانۂ عالم میں ایسی ضروری اور مفید شے ہے۔ تو اس کے میسّر ہونے پر ماتم کیوں کیا جاتا ہے۔ غم و افسوس کا اس سے کیا تعلق، اور لوگوں کو اس سے کیا سروکار، مگر یہ کچھ ایسی پیچیدہ بات نہیں جس کا سمجھنا مشکل ہو۔ جو چیز شہید ہو رہی ہے اس کو تو اپنی موت کا کچھ افسوس و غم نہیں ہوتا، نہایت بے پروائی اور اطمینان سے اپنی ہستی مٹانے کو آمادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن غیروں کے دل پر اُس کی چوٹ

لگنا مقتضائے فطرت ہے، بشرطیکہ ان دلوں میں انسانی حس اور درد شناسی کا مادہ بھی ہو۔ یہ تو بہت بڑی خود غرضی ہے کہ جس چیز نے ہمارے فائدے کے لئے اپنی جان دیدی ہے اس کا رنج بھی نہ کریں۔ جو بتی پہلے جل چکی ہے۔ اس کا سرا جلد ہی آگ پکڑ لیتا ہے۔ لیکن نئی بتی کو جس نے پہلے آگ کی شکل نہ دیکھی ہو مشکل سے روشن کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جن دلوں میں قدرت نے محبت و ہمدردی ودیعت فرمائی ہے، وہ تو عالم کی تمام شہادتوں سے درد محسوس کرتے اور اثر پذیر ہوتے ہیں لیکن جو ازل سے سنگین سرشت پیدا ہوئے ہیں وہ اس بھید کو سمجھنا تو کجا سمجھنا چاہتے ہی نہیں۔

"اسلام میں شہادت کی ابتدا"

اور حسینی شہادت کی خصوصیات

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ شہادت کیا چیز ہے، اور دنیا میں اُس کے بل پر صدہا کام چلتے ہیں۔ اب یہ جاننا چاہیئے، کہ اسلام میں شہادت کا دَور کب شروع ہوا۔ اور کون کون بزرگ سب سے پہلے شہادت کے وارث قرار پائے، جناب ختمی مآب صلعم کو سب سے اول بدر کا معرکہ پیش آیا، اس لڑائی میں جو مسلمان شہید ہوئے، ان کا رتبہ بعد کی لڑائیوں کے شہدا سے زیادہ مانا جاتا ہے، بلکہ جو لوگ زندہ بچے وہ بھی شرکتِ بدر کا فخر شہدا کی طرح کرتے تھے۔ اور مسلمان اُن کے اعزاز کو تسلیم کرکے ان کی عظمت و بزرگی کو دوسرے مجاہدین پر فوق دیتے تھے اسی طرح شہادت کا سلسلہ بدر سے اُحد اور اس کے بعد دوسرے معرکوں کے سبب جڑ پکڑتا گیا۔ یہاں تک، کہ مسلمانوں میں آج تک دین کی حفاظت و حمایت میں جان دینا شہادت خیال کیا جاتا ہے۔

لڑائیوں سے قطع نظر کرکے اسلام میں سب سے پہلے حضرت عمر فاروق ہیں۔ جو ایک مجوسی غلام کے ہاتھ سے مسجد میں قتل ہوئے۔ آپ کے بعد تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی کو مسلمانو

کے ایک گروہ نے ہی قتل کر دیا۔ ان واقعات نے یہ راستہ کھول دیا کہ خود مسلمان اپنے ہم مذہبوں کو شہید کرنے لگے۔ حالانکہ اس سے پہلے صرف مشرکین کے ہاتھ سے یہ درجۂ عالی حاصل ہوا کرتا تھا۔ جناب امیرؑ کی شہادت بھی ایک مسلمان کے ہاتھ سے ہوئی اور اس کے بعد حضرت امام حسنؑ کو بھی مسلمانوں نے ہی زہر دیکر شہید کر ڈالا۔ پھر امام حسینؑ کو کربلا میں بُلا کر مسلمانوں نے ہی بھوکا پیاسا ذبح کیا۔ یہی وہ شہادت ہے جو اسلام میں سب شہادتوں سے زیادہ مشہور، زیادہ پُردرد، زیادہ درجہ والی، زیادہ ہر دلعزیز اور نہایت ہی مہتم بالشان مانی جاتی ہے۔ بلکہ تسلسل واقعات کے لحاظ سے اس کی نظیر تمام دنیا میں نہیں ملتی۔

حسینی شہادت کو اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے، حالانکہ اِس سے پہلے اور اس کے بعد سینکڑوں مسلمان نہایت بیکسی اور بے بسی کی حالت میں شہید کیے گئے، اس کا جواب یہ ہے کہ جو حالات و واقعات حضرت سید الشہداء کو پیش آئے۔ ان کا نہ گذشتہ تاریخوں میں ذکر پایا جاتا ہے نہ بعد کے تذکروں میں، خواہ وہ کسی ملک اور کسی قوم کے ہوں۔ اس قسم اور اس طرز کا کوئی واقعہ موجود نہیں ہے۔

شہادت حسینی میں حسب ذیل خصوصیات ہیں جو اور کہیں نہیں پائی جاتیں۔

(۱) آپ اُس زمانہ میں تھے، جب کہ اسلام کا نشو ونما تازہ ہی تھا۔ ہر فرد کے دل میں اپنے مذہب کی محبت ہر چیز سے زیادہ تھی۔ خصوصاً اپنے پیغمبر کی الفت میں ہر مسلمان کا یہ عالم تھا کہ وہ دل وجان سے آنحضرت پر نثار تھا اور آپ سے تعلق کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز مسلمانوں میں بڑے ادب و احترام کی مستحق مانی جاتی تھی۔ ایسی حالت میں اور ایسے زمانہ میں خاص رسول اللہ کے نواسے اور نواسیوں پر انتہا سے زیادہ دردانگیز ظلم و ستم کس قدر عجیب اور موجب حیرت تھا۔ حضرت سید الشہداء کے قلب مبارک پر جو صدمہ ان لوگوں کی بے وفائی اور جفا شعاری سے گذرا وہ ہزار خنجر و سنان سے بڑھ کر تھا۔ کل کی بات ہے کہ جو لوگ فرزند رسول ہونے کی حیثیت سے اپنی آنکھیں میرے قدموں کے نیچے بچھاتے تھے آج وہی مسلمان ہیں کہ میرے سینہ

پر پاؤں رکھ کر گلا کاٹنے کو تیار ہیں۔

(۲) اہل و عیال کی معیت بھی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی نظیر تاریخ میں کم ملے گی۔ ممکن ہے کہ کسی مقتول کے ساتھ اس کے خاندان والے بھی ہوں۔ مگر جو حالت آپ کو بال بچوں کے ہمراہ ہونے سے پیش آئی۔ وہ اور کسی کو ہرگز ہرگز پیش نہ آئی ہوگی۔ مختلف سن و سال کی عورتیں ننھے ننھے بچے ساتھ ہیں۔ ایک بیمار بھی جس کو ہر قوم اور ہر مذہب نے قابل رحم سمجھا ہے۔ تین روز تک بھوک اور پیاس سے تڑپے۔ اس صعوبت انگیز مصیبت کی سختی ناقابل برداشت تھی۔ لیکن آپ نے بڑے ضبط و استقلال سے اس کو بھی جھیلا:

(۳) بھوک اور پیاس میں بہت آدمی جان بحق تسلیم ہوئے ہوں گے۔ اِلّا جو کیفیت حضرت اور آپ کے خاندان کی تھی وہ کسی کو پیش نہیں آئی۔ تقریباً پورے دو دن اور دو رات بھوکا پیاسا رہنا۔ گرمی کا موسم، عرب کی گرمی، چاروں طرف سے دشمنوں کا نرغہ، بچوں کی زبانیں پیاس کے مارے نکلی پڑتی تھیں، دریا آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا، حضرت یہ ہولناک مناظر دیکھ رہے تھے اور راضی برضا تھے۔ ایسی دردناک تکالیف کو برداشت کرنا اور جادۂ حق سے قدم نہ ہٹانا اس شہادت کی اعلیٰ خصوصیت ہے۔

(۴) سارا کنبہ آنکھوں کے سامنے کٹ گیا، سوائے ایک فرزند بیمار کے کوئی باقی نہ رہا۔ اِس پر بھی قول حق کی حمایت کرنا اور اپنا سر دینے کو بخوشی تیار ہو جانا مخصوص شہادت کا ثبوت ہے۔

(۵) اپنے اصول اور اپنے اشغال کو آخر دم تک جاری رکھنا اور ہجوم مصائب سے حواس باختہ نہ ہونا یہ اِمام کا ہی کام ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ سر کٹتے کٹتے نماز پڑھی۔ اور فریضۂ عبادت کو ناغہ نکیا، کیا کسی قوم کی تاریخ ان خصوصیات کے ساتھ، شہادت کی کوئی نظیر پیش کر سکتی ہے نہیں کر سکتی اور یقیناً نہیں کر سکتی، یہی خصوصیات ہیں جنہوں نے شہادت حسینی کو نہ صرف اسلام۔ بلکہ تمام اقوام عالم کی تاریخ میں ایک خاص امتیازی درجہ کا مستحق قرار دیا ہے۔

ابتلا اور اُس کی حکمت

اگر ہم دنیا کے ان مذاہب کی تاریخوں کو دیکھیں جنہیں آسمانی مذہب کہا جاتا ہے۔ اور جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ انہیں الہامی کتابیں دی گئی ہیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ایسے مذہب و ادیان کے ان لوگوں کی لائف جو ان کے اعلےٰ لیڈر، رہبر یا بانی تھے۔ پُر درد واقعات اور پُر خوف حادثات سے مملو ہے۔ اگرچہ یہ لوگ خدائی قدیر کی طرف سے دنیا اور انسانی جماعتوں کے واسطے بھیجے گئے تھے۔ اور اس کی لا انتہا برکتیں اور عنایتیں ہر وقت ان کے شامل حال تھیں۔ اور انہیں وہ اطمینان حاصل تھا جو ان کے درجۂ رفیع کے لائق اور ڈیوٹی (فرض منصبی) کے لئے ضروری تھا۔ مگر باوجود ان عنایتوں اور مہربانیوں کے اظہار حق اور اعلان کلمۃ اللہ میں ان بزرگوں اور بانیان ادیان نے غیروں یا اپنوں کے ہاتھ سے جو جو تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائیں۔ ان کا احصاء و شمار دشوار ہے۔

حضرت آدم کی بعثت سے ان آسمانی مذاہب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک طرف سے ہمارے ابو الآبا حضرت آدم ہمارے واسطے قانون الٰہی ساتھ لائے۔ دوسری جانب سے مذہبی رہبروں کے واسطے آزمائشی سلسلوں اور امتحانی مصیبتوں کا آغاز ہوا۔ گویا مذہب کے ساتھ ہی ساتھ آزمائش بھی شروع ہوئی۔ یہ امر ضروری تھا کہ انسان بالخصوص مذہب کے بانی اور دوسرے سچے رہبر اور صادق ریفارمر (مصلح) آزمائش میں مبتلا کئے جائیں۔ کیونکہ سونا جب تک کٹھالی اور آگ میں نہ ڈالا جائے۔ اس وقت تک اس کے جرم سے وہ ارضی ذرے اور کدورت آمیز جوہر جو زمین ہی سے اس کے ساتھ چلے آتے ہیں دور نہیں ہو سکتے۔ سونا اگرچہ آگ میں ڈالے جانے سے پہلے بھی سونا ہی تھا۔ مگر آگ کی قوت سے مقابلہ کر کے اس نے ثابت کر دیا۔ کہ وہ ہر ایک آزمائش میں کامل ہے۔ اشیاء اور طاقتوں کی اصلی کیفیت اور حقیقت اسی وقت کھلتی ہے جب کہ وہ آزمائش میں پوری اتریں۔

حضرت آدم صفی اللہ کے بعد جس قدر انبیا مذاہب حقہ کے بانی تھے۔ اس دنیا میں مبعوث ہوئے۔ ان کو ایسی ہی جماعتوں میں رہنے اور ہدایت کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ جو ان کے تابع ہوں۔ بلکہ ان کو سب سے اول ایسی جماعت سے مقابلہ کرنا پڑا۔ جو ان کے مواعظ اور اصلاحات کی بالکل مخالف اور سد راہ تھی۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس مخالف جماعت میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو بانیان مذاہب کی تلقین و تعلیم کی خوبیوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انہیں کماحقہ آگاہی تھی کہ یہ لوگ حق پر ہیں لیکن ان کے خبث نفس نے نہ چھوڑا۔ کہ سیدھے راستہ پر چلیں۔

یہ بات مان لی گئی ہے کہ انسانی طبیعتیں اُن امور کی طرف جو جسم اور نفس سے متعلق ہوں۔ آسانی سے رجوع لاتی ہیں اور جو امور معاد یا تزکیہ نفس سے علاقہ رکھتے ہوں ان کو کسی قدر دقت سے قبول کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت حقہ اور بانیان مذاہب کی ہمیشہ بڑے زور سے مخالفتیں ہوتی رہیں اور ان بزرگان دین کو ایسی ایسی مصیبتیں اور تکلیفیں دی گئیں۔ جن کا برداشت کرنا انہیں کا کام تھا۔ یہ ابتلا اور آزمائش ابتداء سے ہی ان بزرگوں کے شامل حال رہی۔ حضرت آدم سے حضرت عیسےٰ تک عموماً یہ مصیبتیں صرف انبیا کے حصہ میں آتی رہیں اور ان سختیوں کا جھیلنا فقط اُن ہی کا حوصلہ تھا۔ ان کے تابعین اس بار عظیم کو اُٹھانے کے لائق نہ تھے۔

اگر ہم انبیائے سابقین کی مخالف جماعت کو دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ ان کے دشمن وہ لوگ رہے جو ابتداہی سے معاند اور سرکش تھے۔ ایسے لوگ بہت ہی کم بلکہ نہیں نکلیں گے۔ جو ان کو تسلیم بھی کرتے ہوں اور ان کے مخالف اور ایذا رساں بھی ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام کے مخالف وہی تھے جو ان کے کسی اصول و عظمت کو نہیں مانتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو جماعت مخالفت کرتی تھی وہ ہر بات میں ان کے مخالف تھی۔ عیسیٰ علیہ السلام کے مخالف یہود تھے۔ وہ حضرت کو مسیح موعود نہیں سمجھتے تھے ایسے لوگوں کی مخالفت اور معاندت جو کسی شخص کو حق پر نہ سمجھتے ہوں بمقابلہ اس مخالفت اور کج روی کے جو کسی شخص کو عین حق پر جان کر کی جائے قابل

افسوس اور لائق تعجب نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کوئی شخص جان بوجھ کر کوئی نامحمود حرکت کرے تو وہ دائمی نہایت مذموم ہوتی ہے نادانستگی کی حالت میں مخالفوں کی نسبت تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُن کو ان مراتب علیا کا علم نہ تھا لیکن جو لوگ دیدہ و دانستہ اندھے بہرے بن جائیں ان پر جس قدر تاسف کیا جائے کم ہے۔

انبیائے سابقین اور خاتم النبیین کی ابتلا میں خاص امتیاز

ابتلا کی رہیں اور آزمائش کے طریقے جو پہلے انبیاء کے لئے مخصوص تھے۔ وہ حضرت مسیح تک ہی محدود رہے۔ حضرت خاتم المرسلین کی بعثت سے مذہبی دنیا کی مصیبتوں اور آزمائشوں کی طرز و روش بدل گئی۔ سید الانبیاء خود بھی اس قدر مصیبتوں اور آزمائشوں میں مبتلا کئے گئے کہ آپ خود فرماتے تھے "ما اوذی نبی مثلی قط" تاہم مشیت ایزدی میں بعض ایسی بھی مصیبتیں مقدر ہو چکی تھیں جو انبیائے ماسبق کے مصائب سے بالاتر اور زیادہ ہولناک ہیں چونکہ خاتم الانبیاء پر سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا تھا اس لئے اعلیٰ درجہ کی مصیبتوں اور بلاؤں کا سلسلہ بھی آپ ہی کے زمانۂ نبوت میں ختم ہونا چاہئے تھا، اس عطائے ربانی کے یا تو خود حضرت ہی مستحق ہو سکتے ہیں۔ یا آپ کی طرف سے ایسا شخص جو آپ ہی کا آئینہ کمالات اور آپ ہی کا گوشت و پوست ہو، نبی آخر الزماں جو سلسلۂ انبیاء اور سلسلہ ہدایت کو مکمل اور متمم کر کے ختم کرنے کے لئے۔ دنیا میں مبعوث ہوا تھا۔ اُس کے واسطے یہ امر نہایت ہی ضروری تھا کہ وہ تمام انبیاء کی صفات و فضائل سے ممتاز ہو، اور ان کی تمام بلاؤں اور آزمائشوں میں مبتلا کیا جائے بلکہ اس کے منصب اور درجہ کو دیکھتے ہوئے اس کی مصیبت اور آزمائش کا طریقہ بھی دوسرے انبیاء سے افضل اور نرالا ہو۔ تمام انبیائے سلف طرح طرح کی مصیبتوں اور آزمائشوں میں مبتلا ہوتے ہے اور مخالفین کے ہاتھ سے ستائے گئے۔ بعض کو درجۂ شہادت بھی ملا۔ لیکن سردار انبیاء کو بظاہر درجۂ شہادت بذات خود حاصل نہیں ہوا۔ اس درجۂ عظمیٰ اور شہادت کبریٰ کا قدرت نے جناب ختمی مآب کے فرزند سید الشہداء کے نام نامی پر قرعہ ڈالا۔ گویا یہ رتبہ

در اصل حق نبوت تھا چونکہ اس آزمائش اور امتحان کی نوعیت گذشتہ طریقوں سے بالکل نئی تھی۔ اس لئے قادر ذوالجلال نے بظاہر اپنے سب سے پچھلے عہدِ رسالت کو سونپنے امر کے اسی کے فرزند کو اُس کا قائم مقام قرار دیا۔ یہ وجہ تھی کہ یہ مصیبت و آزمائش حسین کے حصہ میں آئی۔

یہ بات قیاسی نہیں۔ بلکہ حدیث اور اقوال بزرگان اسلام سے ثابت ہے کہ سید المرسلین کو رتبۂ شہادت دیا جانا ضروری تھا لیکن ان کی عوض حسین کو خاص کیا گیا۔ اس تخصیص میں ایک عجیب نکتہ یہ بھی تھا کہ نبوت محمدیہ کا علوئے شان دوسرے انبیاء پر اسی صورت میں ثابت ہو سکتا ہے جب کہ نبوت کے بعض درجے اور خصوصیتیں آنحضرتؐ کے تابعین پر بھی ختم ہوں گویا اُن لوگوں کو اُن امور میں جو طبقۂ انبیاء سے ہی مخصوص تھے حصہ دار ٹھہرایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس تخصیص سے دنیا کو یہ دکھایا ہے کہ خاتم النبیین کے فضائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی نسل اور اس کی امت میں ایسے لوگ پیدا کئے گئے کہ مقامات توکل۔ صبر و رضا اور حق الیقین میں گذشتہ انبیاء سے کم نہیں بلکہ بڑھ کر ہیں۔

سید الانبیاء کو درجہ شہادت بذریعہ حسینؑ ملا

مندرجۂ بالا بحث سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ شہادت حسین گویا عین شہادتِ خاتم المرسلین تھی۔ اس مضمون کو خاتم المحدثین شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے اپنے مشہور رسالے سر الشہادتین میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے اس لئے ہم اسی کا خلاصہ درج ذیل کرتے ہیں۔

جو کمالات انبیائے سلف میں متفرق طور پر جدا جدا پائے جاتے تھے وہ سب ہمارے نبی آخر الزماں کی ذات بابرکات میں جمع ہو گئے تھے۔ حضرت آدم اور حضرت داؤد کو خلافت، حضرت نوح کو شکر گذاری حضرت ابراہیم کو خلت، حضرت یوسف کو حسن و صدق، حضرت موسیٰ کو شرفِ ہم کلامی حضرت سلیمان کو ملک، حضرت ایوب کو صبر، حضرت عیسیٰ کو احیائے موتے حضرت یحییٰ کو زہد۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے انبیاء کو خاص خاص اوصاف مرحمت فرمائے۔

لیکن خاتم الانبیاء جامع کمالاتِ جملہ انبیاء تھے۔ بلکہ آپ میں بہت سے کمال ایسے تھے۔ جنہیں آپ ہی کا حصہ سمجھنا چاہیئے۔ مثلاً انواعِ ولایات کثرتِ معجزات، شفاعتِ کبریٰ۔ جہاد مع الکفار، قربِ اتم۔ محبوبیتِ مطلق۔ علم وسیع، عرفانِ کامل۔ انفصالِ قضایا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آپ میں ایک کمال جو اپنی نوعیت میں سب سے بڑھ کر ہے باقی رہ گیا تھا۔ یعنے شہادت۔ اس کمال کی تکمیل آپ کے ذات خاص میں نہونے کی بابت سرِ خفی یہ تھا کہ اگر آپ کسی جہاد میں علانیہ مشرکین کے ہاتھ سے شہید ہوتے، تو شوکتِ اسلام ٹوٹ جاتی اور عوام کی نظر میں آپ کا قائم کیا ہوا دین بے وقعت ہو جاتا۔ اور اگر آپ کی شہادت خفیہ طور پر ہوتی تو اس حالت میں نہ تو اس کا اعلان ہی ہوتا، نہ وہ پوری شہادت سمجھی جاتی، کیونکہ شہادتِ کامل اس کا نام ہے کہ غربت اور مسافرت میں واقع ہو، لاش میدان میں پڑی رہے، اس کے گرد اور بہت سے عزیز۔ بھائی۔ بیٹے۔ یار دوست مارے جائیں، مال لوٹا جائے بیبیاں اور یتیم بچے اسیر ہوں۔ اور یہ ساری مصیبتیں راہِ خدا اور خوشنودیٔ خدا کے لئے برداشت کی جائیں۔ کوئی دنیاوی اور نفسانی غرض شامل نہ ہو۔

چونکہ اس قسم کی مظلومیت اور مغلوبیت آپ کی خلافتِ کبریٰ کی شان سے خلاف تھی۔ مشیتِ ایزدی کا اقتضا یہ ہوا کہ یہ سب سے بڑا کمال آپ کی ذات میں ایام خلافت (زمانۂ حیاتِ خاتم الانبیاء) اور غلبۂ اسلام کے بعد ملحق کیا جائے۔ اور اس کی تکمیل اس شخص کے ذریعہ سے ہو جو آپ کا سب سے زیادہ عزیز، سب سے زیادہ قریب اور سب سے زیادہ محبوب ہو۔ تاکہ اس کا حال آپ کے حال میں اور اس کا کمال آپ کے کمال میں شامل ہو جائے اس کے بعد تسلطِ اسلام واشاعتِ ملتِ حق سبحانہ تعالیٰ کا حکم جاری ہوا۔ اور اس معاملہ خاص میں حسنین علیہما السلام کو اپنے نانا کا نائب اور قائم مقام مقرر فرمایا کیونکہ یہ شہزادے انتہائی خصوصیت کی وجہ سے آنحضرتؐ کے کمالات کے گویا آئینہ تھے۔

شہادت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سری جو پوشیدہ طور پر وقوع میں آئے۔ دوسری

جہری۔ جو علے الاعلان اور کھلم کھلا واقع ہو، شہادت سری۔ سبط اکبر حضرت امام حسنؑ سے مخصوص ہوئی۔ آپ کی شہادت مخفی رہی، وحیٔ الٰہی میں بھی اس کا ذکر کم ہوا۔ خود حضرتؐ نے بھی اس کا تذکرہ کم فرمایا۔ یہاں تک کہ خود آپ کی زوجہ کے ہاتھوں سے یہ حرکت واقع ہوئی حالانکہ بیوی کے تعلقات دوستی پر مبنی ہیں نہ کہ دشمنی پر۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ اس شہادت کی بنا اخفا اور پوشیدگی پر تھی۔ شہادت کی دوسری قسم سبطِ اصغر امام حسینؑ سے مختص کی گئی۔ چونکہ اس کی بنا شہرت اور اعلان پر تھی، اس لئے بار بار جبریل اور دوسرے ملائکہ نے آنحضرتؐ سے ذکر کیا۔ بلکہ مقام شہادت، اس کا نام اور وقت شہادت سب ظاہر کیا گیا۔ مشہد حسینؑ کی خاک رسول اللہ کو دی گئی۔ جناب امیرؑ نے سفرِ صفین میں برملا اس کا ذکر فرمایا۔ جب واقعۂ شہادت ہو چکا۔ تو صرف واقعات کی شہرت پر ہی اس کا اکتفا نہ ہوا بلکہ سماوی وارضی حادثات سے اس اعلان کی تائید کی گئی۔ مثلاً خاک کا خون ہو جانا۔ آسمان سے خون برسنا۔ فرشتوں اور جنوں کا نوحہ وزاری کرنا۔ ہاتفِ غیبی کا مرثیہ پڑھنا۔ طیور و وحوش کا آپکی نعش مطہر کی حفاظت کرنا، آپ کے حرم کا دشمنوں کی حراست میں دمشق تک شہر بشہر ہو کر جانا۔ آپ کے قاتلوں کا رسوائے عام ذلیل وخوار اور عبرت ناظرین بن کر مرنا وغیر ذالک۔ بلکہ اس رنج والم اور حزن وبکا کی دوامی شہرت وعظمت واقعات میں گریہ وزاری کا حیرت انگیز اثر تمام اسلامی دنیا میں ہر سال عزاداری۔ وقتاً فوقتاً معجزات وکرامت کا ظہور یہ سب اسی شہادت جہری وظاہری کے نتیجے ہیں۔ گویا اس طرح اس شہادت کا شہرہ زمین وآسمان جن وانسان ناطق وصامت میں ہو کر جناب ختمی مآب کے کمال شہادت کی تکمیل ہو گئی۔

اب رہا یہ امر کہ ان دونوں نواسوں کی شہادت کو خاص رسول اللہ کی شہادت کیسے مان لیا جائے، اس کی یہ صورت ہے کہ آنحضرتؐ نے ان دونوں شہزادوں کو بارہا اپنا بیٹا۔ اپنا گوشت و پوست اپنا جزو بدن فرمایا ہے۔ امام احمد ابن حنبل نے مسند میں، طبرانی نے معجم کبیر میں دارقطنی نے افراد میں۔ حاکم بیہقی اور ابن عساکر نے جناب امیرؑ سے اور طبرانی نے سلمان فارسی سے روایت کی ہے کہ

رسولِ خدا نے دونوں نواسوں کی نسبت بارہا فرمایا ہے۔ کہ یہ میرے بیٹے ہیں۔ حضرات حسنین کا پرتو جمال محمدی ہونا دو دلیلوں سے ثابت ہے۔ اول سیادتِ مطلقہ۔ چنانچہ نسائی رویانی اور ضیائے مقدسی نے حذیفہ سے ابو یعلی نے ابوسعید سے ابن ماجہ نے ابن عمر سے ابن عدی نے ابن مسعود سے۔ ابو نعیم نے جناب امیر سے طبرانی نے حضرت عمر فاروق سے، جابر۔ براء۔ اسامہ بن زید، مالک بن حویرث اور دیلمی نے انس سے، ابن عساکر نے ام المومنین حضرت عائشہ، عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن عمر اور ابو رمثہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ حسنؑ اور حسینؑ سردار جوانان بہشت ہیں۔ آئینہ کمال محمدی ہونے کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ دونوں صاحبزادوں کی محبت بعینہ محبت رسول اللہ اور ان کی عداوت حقیقتاً عداوت رسول ہے۔ جیسا کہ ابن عساکر وغیرہ نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ آنحضرت نے فرمایا جس نے ان دونوں سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان دونوں سے عداوت کی اس نے مجھ سے عداوت کی۔

دوسرے مشابہت جسمانی۔ کیونکہ دونوں صاحبزادے صورت ظاہری کے لحاظ سے بھی گویا آنحضرت کی تصویر تھے۔ چنانچہ بخاری نے انس سے روایت کی ہے۔ کہ لَمْ یَکُنْ احد اشبہ بالنبی صلعم من الحسن ابن علی وَقَالَ فی الحسین ایضاً کانَ اَشبہم برسول اللہ" کوئی شخص صورت و شکل میں حسن بن علی سے زیادہ آنحضرت سے مشابہ نہ تھا۔ اور امام حسین کی نسبت کہا ہے کہ وہ سب سے زیادہ رسول اللہ سے مشابہ تھے۔ اس حدیث کو ترمذی نے مفصل اور واضح لکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ سر سے سینہ تک تو امام حسنؑ، اور سینہ سے قدم تک امام حسینؑ رسول خدا سے زیادہ مشابہ تھے۔ گویا جس طرح حسنین اخلاق میں مشابہ رسول اللہ تھے۔ ویسے ہی صورت میں بھی اشبہ تھے۔ چونکہ پیغمبر خدا کے کمالات صوری و معنوی کا آئینہ خدائے تعالٰی نے دونوں نواسوں کو بنایا تھا۔ اس لئے ان کی عزت رسول اللہ کی عزت ان کی توہین رسول اللہ کی توہین، ان کی شہادت رسول اللہ کی شہادت تھی۔ ان دونوں کی شہادت سِرّی و جہری ہے۔ جناب خاتم الانبیا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کمال شہادت کا دونوں قسموں سے تکملہ ہو گیا

اور نبوت کے کل مدارج طے اور مکمل ہو گئے، (گویا اس شہادت کو سبب تکمیل نبوت وسیلہ نجات امت اور ذریعہ حصول شفاعت کہنا چاہیئے)

شہادتِ حسینی سے ذبیحہ اسمٰعیلی کی بھی تکمیل ہوئی

ظاہر ہے کہ سرخیل انبیا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آبا و اجداد کا سلسلۂ نسب حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ سے جا ملتا ہے۔ حضرت اسمٰعیل کو خدائے پاک کی طرف سے ذبح کئے جانے کا حکم دیا گیا تھا جس کی تعمیل پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ تیار ہو کر اپنے فرزند اسمٰعیل کے ذبح کرنے پر آمادہ ہوئے تھے۔ مگر خداوند کریم نے اپنی حکمتِ کاملہ سے حضرت اسمٰعیل کو بچا کر دنیا پر یہ ظاہر کرنا چاہا کہ اس حکم ربی کی تکمیل اسی نبی کی مقدس نسل کے اس بزرگ سے جس پر منصب نبوت کا خاتمہ ہو گیا کمائی جائے گی وہ بارِ ربی جو اسمٰعیل کی گردن پر رکھا گیا تھا، اس کا اٹھانے والا۔ خاتم الانبیاؐ کا بیٹا حسینؑ، قرار پایا یہ وہ امانت تھی جو پشتوں سے اسی خاندان میں چلی آتی تھی یہ وہ بار تھا۔ جس کو ہر ایک نے ایک دوسرے کے کندھے پر رکھا اور جس کو کوئی نہ اٹھا سکا۔ حتیٰ کہ امین تک پہنچایا گیا جس نے اس اسمٰعیلی امانت کو اٹھانے کے لئے بڑی خوشی سے گردنِ تسلیم خم کر دی۔

معنوی طور پر گویا اس واقعہ عظمیٰ اور شہادت کبریٰ کی پیشین گوئی حضرت اسمٰعیل کے زمانہ سے چلی آتی تھی، حضرت اسمٰعیل اور ابراہیم پر ظاہر کر دیا گیا تھا کہ تمہاری ہی نسل سے تمہارے ہی خون سے تمہاری ہی اصلاب سے ایک ایسا صابر اور ثابت قدم پیدا ہو گا جو اسمٰعیل کی قربانی اور ذبیحہ کو پورا کرے گا وہ حکم جو ابراہیم کو دیا گیا ہے۔ اس کی تعمیل محمد سے کرائی جائے گی۔ وہ آزمایش جو اسمٰعیل سے شروع کی گئی، اس کی تکمیل علیؑ کے خاندان میں ہو گی وہ وعدہ جو اسمٰعیل سے لیا گیا اس کو وہ شخص پورا کریگا جس کی رگوں میں ابراہیمی خون اور جس کی پیشانی میں اسمٰعیلی نور جوش مارتا اور چمکتا ہو گا اور حسینؑ کے مؤثر نام سے پکارا جائے گا۔ بی بی ہاجرہ کی مقدس نسل سے وعدہ لیا گیا اور بی بی فاطمہ کی پاک ذریت نے اس کو پورا کیا۔ دسویں محرم ۶۱ھ

کو حسین نے میدان کربلا میں اس بھاری امانت اور نہ ٹلنے والے وعدہ کی تکمیل سے حضور خداوندی میں اپنے دادا حضرت اسمٰعیل کو سبکدوش کر دیا اور اس نامکمل قربانی کی جو حضرت اسمٰعیل سے شروع ہوئی تھی حسینؑ کی مکمل شہادت سے تکمیل اور فدینٰہ بذبح عظیم کی شان پوری ہوگئی۔ (یادگار حسین از خان بہادر مرزا سلطان احمد خاں)

شہادتِ حسینی کا دوسرے شہدائے مذاہب سے مقابلہ

اہلِ کتاب کے دو بڑے فرقے یہودی اور عیسائی ہیں یہودیوں کی کتاب توریت کوئی ایسا مہتم بالشان واقعہ پیش نہیں کرتی جس کو ہم واقعہ کربلا سے نسبت دے سکیں اگرچہ اس میں اکثر انبیا کی شہادتوں کا ذکر ہے لیکن اگر کسی بڑے سے بڑے واقعہ کو بھی دیکھا جائے تو اس کی درد انگیز نوعیت حادثہ کربلا کے سامنے ہیچ نظر آتی ہے اور اگر شہدائے مسیحیت کو دیکھا جائے تو عیسائیوں میں ایک خون کی بڑی پکار ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس خون نے تمام جہان کے گناہ دھو ڈالے۔ اور یہ خون تمام گناہوں کا کفارہ ہوگیا۔ اس سے واقعۂ صلیب حضرت عیسےٰ کا مراد ہے۔ ہم سب سے پہلے اسی شہید اول کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں۔ اول تو بقول پیروان مسیح یہ موت ہی لعنت کی موت ہے۔ لہٰذا جو موت خود میت کے لئے باعث وبال ہو۔ وہ دوسروں کو کیا فائدہ بخش ہو سکتی ہے۔ اور جب ہم اس خون کے تفصیلی حالات پر غور کرتے ہیں تو یہ اور بھی خفیف اور سبک معلوم ہوتی ہے۔ انجیل متی باب ۲۶ درس ۳۹ میں لکھا ہے کہ "منہ کے بل گر کر یہ دعا مانگی اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے" پھر درس ۴۲ میں ہے۔ "پھر دوبارہ اس نے جا کر یہ دعا مانگی۔ اے میرے باپ! اگر یہ میرے پئے بغیر نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو" پھر درس ۴۴ میں ہے کہ پھر وہی بات پھر کہہ کر تیسری بار دعا مانگی" اور باب ۲۷ درس ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱ میں ہے "اس کے کپڑے اتار کر قرمزی چوغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے داہنے ہاتھ میں دیا۔ اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے ٹھٹوں

میں اڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ سلام۔ اور اس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے۔ اور جب اس کا ٹھٹا کر چکے تو چوغے کو اتار کر پھر اسی کے کپڑے اسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے" آگے چل کر درس ۴۵ اور ۴۶ میں بیان کیا ہے۔ "دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا۔ تیسری پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا:۔ ایلی ایلی لما سبقتنی یعنی اے میرے خدا۔ اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ اور درس ۴۹ میں ہے۔ "پھر یسوع بڑی آواز سے چلایا اور جان دی" ایسا ہی انجیل مرقس باب ۱۴ درس ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶ میں ہے "پطرس یعقوب اور یوحنا کو اپنے ساتھ لے کر نہایت حیران اور بے قرار ہونے لگا اور ان سے کہا میری جان نہایت غمگین ہے یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو اور جاگتے رہو اور وہ تھوڑا آگے بڑھا۔ اور زمین پر گر کر دعا مانگنے لگا کہ اگر ہو سکے تو یہ گھڑی مجھ سے ٹل جائے۔ اور کہا اے باپ تجھ سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس پیالے کو میرے پاس سے ہٹا لے" پھر آگے درس ۳۹ میں ہے "پھر وہ چلا گیا اور وہی بات کہہ کر دعا مانگی" آگے چل کر یسوع کی تضحیک اور صلیب دئے جانے کے متعلق واقعات وہی ہیں جو انجیل متی سے نقل کئے گئے۔ ایسا ہی انجیل لوقا باب ۲۲ درس ۴۱ و ۴۲ میں دعا مانگنے کا حال درج ہے۔ صرف صلیب پر جزع و فزع کرنا نہیں لکھا۔ انجیل یوحنا باب ۱۷ میں حضرت مسیح کی کسی قدر طویل دعا ہے۔ البتہ پیالۂ مرگ ٹل جانے کی درخواست نہیں ہے۔ نہ صلیب پر بے قراری دکھلائی گئی ہے بہر حال اناجیلِ اربعہ کے بیانات ہم کو بتاتے ہیں کہ ان کے شہید اعظم نے گو اپنی آنے والی حالت کے متعلق پیشینگوئی بھی کی۔ اور اس کے خیر مقدم کا تہیہ بھی کیا۔ تاہم حضرت مسیح کے ذہن میں کوئی ایسی وجہ نہ تھی جس کے لئے انہوں نے پیشتر سے یہ ارادہ مصمم کر لیا ہو کہ ہم جان دیں گے لیکن پیچھے نہ ہٹیں گے۔ موت کے آثار دیکھ کر یسوع میں افسردگی پیدا ہوئی بلکہ جاں کنی کی سی حالت پیدا ہوگئی۔ اور انہوں نے اس مصیبت کے ٹل جانے کے واسطے مکرر سہ کرر دعا مانگی۔ عین مصلوبیت کی اذیت نے بھی

بقول متی و مرقس اس درجہ لغزش پیدا کر دی کہ جزع و فزع شروع کر دیا۔ ان بیانات سے تو مسیحیت کے شہید اعظم کے درجہ استقلال کا قابل تعریف اندازہ نہیں ہوتا۔ اور ان سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ انہوں نے خود شہادت کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ شہادت ان کی طرف دوڑائی گئی تھی۔

یہ ہے مسیحیوں کے مایۂ ناز شہید کی کیفیت جس کی تمام دنیا میں پکار ہے، اور سارے جہان میں اس کے خون کا پرچار کیا جاتا ہے۔ اور تمام عیسائی دنیا اس کو ذریعۂ نجات جانتی ہے۔ تاریخ یہود بھی کسی زبردست اور موثر شہید کے کارنامے پیش کرنے سے خالی ہے۔ زردشتیوں نے بھی شہادت کے اعلےٰ مفہوم کو کبھی نہیں دکھایا اور نہ کسی نے خود کو مذہب پر قربان کیا۔ بودھ دھرم کا ترجمہ ہی موجودات کی بے حقیقتی کا حقیقی اعتقاد ہے۔ اس لئے اس کے پیرو کسی اصول پر قربان ہونے کی شہیدانہ منزلت کیا سمجھ سکتے ہیں۔ آریوں کے وید بھی نمونۂ شہادت پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اور رامائن اور مہابھارت کا عظیم الشان معرکہ بھی کسی مظلوم قتیل کے اہم واقعہ کو بتانے سے عاجز ہے۔ اگر مفہوم شہادت کو اس کے اصلی معنوں میں بتاتا ہے تو وہ اسلام ہی ہے، اسلام نے نہ صرف لفظوں میں مفہوم شہادت کو بیان کیا۔ بلکہ ایک مکمل اور اکمل نمونہ بھی پیش کر دیا ہے۔ شہادت عظمےٰ کا وہ نمونہ حسینؑ اور دوسرے شہدائے کربلا ہیں۔ سید الشہدا کا استقلال صبر، رحمدلی ایثار، ہمدردیِ خلائق توجہ الی اللہ حمایتِ حق، شجاعت، عزتِ نفس، اور بہادرانہ کارنامے ایسے ہیں جن کو سن کر مخالف سے مخالف بھی، انگشتِ حیرت دانتوں کے نیچے رکھ لیتا ہے جس کے سننے سے سنگدل بھی موم ہو جاتے ہیں جس کے ذکر سے دشمن بھی متاثر ہوئے۔ بغیر نہ رہے۔ اور جن پر تاریخ اسلام جس قدر فخر کرے تھوڑا ہے۔ ایک انصاف پسند عیسائی۔ موسیو ماربین لکھتا ہے "حسین سے پہلے بھی بہت سے روسائے روحانی اور ارباب دیانات بحالتِ بیکسی قتل کئے گئے حضرت یحییٰ کا قصہ تاریخی واقعات میں ایک بڑا سانحہ ہے۔ اسی طرح جو سلوک یہود نے حضرت

مسیح سے کیا۔ اس زمانہ تک اس کی نظیر واقع نہیں ہوئی تھی لیکن حسینؓ کے واقعہ نے تمام واقعات پر فوقیت حاصل کر لی۔ تاریخ سے ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ روحانیین اور ارباب دیانات میں سے کسی شخص نے بھی اپنے خیالات عالیہ کی وجہ سے اپنی ذات کو اپنے علم و ارادہ سے قتل کرا دیا ہو۔ حسین کا واقعہ ایسا عالمانہ اور حکیمانہ تھا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ہے

ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی تاریخ۔ متعدد خونیں اور ہولناک واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ یہودیوں نے شاہ بابل ایران۔ روم اور مصر کے ہاتھوں سے ناقابلِ برداشت مصائب اوٹھائے، کئی بار بیت المقدس میں قتلِ عام ہوا۔ اور لاکھوں یہودی تلوار کے گھاٹ اتارے گئے۔ عیسائیوں نے بھی ان پر بے حد مظالم کئے۔ جن کا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ عیسائیوں نے بھی آغاز مسیحیت میں دوسری قوموں خصوصاً رومیوں کے ہاتھ سے بے انتہا مصیبتیں اٹھائیں جن میں بعض ایسے درد انگیز ہیں کہ ان کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے شہدائے ملت کی بھی ایک طولانی فہرست ہے بایں ہمہ اگر شہدائے مللِ ماضیہ کے دردناک واقعات کو تاریخ میں تلاش کیا جائے۔ تو اِس میں بالکل مبالغہ نہیں کہ ان کا کوئی شہید، نوعیتِ مصائب اور ہجومِ شدائد کے لحاظ سے اسلام کے شہیدِ اعظم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تمام اولیاءِ مذاہب کی تکلیفیں حسین کے انبوہ و مصائب کے سامنے لاشئے معلوم ہوتی ہیں یسعیاہ (ذکریا) کا چیرنے والا تیشہ آرہ اُن بےشمار حربوں کے سامنے جن پر ہمارے شہید کا خون ہے کیا کوئی حقیقت رکھتا ہے؟ یا یسوع (عیسےٰ) کے صلیب رسیدہ جسم کی چند کیلیں حسین کے جسم میں چبھنے والے بےشمار تیروں اور نیزوں کے سامنے کیا بے حقیقت نہیں ہیں؟

یہ امر مسلّمہ ہے کہ طبقۂ انبیا کے شدائد و مصائب کا درجہ نوعِ انسان کے دوسرے افراد سے کہیں زیادہ عظیم اور صعوبت انگیز ہے، حضرت آدم نے ایک عزیز بیٹے کی جدائی کا صدمہ اٹھایا۔ حضرت نوح نے قوم کے ہاتھوں بے انتہا تکلیفیں اٹھائیں، حضرت ابراہیم

کو آتشِ نمرود کا مقابلہ کرنا پڑا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے حکم سے آزمائش کی گئی۔ حضرت یعقوبؑ کو فراقِ یوسفؑ کا جانکاہ رنج سہنا پڑا۔ حضرت یوسفؑ بھائیوں کی عنایت سے کنوئیں میں ڈالے گئے، غلام ہو کر بکے۔ اور بارہ برس زندانِ مصر میں قید رہے۔ حضرت موسیٰؑ نے قوم کی نافرمانیوں سے اذیتیں اٹھائیں، حضرت ایوبؑ نے نقصانِ مال و متاع مرگِ اعزا اور عوارضِ جسمانی سے بڑی بڑی تکلیفیں جھیلیں۔ حضرت زکریاؑ ایک درخت کے جوف میں آرہ سے چیرے گئے۔ حضرت یحییٰؑ ایک زنِ زانیہ کی فرمائش سے بے گناہ شہید ہوئے۔ حضرت عیسیٰؑ کو یہودیوں نے براہِ حسد سولی پر آویزاں کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی انبیاؑ طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہوئے بعض کو درجۂ شہادت حاصل ہوا لیکن کیا کوئی شخص انبیاءِ کرام علےٰ نبینا وعلیہم السلام کی طولانی فہرست میں جن کے اسماءِ گرامی کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہی ہے۔ مصائبِ حسینیؑ جیسے مصیبت اور شہادتِ حسینیؑ جیسی شہادت پیش کر سکتا ہے۔ اور جب انبیاؑ کے مقدس طبقہ میں ہی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ تو دوسرے رؤسائے روحانیتین میں اس کی مثال تلاش کرنا عبث ہے۔

حسین علیہ السلام کے مصائب کا موازنہ دنیا کی کسی مصیبت سے نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ہر قوم کے مصلحین و مجددین کو اُن کے مخالفوں نے طرح طرح کی تکلیفیں دیں لیکن جیسا کہ اوپر لکھا گیا انبیاء علیہم السلام کے مصائب کا پیمانہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ تاہم تمام دنیا کے انبیاء و رسل کے واقعاتِ شدائد کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ کسی نبی یا رسول نے حسینؑ سے بڑھ کر رضائے الٰہی کے لئے مصائب کا مقابلہ نہیں کیا۔ کیونکہ انبیائے ماسلف نے اپنے مخالفوں کے ہاتھوں جو آلام و صدمات برداشت کئے۔ وہ صرف ان کی ذات تک محدود تھے۔ یہاں تو صرف نہ اپنی ذات بلکہ سارے خاندان کی تباہی و بربادی قتل و اسیری کو گوارا فرمایا گیا۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے صبر و رضا کا جو امتحان لیا گیا وہ اُن بلاؤں کا دفاع نہیں کر سکتے تھے۔ اِس لئے اُن کو

سوائے صبر کے چارہ نہ تھا۔

اس کے خلاف حسین علیہ السلام پر جن مصائب کا ہجوم بیک وقت ہوا۔ ان کے مقابلہ میں کوئی مصیبت پیش نہیں کی جا سکتی۔ پھر یہ کہ ان کا دفاع آپ کے اختیار میں تھا۔ اگر آپ بیعت یزید منظور فرما لیتے۔ تو ساری مصیبتوں کا خاتمہ تھا۔ یا اگر چاہتے تو مقابلہ کے لئے لشکر فراہم کر سکتے تھے۔

اس کے علاوہ انبیا کی مصیبتیں تنہا تھیں۔ یہاں مصائب و صدمات کی یورش پر ہر مصیبت کے بعد دوسری مصیبت پہلے سے بھی زیادہ شدید اور رُوح فرسا۔ ہر لحظہ شدائد کی سختی بڑھتی جاتی تھی۔ مصیبتوں کے بادل مہیب اور بھیانک صورت کے ساتھ پے در پے اُمڈے چلے آتے ہیں۔ لیکن حسینؑ جادۂ صبر و رضا پر پہاڑ کی طرح قائم ہیں۔ اور ان کے پائے ثبات کو ذرا بھی لغزش نہیں ہوتی۔ شہید دنیا میں ہزاروں ہو گئے اور ہزاروں ہوں گے۔ مگر اس شان کا شہید نہ اب تک ہوا۔ نہ آئندہ ہو گا۔ کسی نے سچ کہا ہے اور اس میں بالکل مبالغہ نہیں۔ کہ:۔

انذیچ ہمبہ کربنیاد ایں کار
واللہ کہ اے حسینؑ کارے کردی

واقعہ کربلا کا دوسرے وقائع عظیمہ سے تقابل و موازنہ

واقعہ ہائلہ کربلا دنیا کے ان معدودے چند واقعات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ جو خود ظہور پذیر ہوتے وقت عملی طور پر کچھ عرصہ نہیں لگاتے، مگر تہذیب تمدن عالم کی تاریخ پر ایک زبردست اور پائدار اثر کا نقش علی الحجر باقی چھوڑ جاتے ہیں تصوف کا ایک

مسئلہ ہے: "قال رابگذار و مردِ حال شو"

لیکن "مردِ حال" ہونا کوئی سہل امر نہیں۔ بلکہ مردانگی و ہمت کا کام ہے اور یہ مردانگی اور ہمت جیسی سانحہ کربلا میں ظاہر ہوئی ہو۔ اس کی نظیر آغازِ آفرینشِ عالم سے تا ایں دم نہیں مل سکی۔ اگر امرِ حق کی پیروی کے تمام واقعات کا سرتاج کسی واقعہ کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ تو وہ کربلا کا ہولناک روح فرسا اور ہوش رُبا حادثہ ہے جس کا نمونہ کسی ملک کسی قوم کسی مذہب اور کسی زمانہ کی تاریخ نہیں دکھا سکتی۔

نوعِ انسان کے مصائب کا آغاز حضرت آدم و حوا کی مصیبت سے سمجھا جاتا ہے جو ان پر جنت سے نکالے جانے کے بعد نازل ہوئی۔ حضرت آدم کے فرزندوں میں ہی پہلی خوں ریزی واقع ہوئی جب کہ قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو والدین کی محبت کے رشک سے مار ڈالا۔ ان دونوں ابتدائی واقعات کے بعد مصیبتوں اور خوں ریزیوں کا سلسلہ ازدیادِ نسلِ آدم کے ساتھ جاری رہا۔ اور ہمیشہ ترقی پاتا رہا۔ اس اثنا میں ہزاروں معرکہ ہائے جنگ ہوئے۔ جن میں سے بعض بعض میں کئی کئی روز تلوار چلی۔ اور لاکھوں کا کھیت پڑا بعض میں برسوں تک خوں ریزی کا سلسلہ جاری رہا۔ خون کے نالے بہہ گئے۔ ایسی تباہی و بربادی پھیلی کہ میدان جنگ کی سرزمین پر برسوں تک گھاس بھی نہ اُگ سکی۔ لاکھوں آدمیوں کے شہر تاراج ہوکر پھر آباد نہ ہونے پائے۔ ملکوں کی جغرافیائی صورت بدل گئی قوموں کی جداگانہ مستقل حیثیت قائم نہ رہ سکی۔ خاندانوں کی صدہا سالہ حکومت غارت ہوگئی۔ علوم و فنون کو سخت صدمہ پہنچا۔ صنعت و حرفت پر زوال آیا۔ ایسے افسوسناک اور پُر درد واقعات سے تمام تاریخیں بھری پڑی ہیں۔

اگلے واقعات و حادثات سے قطع نظر کر کے صرف پچھلی عالم آشوب جنگ کو ہی دیکھو۔ جس نے تمام کرۂ ارض پر تہلکہ ڈال دیا۔ کئی ملکوں اور قوموں کو تباہ کر ڈالا۔ دنیا کی متعدد قوموں نے اس عالمگیر جنگ کے جہاں سوز شعلوں میں اپنی لاتعداد دولت اور بے شمار نوجوانوں کو جھونک دیا توپوں کی گرج سے زمین و آسمان دہل گئے۔ تلواروں کی چمک نے برق و صاعقہ

کو شرما دیا۔ اتنا بڑا کُشت و خون۔ مصارف کا اتنا بارِ گراں۔ جانوں کا اتنا خوفناک نقصان فوجوں اور لشکروں کا اتنا عظیم اجتماع اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ کروڑوں بچے یتیم، لاکھوں، عورتیں بیوہ ہزاروں کے گھر تباہ ہوگئے۔ پدموں روپیہ دُھواں ہوکر اُڑ گیا۔ دنیا کے تین بڑے تاجدار بے تخت و تاج ہوگئے۔ اور ان کے ساتھ کئی بادشاہوں کو اپنی اپنی حکومتوں اور سلطنتوں سے دست بردار ہونا پڑا۔ روس جیسی عظیم الشان سلطنت جو ایک ثلث ایشیا اور نصف یورپ پر قابض تھی پاش پاش ہوگئی۔ جرمنی کا۔ جو دنیا میں سب سے بڑی فوجی طاقت رکھتا تھا۔ شیرازہ بکھر گیا۔ آسٹریا کی سلطنت جو یورپ میں سب سے پرانی اور مؤقر و مقتدر تھی۔ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ سلطنت عثمانیہ جس سے کسی زمانہ میں تمام یورپ کانپتا تھا۔ اپنے بہترین صوبے ہاتھ سے کھو بیٹھی۔ زمین۔ پانی۔ ہوا تینوں کرۂ نار بن گئے۔ اس جنگ کی بے پناہ آگ نے صرف یورپ کو ہی جلا کر بھسم نہیں کیا بلکہ اس کے شعلوں نے مغربی یورپ کے میدان سے۔ جاپان سے امریکہ تک تمام دنیا میں آگ لگا دی اور خدا کی مخلوق کو ایک عجیب مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ ملکوں کے کاروبار بند ہوگئے۔ تجارت کی کساد بازاری نے گرانی اور قحط کو ایسی ہیبت ناک صورت سے نمایاں کیا کہ کہن سال دنیا نے، ایسی تباہی و بربادی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ قصہ کوتاہ اس لڑائی نے تمام کرہ زمین کے نظامِ سیاسی حربی، جغرافیائی اور تمدنی میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔

ایسی ایسی ہولناک اور عالمگیر مصیبتوں کے مقابلہ میں کربلا کی خوں ریزی بظاہر کچھ حقیقت نہیں رکھتی کیونکہ اس میں ایک طرف صرف بہتر یا بیاسی اور دوسری طرف۔ بائیس یا تیس ہزار آدمی تھے۔ کل مقتولین کی تعداد چند ہزار سے متجاوز نہیں ہوئی، لڑائی بھی فقط تین پہر رہی۔ کوئی شہر یا دار العلوم صنعت و حرفت کا مرکز یا کاروبار تجارت کا دسا ور برباد نہیں کیا گیا۔ مگر باوجود اس قلتِ نقصان کے معرکہ مذکور کو دنیا کے معرکہ ہائے جنگ میں ایک غیر معمولی اہمیت نصیب ہوئی۔ اور نہ صرف مسلمان بلکہ غیر اقوام کے مورخ بھی۔ تمدن عالم کی تاریخ میں اس کو بہت بڑی وقعت

دیتے ہیں اور یہ اہمیت و وقعت صرف اس امر پر مبنی ہے کہ اس معرکہ میں گو مخاصمین کی تعداد بہت قلیل اور ایک فریق کی طاقت محض برائے نام تھی لیکن جس بات پر تکرار تھی اس سے بڑھ کر وقیع سبب آجتک دنیا میں کسی لڑائی کا نہیں ہوا۔ یعنے ظاہر میں تو یزید اور امام حسین میں مقابلہ تھا۔ مگر درحقیقت مقابلہ حق و باطل ایمانداری و بے دینی۔ عقبےٰ اور دنیا۔ راستی و دروغ۔ صحت و غلطی، تقویٰ و رندی، روشنی و تاریکی، صدق و کذب کے درمیان آکر پڑا تھا کیونکہ یزید منہیات و معصیات پر دلیر اور فرائض دین سے لاپروا تھا اور اپنی بیعت سے بالواسطہ اُن ہی ناگوار باتوں کو رواج دینا چاہتا تھا۔ حضرت امام حسین حمیتِ دینی اور حمایتِ مذہبی مذہبی کی وجہ سے ان باتوں کو گوارا نہ فرما سکتے تھے۔ اس لئے آپ نے اپنی جان دینا قبول کیا اور ایک بدراہ اور گمراہ کی اطاعت منظور نہ فرمائی اور ان مصائب کے پیش آنے پر بھی جس کا برداشت کرنا انسانی طاقت سے بالاتر تھا۔ آپ کے ثباتِ قدم اور استقلال مزاج میں لغزش نہ آئی اور جو جسمانی و روحانی تکلیفیں حضرت آدم سے لے کر اس وقت تک کسی فرد بشر کو نہ پہنچی تھیں انہیں آپ نے کمال مردانگی سے اٹھایا اور جو فرائض حقوق اللہ اور حقوق العباد کے متعلق آپ کے ذمہ تھے۔ ان کو ایسی خوبی سے ادا کیا کہ دنیا ہمیشہ حیرت کی نگاہوں سے دیکھے گی اور صبر و استقلال کا وہ شاندار نمونہ دکھایا جس سے بڑھ کر ظہور تو کیا خیال میں آنا بھی دشوار ہے۔

کیا دنیا کا کوئی مذہب حمایتِ حق اور مدافعتِ باطل کا ایسا عظیم الشان واقعہ اپنی تاریخ میں دکھا سکتا ہے اور کیا صبر و استقلال کی یہ زبردست مثال کسی دوسری قوم کے بزرگوں میں مل سکتی ہے ؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ واقعۂ ہائلہ کربلا۔ درحقیقت روشنی کا ایک مرتفع مینار ہے جس پر تمام ساکنانِ عالم کی نگاہ پڑتی ہے اور جو تیرہ سو برس کے اندر لاکھوں کروڑوں انسانی زندگیوں کے جہازوں کو آشوبِ دہر کی خطرناک چٹانوں اور حرص و ہوا کے تباہ کن گردابوں سے بچا چکا ہے، مبارک تھی وہ زندگی جس نے ایسی شاندار مثال قائم کر کے انسانی نسلوں

کی ہدایت کے لئے۔ ایک قیامت تک روشن رہنے والی شمع۔ راہ میں رکھی۔ اور بدنصیب ہیں وہ لوگ جو ہمدردی قومی اور حق پرستی کی ایسے اعلےٰ نمونہ سے صحیح طور پر متاثر نہیں ہوتے

سانحہ عاشورہ حمایت صداقت کا بہترین اور عدیم النظیر کارنامہ ہے

دنیا چار برس ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک اک عالمگیر اور جہاں سوز جنگ سے گھبرا اٹھی اور اس قدر خوف زدہ ہوئی کہ موجودہ جنگ کو ٹالنے کی کوشش حد سے تجاوز کر گئی تھی اور اس وقت اس کے ہیبت ناک نتائج سے تمام اقوام عالم کے افق پر خوف و پریشانی کے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں مگر بغور دیکھو تو نظر آئے گا کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ایک مسلسل اور غیر منقطع سلسلۂ جنگ میں مبتلا ہے، صبح و شام، دن اور رات، چاندنی اور اندھیرا۔ بہار و خزاں جاڑا اور گرمی یہ کیا ہیں۔ اس رزم گاہ عالم کے نبرد آزما حریف ہیں ہوا اور مٹی۔ آگ اور پانی دریا اور پہاڑ۔ زمین و آسمان کیا ہیں، عناصر کے باہمی جنگ کے مظاہر ہیں، بلکہ یہ ساری کائنات ان ہی عناصر کی فتح و شکست کے نتائج ہیں۔ جمادات اور نباتات، نباتات اور حیوانات حیوانات اور انسان۔ غور کرو کیا انہیں موت و حیات کی کشمکش کیلئے ایک دائمی جنگ برپا نہیں ہے؟ آگے بڑھو۔ اشرف المخلوقات کی دنیا میں آؤ یہاں قوت قوت سے، جماعت جماعت سے، قوم قوم سے دست و گریباں ہے۔ غرض کائنات سرتاسر جنگ صلح اور شکست ہے۔

لیکن سب سے زیادہ تعجب خیز سب سے زیادہ حیرت انگیز اور سب سے زیادہ تحیر افزا دہ جنگ و صلح ہے جو اس عالم مادی سے ماورا۔ روحانیات کے عالم میں برپا ہے۔ صدق و کذب حق و باطل۔ صواب و خطا۔ میں جب سے دنیا قائم ہے ایک غیر فانی نزاع بھی قائم ہے۔ مگر یہ تعجب یہ حیرت یہ استعجاب اُس وقت اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ جب کمزوری قوت سے شخص جماعت سے، جماعت قوم سے اور قوم دنیا سے لڑنے کو آمادہ ہو جاتی ہے۔ ذرہ پہاڑ کو، قطرہ سمندر کو، اور ایک بے سامان شخص باساز و سامان شہنشاہ کو اعلان جنگ دیتا ہے اور صرف حق اور صداقت کی قوت کو اپنے دست و بازو کا سہارا جانتا ہے کہن سال دنیا کی سوانح عمری کا جتنا تحریری سرمایہ

اس وقت موجود ہے اس کے اکثر اوراق اُن ہی خونیں داستانوں سے رنگین ہیں۔ اس وقت کرۂ ارض کی ہر قوم سراپا آواز ہے۔ کہ اس ضخیم کتاب میں میری زندگی کا باب نکال کر پڑھو۔ مگر واقعات کی ندرت جواب دیتی ہے کہ میری پوری اور مکمل شان دنیا کی صرف آخری قوم میں نظر آئے گی۔

اس قوم کی تاریخ میں وہ شہدائے ملت بھی شامل ہیں جنہوں نے میدانِ حق میں لڑکر جانیں دیں وہ بھی ہیں جن کی گردنیں تلواروں کا امتحان گاہ بنیں وہ بھی ہیں جو سولی پر لٹکائے گئے۔ وہ بھی ہیں جن کی زبانیں حق گوئی کے جرم میں تالو سے کھینچ لی گئیں۔ وہ بھی ہیں جن کا ایک ایک عضو کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ پر اُن میں امن پسند۔ تیغ زنوں کی بھی کمی نہیں جن کے جھونپڑوں سے نکلی ہوئی ناتوان آواز برق و صاعقہ بن کر محلوں اور ایوانوں کو ہلا آئی جن کے ہاتھوں کی ایک کمزور جنبش نے قبائے حکومت کے تار الگ الگ کر دئے۔ جن کے چشم و ابرو کے اک اشارہ نے جاہ و جلالِ سلاطین کے اوراق کو پارہ پارہ کر ڈالا۔

محض حق اور صداقت کی حمایت میں ایک کمزور اور معمولی قوت کے تارک الدنیا شخص کا ایک عظیم الشان سلطان کی طاقت سے مقابلہ حوصلہ اور دل گردے کا کام ہے۔ اور دنیا کی تاریخ میں واقعۂ کربلا سے بڑھ کر اس کی شاندار اور تابناک مثال نہیں مل سکتی۔ غور کرو۔ ایک طرف یزید (جس کی قلمرو کی حدیں دریائے جیحوں سے دریائے نیل تک اور ہندوستان سے بحرِ اسود تک پھیلی ہوئی ہیں اور دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا تاجدار ہے) اپنے ٹڈی دل فوج کے ساتھ آمادۂ خوں ریزی ہے اور دوسری طرف پیغمبر اسلام کا نواسہ۔ حق۔ صدق اولوالعزمی۔ استقلال، عزت نفس اور حمایت اسلام کے لاؤ لشکر کے ساتھ شخصیت و استبداد زندقہ و الحاد کے خلاف صف آرا ہے وہ فاسق و فاجر ثانیٔ فرعون اپنی خلافت منوانے پر تلا ہوا ہے مگر بانیِ اسلام کا فرزند، اسلام کی عزت و حرمت برقرار رکھنے کا عہدِ واثق کر چکا ہے حسینؑ جانتے ہیں کہ شخصیت کی فتح اسلام کی شکست، اور یزید باطل پرست کے دست نجس پر

بیعت اسلام سے روگردانی کا اقرار ہے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہوا۔ آپ نے پوری طاقت سے عدوئے دینِ اسلام کا مقابلہ کیا، کوئی منظر اس سے زیادہ سبق آموز اور عبرت خیز نہیں ہو سکتا کہ ۷۲، یا ۷۲، حق پرستوں کا ایک مختصر سا قافلہ محض احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی غرض سے میدان میں نکلتا ہے اور بانیٔ اسلام کا لاڈلہ نواسہ اپنے نانا کے امتیوں کو خدا سے غداری اور بد عہدی کرنے سے باز رکھنے میں کامیاب نہیں ہوتا، اس کے رفقاء اور اعزا۔ ایک ایک کرکے اس کے سامنے شہید کر دئے جاتے ہیں اور وہ خود برچھیوں تیروں اور تلواروں سے چور ہو کر گرتا ہے تو اس کا ایسی حالت میں بھی، اگر کسی کے آگے سر جھکتا ہے تو خدا ہی کے آگے جھکتا ہے اس کا ضمیر و ایمان اگر سجدہ کرتا ہے۔ تو معبود حقیقی کے حضور میں کرتا ہے۔ اور یزیدی لشکر کی کثرت اس کی شقاوت و سفاہت اور بے نظیر ظلم آرائی۔ اُسے جادۂ مستقیم سے نہیں ہٹا سکتی گویا وہ حق اور صداقت کی حمایت کا ایک پہاڑ ہے جسے مصائب و شدائد کا طوفان اپنی جگہ سے جنبش نہیں دے سکتا اور استقلال اور ثابت قدمی کا ایک سدِ روئیں ہے۔ جس کی بنیادیں صدمات و آفات کے کسی سیلاب سے متزلزل نہیں ہو سکتیں۔ کیا عزم و استقلال تسلیم و رضا حمایتِ دینی اور غیرتِ ایمانی کا یہ حیرت انگیز واقعہ جس کی برداشت انسانی طاقت سے باہر ہے اپنی نظیر آپ نہیں ہے۔

”واللہ کہ اے حسین گارے کردی

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی نے جناب سید الشہدا اور آپکی ہمراہیوں کے کیریکٹر کی جو تصویر دلکش الفاظ میں کھینچی ہے وہ ہر مسلمان کے نہاں خانۂ دل میں۔ ہنی چاہیئے۔ فرماتے ہیں۔

”فضائل اخلاق کا نمونہ اس سے اعلےٰ اور اشرف کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے نبی کا نواسہ جس کے آگے ہر مسلمان کا سر جھکنا چاہیئے تھا۔ اور جس کو ان سے بے انتہا امیدیں ہونی چاہیئے تھیں، وہ چند عزیزوں اور دوستوں کے سوا ہر مسلمان کو اپنے خون کا پیاسا دیکھتا ہے۔

ریگستان عرب کی لُو اور گرمی ہے۔ عورتیں صغیر سن بچے اور سارا کنبہ ہمراہ ہے۔ مدینہ سے کوفہ تک مہینوں کی راہ طے کرنی ہے جو اعوان و انصار بن کر ساتھ چلے تھے۔ ان میں سے چند کے سوا سب ساتھ چھوڑ چھوڑ کر چل دیے۔ جن لوگوں نے متواتر خط اور پیغام بھیج کر اور خدا و رسول کو درمیان دے کر نصرت و یاری کے وعدوں پر بلایا تھا۔ وہ ان کو یک قلم منحرف اور برگشتہ پاتا ہے اور تمام امیدیں مبدّل بہ یاس ہو جاتی ہیں، بایں ہمہ وہ راضی برضا ہے، ہر حال میں خدا کا شکر کرتا ہے اور اپنے ارادہ پر ثابت قدم ہے جس شخص کو وہ ملک قوم اور دین کے حق میں ایک مرض مہلک سمجھ کر اس کی بیعت سے انکار کر چکا ہے باوجود ان تمام شدائد کے اپنے انکار پر اسی طرح قائم ہے۔ دشمنوں نے کھانا پانی بند کر رکھا ہے۔ دریائے فرات آنکھوں کے سامنے بہہ رہا ہے۔ دشمنوں کے گھوڑے گدھے اور اونٹ تک سیراب ہوتے ہیں مگر اُس کا سارا کنبہ تین روز سے پیاسا ہے، اس کے ننھے ننھے بچے پانی کی ایک بوند کو ترستے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ وہ ایک نالائق آدمی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتا۔ اپنے ارادہ پر اسی طرح ثابت قدم ہے کسی سختی اور کسی مصیبت سے اس کے استقلال میں فرق نہیں آتا۔ اس کے یار و مددگار کل بہتّر اور وہ بہتّر ہیں اور ایک ٹڈی دل سے مقابلہ ہے۔ لڑنے میں اپنا اور اپنے سب عزیزوں اور دوستوں کا خاتمہ نظر آتا ہے خیموں اور اسباب کا لٹنا پسماندوں کا اسیر ہونا عورتوں کی بے ردائی اور بادیہ پیمائی یہ سب آفتیں گویا نگاہوں کے سامنے ہیں۔ مگر وہ ان سب کو گوارا کرتا ہے اور بہتر سمجھتا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ ایک نالائق آدمی کے ہاتھ پر بیعت کرے اور اس کی حکومت کو تسلیم کرلے وہ اپنے بھائی بھتیجے۔ بھانجوں کو نہایت اطمینان سے مسلح اور آراستہ کرکے ایک ایک کو ہزاروں کے ساتھ لڑنے کے لئے بھیج رہا ہے۔ ان کے بازو تلواروں سے کٹتے ان کے کلیجے برچھیوں سے چھدتے دیکھتا۔ ایک ایک کی لاش کاندھے پر رکھ کر لاتا ہے اور اپنے ہاتھ سے زمین میں دفن کرتا ہے۔ خیمہ میں عورتوں کے کہرام سے ایک قیامت برپا ہے۔ بی بی بیٹی اور بہنوں کی دلخراش صدائیں دل میں ناسور ڈالی ہی

ہیں۔ چھ مہینہ کا شیر خوار بچہ ایک بے رحم کا تیر کھا کر۔ گود میں مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہے۔ اس کے حلق سے خون کا فوارہ جاری ہے۔ سب چھوٹے بڑے کام آچکے۔ اور بچہ بھی کوئی دم کا مہمان ہے۔ اب سب کے بعد اپنی باری نظر آتی ہے۔ اور پھر اہل بیت کے جہاز کا خدا کے سوا کوئی ناخدا نظر نہیں آتا۔ ان سب بلاؤں کا سامنا ہے اور مصائب و آفات کی گھنگھور گھٹا چاروں طرف چھائی ہوئی ہے مگر ان میں سے کوئی چیز اس کے عزم و استقلال میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ کوہ راسخ کی طرح اپنے ارادہ پر ثابت قدم ہے اور اپنے قول سے نہیں ہٹتا۔

"وہ بے رحم قوم جو نانا کا کلمہ پڑھتی ہے اور نواسے کی خون کی پیاسی ہے۔ جو چند نفوس کے مقابلہ کے لئے ایک ٹڈی دل کو ساتھ لے کر آتے ہیں اور تمام طاقت اس بات میں صرف کر رہے ہیں کہ جو اذیتیں اور تکلیفیں آدمؑ سے تا ایں دم کسی ذی رُوح کو نہ دی تھیں۔ وہ اپنے نبی کے دل بندوں اور جگر کے ٹکڑوں پر ختم کی جائیں جو حرص و طمع کے نشہ میں ایمان۔ رحم انصاف، آدمیت ہمدردی اور تمام انسانی فضائل سے دست بردار ہو کر خدا کا گھر ڈہانے یعنی خاندان نبوت کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے پر تیار اور کمربستہ ہیں نہ وہ ان کو بد دعا دیتا ہے نہ ان کی شکایت کرتا ہے نہ ان پر غصہ ہوتا ہے۔ بلکہ نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ اپنے حقوق جن کے ماننے کا وہ دعوے کرتے ہیں، ان کو جتاتا ہے، اور ان کے وہ فرائض جو خاندان نبوت کے ساتھ ان کو بجا لانے چاہئیں انہیں یاد دلاتا ہے۔

"چھوٹے سے بڑے تک ہر شخص کے دل میں یہ امنگ ہے کہ سب سے پہلے اپنی جان خاندان پر نثار کر دوں۔ باپ کی یہ خواہش ہے کہ تلواروں کی آنچ میں۔ بھائی بھتیجے۔ بھانجوں سے پہلے اپنے جگر بند کو جھونک دوں۔ بھائی۔ بھائیوں اور بھتیجوں سے پہلے مرنے کو تیار۔ اور میدان جنگ کا خواستگار ہے۔ بھانجوں کی یہ تمنا ہے کہ ماموں اور ماموں کی اولاد پر سب سے پہلے ہم قربان ہوں بھتیجے کی یہ آرزو ہے کہ چچا کا فدیہ سب سے پہلے میں ہوں بہن کا یہ ارمان ہے کہ اپنے بچوں کو بھائی اور بھتیجوں پر قربان کردے۔ بھائی اس فکر میں گھلا جاتا ہے کہ

"اگر بھائی کے بچے میری رفاقت میں مارے گئے تو بہن کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

"چچا کو خود بھی تین دن سے پیاس ہے، بے قرار ہے مگر اپنی پیاس کی کچھ پروا نہیں کرتا مگر پیاسی بھتیجی کی بے قراری کسی طرح نہیں دیکھ سکتا۔ وہ مشکیزہ گلے میں ڈال اور جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمنوں کی صفیں چیرتا ہوا۔ دریا میں گھوڑا جا ڈالتا ہے۔ دریا کا سرد اور شیریں پانی لہریں مار رہا ہے۔ پیاس کے مارے دم آنکھوں میں ہے۔ دل قابو سے باہر ہوا جاتا ہے دو چلو میں پیاس بجھتی ہے مگر غیرت اور حمیت اجازت نہیں دیتی کہ ننھے ننھے بچوں کی پیاس بجھنے سے پہلے اپنی پیاس بجھائے وہ مشکیزہ بھر کر اسی طرح دریا سے پیاسا پھرتا ہے تاکہ جلدی جا کر بچوں کے حلق میں پانی پہنچائے۔ مگر دشمنوں نے گھیر کر دونوں بازو کاٹ ڈالے۔ اس پر بھی اس کو اپنے بازؤں کا کچھ خیال نہیں۔ اگر ہے تو مشکیزہ کی فکر ہے۔ کہ مبادا پانی ضایع ہو جائے۔ اور بچے پیاسے رہ جائیں وہ سب حربے اپنے اوپر لیتا ہے مگر مشک پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ جب تک کہ زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے نہیں گرتا۔"

"بیبیاں خاوندوں کو اور مائیں بیٹوں کو قتل اور زخمی ہوتے دیکھتی ہیں۔ مگر کوئی زبان سے اُف نہیں کرتی اور منہ سے سانس نہیں لیتی، صرف اس خیال سے کہ جس مربی اور سرپرست کی رفاقت میں وہ کام آئے ہیں اس کے دل پر میل نہ آئے اور وہ اپنے دل میں ہم سے محجوب نہ ہو۔ سب اس کی اور اس کی اولاد کی خیر مناتے ہیں اور اپنے بچھڑے ہوؤں کو کوئی یاد نہیں کرتی۔"

"ایک خدا کا بندہ جو دشمنوں کی فوج کے ساتھ نبی کے نواسے سے لڑنے کو آیا ہے۔ باوجودیکہ دشمنوں کا ساتھ دینے میں اس کو ہر طرح دولت اور جاہ و منصب کی توقع ہے۔ اور ان کا ساتھ چھوڑنے میں جان و مال اور خاندان کی تباہی کا یقین واثق ہے جس قوم میں وہ گھرا ہوا ہے وہاں کوئی ترغیب یا تقریب ایسی نہیں ہے۔ جو اس کا دل ظلم و بیدردی اور بے دینی اور حبّ جاہ و ثروت سے ہٹا کر رحم و ہمدردی اور دینداری کی طرف مائل کر سکے۔ اس کو ہر

طرف سے یہی آواز آتی ہے کہ جلد از جلد قلیل جمعیت پر فتح حاصل کیجئے۔ مردوں کے سر اتاریئے عورتوں اور بچوں کو اسیر کر کے لے چلئے اور حاکم سے جل کر اپنی خدمات کا صلہ لیجئے۔ دوسری طرف کوئی ظاہری سامان ایسا نظر نہیں آتا جس کے لالچ میں وہ ان فائدوں سے قطع نظر کر کے اپنی فوج کا ساتھ چھوڑ دے بلکہ خلاف اس کے طرح طرح کی بلاؤں اور آفتوں کا سامنا نظر آتا ہے باایں ہمہ وہ تمام دنیوی منفعتوں اور امیدوں پر خاک ڈال کر ظالموں سے کنارہ کرتا ہے۔ حق کی نصرت پر اپنی جان دینے کو فوز عظیم جانتا ہے اور سب سے پہلے خاندان نبوت پر اپنی جان فدا کرتا ہے۔"

"چند وفادار رفیق اور دوست جو فرزند نبی کے ہمراہ ہیں اور جو ایک ٹڈی دل کے مقابلہ میں اس قدر قلیل ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکیں وہ ایک عالم کو اپنے سردار سے برگشتہ اور منحرف پاتے ہیں۔ خود اس کے ساتھیوں اور رفیقوں کو اثنائے راہ میں اس کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر اور آنکھیں چرا چرا کر جاتے دیکھ چکے ہیں اپنے لئے اس کا ساتھ دینے میں کوئی نفع عاجل اور دنیا کی کوئی بھلائی نہیں سوجھتی بلکہ ہر وقت موت کا سامنا ہے۔ اس کی رفاقت کی بدولت بھوک اور پیاس میں تین دن سے جان لبوں پر آ رہی ہے نہ کوئی رشتہ ہے نہ قرابت ہے۔ جو اس کی رفاقت چھوڑنے سے مانع ہو مگر وفاداری کا طوق ان کی گردن میں اور دوستی و اخلاص کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑی ہے کوئی خوف اور کوئی طمع ان کے اس تعلق کو قطع نہیں کر سکتی، ہر وقت یہی آرزو ہے۔ کہ کب اذن جنگ ملے اور کب خاندان نبوت پر اپنی جانیں قربان کریں اور کب اس فرض سے سبک دوش ہوں۔"

"غور کیجئے ان خاصان خدا کے جذبات وفاداری کی کیا کیفیت تھی اور وہ سب ایک اصول کے لئے قربان ہونے آئے تھے۔ اور حق و صداقت کی حمایت کا حق ادا کر گئے۔ یوں تو اسلام اپنے ہر ایک فرزند سے حق اور صداقت کی نظیر پیش کر سکتا ہے، حمایت صداقت کی ایسی شاندار مثال قائم کرنا۔ صرف حسینؑ کا ہی کام تھا حسینؑ نے اسی جذبہ سے متاثر ہو کر ناقابل برداشت

مصائب کو جھیلنا گوارا فرمایا۔ اور تعلیم اسلام کو اپنے خون سے عملی رنگ میں دنیا کے روبرو پیش کیا۔ حسینؑ اگر باطل سے دب جاتے تو یہ اسلام کی شکست تھی۔ اس لئے وہ خود ہدفِ مصائب بنے اور اپنے قتل سے نہ صرف اسلام کی آبرو رکھ لی بلکہ اسلام کی فتح کا اعلان کر دیا۔ جب تک دنیا قائم ہے۔ اسلام فرزند بانیٔ اسلام کا مرہونِ احسان اور یہ واقعہ مسلمانوں کے لئے درسِ عبرت و موعظت بنا رہے گا اور ان کو یاد دلاتا رہے گا کہ مسلمانوں کو حق اور صداقت کی حمایت اس طرح کرنی چاہئے۔" (مقدمہ دیوان حالی مطبوعہ نامی پریس)

"حسینؑ کی شہادت نے اِسلام کو ہلاکت سے بچا لیا"

جس وقت سے سلطنت بنی امیہ کی بنیاد پڑی اور بنی ہاشم کے رقیب اِسلامی خلافت پر قابض ہو کر اہل اسلام کی قسمتوں کے مالک ہوئے بمصداق "الناس علیٰ دینِ ملوکھم" مسلمانوں کا عام رجحان ان ہی کی اطاعت اور ان ہی کے اقوال و افعال کی تقلید پر مائل ہونے لگا ان کی اوضاع و اطوار خواہ موافق شرع ہوں یا نہ ہوں مستحسن سمجھے جانے لگے۔ اسلامی سادگی جو خلفائے راشدین کے عہد میں شعارِ خلافت رہی۔ اب موقوف ہو کر سلطنت کے ٹھاٹھ اور امارت کے کر و فر قیصر و خاقان کی درباری شان و شوکت کو شرمانے لگے گورنروں اور عاملوں نے ہر طرح کی بے اعتدالیاں اختیار کر لیں عام مساوات کا اصول رَوند ڈالا گیا۔ تمام بڑے بڑے ملکی اور فوجی عہدوں پر وہ لوگ جو نہ صرف دشمن خاندان رسالت بلکہ اعلےٰ درجہ کے بد افعال بھی تھے۔ مامور کئے جاتے تھے۔ بنی ہاشم خصوصاً بنی فاطمہ کی عداوت و خصومت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ علیٰ رؤس الاشہاد ممبروں پر جنابِ امیر جناب سیدہ اور آپ کی اولاد امجاد پر سب و شتم کیا جاتا تھا۔ خطبوں میں فضائل اہل بیت۔ بصورت رذائل اور رذائل بنی امیہ بصورتِ فضائل بیان کئے جاتے تھے۔ بچوں کی درس گاہوں میں یہ ہی تعلیم دی جاتی تھی وہ اسی حالت میں نشو و نما پاتے جوان ہوتے اور بوڑھے ہو کر مرجاتے۔

یہ حالت ملک شام تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ تمام اسلامی ملکوں میں جہاں جہاں بنی امیہ کا غلبہ اور تسلط تھا۔ یہی بدعنوانیاں اور بے اعتدالیاں اشاعت پذیر ہو .... نے لگا تھا۔

ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ دین برحق کا صاف اور نورانی مطلع بدعتوں اور گوناگوں خرابیوں کے ابرِ غلیظ سے تیرہ و تار ہو جائے۔ مسلمانوں کے عقائد و اعمال بگڑ جائیں۔ خاندان نبوت سے عناد (جو بنی امیہ کی زریں پالیسی تھی) دلوں میں جاگزیں ہو۔ حق و باطل کی تمیز جاتی رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اسلام کی اصلی صورت مسخ ہونے کے قریب پہونچ چکی تھی۔ اور افسوس ہے کہ آخر کار اجماعِ امت ایک ایسے شخص کی خلافت پر ہوا جو باعث ننگ و عارِ اسلام تھا اور جس کا دستِ تسلط اسلام کے استیصال کے واسطے ایک کاری حربہ تھا۔

یزید کی تخت نشینی کا لیدا اسلام کے لئے زہر قاتل سے کم نہ تھی۔ اس کے تمام اعمال و افعال علانیہ خلاف شرع محمدی تھے، وہ بظاہر کلمہ گو مسلمان مگر حقیقۃً کافروں سے زیادہ دشمنِ اسلام تھا۔ خانۂ نبوت کی بربادی۔ خانۂ کعبہ کی توہین مسجد نبوی کی بے حرمتی اور شعائرِ اسلام کی کھلم کھلا گستاخانہ مخالفت اس کے کفر صریح کی بین دلیلیں ہیں۔ یزید نے بااختیار ہو کر صرف اپنے ہی فسق و فجور پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ دینِ اسلام کو ملیامیٹ کر ڈالنے کے ڈھنگ ڈالے۔ علانیہ شراب خوری، زنا کاری، قمار بازی کو جائز حال بہن۔ بیٹی کو مباح اور دوسرے منہیات شرعی کو جاری کر دیا۔ ایسے ناپاک وجود کی نحوست کچھ عجب نہ تھا کہ دینِ اسلام کی متزلزل دیوار کے لئے۔ بھونچال کا اثر دکھاتی۔ اسلام کا شیرازۂ بستہ درہم و برہم ہو جاتا۔ کیونکہ تختِ حکومت ہنوز تختِ خلافت اور امیر المومنین ہنوز نائب رسول سمجھا جاتا تھا۔ دینی اور دنیاوی اقتدار دونوں توام اور لازم و ملزوم خیال کئے جاتے تھے۔ مذہب اسلام اگرچہ دنیا کے وسیع حصہ پر پھیل چکا تھا۔ تاہم اس کی بنیاد قائم ہوئے۔ ابھی نصف صدی سے کچھ ہی مدت زیادہ گذری تھی آثار و علامات صاف کہہ رہے تھے کہ اگر یہی لیل و نہار ہے۔ اور دنیائے اسلام کا فرماں روا جو امیر المومنین اور

خلیفۃ المسلمین کہلاتا ہے شعائر اسلام سے لاپرواہ اور اس کی تخریب و انہدام کے درپے رہا تو بانئ اسلام اور خلفاء راشدین کی تمام کوششیں رائگان جائیں گی اور وہ زمانہ دور نہیں ہے کہ دین اسلام اولٹے پاؤں رجعتِ قہقری کرتا کرتا پھر اپنے اصلی مقام پر آجائے۔ اور دنیا بدستور سابق پھر ضلالت و گمراہی کے گڑھے میں گر جائے۔

ضرور تھا کہ "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"۔ قدرت نے اسلام کی حفاظت و صیانت کے واسطے فرزندِ بانئِ اسلام کو منتخب کیا حسین علیہ السلام پیغمبر اسلام کے نواسے ہونے کے علاوہ اپنے جدِ امجد کے وارث جائز اور حقیقی خلیفہ تھے۔ آپ کا فرض تھا کہ اپنے جدِ بزرگوار کے دین کی حمایت و حفاظت کریں خواہ کچھ بھی افتاد پڑے۔ اسی واسطے آپ نے یزید کی اطاعت کو ناجائز اور افعال کو مردود قرار دے کر بیعت سے صاف انکار کر دیا حسین کا بیعت و اطاعتِ یزید کر لینا۔ گویا اس بات کی ضمانت ہو جاتا۔ کہ بنی امیہ کے فاسق و فاجر خلفاء امتِ محمدیہ کے جائز خلیفہ اور رسول اللہ کے برحق جانشین ہیں۔ لیکن حسینؑ کے انکار اور باوجودِ مظالم انکار پر اصرار نے۔ اس مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا۔ کہ فاسق و فاجر کسی طرح خلافت رسول للہ کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ آپ دیکھ رہے تھے۔ کہ اب ہمارے مخالفین جو ہمارے جد اور ان کی شریعت کے بھی معاندین ہیں اپنے اصلی رنگ و روپ میں دنیا کے سامنے آگئے ہیں تو آپکی قوتِ قدسی فوراً اس نتیجہ پر پہونچ گئی۔ کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اسلام کا اصلی چہرہ عالم کو دکھا دیں وہ زمانہ پہنچ گیا ہے۔ جب کہ ہم اپنے عہد کو پورا کریں جو ہم نے اپنے خدا سے باندھا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس کے اہل کے لئے "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" فرمایا گیا ہے اب ضرورت داعی ہے کہ ہم کشتی اسلام کے حقیقی ناخدا بن کر اس کو بھنور سے نکالیں۔ گو طوفانِ استبداد کے تھپیڑے چاروں طرف سے اس کشتی پر پڑتے تھے ہوائے ظلم کے تیز و تند جھونکے اس سفینہ کو ڈبونا چاہتے تھے۔ قریب تھا کہ تباہ اور پاش پاش ہو جائے۔ اس اولوالعزم امام نے ان مخالف ہواؤں کی کچھ پرواہ

نہ کی اور بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا کہتے ہوئے کشتی کو گرداب ہلاکت سے نکالنے کا عزم بالجزم کر لیا اس نے سفینۂ اسلام کو بچانے کے لئے ایک ایسی راہ اختیار کی جس کو پہلے کسی نے اختیار نہ کیا تھا۔ جو بہ لحاظ اپنی ابتلا کے جو بلحاظ اپنے پُر خطر ہونے کے ایسی سخت اور کٹھن تھی کہ اس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں جس کے ذکر سے سنگدل سے سنگدل انسان کا دل پسیج جاتا ہے۔ اس کشتی کا بچانا آسان کام نہ تھا کوئی سہل مہم نہ تھی کوئی چرب لقمہ نہ تھا۔ اس سفینۂ نجات کی حفاظت بڑی بھاری قربانیاں چاہتی تھی۔ بڑے بڑے فدیوں کی ضرورت تھی۔ کوہ شکن مصائب کا تحمل درکار تھا۔ مگر حسینؑ ایسے نہ تھے کہ ان مصائب و شدائد کے سامنے جھجکتے۔ انہوں نے بڑی خوشی سے لبیک کہا اور ان تمام آنے والی مصیبتوں کا تہِ دل سے خیر مقدم کیا۔ وہ عہد طفولیت سے ہی ان تمام مصائب کیلئے تیار تھے اور باوجود ایسے جانکاہ شدائد کے جو اپنی نوعیت میں عدیم المثال ہیں آخر دم تک اپنی بات پر ثابت اور قائم رہے۔

آپ کی اس قربانی سے عام اسلامی دنیا پر حیرت انگیز اثر پڑا۔ حق اپنے مرکز پر قائم ہو گیا۔ دینِ محمدیؐ کی گرتی ہوئی دیوار نہایت استحکام سے سنبھل گئی۔ حق اور باطل کا امتیاز نہایت اعلان اور اشتہار کے ساتھ آشکارا ہو گیا لوگوں پر بنی امیہ کی گمراہی اور خاندانِ رسالت کے ساتھ معاندانہ برتاؤ آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہو گئے۔ لوگوں کے خیالات بدل گئے۔ گویا شہادتِ حسینؑ نے اسلام کے نیم مردہ قالب میں تازہ روح پھونکدی۔ شروع اسلام میں بھی مخالفوں نے جو بظاہر پیروِ اسلام تھے۔ اسلام پر سخت حملہ کیا تھا اگر اس وقت اس خوفناک حملہ کی روک نہ کی جاتی یا اس حملہ کا روکنے والا بزدل اور کمزور طبیعت کا ہوتا۔ تو ضرور اسلام کو چشم زخم پہونچتا۔ اور لوگوں کے دلوں میں دینِ اسلام بے وقعت اور اس کی حقانیت مشکوک ہو جاتی۔ لیکن مشیت نے اس عظیم الشان کام کے لئے حسینؑ کو چنا اور حسینؑ نے بھی اس نازک اور کٹھن ذمہ داری کو ایسا نبھاہا کہ اسلام تباہ ہونے سے بال بال بچ گیا۔ اگر آپ باوجود نائب رسولؐ اور محبتِ خدا ہونے کے ایک فاسق کی جو اپنے ناپاک حرکات کے باوجود بھی امیر المومنین

اور خلیفۃ المسلمین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ بیعت کر کے اس کو امیر المومنین تسلیم کر لیتے۔ تو تمام مسلمان یزید کے ہر فعل کو جو سراسر فسق و فجور کفر و ارتداد پر مبنی تھا فعلِ خلیفۂ رسول سمجھ کر ضلالت و گمراہی کے گڑھے میں سرنگوں گر جاتے۔ آپ کا بیعتِ فاسق نہ کرنا۔ اور دردانگیز مصائب اٹھا کر شہید ہو جانا فی الحقیقت کالبدِ اسلام کے لئے نئی رُوح تھا جس سے تمام مسلمانوں کو یزید کا خلیفہ ناجائز اور اس کی اطاعت کا حرام ہونا ثابت ہو گیا۔

ہادیٔ اسلام کی وفات کے بعد اسلامی حکومت میں جو انقلاب رونما ہوئے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ بہر حال قوم کی سیاسی غلطی کہو یا مسلمانوں کی سادہ لوحی چالیس برس کے عرصہ میں کسی نہ کسی طرح اسلامی حکومت پر اسی قبیلہ بنی امیّہ کا قبضہ ہو گیا جس کی قوت کم کرنے۔ اور جس کا اقتدار توڑنے میں پیغمبرِ اسلام نے پوری سیاست اور تدبّر سے کام لیا تھا۔ کیونکہ وہ خدا کا برگزیدہ پیغامبر اور فطرت انسانی کا مطالعہ کرنے والا مدبّر خوب جانتا تھا۔ کہ یہ قبیلہ کبھی اسلام کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اس طرف ہادیٔ اسلام کا محبوب نواسہ جس کے ناز نانا نے زندگی بھر اٹھائے تھے۔ مدینہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ مسلمانوں کو خاموشی کے ساتھ فلسفۂ اسلامی کا درس دے رہا تھا اس کی زبانِ فیض ترجمان سے علم و حکمت کے دریا موجزن ہو کر تشنہ کاموں کو سیراب کر رہے تھے۔ وہ اپنے نانا محمد مصطفےٰؐ اپنے باپ علیؑ مرتضیٰ اور اپنے بھائی حسنؑ مجتبےٰ کے اصول پر غریبوں کی دستگیری، رانڈوں کی خبر گیری اور یتیموں کی سرپرستی سے مدینہ کو جنتِ ارضی بنائے ہوئے تھا۔ ادھر حکومتِ اسلامی کے پایہ تخت دمشق میں ابو سفیان کا پوتا۔ معاویہ کا بیٹا۔ بنی امیّہ کا نوجوان سردار یزید پیغمبرِ اسلام کی نیابت کو کھیل بنائے ہوئے حصیرِ خلافت کو تختِ سلطنت سے بدل کر اسلام کے قانون کو بنی امیہ کی ذہنیت میں تبدیل کرنے کا قومی فرض ادا کر رہا تھا۔ چونکہ رسول اللہ کی وفات کے بعد پہلے ہی جانشینِ رسول اللہ کے زمانہ سے صوبۂ شام کی گورنری یزید کے چچا اور باپ کو سپرد کر دی گئی تھی۔ شام کے رہنے والے جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور جن کو سوائے بنی امیہ کے اد

کسی سے سابقہ ہی نہیں پڑا تھا۔ ان کا ہموار کر لینا۔ بنی امیہ کو کچھ دشوار کام نہ تھا۔ ان کو باسانی یہ ذہن نشین کرا دیا گیا تھا کہ ہم لوگ ہی سب سے زیادہ قریبی رسول اللہ کے رشتہ دار۔ وارث و جانشین اور اسلام کے حقیقی نمائندہ ہیں۔ ہماری زبان اسلام کی زبان اور ہمارا ہی قانون اسلام کا قانون ہے۔ خلیفۂ رسول کے خطاب نے اس دعویٰ کی سند بھی دیدی تھی۔ اس لئے یزید جب تختِ حکومت پر بیٹھا تو شام کی زمین اس کو ظلم و بدعت کی تخم ریزی کے لئے مل گئی۔

وہ اہل شام کی طرف سے مطمئن تھا مگر اس کے تخت پر قدم رکھتے ہی عراق و حجاز میں بے چینی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اور دیندار مسلمانوں نے رنج و افسوس سے سنا کہ شراب پانی کی طرح حلال ہو گئی ہے فسق و فجور اور حرام کاری اربابِ حکومت کا دلچسپ مشغلہ ہو رہا ہے۔ ماں اور بہن کا امتیاز اٹھ گیا بندروں کو عالموں کے کپڑے پہنائے جا کر ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ غریب اور مزدور مسلمان فاقہ کشی میں مبتلا ہیں اور بنی امیہ کے ایک ایک فرد کا دسترخوان ان کے ہوا خواہوں، اربابِ نشاط مسخروں اور سرمایہ داروں کے لئے وسیع ہو رہا ہے۔ ہر ممبر اہلبیت رسول کے متعلق گستاخیاں اور بے ادبیاں بڑھتی جاتی ہیں اسلامی اخلاق کا یہ انقلاب شام تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ گورنرانِ صوبہ جات کی بدولت جو بالعموم خاندان بنی امیہ کے افراد یا ان ہی کے زلّہ خوار اور ابن الوقت تھے اس انقلاب کی وبا، ہر شہر اور ہر قریہ میں زور و شور سے پھیل گئی تھی اور پھیلتی جاتی تھی ظاہر ہے کہ جو اربابِ حکومت کا مذہب اور ارکانِ سلطنت کی معاشرت ہوتی ہے رفتہ رفتہ رعایا بھی وہی طریقہ اختیار کر لیتی ہے جس کے ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں۔ آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستانی معاشرت کس قدر انگریزی معاشرت سے بدل گئی ہے اور یہ انقلاب کس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی پذیر ہو رہا ہے۔ مدینہ کی کچی دیواروں کی مسجد جس کو رسول اللہ اور اصحاب رسول اللہ نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا۔ رسول کا محل اور اس کا فرش۔ رسول کا تخت تھا۔ نہ کوئی حاجب تھا نہ دربان۔ یہی رسول اللہ کا دربار تھا اب اس کو

رسالت سمجھو۔ یا بادشاہت، اس کے خلاف یزید کے محلات اور اس کا دربار۔ شاہان روم و فارس کے محلات اور درباروں کا نمونہ بنا ہوا تھا، سر بفلک اور عالی شان عمارتیں۔ جواہر نگار تخت طلائی، نقرئی کرسیاں۔ قاقم و سنجاب کا فرش حریر و دیبا کے پردے، زرّیں کمر اور خوب صورت غلام۔ حاجب، چوبدار، خواجہ سرا۔ عرض بیگی وغیرہ سب تھے۔ خلاصہ یہ کہ شان و شوکت اور کرّ و فر کا کوئی دقیقہ باقی نہ رہا تھا۔ اور بیت المال اسلامی خزانہ کا روپیہ جو رعایا کا خون تھا۔ یزید اور اس کے عمال کی عیش پرستی کے لئے پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ اور قریب قریب یہی شان اس کے صوبہ داروں کی تھی۔ رسول کی آنکھیں دیکھے ہوئے مسلمان اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اور رسول کے ہدایات و ارشادات کو اپنے کانوں سے سننے والے بزرگوار ان ناگوار واقعات کو کانوں سے سن رہے تھے مگر کچھ لوگ ایسے تھے جن میں احتجاج کی قوت باقی نہ رہی تھی بنی امیہ کی فوجی طاقت ان کو مرعوب کر چکی تھی۔ یزید کے سخت گیر، گورنروں کا خوف ان کو زبان ہلانے کا موقعہ نہیں دیتا تھا کچھ ایسے تھے جنہوں نے خاموشی کو ہی مصلحت سمجھ لیا تھا بعض ایسے تھے کہ اپنی ذات کو اصلاح قوم کا ذمہ دار نہ سمجھتے تھے۔ زیادہ ایسے تھے جن کو دنیا کی دولت نے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ ایک بنی ہاشم کا قبیلہ اور بنی ہاشم میں حسین کی ذات ایسی تھی جس کو اسلام کا درد تھا حسین اپنے نانا کے دین کے ساتھ دنیا کا اخلاق تباہ ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ ملاحظہ کر رہے تھے۔ کہ وہ اسلام جو دنیا کا اخلاق درست کرنے تہذیب پھیلانے، اور نوع انسانی کو امن و امان، نیکی و تقویٰ کی تعلیم دینے آیا تھا اس کے پردہ میں اسی کا نام لے کر اسی کا بھیس بدل کر انسانوں کے اخلاق کو زہر آلود۔ اور عادات و فضائل کو وحشیانہ اور بہیمانہ بنایا جا رہا ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ دنیا قوموں کی بد اعمالیوں اور فتنہ و فساد کا ذمہ دار اسلام کو ٹھہرائے گی حسین جانتے تھے کہ مفلس بدو کو بنی امیہ نے عیش و عشرت کے ایسے خواب دکھائے ہیں اور دنیاوی آرام و آسائش کی ایسی راہ پر لگایا ہے کہ اب اسلامی فتوحات کا سیلاب رُکنے والا نہیں اور مسلمان جس ملک میں جائیں

یہی بھیانک اور وحشت خیز صورت کا اسلام اپنے ساتھ لے جائیں گے، اور بنی امیہ کے پھیلائے ہوئے جرائیم دوسری قوموں کی عمدہ خصائل کو بھی ہلاک کر دیں گے۔ اسلام کو بنی آدم کی تباہی و بربادی کا ذمہ دار ٹھہرا دیں گے حسینؑ خاموش نہیں رہ سکتے تھے حسین خاموش نہیں رہے۔ برابر مسلمانوں کو اس مسخ شدہ اسلام اور حقیقی اسلام کا فرق بتا رہے تھے وہ لیکن مسلمان اب چالیس برس پہلے کے مسلمان نہیں رہتے تھے (لیکن مسلمان اب چالیس برس پہلے کے مسلمان نہیں رہے تھے، عہد رسالت اور زمانہ راشدہ خلافت کے مسلمان زیادہ تعداد میں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اس زمانہ کے جوان۔ بڈھے، اور بچے جوان ہو رہے تھے۔ نئی نسلوں نے ہوش سنبھال کر بنی امیہ اور ان کے بہی خواہوں کو برسر اقتدار دیکھا۔ وہ بنی ہاشم اور حسین کی شخصیت کو اتنا نہیں جانتے تھے۔ جیسا کہ ان کے بزرگ سمجھے ہوئے تھے حسین کے دل سے لگی ہوئی تھی، وہ اس فکر میں تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہو دنیا کے سامنے بیک وقت حقیقی اسلام کو اس طرح پیش کر دیا جائے کہ آج سے لے کر قیامت تک آنے والی نسلیں باسانی دونوں کا فرق سمجھ لیں وہ یہ بھی جانتے تھے کہ موجودہ فضا میں ایک عالمگیر انقلاب پیدا کرنے کے لئے۔ بہت بڑی قربانی کی ضرورت ہے ایسی قربانی جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہ مل سکے۔ مدینہ کی زمین خاموش تبلیغ کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی حسین وقت کے منتظر اور اس قربانی کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ اودھر یزید اس فکر میں تھا کہ حسینؑ سے اپنی حکومت و خلافت تسلیم کرا کے اپنے پوزیشن اور اپنے حق خلافت کے استحکام پر نواسۂ رسول سے مہر تصدیق کرالے۔

درحقیقت واقعہ کربلا کا سب سے بڑا نتیجہ ملتِ محمدیہ کا احیا اور اس میں روحانیت کی ابقا ہے یہ ظاہر ہے کہ شارع اسلام کی اصلی منشا تبلیغ رسالت سے توحیدِ حقیقی، عرفان الٰہی تزکیہ نفس۔ ترقی روحانی۔ تہذیب و تمدن تکمیلِ اخلاق۔ ہمدردیِ بنی نوع اور حمایتِ صداقت کا وعظ تھا۔ اور اس تاریکی اور جہالت کے زمانہ میں ان باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے بہ نسبت وعظ کے عمل کی زیادہ ضرورت تھی مگر عملی نمونہ بننے کے لئے سچی بہادری، اخلاقی جرأت اور مذہبی

آزادی درکار ہے۔ بانیٔ اسلام کی وفات اور خلافتِ راشدہ کے ختم ہونے پر جب دنیا پرست لوگوں کا اسلامی سلطنت پر دسترس ہوا۔ اور انہوں نے اسلام کو اپنی خود غرضی اور نفس پرستی کی ڈھال بنانا چاہا۔ ضرور تھا کہ کوئی ایسا شخص کھڑا ہو جو سچی بہادری اخلاقی جرأت اور مذہبی آزادی کا عملی نمونہ پیش کرے اور اس طرح اسلام کو ہلاکتِ ابدی سے بچا کر اس کو اس کے اصلی مرکز پر قائم کر دے چنانچہ جب یزید نے باوجود تمام کمینہ خصائل کے جو اس کی ذات میں موجود اور اصولِ اسلام کے سراسر خلاف تھے۔ اسلام کا مذہبی پیشوا بننا چاہا تو بانی اسلام کے فرزند نے۔ باوجود اس علم کے کہ بادشاہِ وقت کی مخالفت میں دنیاوی نقصان معمولی نہیں۔ بلکہ اپنی اور تمام خاندان کی تباہی ہے۔ اس کی سخت مخالفت کی اور سچی بہادری اور اخلاقی جرأت کا وہ اعلیٰ نمونہ دکھایا جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

اگر آپ یزید کی بیعت کر لیتے تو گویا اس کو خلیفہ رسول اور مذہبی پیشوا تسلیم کر کے اُس کے احکام کے آگے سر اطاعت خم کر دیتے نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ اسلام شاہانِ اسلام کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہو جاتا اور وہ جس وقت اور جس طرح چاہتے اپنی مرضی کے موافق اس کے اصول کو ڈھال لیتے اور کسی کو مجال چون وچرا باقی نہ رہتی اور یہ ایک ایسی مضرت رساں اور مکروہ نظیر قائم ہو جاتی کہ جب تک دنیا میں مذہب اسلام ہے اس کا زہریلا اثر باقی رہتا۔ اور اس کی تردید والبطال امکانی حد سے باہر ہو جاتی مگر شہدائے کربلا نے نخل اسلام کو اپنے خون سے اس طرح سینچا کہ شخصی حکومت اور مرتدانہ قوت کے بادسموم کے سخت جھونکے اس کی تازگی میں خلل نہ ڈال سکے۔ اگر سید الشہداء اپنی جان و مال و اولاد کو نذر اسلام کرتے تو اسلام کبھی کا خود غرض اور دنیا پرست بادشاہوں کے ہاتھ سے غارت ہو چکا ہوتا اور اگر باقی بھی رہتا تو صرف اس مٹی کی مورت کی طرح ہوتا جس میں روح نہیں ہوتی اور اس طرح آپ کے جدِ امجد کی ساری عمر کا ریاض بدخواہان اسلام نے اسلام کے پردہ میں برباد کر دیا ہوتا۔ مگر امام حسین اور دوسرے شہدائے کربلا نے حقانیت اسلام پر اپنے پاک خون سے ایسی مہریں ثبت کر دیں جو کبھی نہ مٹ سکیں گی اور جن کو دنیا

ہمیشہ عزت و تعظیم اور اعتقاد کی نظروں سے دیکھے گی۔

اس واقعہ نے اس بات کو بھی کہ "انجام کار راستی ہی کی فتح ہے" نہایت خوبی سے ثابت کر دیا غور کرو دنیاوی لحاظ سے ایک معمولی درجہ کا آدمی جو مع اپنے چند عزیزوں اور دوستوں کے ایک جنگ میں قتل کیا جائے۔ آج اس کے غلاموں کے قدموں پر بڑے بڑے بادشاہ اپنا سرِ نیاز رکھنا باعثِ فخر سمجھیں جس کا صرف ایک بیٹا زندہ بچے۔ آج اس کی چونتیسویں پینتیسویں پشت میں ایک کروڑ سے زیادہ لوگ موجود ہوں تیس چالیس کروڑ آدمی اس کی گردِ قدم کو اپنی آنکھوں کا سُرمہ بنانے پر تیار ہوں۔ تمام دنیا اس کے پاک نام کو عزت و تعظیم کے ساتھ لے اور اس کو دنیا کے سربرآوردہ مشاہیر میں شمار کرے اس کے مناقب و مصائب میں بے شمار کتابیں لکھی جائیں دنیا کے اکثر طبقات میں اس کی مجالس عزا سالانہ قائم ہوں اور ہر سال کروڑہا روپیہ اس کی یادگار قائم رکھنے میں صرف کیا جائے، غیر مذاہب والے بھی جو اس کے نانا کو نہیں مانتے اس کا نام ادب سے لیں اور اس کے نام پر روپیہ لٹائیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسا آدمی ناکامی کے ساتھ مر گیا۔ ہرگز نہیں۔ اس کی موت پر زندگی کو رشک ہے، اور اس کی ناکامی کی طرف فتح بحسرت نگراں۔ یہ ساری باتیں اس لئے ہیں اور ہوتی رہیں گی کہ وہ محسن اسلام اور اُسے ہلاکت سے بچانے والا ہے اس نے اپنی جان حیاتِ اسلام اور تائیدِ حق پر دی اور راستی کے راستہ باوجود نقصانِ عظیم اٹھانے کے ایک انچ نہ سَرکا۔ بس یہ حیاتِ ابدی اور فتح مندی کا خلعت اس کو حق اور صداقت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ جو باوجود مرورِ زمانہ ہمیشہ نیا ہی رہے گا۔ بلکہ زیادہ چمکتا جائے گا اور کہنگی و فرسودگی سے محفوظ رہے گا۔

اب اس کے دشمنوں کو دیکھو، یزید اس وقت دنیا کا سب سے بڑا تاجدار اور دنیا کی سب سے وسیع اور عظیم الشان سلطنت کا شہنشاہ تھا جس کے پاس لاانتہا خزانے اور سپاہ تھی جس کو کربلا میں بظاہر کامیابی بھی ہوئی اور جس نے بقول طبری بارہ بیٹے چھوڑے۔ مگر آج روئے زمین پر ایک شخص ایسا نہیں ہے۔ جو اس کی اولاد میں ہونے کا دعویٰ تو کجا۔ اقرار بھی کرتا ہو۔ یا اپنے کو کسی قسم کی نسبت اس سے

ساتھ دنیا پسند کرے۔

تمام دنیا اس کے نام کو ذلت وحقارت سے لیتی ہے اور وہ انسان اور انسانیت کے لئے باعثِ شرم اور موجب ننگ سمجھا جاتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ ظالم فاسق اور حق سے روگرداں تھا۔ اس نے اپنے غرورِ سلطنت میں وہ کام کیا جو خود شیطان سے نہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا وہ ابدی لعنت میں گرفتار ہوا۔ اور ہمیشہ کے لئے جہنم کا ایندھن بن گیا۔

خواجہ حسن نظامی دہلوی محرم نامہ میں واقعاتِ کربلا کے بعد لکھتے ہیں "بنی امیہ کی طولانی کہانی سے تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ یہ لوگ منافق تھے۔ خوف سے مسلمان ہوئے تھے اور لالچ سے اس پر قائم رہے۔ ورنہ ان کے دل میں اسلام کی کچھ عظمت نہ تھی۔ جب وہ دین اور اہل دین کی قدر ہی نہ جانتے تھے تو جو بھی حرکت کرتے وہ کم تھی۔ ابولہب آنحضرت کے چچا۔ اور ابوجہل قریش کے سرداران نمائشی مسلمانوں سے بہتر تھے جنہوں نے کھلم کھلا مخالفت کی اور مشرک کہلائے۔ خوفناک یہ بنی امیہ تھے جن کی زبانوں پر کلمہ تھا۔ جن کی پیشانی سجدہ میں تھی جن کے منہ میں روزے تھے۔ مگر دل تاریک تھے۔ اور ان میں حرص دنیا اور خواہش عزت وجاہ کے سوا۔ ایمان کی اصلیت ذرہ برابر نہ تھی۔ پھر ایسے لوگوں سے جو گناہ نہ ہوتے زیبا تھے۔ آج وہ مٹ گئے۔ ان کے تخت اوندھے ہو گئے۔ ان کی خاک میں مل گئی۔ دمشق میں یزید کی قبر میں نے دیکھی ہے لوگ اس پر پتھر مارتے ہیں۔ اور پیشاب کرتے ہیں۔ معاویہ کی قبر پر بھی گیا ہوں ایک چھوٹی سی برجی میں ویران پڑی ہے جس پر وحشت پہرہ دیتی ہے مگر بنی فاطمہ کی قبریں سلطنت کر رہی ہیں اور ان کے کارنامے دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ محرم میں کروڑوں آدمی ان کا ذکر خیر کرتے ہیں اور کروڑوں روپیہ ان کے نام پر خیرات کیا جاتا ہے۔ بنی امیہ کا نہ کوئی نام لیوا ہے اور نہ پانی دیوا۔ یہی قدرتی انصاف سب سے بڑی دلیل حق وباطل کے سمجھنے کی ہے (محرم نامہ صفحہ ۱۹۵)

روزِ عاشور بعد خاتمہ جنگ دشمن شادیانے بجاتے تھے اور فتح کی خوشی میں نعرہ ہائے مسرت بلند کر رہے تھے۔ مگر ان دشمنانِ انسانیت کو کیا خبر تھی۔ کہ ان کے طبلِ فتح کی صدا چند لمحوں میں ڈوب

جائے گی۔ اور حسینؑ کے ماتمی باجوں کا شور ابد الآباد تک قائم رہے گا۔ یہ فاتحانہ صدائیں صرف تھوڑی دیر کی ہیں اور حسین کے غم کی صدا انسانی جماعتوں میں روز بروز بلند ہوتی جائیگی۔ اس کی لہریں بجلی کی لہروں کی طرح فضائے کائنات میں پھیل جائیں گی آج دنیا کا مشکل سے کوئی گوشہ ہے جہاں حسینؑ کے نام سے کوئی واقف نہ ہو، اور اس کی عزت وہمدردی کے اثر نے قلوب پر ایک طلسمی تسخیر کا عمل نہ کیا ہو مظلوم کی قبر اگرچہ ایک زمانہ تک سیاسی تشدد کے تابع رہی باوجودیکہ لاش اور سر میں تفرقہ کیا مگر اس مظلوم کا نام اس ریگستانی ویرانہ سے جسے کربلا کہتے ہیں بلند ہوا۔ اور وہیں ایک نشان قبر اور روضہ بن گیا جہاں جہاں کسی نے نام لیا۔ ہمدردوں کی جماعت اس طرح اپنے وقت اپنی توجہ اور اپنے مال کو اس کے تذکرہ کے لئے صرف کرنے لگی گویا اس کے واسطے اس سے زیادہ خوشگوار کوئی دوسرا فرض نہ تھا۔ کیا ہوا اگر حسینؑ کی قبر مطہر کے لئے مختلف روایتیں ہیں۔ کیا ہوا۔ اگر سر اور لاش کے ایک جگہ دفن ہونے کے متعلق بیانات مختلف ہیں۔ کیا ہوا۔ اگر کوئی (متوکل) پھر پیدا ہو جائے اور ہم کو حسین کی قبر مطہر کا نشان نہ ملے حسین کی قبر تو اس بلند اور مخصوص زمین میں ہے جس سے بڑھ کر مدفن تلاش کرنا بے سود ہے۔ اور وہ شرافت پسند انسانوں کا دل ہے۔

جس وقت تک دنیا میں ایک انسان بھی باقی رہے گا۔ اس وقت تک حسین کا نام فخر سے لیا جائے گا اور اس کے استقلال وحمایتِ حق کی تعریف ہوگی۔ اولوالعزم شہنشاہوں تاج بخش وتاج نشان تاجداروں کا نہ کوئی نام لیتا ہے، نہ کوئی ان کا زائر ہے مگر جس مظلوم کی زیارت کرنے والوں کا سیلاب اور ان کی تعداد بارہ صدیوں سے برابر ترقی پذیر ہے اور یہ سیلاب ذرائع آمد ورفت کی سہولت کے ساتھ بڑھتا جائے گا انسانوں کی جماعتیں اس نشان کو دیکھنے جائیں گی۔

جہاں شرافت وشجاعت انسانی ہمدردی صبر واستقلال اصول حق کی حفاظت خدا کی لاثانی عبادت اور عزت نفس کی روح دفن ہے حسین کی شہادت انفرادی اور قومی حیات کا مقدمہ ہے۔ حسینؑ اس لئے شہید ہوئے کہ شرافت وانسانیت کا رتبہ بلند کریں۔ خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ نے خوب فرمایا ہے۔

حسینی شہادت کا فلسفہ

حسین علیہ السلام نے بیعت یزید کیوں نہ کی ناقابل برداشت مصیبتیں اُٹھائیں۔ لیکن بادشاہ وقت کی اطاعت کو منظور نہ فرمایا اپنا اپنی اولاد کا اپنے عزیزوں کا رفیقوں کا قتل اپنے گھر کی بربادی پسماندوں کی اسیری اور توہین سب قبول مگر انکارِ بیعت پر آخر تک وہی ثابت قدمی اور استقلال آخر اس میں کیا مصلحت اور حکمت تھی اور بیعت کرنے میں کس خرابی اور قباحت کا اندیشہ تھا۔ یہی سب سے زیادہ اہم رمز ہے جس پر غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ یزید جو اس زمانہ کے مسلمانوں کے خیال میں جائز خلیفہ رسول اور جانشین ہادی اسلام تھا اور اس کو اجماع استخلاف اور تسلط فی الارض تینوں شرائط خلافت حاصل تھیں اور اس وقت جس قدر صحابۂ رسول زندہ تھے اس کی بیعت کو طوعاً یا کرہاً تسلیم کر چکے تھے۔ اِس کی بیعت اِس وجہ سے حرام تھی کہ وہ علانیہ فسق و فجور کا عادی تھا۔ جب خلیفۂ وقت جانشینیِ رسول کا ادعا بھی کرے اور اس کے ساتھ ہی شراب خوار ہو زنا کار ہو تارک الصلوٰۃ ہو تارک الصوم ہو۔ خدا و رسول سے استہزا کرنے والا ہو۔ احکام شریعت کا مٹانے والا ہو تو اُمت محمدیہ کا کیا حشر ہوتا۔ پھر حسینؑ کی بیعت جن کا گوشت پوست رسول اللہ کا گوشت پوست تھا جن کی پاک ہستی اسوۂ محمدیہ کا مکمل ترین نمونہ تھی۔ یزید کے خلیفہ واجب الاتباع ہونے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیتی۔ گویا آپ اس کو خلیفہ برحق تسلیم کر کے اس کے رندانہ اور ملحدانہ افعال کے جواز کو منظور فرما لیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ فرزند رسول کے مصدقہ خلیفہ کے اعمال و احکام جو سراسر خلاف شریعت بلکہ ہادم بنیاد دین و مذہب تھے مستحسن اور عام مسلمانوں کے لئے نظیر ہی نہیں بلکہ واجب العمل ہو جاتے اور مذہب اسلام رجعت قہقری کر کے اپنے اصلی مقام کفر و بے دینی پر آ جاتا۔ حسین سے بڑھ کر اس بیعت کے تباہ کن اسلام نتائج کا سمجھنے والا کون ہو سکتا تھا۔ آپ نے اپنے جد بزرگوار اور

پدر عالی مقدار کی اُن تھک کوششوں اور محنتوں کا ضایع و برباد ہونا گوارا نہ فرمایا تمام ناقابلِ برداشت مصائب منظور کئے مگر اسلام کی تباہی قبول نہ کی حسینؑ نے دل ہلا دینے والی مصیبتوں کا مقابلہ نہیں کیا اپنے اقربا اور انصار کی شہادت اپنے اہل بیت کی جانکاہ اذیتیں منظور نہیں کیں لیکن اسی لئے اور صرف اسی لئے کہ دین اسلام پر آنچ نہ آئے اسلام کی حقانیت فنا نہ ہونے پائے اور دنیا دیکھ لے اور سمجھ لے کہ فاسق و فاجر جانشینِ رسول نہیں ہو سکتا۔ اور ایسے شخص کی اطاعت مسلمانوں پر حرام ہے مسلمانان عالم نہ صرف اس وقت بلکہ قیامت تک درسِ عبرت حاصل کر لیں کہ شریعت کی حمایت اور حق و صداقت کا اعلان اس قدر ضروری اور اہم ہے کہ اس کے لئے ہر قسم کی مصیبتوں کا جھیلنا اسلام کے ہر نام لیوا کا فرض اولین ہے حسینؑ کے انکار بیعت اور اس کے نتیجہ پر شدید سے شدید مصائب کے خیر مقدم کو آخر دم تک ثابت قدم رہنا ایسی حکمت عملی تھی جس نے بنی امیہ کے طلسم کو توڑ دیا۔ یزید کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ اسلام کے نیم مردہ قالب میں نئی رُوح حلول کر گئی۔ اور اس کا وہ عظیم الشان قلعہ جو فسق و فجور اور بے دینی و زندقہ کے بھونچال سے سربسجود ہونے والا تھا۔ از سرِ نو ایسا مستحکم ہو گیا۔ کہ اب قیامت تک کوئی طاقت اس کو جنبش نہیں دے سکتی۔ ملت محمدیہ کا سرسبز و شاداب باغ بدعت و کفر کے باد سموم کے جھونکوں سے خشک ہو جاتا۔ اگر حسینؑ اپنے خون سے اس کی آبیاری نہ کرتے۔ یہ سب ہادی اسلام کے فرزند کی سرفروشی اور جانبازی کا طفیل ہے جو آج دنیا میں چالیس کرور انسان لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ کہنے والے موجود ہیں۔

اسلام کا یہ رنگیلا خلیفہ (یزید) ان تمام خصائل و رزائل کا مجموعہ تھا جو انسانیت کو حیوانیت کے درجہ تک پہنچا دیتی ہیں اس کی رندانہ عیاشی اس حد سے بھی تجاوز کر چکی تھی جسے فاجر سے فاجر بدکار سے بدکار بھی حمیت و غیرت بلکہ انسانیت کے منافی سمجھتا ہے اور اسے اس کا ضمیر ہرگز قبول نہیں کر سکتا جب کفر اس طرح عریاں ہو کر میدان میں آ گیا۔ اور مسندِ خلافت سے اسلام کو

چیلنج دینے لگا تو ہادیٔ اسلام کے فرزند اور جانشین کے لئے دو ہی راستے تھے، ذلت کی زندگی یا عزت کی موت پہلا راستہ آپ کیلئے ناممکن تھا۔ اس لئے دوسرا راستہ اختیار فرمایا۔

عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ ابن زبیر جو اس وقت اسلام کے نہایت سربرآوردہ ممتاز افراد تھے انہیں بھی یزید کی حرکاتِ بد کی بناء پر تنفر تھا۔ اور انہوں نے امام حسینؑ کی طرح اس کی بیعت ولی عہدی سے بڑی شدت کے ساتھ انکار کیا تھا۔ مگر جب وقت آیا تو وہ اسلام کی حمایت میں ایثار و قربانی کا عملی نمونہ کچھ بھی نہ دکھا سکے۔ یہ حوصلہ صرف اسی مقدس ہستی کا تھا جس کے گھر سے اسلام کا آغاز ہوا صبر و آزمائش کے اس کٹھن کام کو اگر پایۂ تکمیل کو پہنچا سکتا تھا۔ تو گھر والا ہی جو بانیٔ اسلام کا فرزند اور گوشت پوست تھا جس کے لئے "حُسَیْنٌ مِنِّیْ وَاَنَا مِنَ الْحُسَیْن" ارشاد ہوا تھا۔ نہ کہ دوسرے گھر والے ابن زبیر نے بیعت تو نہ کی لیکن ایک جداگانہ حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ انجام یہ ہوا کہ ان کی وجہ سے خانہ کعبہ کی بے حرمتی ہوئی اور ابن عمر نے تو آخر میں یزید کی بیعت کر ہی لی۔ صرف حسینؑ ہی ایسے تھے جنہوں نے اپنے جان و مال اپنا سب کچھ اسلام پر قربان کر دیا کسی نے سچ کہا ہے ؎

سر داد و نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

شہادتِ حسینی اسلام کیلئے درسِ عمل ہے

خالقِ عالم حکیم مطلق۔ کارساز حقیقی نے اپنی محبوب ترین مخلوق کی فضیلت و شرافت عظمت و جلالت رفعت و منزلت آگ سے بنی ہوئی ہستی، اور عالم بالا کے خود پسند ملائک سے منوانے کے لئے اس عالم فانی، اور دار ناپائیدار کی تخلیق فرمائی، زمانہ تیز رفتاری سے منزلیں طے کرتا ہوا مقصود مستتر کے تجسس و تفحص میں ساری و جاری ہے۔ وقت کے دورِ پیہم کا سلسلہ۔ نامعلوم قائم ہے

دن و رات گزرتے ہیں۔ زمانۂ قدیم کا جزو لاینفک بن کر معدوم ہو جاتے ہیں شمس و قمر کی گردشیں اپنے فرائض کی انجام دہی میں معروف و منہمک ہیں یہ معلوم نہیں کہ موجوداتِ عالم کو کہاں سے کہاں لئے جا رہی ہیں، اور قصۂ ماضی بن کر طاقِ نسیان کا گلدستہ بن جاتی ہیں مختصر یہ ہے کہ روزگار بے نیاز، آمد و رفت کے تسلسل پیہم میں مصروف کار ہے مگر زمانہ کے اسی دور، اور روزگار کے اسی تسلسل میں بعض معرکۃ الآراء۔ اور مہتم بالشان ایسے حادثات پیش آتے ہیں۔ جو فرش سے لے کر عرش تک کارگاہ عالم اور موجوداتِ کون و مکان میں اضطراب و ہیجان کا بحر تموج خیز، تشویش و انتشار کا سیلاب عظیم، پریشانی و آشفتگی کا طوفان بے پناہ۔ برپا کر دیتے ہیں۔ دنیا کے کاروبار میں ہل چل پیدا ہوتی ہے، نظام عالم میں انقلاب واقع ہوتا ہے۔ واقعاتِ روزگار درہم و برہم ہو جاتے ہیں۔ جدید دستورالعمل جامۂ حیات پہن کر کرۂ ارضی پر غلبہ و تسلط حاصل کر لیتا اور دورِ تازہ کی ابتدا کرتا ہے۔

حکیم مطلق کی حکمت و مصلحت ہمارے عاجز و محدود ادراکات و تفہیمات سے باہر ہے۔ اور ہم کارخانۂ تکوین میں صانعِ حقیقی کی اصلی غرض و منشا کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ جب کرۂ ارضی پر تیرگی و تاریکی مسلط ہو جاتی ہے۔ تمرد و سرکشی مناسب حدود سے متجاوز ہو کر انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔ جہالت و لاعلمی کو غیر معمولی فروغ ہوتا ہے، اخلاقِ حسنہ کے بجائے، بدکاری و بداعمالی نشو و نما پاتے ہیں، کفر و شرک کی تاریک گھٹائیں۔ فضائے عالم پر محیط ہو جاتی ہیں اور خدا کے نافرمان و سرکش بندے مخلوقِ خدا کو ظلم و جور اور جبر و تشدد کا تختۂ مشق بنا لیتے ہیں۔ صداقت پرست اور حقانیت نواز بندوں کے لئے مالکِ حقیقی کی زمین پر کوئی ملجا اور ماوا نہیں رہتا تو قادرِ مطلق اپنی قدرتِ کاملہ سے آن واحد میں روزگارِ سفلہ اور دنیائے دَنی کا تختہ الٹ دیتا ہے، حق و صداقت کی غیر فانی عظمت و جلالت غالب اور مسلط ہو جاتی ہے نفس پرستوں اور خود غرضوں کے شیدائیوں کو ابدی ذلت و رسوائی کا ہدف بنایا جاتا ہے اور حقائق و معارف کے جاننے والے حقانیت و حقیقت کے علم بردار

دنیاوی عیش و آرام کو صداقت کی حمایت پر نثار کر کے بندگانِ خدا کے سامنے صحیح شاہراہِ عمل پیش کر دیتے ہیں۔

کربلا کا خوں چکاں، دل فگار اور جاں سوز واقعہ مسلمانانِ عالم کے سامنے درس عبرت کے ہزارہا خونیں اوراق پیش کرتا ہے۔ اور مسلمِ امروزہ سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ تیری خواری و پستی، محتاجی و مفلسی کا سبب یہ ہے کہ تو محوِ تغافل ہے۔ تیرے قوائے عملیہ مضمحل و بے کار ہو رہے ہیں تیری زندگی کا منشاء دنیا پرستی اور ملت فروشی ہے تو دو روزہ عیش و راحت کی خاطر احکامِ الٰہی سے روگرداں ہے، تو دنیا میں عزت و وجاہت حاصل کرنے کے لئے مذہب کی توہین و تذلیل پر کمربستہ ہے، تیرے اعمال و افعال شرک و بدعت کے رہینِ منت ہیں تجھ کو اللہ کا ڈر نہیں بندوں کا خوف ہے، حالانکہ توحید کے امین جس کا تو خائن ہے۔ اسی شریعت کے پابند تھے جس سے تو روگرداں ہے۔ اسی دینِ متین کے حامل تھے جس تعمیر کو تو گرا رہا ہے۔ انہوں نے اس کی بنیادوں کو اپنے خون سے مستحکم کیا تھا۔ دین و مذہب پر آنچ آتی تھی تو تیغ بکف اللہ پر بھروسہ کر کے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اعدائے دین کو مغلوب کرتے تھے یا اپنا خون راہِ مولا میں بہا کر درجۂ شہادت پر فائز ہوتے تھے۔

خدائے قدوس کے جلیل القدر پیغمبر کے نواسے، عزیز ترین خاندان والوں، امیر المومنین کے جگر پاروں اور سیدۂ عالم کے لاڈلوں نے صحرائے کربلا کی تفتیدہ ریت پر اپنا خون اس لئے نہ بہایا تھا کہ محرم کا مہینہ آئے اور گذر جائے، یوم عاشورہ کی ساعتیں ظہور پذیر ہوں اور چلی جائیں۔ خاتم الانبیاء کے دوش اور آغوش میں بیٹھنے والے کا دلخراش سانحہ اس لئے وقوع پذیر نہیں ہوا کہ عشرۂ محرم کی آمد آمد ہو، اور مسلمان لہو و لعب کے سامان مہیا کرنے میں سرگرمِ کار ہوں۔ یا اگر سید الشہداء اور اہل بیت اطہار کے دردناک مصائب کا اثر لئے ہوئے ہیں تو صرف مجالس سوزوگداز منعقد، اور سامان عزاداری فراہم کریں اور رو پیٹ کر بیٹھ رہیں اے غفلت شعار اور رسم پرست کلمہ گو، سردارِ شہدائے

اولین و آخرین نے جس کے نام کے سامنے قیامت تک کروڑوں گردنیں جھکی رہیں گی۔ اپنے حلق تشنہ کو اعدائے شوم کی تیغِ ناپاک سے کٹوایا۔ اہل بیت رسالت کا خستہ و پریشان ہونا گوارا کیا اس لئے اور صرف اس لئے کہ تو حق و صداقت کی قدر پہچان لے۔ دینِ محمدی کی خدمت کرنا۔ اور اللہ کی راہ میں سر کٹوانا سیکھ جائے۔

حادثۂ کربلا کوئی معمولی حادثہ نہ تھا۔ مرورِ ایام کا کوئی ادنیٰ معاملہ نہ تھا۔ روزگارِ عالم کی آئے دن کی بات نہ تھی۔ بلکہ گردشِ افلاک کا اہم ترین دور تھا۔ تاریخ اسلام کا شاندار واقعہ تھا، حق و باطل کی جنگ کا معرکہ آرا دور تھا۔ بے دینی و ایمان۔ صداقت و بطلان کا فیصلہ کن ہنگامہ تھا۔ کارسازِ حقیقی نے مصائب و آلام کا یہ کوہ گراں اپنے برگزیدہ ترین بندہ کے سر پر کیوں رکھا۔ بارگاہ خداوندی کے مقرب ملائکہ نے تخلیق آدم کے وقت عرض کیا تھا کیا تو زمین پر ایسا خلیفہ (انسان) پیدا کرے گا جو فساد برپا کرے اور خون بہاتا رہے اور ہم تیری حمد و ثنا کی تسبیح کرتے ہیں اور تہلیل و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں حکیم مطلق اُن فرشتوں کو یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ اطمینان و سکون سے تمہارا حمد و ثنا کرنا ان انسانوں کی تسبیح کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا، جو ہماری خاطر اور ہماری راہ میں اپنی گردنیں قلم کراتے ہیں اور امانتِ توحید کی پاسبانی کے لئے۔ خطرات عظیمہ کا تسلیم و رضا سے مقابلہ کرتے ہیں بلاشبہ معبودِ مطلق کے دربار میں وہی عبادت اعلیٰ قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہے جو مصائب و آلام اور ابتلاء و آزمائش سے ہم آغوش ہو۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت عہدِ حاضرہ کے ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کو بھی درسِ عمل دینا چاہتی تھی کہ توحید پرستی و حق نوازی وہ گرانقدر اور عظیم الشان عمل ہے، جس کی حفاظت و پاسبانی میں تمہاری دنیا و آخرت کے سردار کا عزیز ترین لخت جگر معہ بیٹوں۔ بھائیوں اور بھتیجوں، بھانجوں کے اپنا خون پانی کی طرح بہا چکا ہے کیا آج ہم اس سے سبق لے رہے ہیں، کیا امام الشہداء کا اسوۂ حسنہ ہمارے پیش نظر ہے۔ کیا اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی

کے لئے ہم اپنا سر ہتھیلیوں پر لئے پھرتے ہیں۔ کیا عشرۂ محرم کے عبرت آموز ایام میں ہم اپنے سید و آقا کی صحیح یادگار زندہ کرتے ہیں نہیں بلکہ یوم عاشورہ عام مسلمانوں کی لطف و تفریح کا مخصوص تہوار ہو گیا ہے، خوشی و مسرت کے سب سامان فراہم کئے جاتے ہیں۔ معاذ اللہ ہندوستان کے بعض خطوں میں وہ طوفان بے تمیزی برپا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت و جہالت پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔ ہم تو یہ کہیں گے کہ ایسے مسلمان بجائے کربلا کے سانحۂ جانکاہ پر آنسو بہانے کے اپنی لاعلمی و غفلت پر رو لیا کریں تو بہت مناسب ہے خدا ان پر رحم کرے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت عطا فرمائے۔

ہر نیا سال سنتِ الٰہی کے ماتحت اُسی گزری ہوئی بستی کا ایک رکن بن جاتا ہے جہاں دنیائے حاضرہ کی ہستیں ہزار در ہزار محو خواب شیریں ہیں۔ جو نفس جاتا ہے۔ لوٹ کر کبھی نہیں آتا۔ اللہ اللہ! انقلاب اور کس قدر یکساں۔ ہیجان اور کس قدر پُرسکون۔ اضطراب اور کتنا پُر قرار باوجود بے شمار ازمنہ گزر جانے کے بعد اس ردّ و بدل میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی آسمانِ موجودہ کے وہی انداز اور کائناتِ حاضرہ کے وہی مشاہدات عالم رواں کے ہر عرض و جوہر کے اندر اضطراب و انقلاب نمایاں ہے، مگر ایک ہی شان کے ساتھ۔ دنیائے امروز و فردا کی بے قراریوں میں جذب ہوتی جاتی ہے، مگر ایک ہی اثر کے تحت میں کائنات کا ہر ذرہ تغیر و تبدل کا محکوم ہے، مگر ایک ہی ضابطہ اور قاعدہ کے اندر زیست میسر ہوتی ہے، مگر غیر متبدل قواعد کے تحت ہیں، موت اپنی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے مگر غیر فانی ضوابط کے ساتھ حیات و ممات کی تغیر آفرینیاں شیرازۂ عالم کے نظام دیرینہ پر حاوی ہیں لیکن ایک قوتِ غالب کے منشاء کے موافق، افعال و اعمال کی انقلاب آرائیاں کیفیاتِ تکوین کے ہر انداز پر مسلط ہیں مگر ایک حکیم ازلی و ابدی کے ماتحت، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری محدود نگاہوں اور مفید نظروں کے سامنے جو واقعات و حادثات صف در صف گزرتے چلے جاتے ہیں باوجود مختلف الاشکال ہونے کے اپنے تاثرات نہیں

چھوڑتے۔ نظام ایک، قواعد یکساں، ضوابط مقررہ، اثرات غیر منقلب اس پر بھی اگر ان انقلابات روزمرہ اور ان تغیراتِ متواترہ سے ہم درس عبرت حاصل نہ کریں۔ اور قوائے عملیہ کو مجبور و معذور بنا لیں تو یہ ہمارا قصور اور ہماری ہی خطا ہے۔

ہر موجودہ سال سنینِ ماضیہ کی پُر ہیبت سلسلہ کی ایک کڑی ہوتا ہے۔ جنہوں نے صفحۂ ارضی کو انسانی تاراجی و تباہی کی خونی تحریروں سے معمور کیا ہے۔ وہ کسی جدید حادثہ کا امین نہیں ہوتا۔ دنیائے مضطرب کی کتابِ اعمال میں کوئی تجدید و تحریف نہیں ہوتی۔ ازل و ابد کے اس بین الدفتین دفتر کے اندر کوئی ترمیم و تنسیخ عمل میں نہیں آتی۔ سال گذشتہ میں جو واقعات رونما ہوئے۔ ان ہی کے نتائج و اثرات سے وہ بھی مملو ہوتا ہے مگر فطرت غالب کی منشاء کے موافق، ہمہ گیر حوادث و اسباب سے قطع نظر کرکے محدود طبقات ارضی میں بھی ایسے ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں جو گذرنے والے سال کو صدیوں تک ممتیز رکھتے ہیں اس لئے دیدۂ بینا کے لئے ان ہی واقعات کے نتائج پر غور کرنا ضروری ہے۔

اب تم اس ملت مرحومہ کی موجودہ زندگی پر نظر ڈالو جس کی تہذیب و ترقی کے افسانے تیرہ سو برس سے زبان زدِ خلائق ہیں جس کے علوم و فنون کی شمع روشن نے ظلمت کدۂ ارض میں چراغاں کیا جس کی اخلاقیات و روحانیات نے دشت کدۂ عالم کو شادابی کا غیر فانی چشمہ بنایا۔ مراقش کی سرسبز وادیوں سے بحر چین کے شاداب ساحل تک، کریمیا کی تاتاری یادگاروں سے دریائے کانگو کی تاریک موجوں تک کوہ ہندو کش کی برف پوش چوٹیوں سے جاوا کی مرطوب کیاریوں تک ایک شہنشاہِ کونین کے غلام ایک کتابِ یزدانی کے محکوم ایک خدائے قدوس و قادر کے پرستار وحدتِ اسلامیہ کا سبق بھول چکے ہیں، دنیائے فانی کی ایمان فریب اداؤں پر اتحادِ اسلام کا سرمایہ قربان کر چکے ہیں اور اپنے ہاتھوں حریتِ شخصی آزادیِ ملکی اور استقلالِ ملیہ کی عمارت منہدم کرتے

جاتے ہیں۔ جس کی تعمیر میں کافی خونِ نیاز صرف ہو چکا تھا۔ ہمارا آخری روئے سخن اپنی ملت مرحومہ کے ان افراد کی طرف ہے جو اپنی انفرادی دنیاوی ترقیوں میں اس قدر منہمک اور محو ہو گئے ہیں، کہ قومی اور ملی درد سے قطعی ناآشنا ہیں جن کی خود غرضیاں اور نفس پرستیاں چند ملازمتوں اور چند اعزازی و امتیازی نشانوں کے حصول کو حیاتِ انسانی کا اصلی مقصد سمجھتے ہیں۔

واقعہ ہائلہ کربلا۔ کلمہ گویانِ محمدی کے قومی و ملی احساسات کے نشوونما کے لئے ایک دعوتِ حق ہے جو تیرہ سو برس گزر جانے پر بھی اپنی تازگی و شدت میں اہم سے اہم تازہ واقعات سے بھرا ہوا ہے، یہ واقعہ اسلامی تاریخ کا وہ عظیم الشان اور معرکہ آرا دورِ ابتلاء ہے جس میں اہلِ نیاز تکمیلِ نبوت کا نقش دیکھتے ہیں۔ جو حق پرستی و حق نوازی اور حق پژوہی کی مثال ہے، خاندانِ اہلبیت کا سرتاج دوشِ رسالت کا راکب سید الشہداء امام المومنین اپنے عیال و اطفال کے ساتھ حمایتِ حق اور تبلیغِ صداقت کے لئے بے سروسامان نکلتا ہے، عفریتِ انسانیت اور طاغوتِ دنیا پرستی، یزید، عبداللہ، شمر کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، اور حقانیت و صداقت کے ان پیکرہائے مجسم کو اس آزمائش و ابتلا میں ڈالتا ہے جس میں کامیابی و نصرت وحدت کے پرستاروں کا شعار رہا ہے۔ آج بھی اگر اس امامِ حق و صداقت کی پیروی کے لئے ہر مسلمان کا قلب تیار ہو جائے۔ تو بیڑا پار ہے۔ اہلِ محبت اس افسانۂ عشق کی بے نیازی دیکھیں اور جوشِ نیاز میں عقیدتمندانہ وجد کریں کہ آقائے دو عالم کے نواسے نے کس طرح اپنی اور اپنے وابستگانِ معلوم و معصوم کی جانیں نثار کر کے ایثار و قربانی کی اعلےٰ ترین مثال قائم کی اور سنتِ اسمٰعیل کو زندہ کر کے اسلام کو زندہ کر دیا۔

حسین کی شہادت سے جس طرح روحانیت اور مذہبیت کی صیانت اور صداقت کی حفاظت ہوئی اسی طرح اخلاقِ حسنہ اور شمائل پاکیزہ کی اشاعت بھی۔ مذہبی حسیات سے

خالی الذہن ہو کر اگر محض انسانیت کے پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شہادتِ حسینی پر ایک تنقیدی نظر ڈالی جائے تو انسانیت کے بہترین جواہر تاباں اور درخشاں نظر آئیں گے۔ جن کی چمک اور تابندگی سے ہر انسان خواہ مشرقی ہو یا مغربی۔ اسود ہو یا ابیض، اقتباسِ نور کر سکتا ہے، حسینی شہادت نے جو عام احسانات نسلِ انسانی پر کئے ہیں، وہ شاہ و گدا شہری و دہقانی عرب و عجم مسلمان و ہندو، یہود و نصاریٰ۔ بدھ و مجوس۔ ملحد و زندیق۔ سب کے لئے یکساں سبق آموز ہیں، ریاضت، عبادت، مروّت، غیرت، شجاعت و سخاوت، تحفظ شریعت ہمدردی، راست بازی، عالی ہمتی، عزتِ نفس، خودداری، حریتِ ضمیر۔ پابندیٔ قول حمایت اصول ایفائے وعدہ، صبر و حلم و تسلیم و رضا۔ ثابت قدمی۔ استقلال، احقاقِ حق، ابطالِ باطل، ایثار، توکل، وغیرہ تمام اخلاقِ حسنہ کے جو حیرت انگیز کارنامے حسین سے معرکہ کربلا میں ظاہر ہوئے وہ ایسے ہیں کہ تمام انسان ان کو اپنا دستور العمل بنانے سے انسانِ کامل بن سکتے ہیں۔

حسین علیہ السلام کی شہادت نے جو درسِ عمل پیش کئے، ان کے علاوہ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اسلامی دنیا کو جو فوائد پہنچے وہ نہایت اہم اور فلسفۂ سیاست کے زریں باب ہیں یعنی مستبدانہ حکومت کی غلامی سے آزادی کا سوال جو آج ہندوستان اور تمام دنیا میں عالمگیر ہے، صرف یہی نہیں کہ حکومت کی غلامی سے ملک و قوم کو آزادی دلوانے کی بنیاد ڈالی بلکہ حکومت کے طرزِ عمل کا بھی پردہ فاش کر دیا۔ اس لئے کہ اسلامی حکومت کو اور دنیاوی سلطنتوں کے مقابلہ میں ایک امتیازِ خاص حاصل تھا، اسلامی حکومت کے تمام قواعد و ضوابط محکم خدا اور ارشادِ رسول کے متبع تھے۔ خلاف اس کے دوسری حکومتوں کے دستور و قوانین انسانی تخیلات کے نتیجے ہیں لہٰذا حسین کو پہلی حکومت سے بیزاری تھی، پھر اس کے طرزِ عمل اور احکامِ سیاست سے قوم و رعایا کا طبقہ حکومت کے اس قدر زیرِ اثر ہو چکا تھا کہ باوجود حکومت کی الحاد پرستی، اور کفر شعاری کے اسی کو نیابتِ رسول سمجھے ہوئے تھا، شہداء کربلا نے اپنی جانیں دے کر پہلے جس غلط فہمی کو دور

کیا، وہ یہی تھی، اور ایسی کامیابی کے ساتھ، کہ خود یزید کا خلیف اکبر و ولی عہد (معاویہ نے) تخت شاہی سے انکار کرتے ہوئے، تمام اکابر دام السلطنت کے سامنے اپنے دادا، اور باپ کے معائب کی قلعی کھول دی اور صاف کہہ دیا کہ یہ حق حسین کا تھا، اس نے دربار عام میں ممبر پر بیٹھ کر صاف اعتراف کر لیا کہ یہ حکومت نہ اتباع کے قابل ہے نہ اس کے حاکم اطاعت کے لائق۔ یہ شہادتِ حسینی کی روحانیت و مظلومیت کا اثر تھا کہ اس نے اپنا خاموش اور گہرا اثر ولی عہد کے قلب پر ایسا ڈالا کہ اس نے حاکم و حکومت کے اخلاقی و سیاسی عیوب کا دربارِ عام میں اعلان کر دیا، اس اعلانِ شاہی نے انقلاب پسندوں کے خیالات کو جو واقعہ کربلا کے بعد بھی سلطنت کے مخالفت میں پیدا ہو چکے تھے، اور قوی و مستحکم کر دیا، اس تقریر سے چند مہینوں کے بعد ہی تمام عراق و عجم، حجاز و عرب میں شورش کی آگ بھڑک اٹھی۔ بلکہ حجاز والوں نے تو شہادت حسینی کے بعد ہی سلطنت کے خلاف ہتھیار اٹھالئے تھے جس کے نتیجہ پر واقعہ حرا پیش آیا۔ مدینہ میں قتل عام ہوا، مسجد نبوی کی توہین ہوئی۔ خانہ کعبہ پر آگ برسائی گئی، حجاز و عراق کے لئے تمام ممالکِ اسلامی کی گردنیں خم تھیں۔ یہاں کی شورشوں سے تمام بلادِ اسلامیہ کے طول و عرض میں بجلی کی طرح اثر ہوا۔ اور ہر شخص میں اپنے جائز مطالبات کا احساس پیدا ہو گیا تعلیم اخلاق کا اُس وقت تک دوسروں پر اثر نہیں ہوتا، جب تک معلّم اخلاق اپنے ہر فعل و عمل سے ایثار و قربانی کا خود مجسمہ نہ بنے۔ دنیا میں جس قدر بھی معلّم اخلاق ہوئے، انہوں نے اپنے مواعظ کو صرف زبانی تبلیغ تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ اپنے مسلسل اعمال و افعال سے ان کا استحسان انسانی قلوب میں راسخ کرنے کی سعی فرمائی تو کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ان معلّمین اخلاق کے اعمال کو اسی روشنی میں دیکھیں کیا ہمارا ان تعلیمات سے اثر لے کر تاسّی کی بجائے ان کی مصیبتوں پر صرف آنسو بہا دینا کافی ہے۔ شہادت حسینی کا مقصد الفائے شریعت اور تہذیب و اخلاق تھا۔ اگر اس شہادت سے اخلاقی سبق حاصل نہ کریں اس کے فلسفہ کو نہ سمجھیں تو ہم سے بڑھ کر بدقسمت اور کون ہو سکتا ہے۔

شہادت حسینی پر آنسو بہانے والوں اور سینہ کوبی کرنے والوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ کہ کربلا کا سانحہ اپنے دامن میں ہمارے لئے موعظت و ارشاد کی ایک دنیا چھپائے ہوئے ہے۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ ایسے اعلےٰ اخلاقی نمونے ہماری آنکھوں کے سامنے ہوں، اور پھر بھی دنیا کی صفِ اقوام میں ہماری جگہ سب سے پیچھے رہے۔ ہمارے دلوں میں قوت، بازوؤں میں شکست، آوازوں میں زور نہیں، تو یہ سب اس کا نتیجہ ہے کہ ہم نے اس شہادت کے نتائج و اغراض سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔

حسینؑ کی حیرت انگیز ثابت قدمی

اور

عدیم المثال استقلال

دنیا در اصل مجموعہ اضداد و اختلافات کا نام ہے، اور یہ آغاز آفرینش سے تا ایندم موجودات کی ہر چیز اور ہر بات موالیدِ ثلاثہ کی ہر چھوٹی بڑی شاخ اور عناصرِ اربعہ یا چہار دہ گانہ کی ہر ایک مرئی و غیر مرئی جزو میں موجود ہیں، اور خاتمہ دنیا کے وقت تک خواہ اس کا زمانہ کتنا ہی قریب و بعید اور اس کے اسباب کیسے ہی، موافقِ قانون قدرت یا فوق العادت ہوں برابر موجود رہیں گے، خیال اور نظر کو جہاں تک بسط دیا جائے معلوم ہوتا ہے کہ سارا نظام عالم در اصل اسی کشمکشِ اضداد سے وابستہ ہے، اور اس کشمکش کا رفع ادآن واحد میں اس عالم اسباب کی درہمی و برہمی کا باعث ہو سکتا ہے حکیم فیثا غورس کا نظام شمسی سائنٹفک آلات اور مسلسل تحقیقات کی مدد سے اگر بالکل صحیح نہیں تو کم از کم قرین صحت ضرور ثابت ہو چکا ہے اور آج کل مہذب دنیا میں نجوم، ہیئت، جہاز رانی وغیرہ کا مدار علیہ ہے، اس کرۂ ارضی کو فضائے لامکاں میں بعض مخالف اور متضاد قوتوں کی کشمکش باہمی پر

قائم بناتا ہے اور زمین کے لئے وہ وقت قیامت خیز قرار دیتا ہے۔ جب کہ ایک سمت کی کشش بوجوہ چند در چند سبک ہو کر۔ ہمارا کرۂ سورج یا کسی دوسرے ستارہ سے ٹکرا جائے۔ اور پاش پاش ہو جائے۔

خیر یہ تو دور کی باتیں ہیں لیکن ہم اپنے گرد و پیش کے حالات اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات پر بھی نظر ڈالیں تو بھی ہمیں قدم بہ قدم اور لحظہ بہ لحظہ اسی ضد اور اختلافات سے سابقہ پڑتا ہے۔ آفتاب کا باقاعدہ طلوع، غروب لیل و نہار کی مسلسل گردش، روشنی و تاریکی کا غلبہ و خاتمہ، موسموں کا تغیر و تبدل، گرمی و سردی کی ابتدا، اور اختتام، بہار و خزاں کا آغاز و انجام، فصلوں کا کاشت و درو نباتات کی روئیدگی و افسردگی بارش کی کثرت و قلت، سمندر کا جزر و مد، پہاڑوں کا ارتفاع اور غاروں کا عمق۔ غنچوں کی شگفتگی اور پھولوں کی پژمردگی، پُروائی ہوا کی برودت اور پچھوائی کی یبوست۔ بیل دماں کی توانائی، مور ضعیف کی ناتوانی، اشجار بلند کی مضبوطی اور برگ و گیاہ کی نازکی قوموں کا عروج و زوال، سلطنتوں کی ترقی و تنزل، افراد کا تمول و افلاس، غرض ہر چیز میں ہم تقابل و تخالف کا رنگ دیکھتے، اور بمصداق تعرف الاشیاء باضدادہا اسی کے ذریعے سے تمام حالتوں اور صورتوں کو پہچانتے ہیں، روشنی کو ہم اس لئے روشنی کہتے ہیں کہ وہ تاریکی کی ضد ہے۔ سپیدی کا نام اس لئے سپیدی رکھتے ہیں کہ وہ سیاہی سے ممیز ہے، رات محض اپنے اندھیرے کے باعث دن سے جدا ہوتی ہے اور فصل سرما صرف بوجہ برودت موسم گرما کی حرارت سے پہچانی جاتی ہے، دوست کی محبت بدیں سبب ہمارے نزدیک قابل قدر ہے کہ وہ دشمن کی عداوت سے ایک جداگانہ حالت رکھتی ہے۔

اس سلسلہ کو جہاں تک وسعت دیجئے، اور کائنات کے سامان پر غور کیجئے۔ سب کی بنیاد اضداد پر نظر آئے گی، ہماری جسم میں چار اخلاط اپنی اپنی جگہ حکومت کرتی، اور

ایک دوسرے کو دبانے کے درپے رہتی ہیں ان کی حرکات مخالفانہ پر ہی ہماری صحت کا دار و مدار ہے۔ اگر ان میں سے ایک باقی رقیبوں پر غلبہ پا لیتی ہے تو فوراً ہماری تندرستی میں خلل آجاتا ہے۔ اور مختلف تدبیروں سے ہمیں پھر ان میں وہی سابقہ رقابت ڈلوانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر سب سے بڑھ کر ہمیں اپنے جذبات اور احساسات میں اس ضد اور اختلاف سے واسطہ پڑتا ہے اور اسی کی مدد سے ہم اپنی زندگی کا زمانہ جو بہت مختصر ہونے کے باوجود۔ اگر برسوں، مہینوں، ہفتوں، دنوں، گھنٹوں منٹوں لمحوں پر تقسیم کیا جائے، تو خاصہ طویل ہے۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے، جاگتے، سوتے ہنستے، روتے گزارتے ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ اگر اس کی زندگی کی ایک حالت قائم ہو جائے تو سال بھر کیا۔ ایک مہینہ بھی زندہ رہ سکے گا اور خود اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی تلف کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے گا۔

جن اصحاب کو اپنے کسی دوست یا عزیز کو خودکشی کرنے سے پہلے دیکھنے اور اس کے جذبات معلوم کرنے کا اتفاق ہوا ہے، یا کسی وارداتِ خودکشی کے حالات انہوں نے بغور پڑھے ہیں، تو معلوم ہو جائے گا کہ ایک ہی حالت کے معمول سے زیادہ قیام نے ان کے لئے زیست کو ناقابلِ برداشت بنا کر انہیں خود اپنے ہلاکت پر مجبور کر دیا۔ عموماً یہ صورت غم و غصہ اور یاس کی حالت میں جب کہ ان کا کانشنس ان سے مغلوب ہو جاتا ہے، واقع ہوتی ہے یا کسی شخص کی امید کو اس قدر شدید صدمہ پہنچتا ہے کہ ساری دنیا اس کی آنکھوں میں تاریک ہو جاتی ہے اور اتنے بڑے فضائے عالم میں اسے کوئی دلچسپی اپنے لئے نظر نہیں آتی۔ اس لئے کہ وہ موت کو حیات پر ترجیح دیتا اور اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے، مگر یہ صرف اُس کی تنگ نظری اور کوتاہ بینی کا سبب ہوتا ہے۔ ورنہ دنیا کے اسباب راحت و انبساط میں کبھی کسی قسم کا فرق نہیں آتا، خودکشی کے بدقسمت مرتکبین اپنی عزیز جانیں بھی گنواتے ہیں۔ اور بہت بڑی اخلاقی کمزوری کا بھی اظہار کرتے ہیں جس کی بنا پر وہ ہرگز کسی عقلمند کی نظر میں تائید و تحسین کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کا یہ فعل بے انتہا دماغی اور اعصابی خرابی

پر دلالت کرتا اور بزدلی اور ناعاقبت اندیشی پر مبنی کہا جاسکتا ہے، ورنہ اگر وہ ذرا بھی ضبط و تحمل سے کام لیتے اور اپنے حال و مآل پر غور کرتے، تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ زمانہ کو کسی ایک پہلو پر قرار اور دنیا کی کوئی حالت پائیدار اور استوار نہیں۔ پس جس تکلیف کو وہ اس وقت اپنے لئے ناقابل برداشت سمجھتے ہیں اس کا درد و اضطراب رفتہ رفتہ کم ہی ہو جائے گا، اور جو دنیا اس وقت ان کی آنکھوں میں سیاہ ہو گئی ہے وہ تھوڑے عرصہ کے بعد اوسی حسن و دلفریبی کی شان میں سامنے آکر ان کے دل کو لبھائے گی، اس لئے ہمتِ مردانہ اور حوصلہ جوانانہ کے یہ معنی ہیں کہ جو مصیبت یا آفت انسان پر وارد ہو اس کا دلیری اور استقلال سے مقابلہ کیا جائے، اور بارگاہ خداوندی سے ہر وقت رحمت و برکت کی امید باندھی جائے ؎

زرنج و راحت گیتی شو خنداں مرنجاں دل ⁂ کہ آئین جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد

انسان براہِ نادانی ہر وقت اسبابِ راحت و مسرت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اور ہر قسم کے حزن و ملال سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے اگر اسے اس کی خبر نہیں کہ اسبابِ فرحت و انبساط کا پورا لطف اسے جب ہی آئے گا جب وہ احساس رنج و ملال سے پورے طور پر واقف ہو گا کیونکہ موجودات میں تمام اشیاء کی معرفت کامل ان کی اضداد سے حاصل ہوتی ہے اور صرف بُروں کی بُرائی نیکوں کی بھلائی ظاہر کر سکتی ہے۔ جو لوگ غم و غصہ کے احساس سے خود کو بچاتے ہیں وہ در اصل خوشی کے سامان کا پورا لطف اٹھانا نہیں چاہتے۔ اور ان نعمات کی بے قدری کرتے ہیں، جو قدرت نے کمالِ شفقت و فیاضی سے ان کو عطا کی ہیں امریکہ کے ایک مشہور و معروف کروڑپتی کو اعلےٰ سے اعلےٰ درجہ کے کھانوں اور عیش و عشرت کے تمام سامانوں پر بھی ضعفِ معدہ وغیرہ کی شکایت رہتی ہے جس نے اس کی نیند حرام کر دی ہے، اور وہ لاکھوں روپیہ اس شخص کو دینے کے لئے تیار ہے جو اس کو چین سے سُلا سکے اسی طرح اسپانیہ کے ایک دولتمند کو صرف حرکت کی حالت میں کچھ نیند آتی ہے اور اس غرض کے

اس کی سیلون گاڑی ہر رات کو ریلوے ٹرینوں کے ساتھ لگائی جاتی ہے اور رات بھر چکر میں رہتی ہے۔ مگر ایک کاشتکار جو صبح سے شام تک اپنے کھیت پر محنت و مشقت کرتا ہے۔ وہ غروب آفتاب کے بعد گھر آکر جوار باجرے کی روٹی اور ابالے ساگ سے کھاکر بستر گھری چارپائی پر دراز ہوتا ہے اور ایسے آرام کی نیند سوتا ہے کہ راک فیلر۔ وینڈربلٹ اور رسٹر فورڈ کو مخمل و کمخواب کے بچھونوں اور بجلی کے پنکھوں میں بھی خواب راحت کا وہ لطف حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس مزدور کی طرح پہلے محنت اُٹھاکر خود کو بعد کی راحت کے لئے تیار نہیں کیا اور حصولِ آرام کے لئے تکلیف کا ضروری کفارہ نہیں دیا۔ غم و الم سے گھبرانے والوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ دکھ درد لازمہ انسانیت اور باعثِ مسرت ہے۔ اور راحت صرف محنت کے بعد مل سکتی ہے اور دنیا میں ہر چیز کی ابتدا سختی سے ہوتی ہے۔ رات دن پر مقدم ہے، کیونکہ پہلے جہان میں تاریکی تھی، بچہ جس وقت شکم مادر سے باہر آتا ہے تو رونے کی آواز سے اہل دنیا کو اپنی آمد کی خوشخبری سناتا ہے، آبشار پہاڑ کے پہلوؤں سے سر ٹکرا کر ماتم کرتا ہے تو دامن کوہسار کو لالہ و گل سے بھرتا ہے انجن اپنے آہ گرم کی طاقت سے ٹرین کو کھینچ کر منزل مقصود تک لے جاتا ہے، شمع کا زار و قطار رونا بزم عشرت کو روشنی پہنچاتا ہے۔

الغرض سلسلہ کائنات میں جہاں تک غور فرمائیے "درپس ہر گریہ آخر خندۂ الست" کی تصدیق ہو جاتی ہے اور فرحت و مسرت پر رنج و عسرت کو تقدیم و فوقیت نظر آتی ہے۔ اس لئے بسا ضروری ہے کہ انسان خود کو اس کا خوگر بنائے۔ کیونکہ رنج و الم کا درد خود آئندہ مسرت و شادمانی کا پیش خیمہ ہے اور بمصداق "فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ" ہر ایک رنج و ملال میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور پوشیدہ رہتی ہے۔

البتہ تکلیف و مصیبت سے گھبرانا لازمہ فطرت انسانی ہے۔ آگ لگنے پر دھواں ضرور اُٹھے گا مگر اس موقعہ پر دنیا کے نامور اور عظیم الشان اصحاب کی حالت کو پیش نظر اور اپنی مصیبت کا ان کے مصائب سے مقابلہ کر کے دیکھنا چاہیئے مسلمان اس معاملہ میں جملہ اقوام

عالم سے ممتاز ہیں کربلا کے سانحۂ روح فرسا میں ان کی تسلی و تشفی کے لئے ایک ایسی زبردست اور شاندار مثال موجود ہے جس کی ظہور آدم سے تا ایندم تاریخ عالم کوئی نظیر پیش نہیں کرسکتی۔

استقلال و حمایت صداقت انسان کے بہترین جوہر ہیں لیکن مصیبت کے وقت کیسا ہی جری اور مستقل مزاج شخص ہو مرعوب و خائف ہو کر اس کے پائے ثبات میں لغزش آہی جاتی ہے۔ البتہ حسینؑ کا اٹل انکار بیعت، ان کے فولادی عزم و استقلال کا مظاہرہ ایک بہترین سبق ہے حسینؑ کی گردن باوجود ناقابل برداشت مصیبتوں کے باطل کے سامنے نہ جھکی مصیبتیں اس وقت تک مصیبتیں ہیں جب تک انسان ان سے ڈرتا ہے۔ کس چہرہ کا یہ حوصلہ تھا کہ شش ماہہ کو دم توڑتا دیکھ کر شکر کی مسرت سے سرخ ہو جائے۔ کس کی زبان کا یہ جگر تھا کہ محراب خنجر میں امت کی نجات کے لئے دعا مانگے۔ تلوار کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی کہ کسی مظلوم کے گلے پر پھرائی جائے۔ تیروں کے لئے یہ پہلا موقعہ نہ تھا کہ کسی بے گناہ کے بدن میں پیوست ہوں۔ نیزے آج سے پہلے بھی انسانی خون سے رنگین ہو چکے تھے۔ لیکن دنیا کے کسی ہتیار نے اپنے مقتول کو اس قدر مستقل مزاج نہ پایا ہوگا۔ وقت تھا کہ رستم اور اسفند یار اپنی خاکی آرام گاہ سے سر نکالتے ارجن و بھیم کی راکھ کے پریشان ذرّوں میں روح پھونکی جاتی۔ جعفر طیار اور حیدر کرار قبروں سے نکل پڑتے۔ بہنال اور جولیس عم ارواح کے مؤکل سے رخصت لے کر دنیا میں آتے اور یہ سب مل کر تین دن کے بھوکے پیاسے کی مدافعانہ جنگ کا تماشہ دیکھتے۔ زخمی ہاتھوں نے کس روز اس زور کی لڑائی لڑی تھی۔ بہتر کا داغ اٹھائے دل نے کس دن یہ جرأت دکھائی تھی شجاعت اور استقلال کو علیؑ نے پالا تھا۔ اور آج حسینؑ کے ہاتھوں ان کو پروان چڑھایا جا رہا تھا حسین کی پیری تھی لیکن اُن کی ہمت و جرأت کا شباب تھا۔ کثرت مصائب سے جس قدر حسینؑ کی کمر جھکتی تھی اسی قدر ہمت و جرأت بلند ہوتی جاتی تھی۔ جب تک بدن پر سر اور تن میں روح رہی حسینؑ کے استقلال میں سر مو فرق نہ آیا۔ پیرانہ سالی تین دن کی بھوک۔ عورتوں کی نالہ و زاری۔ بچوں

کی فریاد العطش، عزیزوں اور دوستوں کے داغ ان کے جسموں کو اپنی آنکھوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا، پھر بھی اپنی آن اپنی بات، اپنی خودداری پر پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہنا۔ صرف حسین ہی کا کام تھا۔

حسین نے جس کٹھن اور دشوار مہم کا بیڑا اٹھایا تھا وہ انسان کی طاقت برداشت سے بالاتر تھی اور جیسا یہ کام مہتم بالشان تھا ویسی ہی اس کی مصیبتیں سخت اور قدم کو ڈگمگا دینے والی تھیں اور جیسی یہ مصیبتیں سخت تھیں ان کے لئے مافوق العادت صبر و استقلال درکار تھا۔ اگر حسین چاہتے تو صرف بظاہر اتنی بات پر آپ کی اور آپ کے کنبہ کی ان بلاؤں سے نجات ممکن تھی کہ یزید کے اُن احکام کے آگے جو اسلام سے صریح مخالف اور منافر تھے گردن جھکا دیتے اس صورت میں یہ بھی ممکن تھا کہ یزید کے لعنتی دربار میں آپ کی عزت و حرمت ہوتی۔ مگر فرزند خاتم المرسلین کی غیرتِ نفس نے آخر دم تک اس ذلت کو گوارا نہ کیا کہ اپنے بچاؤ کی خاطر حاکم فاسق کی اطاعت کر کے اپنے نانا کے اُس دین کو جس کی حفاظت آپ کے ذمہ عائد تھی دنیا کی نظروں میں حقیر و ذلیل کر دیں آپ خوب جانتے تھے اور آپ کی آنکھوں کے سامنے وہ کشت و خون اور ہنگامہ محشر برپا ہونے والا تھا جس میں آپ کے سب عزیز و رفیق تلواروں سے کٹ کٹ کر زمین پر گر ینگے، آپکی آنکھوں کے سامنے وہ نامبارک اور منحوس سماں تھا جس میں آپکی شہادت کے بعد مخدرات عصمت پر بلاؤں کا آسمان ٹوٹنے والا تھا۔ عورتوں کی جگر خراش صدائے فریاد صغیر سن بچوں کی بھوک اور پیاس سے بے قراری اور ان کا بار بار العطش العطش پکارنا۔ دریا کا آنکھوں کے آگے موجیں مارنا، سوائے ذات خدا کے کوئی معین و مددگار نظر نہ آتا۔ اپنی [illegible]ت کی قلت، دشمنوں کی کثرت تمازتِ آفتاب، لُو کے جھونکے۔ پانی کی بندش۔ کیا یہ تمام باتیں اس کے لئے کافی نہ تھیں، کہ ایک انسان کو خواہ وہ اپنی بات کا کیسا ہی دھنی، اور اپنے قول و فعل کا کیسا ہی راسخ اور ثابت قدم کیوں نہو، مرکز ثقل سے ہٹا کر اپنے وجدان۔ نورِ قلب کانشنس اور دین کے مخالف عمل کرنے پر مجبور نہ کر دے۔ کیا کوئی فرد بشر اپنی انسانی

سہنی ہیں ایسی صعوبتوں ایسی سختیوں، ایسی بلاؤں کو اٹھا کر وجدانی صداقت، روحانی سچائی، ایمانی قوت اور اسلامی جوش پر ثابت اور قائم رہ سکتا ہے، کیا دنیا کی تاریخ میں کسی قوم کے کسی نبی اور کسی بہادر کی ایسی شاندار مثال موجود ہے۔

یہ وہ بلائیں تھیں جن کو انبیاء اولوالعزم بھی نہ جھیل سکے، البتہ خاتم الانبیاء کے وارث اور جانشین نے تہہ دل سے ان مصائب کا خیر مقدم کیا اپنے عزیزوں اور بچوں کو کٹوایا۔ بھوک اور پیاس کی تکلیف اٹھائی، خود اپنے جسم پر صدہا زخم کھائے، عورتوں اور بچوں کی اسیری قبول کی، بایں ہمہ ضبط و استقلال جو شروع میں تھا۔ وہی آخر دم تک رہا۔ آپ کی زبان مبارک سے سوائے اس کے اور کوئی کلمہ نہ نکلا۔ ربّ العالمین جو تیری مرضی اور خوشی ہے اسے پورا کر۔ میں تیری رضا پر شاکر، اور تیری مرضی پر صابر ہوں۔ اور کسی صورت میں تیرے حکم سے باہر نہیں حسین کے منہ سے یہ کبھی نہ نکلا کہ ربّ العالمین! اس آزمائش کو ٹال دے یا مجھ کو اس سے بچا لے۔ وہ ازلی امین باوجود ان ناقابل برداشت مصائب کے ذرا بھی بے دل اور بے صبر نہیں ہوا۔ اس نے مسیح کی طرح بچنے کی دعا نہیں مانگی بلکہ وہ خدا کی درگاہ میں ساری رات مناجات کرتا رہا۔ اور صاف کہا کہ میں اس بار کو اٹھاؤں گا۔ بے شک حسین دنیا میں اسی لئے آئے تھے کہ انسانی استقلال، بہادری، صداقت شعاری کا ایک بے مثال نمونہ نسل انسانی کے روبرو پیش کر کے درس گاہِ عالم میں ایک سبق آموز عمل یادگار چھوڑ جائیں۔

حسین علیہ السلام کی عدیم المثال عبادت

ظاہر ہے کہ جملہ مذاہب و ادیان کی تبلیغ و تلقین کا اصلی مقصود، روحانی و اخلاقی تعلیم ہی ہے، اور اس تمام تعلیم کا لُبِّ لباب خالقِ کائنات کی عبادت و پرستش، عبادت و پرستش کے طریقے گو مختلف اور متبائن ہیں مگر علتِ غائی سب کی ایک ہی تھی۔ البتہ بعض نے اس وادی

افراط و تفریط سے کام لیا کہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کو اصل اصول سمجھ لیا نفس کشی اور تزکیہ نفس کے واسطے نہایت ہی سخت اور کٹھن ریاضتیں کیں اپنے بدن کے بعض اعضا خشک و بے کار کر لئے مگر یہ طریقہ قانونِ فطرت کی خلاف ورزی پر مبنی اور عقلاً و نقلاً ناقابل استحسان ہے، مذہب اسلام نے جہاں رہبانیت اور تجرّد کو ممنوع قرار دیا وہاں تمام ارکانِ عبادت میں نماز کو رکنِ اعظم اور ایسا لازمی و ضروری ٹھہرایا کہ کسی حالت میں بھی اس کے ترک کی اجازت نہیں ہے۔

طبقۂ انبیاء کے علاوہ دوسرے مذاہب میں بھی بڑے بڑے مرتاض اور عابد گذرے ہیں جن کی شاقہ عبادتوں اور حیرت انگیز ریاضتوں کو سن کر انسان دنگ اور ششدر رہ جاتا ہے، مذہب اسلام میں بھی بے شمار بزرگوں نے عبادت و ریاضت کی بدولت اولیاء اور صلحاء کا رتبہ پایا۔ مگر آؤ ہم تم کو ایک ایسے نمازی کی عبادت کا منظر دکھائیں جس کی مثال اولین و آخرین کے واقعات عبادت میں نہ ملے گی۔ اور اس کی شان اپنی نوعیت میں بالکل انوکھی پاؤ گے۔

غور کرو۔ ٹھیک دوپہر کا وقت ہے، لو چل رہی ہے زمین و آسمان کرۂ نار بنے ہوئے ہیں۔ گرد و غبار سے ایک اور آسمان، آسمان کے نیچے پیدا ہو گیا ہے، حدتِ آفتاب سے بدن پر ہتھیار آتشِ سوزاں کا کام دے رہے ہیں۔ بیابانِ کربلا کا ریگ تپش میں تنور کے خاکستر سے کم نہیں میدان کارزار گرم ہے، دشمنوں کی ٹڈی دل سپاہ گھنگھور گھٹا کی طرح چاروں طرف چھائی ہوئی ہے۔ شدتِ تشنگی سے سب کے جگر کباب ہو رہے ہیں اور خیموں میں ننھے ننھے بچوں کی فریاد العطش نے شورِ محشر کا نمونہ برپا کر رکھا ہے۔ عورتوں کا نالہ جانکاہ جگر کے ٹکڑے کئے دیتا ہے، لاش پر لاش گر رہی ہے حسین کی قلیل جماعت کے نصف سے زیادہ آدمی کام آ چکے، ۲۰، ۳۰ آدمیوں سے زیادہ باقی نہیں، سب کے سب دو دن کے بھوکے پیاسے ہیں۔ زبانیں شدتِ تشنگی سے سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہیں۔ ہاتھ پاؤں قابو سے باہر ہوتے جاتے ہیں مگر فرزندِ رسول کی حمایت میں دشمن کی کثیر التعداد

فوج کو خاطر میں نہ لاکر ہمت مردانہ کے جوہر دکھا رہے ہیں، اتنے میں دوپہر ڈھل گئی۔ اور نماز ظہر کا وقت آگیا، ابو ثمامہ صیداوی آگے بڑھتے ہیں اور عرض کرتے ہیں۔ یا ابن رسول اللہ میری جان آپ پر فدا ہو جب تک میں قتل نہ ہو جاؤں گا آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ میری تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنے سے پہلے آخری نماز با جماعت آپ کے ساتھ ادا کرلوں۔ حضرت نے آسمان کی طرف دیکھا تو واقعی نماز ظہر کا وقت تھا۔

حسین علیہ السلام نے بروز عاشورہ ایسی حالت میں جب کہ فوجِ مخالف چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی، دو دن کی بھوک و پیاس گرمی کی شدت آفتاب کی حدت تلواروں کی چھاؤں اور تیروں کی بوچھار میں نمازِ ظہر کو اپنی تھوڑی سی جماعت کے ساتھ باطمینان ادا کرکے تمام دنیا کو یہ بات دکھا دی کہ احکامِ الٰہی کی کامل پیروی اس کو کہتے ہیں۔ اب نماز عصر کا حال سنئے حسین گھوڑے سے گر چکے ہیں سر سے پاؤں تک زخموں سے چور ہیں۔ سر تلواروں سے ٹکڑے، گلا اور سینہ تیروں اور برچھیوں سے چھدا ہوا ہے۔ دشمن بارادۂ قتل گھوڑوں سے اوتر کر چاروں طرف محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ قاتل خنجر بکف پہلو میں کھڑا ہے، بہن۔ بیویاں۔ بیٹیاں یہ ہوشربا اور جگر خراش منظر دیکھ کر شور و واویلا کی آواز بلند کر رہی ہیں مگر نماز عصر کا وقت ہے، اس امام المصلّین کا سر سجدہ الٰہی میں جھکا ہوا ہے۔ قاتل اتنا بھی صبر نہیں کرتا کہ بانیٔ نماز کے مجروح فرزند کو فریضۂ عصر ادا کر لینے دے پہلے ہی سجدہ میں سر کو قلم کرتا ہے اور آپ کی روحِ مقدس جسدِ مطہر سے مفارقت کرتی ہے، تو عین سجدۂ معبودِ حقیقی میں۔

جس طرح جنگ خندق میں (باپ) حیدر کرار کی ایک ضرب دونوں عالم کی عبادت سے افضل تھی۔ اُسی طرح (بیٹے) حسین مظلوم کی یہ آخری نماز جمیع مخلوق کی اطاعتِ الٰہی سے برتر ہونے میں اپنا نظیر نہیں رکھتی ؂ رعنا

یادر کھا اسے دکھ درد میں آزاروں میں ٭ اور سجدہ کیا چلتی ہوئی تلواروں میں

ایسی حالت میں نماز کا خیال رکھنا اور اس کو کامل اطمینان اور ذوق و شوق کے ساتھ ادا کرنا۔ کیا ہر شخص کا کام ہے؟ حاشا و کلا۔ یہ حوصلہ حسین اور اصحاب حسین ہی کا تھا۔ کیا دنیا کی کوئی قوم اپنی عبادت و ریاضت کرنے والوں کی فہرست میں ایسا نام پیش کر سکتی ہے جس کو اس کا نظیر سمجھا جائے۔

حسین علیہ السّلام کی عدیم النظیر شجاعت

یوں تو تمام قوموں کی نہ صرف ابتدائی تاریخ (جس کو قصص و حکایات کا مجموعہ کہنا چاہیئے) بہادرانہ کاموں سے لبریز ہے بلکہ ہر قوم کی صحیح تاریخ میں بھی ایسے دلیروں اور شجاعوں کے متعدد نام پائے جاتے ہیں جن کی حیرت خیز طاقتوں اور ولولہ انگیز کارگذاریوں پر فخر کیا جاتا ہے۔ جو کسی طرح بے جا نہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو اپنی جسمانی طاقتوں اور ذاتی نبرد آزمائیوں کی وجہ سے تاریخ میں ایک خاص امتیازی درجہ رکھتے ہیں، اور ایسے بھی ہیں جن کی فاتحانہ قابلیتوں اور اولوالعزمیوں نے ملک گیریوں کے واقعات کو زندہ کر دیا ہے، اگر یونان کو اپنے ہرکلس اور لیونڈس پر ناز ہے تو ایران کو نریمان، رستم، سہراب، فرامرز و برزو وغیرہ پر، اگر عبرانی شمعون پر فخر کرتے ہیں تو ہندوستانی ارجن و بھیم بھیشم، کرن و دشاسن وغیرہ پر، اگر کارتھیجی تاریخ ھنیبال اور ہملکر پر نازاں ہے، تو رومی تاریخ جولیس سیزر سپاہیو اور مارک اینٹونی وغیرہ پر۔ اگر برّاعظم امریکہ جارج واشنگٹن اور سائمن، بالیور کی بہادرانہ خدمات کا ممنون احسان ہے تو جاپان مارشل اوایامہ جنرل اوکو او، یا ناگاٹہ کا۔ اگر انگلستان کی تاریخ سڈنی فلپ ڈیوک آف مارلبرا ڈیوک آف ویلنگٹن وغیرہ کے کارناموں سے مزین ہے تو جرمنی کے کونٹ مولیگ مارشل ہنڈن برگ جنرل لونڈارف وغیرہ کی کارگذاریوں سے اگر روس میں اس کو بلوف اور گور کو جیسے ہیرو گذرے ہیں تو ترکی میں عمر پاشا اور عثمان پاشا جیسے بادشاہوں کی فہرست میں بھی۔ ایسے اولوالعزم اور ملک ستان فاتح بکثرت موجود ہیں

جنہوں نے بزورِ شمشیر دنیا کے وسیع حصوں کو مغلوب و مسخر کیا، ملک کے ملک گھوڑوں کی ٹاپوں کر روند ڈالے ان کی افواجِ قاہرہ کا سیلاب جس رُخ پر ہو لیا، تر و خشک سب کو بہا لے گیا۔ اُن کی فاتحانہ اولوالعزمیوں کو نہ کوئی پہاڑ روک سکا، نہ کوئی سمندر۔ خواہ سکندر[1] اعظم ہو۔ یا چارلس[2] اعظم۔ فریڈرک[3] اعظم یا نپولین[4] اعظم، خاقان[5] اعظم ہو یا صاحبقران[6] اعظم۔ سلطان سلیمان[7] خان اعظم ہو یا شاہ عباس[8] اعظم گستاوس[9] اعظم ہو یا نیرا[10] اعظم۔ قیصر جولیس[11] ہو۔ یا قیصر ولیم۔ بہرحال اگر تمام قدیم و جدید تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو ایسے بے شمار نام پائے جائیں گے تو شہرتِ دوام کے سائن بورڈ پر سنہری حرفوں سے لکھے ہوئے ہیں اور جن کی شاندار اور تابناک کارناموں کی عزت[12] افرادِ انسانی کے قلوب پر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہے گی۔

لیکن تمام تاریخِ عالم کے ورق الٹ جاؤ، یا شجاعانِ عالم کے کارناموں کو چھان مارو۔ ایسا صبر ایسا استقلال ایسی استقامت ایسی شجاعت کہیں نظر نہ آئے گی جیسی معرکۂ کربلا کے واقعات میں دیکھو گے حسین نے جان دی۔ مگر بات نہ دی۔ سر قلم ہو جانا گوارا کیا۔ مگر اپنی عزت پر حرف نہ آنے دیا۔ سخت ترین گرمی کی شدت بھوک و پیاس کی صعوبت، انصار کی قلت، دشمنوں کی کثرت دوستوں اور عزیزوں کی شہادت، اطفالِ خورد سال کی تشنگی سے ہلاکت، عورتوں کی اسیری و ذلت ان سب مصائب و آلام کو نہایت خندہ پیشانی اور خوشی کے ساتھ قبول کیا۔ مگر وہ امر منظور نہ کیا جس سے اسلام کی سراسر بے حرمتی سراسر بے غیرتی اور سراسر توہین ہو۔ تین دن کی بھوک و پیاس میں اس قدر صدمات اٹھانا اس قدر زخم کھانا اور پھر بھی دشمن کے مقابلہ سے قدم نہ ہٹانا شجاعت و بہادری کا ایسا زریں کارنامہ ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں تلاش کرنا

(1) مشہور بادشاہ یونان (2) شاہنشاہ فرانس (3) بادشاہ پروشیا (4) شاہنشاہ فرانس (5) چنگیز خاں (6) امیر تیمور، سلطان ترکی (8) بادشاہ ایران (9) بادشاہ سویڈن (10) شاہنشاہ روم (11) فرماں روائے روم (12) پچھلا قیصر جرمنی جو اس جنگ عالمگیر کا ہیرو تھا جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جاری رہی

عبث ہے۔

حسین کی تنہا ذاتِ مقدس پر جن مصائب کا نرغہ ہوا۔ اور جن ہوش ربا اور روح فرسا صدمات و حالات کا حسین نے تنہا مقابلہ کیا وہ انسانی طاقت و برداشت سے بالاتر ہیں۔ رفیقوں اور عزیزوں کی شہادت کے بعد بھی خود تن تنہا بھوک و پیاس میں حسین کا حیرت انگیز بہادری سے ہزاروں دشمنوں کے ساتھ جدال و قتال کرنا، اور صدہا زخم کھانے پر بھی تلوار کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا جنگی کارناموں میں ایک ایسا حیرت افزا کارنامہ ہے، کہ اس کی قدر وہی بہادر اور جری لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے معرکۂ جنگ میں اپنی عمریں صرف کر دی ہیں اور بارہا ایسے خوفناک اور خونیں منظر کو دیکھا ہے۔

اس حالت پر خیال کیجئے کہ سید الشہدا سر سے پاؤں تک زخموں سے چور اور بالکل ناقابلِ جنگ ہو چکے ہیں وہ دشمن جو آپ کو محاصرہ کئے کھڑے ہیں، عرب کے نامور اور منتخب بہادر سمجھے جاتے ہیں باایں ہمہ مجبوری و کمزوری، جب آپ کسی طرف متوجہ ہوتے ہیں دشمن بدحواس ہو کر گرتے پڑتے بھاگ جاتے ہیں، ایک ہاشمی تلوار کے جوہر دکھائے بغیر جان نہیں دے سکتا۔ اپنی ساری عمر میں یہ پہلا موقعہ تھا، کہ حسینؑ نے کسی دشمن کے مقابلہ کے لئے تلوار ہاتھ میں لی تھی۔ صرف تین حملے کئے، اور ہر مرتبہ فوجِ مخالف کے قدم اکھڑ گئے، حسینؑ کے ان یادگار حملوں کا اثر اور شمشیر زنی کی ہیبت سمجھو، یا روحانی رعب و جلال جو اس وقت حسینؑ کے خون آلود چہرے سے نمایاں تھا۔ دشمن دور سے تیر لگا رہے ہیں، قریب آنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اور اگر ہجوم کر کے آتے ہیں تو جدھر حسین نظر اٹھا کر دیکھتے، کائی سی پھٹ جاتی۔ اب آپ پر نیم غشی کی حالت طاری ہے ایک ایک قاتل ہمت کر کے آگے بڑھتا ہے مگر آنکھیں چار ہوتی ہی، ہیبت و دہشت کے کانپنے لگتا ہے اور تلوار ہاتھ سے پھینک کر راہِ گریز اختیار کر لیتا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے، کہ کسی انسان کو اس قدر مصیبتوں اور تکلیفوں نے گھیرا ہو اور وہ اپنے عزم و استقلال پر اس طرح ثابت قدم رہا ہو، کیا دنیا کے کسی بہادر نے اتنے صدمے برداشت کرنے کے بعد ایسے دشمن

ہجوم والام میں شجاعت و بہادری کے ایسی مافوق الفطرت جوہر دکھائے ہیں۔ ہم بلا خوف تردید دعوے سے کہتے ہیں کہ نہیں ہرگز نہیں، اگر تم تمام بہادرانِ عالم کے فرداً فرداً شجاعانہ کارناموں پر غور کرو اور بایں ہمہ مصائب و شدائد حسین کی شجاعت، ہمت، استقامت سے ان کا موازنہ کرو تو تمہارا ضمیر خود پکار اٹھے گا۔ کہ بے شک شجاعت و استقلال کا حسین پر خاتمہ ہوگیا۔ یا شجاعت و استقلال کا دوسرا نام "حسین" ہے۔

شہادتِ حسینی کا عالمگیر اثر

انسان جن چیزوں یا جن محسوسات کو دیکھتا یا سنتا ہے۔ وہ تو خود اثر قبول کرنے والی ہیں یا دوسروں پر اپنا اثر ڈالتی ہیں دنیا میں کوئی ایسی طاقت یا آواز نہیں۔ جو ان دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں نہ ہو، یا مؤثر ہوگی، یا متاثر۔ البتہ اس قدر فرق و امتیاز ضرور ہے کہ بعض اشیا یا بعض طاقتیں محدود الاثر والتاثیر ہیں اور بعض غیر محدود، محدود یا غیر محدود ہونا۔ واقعہ کی اصلیت اور عظمت کے لحاظ اور اعتبار سے ہوتا ہے۔ جو واقعات یا حادثات اپنی ذات ہی میں محدود ہیں ان کی تاثیریں بھی محدود ہی ہوتی ہیں اور جو اپنی ذات میں غیر محدود ہیں ان کے آثار بھی لاتعداد ہیں۔ گریوٹی یعنی جاذب و کشش ہر ایک جسم میں ثابت کی گئی ہے۔ اجسام کے سوا واقعات اور اسمار میں بھی کشش پائی جاتی ہے جس کی مقدار اور وزن بھی اثر کے طریقہ پر ہی بعض واقعات اور بعض اسماء ہی ایسے ہوتے ہیں جن میں بہ نسبت دوسرے واقعات اور اسما کے کشش و جذب کی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ کشش و جذب اور اس کی تاثیریں عموماً واقعات و حادثات کی حالت میں اور حیثیت سے متعلق ہوتی ہیں اگر وہ واقعات جسمانی امور سے تعلق رکھتے ہیں تو ان کی تاثیریں بھی جسمانی ہوتی ہیں اور اگر روحانی امور سے لگاؤ رکھتے ہیں تو عموماً ان کا اثر روحوں پر پڑتا ہے۔ اور وہ اثر ایسا قوی اور زبردست ہوتا ہے۔ کہ ہر قسم کی مزاحمتوں اور رکاوٹوں کو توڑ کر

بھی مؤثر ہو جاتا ہے طبیعتیں خود بخود اس کے قبول کرنے کو دوڑتی ہیں، اور اس سے ایسی لوس ہوتی ہیں کہ آنکھ کان دل اور دماغ سب کے سب اُسی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور اسی توجہ کا کرشمہ ہے کہ قلوب پر ایک خاص وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

واقعۂ کربلا دنیا کے وقائعِ عظیمہ میں ایک سر برآوردہ سانحہ ہے۔ پھر اس کا مقناطیسی اثر جس قدر ہو تھوڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود قافلہ سالار کربلا کا نام ہی اپنی حالت اور حیثیت میں ایک خاص اثر اور حیرت انگیز کشش رکھتا ہے اور یہ اثر و کشش اس لئے کہ حسینؑ کا واقعہ روحانی اور ربی امور سے تعلق رکھتا تھا۔ ایسے وسیع اور غیر محدود ہیں کہ ان کی تاثیریں اقصائے عالم اور ہر ایک نسل انسانی تک پہنچ گئی ہیں مجال نہیں کہ جس سے یہ واقعہ بیان کیا جائے اور جس کو یہ پُر درد کہانی سنائی جائے اس کے قلب پر چوٹ نہ لگے اور اس کی آنکھیں پُر آب نہوں دل و دماغ میں ہمدردی کا ہیجان پیدا نہ ہو یوں تو دنیا میں لاکھوں انسانوں پر مصیبت آئی اور بے شمار بندگان خدا مظلومیت کی حالت میں مارے گئے۔ لیکن مظلومین کربلا کی حالت و کیفیت ہی جدا ہے۔

تمام دنیا کے پُر درد واقعات اور پُر سوز واقعات کو اکٹھا کر کے سانحہ کربلا سے مقابلہ کرو اور پھر دیکھو کہ رُوح اور قلب پر کس واقعہ اور حادثہ کا بجلی کی طرح اثر ہوتا ہے حسین کا نام آتے ہی آنکھیں رونے کی طرف اور دل پیچ و تاب کی جانب خود بخود مائل ہو جاتا ہے۔ یہ نام دلوں اور آنکھوں کو کیوں اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے، کیوں ان واقعات کو سُنتے ہی انسان کے رگ و ریشہ میں اضطراب کی بجلی گھر کر لیتی ہے، انسان کیوں سب مخالفتوں اور منافرتوں کے خیالات کو خیرآباد کہہ کر ہمدردی کا دم بھرنے لگتا ہے محض اس وجہ سے کہ حسین کے واقعات میں خدا پرستی صداقت، استقامت، رحم و کرم۔ بے مثل بہادری اور بے نظیر مظلومیت و بیکسی شامل ہے، جس طرح کہا جاتا ہے۔ "آفتاب آمد دلیل آفتاب" اسی طرح حسین کا نام بھی اپنی ازلی صداقت کی پرزور کشش سے قلوب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا

ہے اور اس میں ایک خاص کشش وجذب ہے جس کے سامنے دنیا کے بڑے بڑے بہادر اور بڑے بڑے بے رحم اور سنگدل موم ہو جاتے ہیں اور ادب سے سر جھکاتے ہیں۔ بے شک حسین کا یہ زندہ معجزہ ہے کہ تمام دنیا کے منصف مزاج آپ کے ساتھ ہمدردی اور آپ کے بے مثل استقلال اور بے نظیر بہادری کی داد دیتے ہیں وہ کون ایسا بہادر اور شجاع ہے جس نے تمام دنیا والوں سے خراج تحسین و آفرین حاصل کیا ہو، وہ کون ایسا مصیبتوں میں ثابت قدم رہنے والا ہے۔ جس کے ذکر خیر سے تمام دنیا نے اپنی تاریخوں صفحوں کو زیب و زینت دی ہو۔ دنیا کی ساری تاریخوں کو دیکھو گے تو سوائے حسینؑ کے تم کو اور کوئی ایسا نظر نہ آئیگا جیسیں کارکرن کا یہ کہنا ہرگز داخل مبالغہ نہیں کہ دنیا کی رزم گاہ میں اول درجہ کا بہادر صرف ایک حسینؑ ہی ہے۔

جس طرح زندہ انسانوں میں آپ کی مصیبتوں پر آنسو بہائے جاتے ہیں اسی طرح روحی جماعتوں میں بھی اس جگر سوز واقعہ کا المناک اثر ہے۔ امام الصوفیہ غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

"کہ اس واقعہ جانکاہ کے بعد ایک صحابی نے آنحضرت کو خواب میں دیکھا کہ آپ کے سر مبارک کے بال پراگندہ اور گرد آلود ہیں اور آپ کے ہاتھ میں ایک شیشی ہے جس میں خون بھرا ہوا ہے۔ صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ کی یہ کیا حالت ہے اور یہ شیشی کیسی ہے حضرت نے فرمایا کہ اس شیشی میں حسین اور اسکے عزیزوں اور مددگاروں کا خون ہے جو حسین کے ساتھ شہید ہوئے ہیں میں اس وقت مقتل حسین میں موجود تھا اس لئے میں نے اس شیشی میں وہ خون بھر لیا ہے"

وہ لوگ جن کے دل کمزور اور دماغ بودے ہیں اور جو محض نام کے مسلمان ہیں ایسی باتوں پر یقین نہ کریں گے۔ لیکن اگر روح کوئی طاقت رکھتی ہے، اور اس کو اس قالب خاکی کے چھوڑنے کے بعد بھی بقا ہے۔ فنا نہیں تو ضرور اسبات کو ماننا پڑیگا کہ روحیں مدرک بھی ہیں۔ بالخصوص وہ پاک روحیں جو دنیا میں سچائی پھیلانے کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ جب روحیں مدرک ہیں تو ضرور ہے

کہ اس جانکاہ حادثہ کا ادراک ان کو بھی ہوا ہو جو لوگ اپنی کم علمی کے باعث روحانی تصرفات سے انکار کرتے ہیں ان کو ہم قواعد اسپرچولزم (روحانیت) کی طرف جو زمانہ حال میں علماء یورپ نے روحوں کی تحقیقات کر کے وضع کئے ہیں توجہ دلاتے ہیں ان کو دیکھیں اور شرم کریں ہم نے اسلامی مسلمات کا حوالہ اس لئے نہیں دیا کہ نئی روشنی والوں کے ذہن میں وہ پرانے اور بوسیدہ خیالات ہیں ان کو چاہیئے کہ جدید خیالات سے اپنی تسلی کر لیں۔

بہرحال اس میں شک وشبہ نہیں کہ جیسا دردناک اثر اس شہادت کا عموماً تمام دنیا اور خصوصاً اسلامی دنیا پر پڑا اور کسی غم انگیز سے غم انگیز واقعہ سے نہیں ہوا۔ باوجودیکہ اس سانحہ کو تیرہ سو سال ہوتے آئے آج تک ویسا ہی تازہ اثر چلا جاتا ہے۔ تمام دنیا کی قوموں میں صرف مسلمانوں کی ہی قوم ایسی ہے جس میں شہادتِ امام حسین علیہ السلام ایک ایسا حادثہ ہوا ہے جس کا صدیوں سے ماتم ہو رہا ہے اور مسلمانوں کا ہر گروہ کم و بیش اس مظلومانہ شہادت پر ہر سال ماتم کرتا ہے۔ ہر قوم میں نہ صرف معمولی مشاہیر، بلکہ پیغمبر، رہنما، مجددین اور مصلحین نہایت بے کسی کی حالت میں قتل ہو گئے۔ جلا وطن کئے گئے۔ مخالفین نے ان پر پتھر برسائے۔ قید کی تکلیفیں دیں، تمام ممکن الوقوع مصائب توڑے گئے۔ مگر ان میں سے آج تک کسی کا ماتم کسی نے نہیں کیا۔ تمام قوموں کی مستند تاریخیں ان دردانگیز حالات سے بھری ہوئی ہیں۔ مگر وہ اثر اور خونی اثر جو حضرت سید الشہداء کی دردناک شہادت کا اسلامی دنیا پر پڑا۔ آج تک کسی قوم پر اس کے رہنما کا نہیں ہوا۔ یہ ایک ایسا راز ہے جس کی تہہ تک پہنچنا محال عقل ہے۔ یہ ایک ایسا بھید ہے جو اب تک نہیں کھلا اس واقعہ کے متعلق بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اور شاید ہمارا یہ کہنا داخل مبالغہ نہ ہو کہ دنیا کی بے شمار تالیفات میں جس قدر اس واقعہ نے جگہ لی ہے، وہ اور کسی واقعہ نے نہیں لی ہزارہا کتابیں اس شہادت کے بیان سے پر ہیں شیعہ اور سنی متفق طور پر اس مظلومانہ شہادت پر آنسو بہاتے ہیں۔ علماء فریقین کی بیشمار کتابیں ان خونی بیانوں سے بھری ہوئی ہیں۔ مختصر یہ کہ دنیا میں آج تک اسلام کا کوئی ایسا فرقہ نہیں

ہوا جس نے اس بیکسانہ شہادت پر ماتم نہ کیا ہو۔ اور یقین ہے کہ یہ ماتم یوں ہی۔ قیامت یا کم از کم ایک نامعلوم زمانہ تک جاری رہے گا

حسینی کارناموں پر عیسائی مصنفین کی رائیں

مسلمان ایک طرف، یہ وہ پُر درد اور پُر اثر واقعہ ہے جس نے اپنوں اور غیروں سب پر عمل مسمریزم کر کے مسحور بنا دیا ہے، اسلامی تاریخوں سے قطع نظر کر کے اگر ہم یورپ اور امریکہ کے مورخوں کے بیانات دیکھتے ہیں تو ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے ماتم نے نہ صرف ہمیں ہی افسردہ کیا ہے بلکہ مغربیوں کی ٹھنڈی فطرت پر بھی ویسا ہی خونی اثر ڈالا ہے،

مورخِ اعظم "اڈورڈ گبن" نے اپنی مشہور کتاب "ڈکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر" میں لکھا ہے کہ:۔

یہ مظلومانہ شہادت اور پُر درد واقعہ وطن سے اک دور دراز ملک میں واقع ہوا۔ یہ ایک ایسا سانحہ ہے جو بے رحم اور سنگدلوں کو بھی ہلا دیتا ہے۔ اگرچہ کوئی کتنا ہی قسی القلب کیوں نہ ہو اس کے دل میں بھی ایک جوش ہمدردی پیدا ہو ہی جائے گا (تاریخ دوم جلد ۹ صفحہ ۳۴۶)

علٰے ہذالقیاس جان لونگ کی اس نظم سے جو اس نے شہادت حسین کے متعلق پُر سوز الفاظ میں سولہ صفحات پر لکھی ہے، ثابت ہوتا ہے کہ اس منصف مزاج عیسائی سے بغیر ہمدردی کے نہ رہا گیا اس نے تقریباً چار سو اشعار میں نہایت ہی دردناک اور موثر الفاظ سے اس واقعہ کا مرثیہ لکھا ہے حسین کی نسبت اس کی منصفانہ رائے کا خلاصہ ان الفاظ میں ہے:۔

"وہ (حسین) دیندار خدا پرست، فروتن خلیق اور بے مثل بہادر تھا۔ وہ سلطنت

اور حکومت کے واسطے نہیں لڑا بلکہ خدا پرستی کے جوش میں یزید سے اس لئے بیزار تھا کہ وہ اسلام اور دین محمدی کے خلاف تھا"!

امریکن مورخ اسمتھ کلیز اپنی تاریخ عالم میں بعد ذکر واقعہ کربلا تحریر کرتا ہے:۔

ہم انصافاً کہتے ہیں کہ حسین کے صبر اور ثابت قدمی کی نظیر نہیں اُن کی دردناک اور مظلومانہ شہادت نے ہوا خواہان اسلام کے قلوب پر رنج و غم کے اثر کا ایسا گہرا زخم پہنچایا ہے! جو آج تک باوجود مرورِ زمانہ اندمال پذیر نہیں ہوا اس شہادت کے متعلق جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ ایسے عجیب و غریب ہیں کہ آدمی ان کو سن کر سناٹے میں آجاتا ہے (ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۳ صفحہ ۲۱۵)

آرتھر گلسٹن اپنی کتاب "ہاف آور ود محمد" میں واقعہ شہادت حسینی کو لکھتا ہوا۔ آپ کی جنگ کے متعلق تحریر کرتا ہے:۔

"حسین پھر ایک دفعہ دشمن کی فوج میں جا دھنسے اور ہر طرف تباہی اور خرابی پھیلا دی۔ دشمن ان کے مقابلے سے ایسے بھاگتے تھے جیسے لومڑی شیر سے دشمن سودائے عداوت سے پاگل ہو رہے تھے اور ان کے دلوں میں دشمنی کھولتے ہوئے پانی کی طرح جوش مار رہی تھی۔ مگر وہ اپنی فوج کی کثرت سے ہی اُس بہادر کو قتل کر سکتے تھے۔ آخر حسینؑ کے ہاتھ پر تلوار کا کاری زخم لگا۔ دوسرا کاری زخم ان کی گردن پر آیا۔ جب زمین پر گرے تو ایک برچھی آپ کے سینہ پر لگائی گئی اور اس طرح اُس محبوب حسین کا خاتمہ ہوا جو علی کے گھرانے کا تیسرا امام تھا۔ دشمن تہذیب اور انسانیت کے راستہ سے کوسوں دُور تھے۔ اور گدھوں کی طرح حسینؑ کی لاش کے گرد جمع ہوتے تھے۔ لاش کے ساتھ ایسی حرکتیں کرتے تھے۔ جیسے پلید بھوت کرتے ہیں سر کو بدن سے جدا کر دیا گیا تھا۔ یزیدی فوج کے سوار

جوق در جوق آتے تھے، اور لاش کو دیکھتے تھے جس پر اس لڑائی میں ۳۳ زخم آئے تھے پھر انہوں نے لاش کو گھوڑوں کے سموں سے پامال کیا یہاں تک کہ اس غازی شہید کا جسم پاش پاش ایک لوتھڑا بن گیا جو شکل سے بھی شناخت میں نہ آتا تھا۔ یہ لاش اس بہادر کی تھی جس کی شہزوری اور بہادری کا شاعر بڑے زور و شور سے ذکر کرتے ہیں یہ وہ بہادر تھا جس کی بہادری کی نظیر کسی قوم میں نہیں ملتی، اور تمام جنگجو اور نبرد آزما قوموں میں ایسا بے مثال کوئی بہادر نہیں گزرا (صفحہ ۱۲۲)

واقعہ کربلا پر ایک مسیحی مورخ سی۔ ایچ۔ مارس اپنی کتاب "اے لیکچر آن اسلام میں" لکھتا ہے :۔

"تاریخ عالم اپنے دامن میں کئی ایسے واقعات لئے ہوئے ہے جن میں بڑے بڑے مصلحین نے محبت و رضائے الٰہی اور دعوت حق کی راہ میں عظیم الشان قربانیاں پیش کی ہیں اور جن مصائب و آلام کی آزمائشوں سے ان کی آزمائش کی گئی ہے۔ وہ نہایت ہی جانگداز ہیں مگر امام حسین کی آزمائش ان سب سے زیادہ جانگداز ہے۔"

ہر ماربین ایک مشہور جرمن مورخ نے شہادت حسین پر ایک خاص رسالہ لکھ کر اس واقعہ کے اسباب و نتائج پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے وہ ایک موقعہ پر لکھتا ہے کہ :۔

حسینؑ نے یہ مصائب سلطنت و حکومت کے لئے برداشت نہیں کئے۔ اور نہ بغیر سوچے سمجھے اس مہلکہ عظیم میں قدم رکھا۔ اگر حسین کے کلمات و حرکات پر باریک بیں نگاہ سے غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ بہ حیثیت سیاست انہوں نے بنی امیہ کے قبائح اور شنائع اور بنی ہاشم کے ساتھ ان کی قلبی عداوت اور نیز اپنی مظلومیت ظاہر کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور یہ بات ان کے لئے حد درجہ کی سیاست، قوت قلب اور اپنے مقصد عالی کے پورا کرنے میں خود رفتگی کو ثابت کر رہی ہے حسین نے اپنی زندگی کے آخری وقت تک اپنے شیر خوار بچہ کے متعلق وہ کام

کیا کہ حکمائے زمانہ کی عقلیں حیران ہیں ان حالانکہ مصائب کے ہجوم میں ان افکار کثیرہ کے تراکم میں اس تشنگی میں اس کثرت جراحات میں اپنے مقصد عالی سے چشم پوشی نہ کی اور باوجودیکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے صغیر سن بچّہ پر بنی امیہ رحم نہ کریں گے۔ محض اس غرض سے کہ اپنی مصیبتوں کی عظمت بڑھائیں اور یہ مصائب زیادہ تر عظیم الشان ہو جائیں اس بچہ کو اپنے ہاتھ پر بلند کر کے سب سے اس کے لئے پانی کی درخواست کی اور زبانِ تیر سے اس کا جواب سُنا۔ گویا اس عمل سے حسین کی یہ غرض تھی کہ تمام اہل عالم واقف ہو جائیں کہ بنی امیہ کی عداوت بنی ہاشم کے ساتھ کس درجہ پر تھی اور تصور کر لیں کہ یزید اپنے دفاع کے لئے ایسے ظلم و ستم کرنے پر مجبور نہ تھا۔ اس لئے کہ شیر خوار بچے کا ایسی حالت میں اس وحشت ناک طریقے سے قتل کر دینا سوائے وحشت اور بہیمانہ عداوت کے جو ہر دین و مذہب اور قانون و قاعدہ کے منافی تھی۔ اور کچھ ظاہر نہ کرتا تھا اور یہی ایک نکتہ قبائح اعمال نہایت فاسد اور بغض و عناد بنی امیہ کا پردہ اچھی طرح فاش کر سکتا ہے، اور تمام اہل عالم بالخصوص مسلمانوں پر ظاہر کر دیا کہ بنی امیہ فقط احکام اسلام کی ہی مخالفت میں ایسے حرکات نہیں کرتے۔ بلکہ جاہلانہ تعصب کی وجہ سے کوشاں ہیں کہ ایک متنفس بھی بنی ہاشم خصوصاً ذریت محمدؐ کا باقی نہ چھوڑیں۔

پھر آگے چل کر کہتا ہے۔

حسین سے پہلے بھی رؤسا روحانی اور ارباب دیانات بحالت ظلم قتل کئے گئے ہیں یحییٰ کا قصہ بھی تاریخی واقعات میں بڑا شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہودیوں نے جو سلوک حضرت مسیح کے ساتھ کیا اس زمانہ تک اس کی نظیر واقع نہ ہوئی تھی۔ مگر حسین کے واقعہ نے تمام واقعات پر فوقیت حاصل کر لی۔ تاریخ

سے ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ روحانیین اور ارباب دیانات میں کسی شخص نے بھی اپنے علم اور ارادہ سے اپنی ذات کو قتل کرا دیا ہو حسینؑ کا واقعہ عالمانہ ۔ حکیمانہ ، اور سیاسی حیثیت کا تھا اور دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ہے کتنے برس تک حسینؑ اپنے مقتول ہونے کا انتظام اور تہیہ کرتے رہے اور جو مقصد ان کے پیش نظر تھا وہ نہایت ہی اعلیٰ اور بلند تھا ۔ تاریخ میں کہیں پتہ نہیں کہ کسی نے اپنے دین کی ترویج کے لئے بہ علم وقصد اپنی جان دی ہو ۔ سوائے حسینؑ کے ۔ جو مصیبتیں کہ حسینؑ نے اپنے نانا کے دین کو زندہ کرنے میں برداشت کیں ۔ گذشتہ ارباب دیانات پر فوق رکھتی ہیں ، اور سابقین میں سے کسی پر بھی واقع نہیں ہوئیں ۔ بالفرض اگر کہا جائے کہ اور لوگوں نے بھی دین کے لئے اور دین کی راہ میں جانیں دی ہیں ۔ مگر حسینؑ کے طرز و انداز پر ایسا نہیں ہوا حسینؑ نے اپنی جان دی اپنے عزیز ۔ فرزند ۔ بھائی ۔ بھتیجے ۔ بھانجے ۔ اپنے دوست اقربا ، سب دیدیئے ۔ مال دیا ، عیال کی اسیری گوارا کی ۔ اور یہ مصیبتیں ایک دفعہ اور ناگہاں اور نادانستہ واقع نہیں ہوئیں ، کہ مجموعی حیثیت سے ایک مصیبت کا اطلاق ہو سکے بلکہ کسی قدر فاصلہ کے ساتھ ۔ یکے بعد دیگرے یہ مصیبتیں پیش آئیں اور وارد ہوئیں ۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے مصائب کا پے در پے ہجوم کرنا حسینؑ کے ساتھ خاص ہے (رسالہ فلسفہ شیعہ)

مؤلف تاریخ چین دختر چین کا رکرن مترجم صدر دیوان عدالت کلکتہ جس نے تاریخ مذکور دو جلدوں میں لکھ کر ۱۸۵۲ء میں شائع کرائی ، جہاں مغلوں اور رغتا نیوں کی بہادری کا ذکر کرتا ہے وہاں اس نے بہادران معرکہ کربلا کی نسبت نہایت منصفانہ اور قابل قدر رائے دی ہے ، چونکہ یہ کتاب مورخ موصوف نے اردو میں لکھی ہے ، اس لئے اس کا ریمارک بجنسہٖ لفظاً لفظاً نقل کیا جاتا ہے :۔

" دنیا میں رستم کا نام بہادری میں مشہور ہے لیکن کئی شخص ایسے گذرے ہیں کہ ان کے سامنے رستم کا نام لینے کے قابل نہیں ہے ۔ چنانچہ حسین ابن علی کا بہادری میں درجہ اول ہے میدان کربلا میں گرم ریت پر تشنگی اور گرسنگی میں جس شخص نے ایسا کام کیا ہو اس کے سامنے رستم کا نام وہی شخص لیتا ہے جو تاریخ سے واقف نہیں کس کے قلم کو قدرت ہے کہ امام حسینؑ کا حال لکھے کس کی زبان میں یہ لطافت و بلاغت ہے کہ ان بہتر بزرگواروں کی ثابت قدمی اور تہور و شجاعت اور تیس ہزار سوار خونخوار شامی کے جواب دینے اور ایک ایک کے ہلاک ہو جانے کے باب میں مدح جیسی کہ چاہیئے کر سکے ۔ کس کی نازک خیالی کی یہ رسائی ہے کہ ان لوگوں کے دلوں کے حال کو تصور کرے کہ کیا ان پر گذرا ۔ اس وقت سے کہ عمر سعد نے دس ہزار سواروں سے اس کو گھیر لیا ، اس وقت تک کہ شمر ملعون نے ان کا سر کاٹ لیا کیونکہ ایک کی دوا دو مشہور ہے اور مبالغہ کی بھی حد ہے ۔ جب کسی کے حال میں کہا جاتا ہے کہ دشمن نے چاروں طرف سے گھیر لیا ۔ مگر حسینؑ اور بہتر تن کو آٹھ قسم کے دشمنوں نے تنگ کیا تھا اور اس پر بھی قدم نہ ہٹا چنانچہ چار طرف سے تو دس ہزار فوج یزید کی تھی جس کے نیزوں اور تیروں کی بوچھاڑ مثل آندھی کے آتی تھی ۔ اور پانچواں دشمن عرب کی دھوپ تھی ۔ جس کی مثال کسی شئے میں زیر فلک نہیں ملتی اور یہی کہنا ہوتا ہے کہ عرب کی دھوپ کے مانند ، عرب ہی کی دھوپ ہے اور چھٹا دشمن وہ ریگ کا میدان تھا ۔ جو آفتاب کی حرارت میں شعلہ زن اور تنور کے خاکستر سے زیادہ پرسوز تھا ۔ بلکہ اس کو دریائے قہار کہنا چاہیئے ۔ جس کے بلبلے بنی فاطمہ کے پاؤں کے آبلے تھے اور دو دشمن سب سے ظالم بھوک اور پیاس مثل دغا باز ہمراہی کے جن کے برابر کوئی عدو نہیں ساتھ تھے اور تشنگی سے جب زبان پھول کر پھٹ جاتی تھی ۔ جب

ہی ان دونوں کی خواہش اندکے متی تھی۔ بس جنہوں نے ایسے معرکہ میں ہزارہا کافروں کا مقابلہ کیا ہو۔ ان پر بہادری کا خاتمہ ہو چکا۔ اور اس رزم کو سر دفتر تاریخ عالم سمجھنا چاہیئے۔ (تاریخ چین جلد دوم باب ۱۶ صفحہ ۲۳۵)

یہ پُر درد الفاظ اور ہمدردی کے بھرے ہوئے جملے کن لوگوں کے قلم سے نکلے ہیں۔ یہ مسلمان نہیں بلکہ عیسائی ہیں جو حسینؑ کے نانا کے مخالف ہیں مگر ہاں ان مسلمانوں سے بدرجہا افضل ہیں۔ جو مسلمان ہو کر اپنے پیغمبر کی ذریت پر ظلم کر رہے تھے اسی طرح اور بہت سے یورپین مورخ ہیں۔ جنہوں نے جناب سید الشہداء کے واقعۂ شہادت کے متعلق پر زور ریمارک اور نہایت ہی منصفانہ رائیں تحریر کی ہیں جن میں جرجی زیدان، ارونگ واشنگٹن۔ سائمن ڈی کلی اور آیسرن کے نام خصوصیت سے لئے جا سکتے ہیں، ہم بخوف طوالت اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

واقعی حضرت امام حسینؑ کے دل گردہ اور ہمت و استقلال کے ساتھ۔ رستم اور اسفندیار، ہیر نپولین اور قیصر ولہم یا ایسے ہی دوسرے مشاہیر کے کارناموں کو نسبت دینا، انصاف کا خون کرنا ہے ان مصائب و شدائد پر یہ استقلال اور یہ ثابت قدمی حسینؑ ہی کا حوصلہ اور حسین ہی کی ہمت تھی۔

سانحہ کربلا پر موثر خانہ نظر

واقعہ کربلا کے متعلق کئی باتیں غور طلب ہیں۔

(۱) یہ واقعہ ناگہانی واتفاقی تھا یا یہ قصداً عمل میں لایا گیا؟

(۲) اس واقعہ کے اسباب کیا تھے؟

(۳) طرفین کا اس جنگ سے کیا مقصود تھا؟

(۴) طرفین بغیر جنگ بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے تھے یا نہیں؟

(۵) طرفین کہاں تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے؟

(۶) اس واقعہ نے کیا نتائج پیدا کئے؟

(۷) یہ جنگ سیاسی تھی۔ یا مذہبی؟

(۸) اس جنگ کی ذمہ داری کس فریق کے ذمہ عائد ہوتی ہے؟

(۹) ہم کو اس عظیم الشان واقعہ سے کوئی سبق ملتا ہے یا نہیں اور ملتا ہے تو کیا؟

(۱۰) اسلام کو اس کی کوئی یادگار قائم کرنی چاہیئے، یا نہیں اور اس یادگار کی کیا نوعیت ہونا مناسب ہے؟

امر اول:۔ کی بابت کتب احادیث و تاریخ کے صفحات پر متعدد ایسی شہادتیں ملتی ہیں جن سے ہر شخص بہ آسانی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ واقعہ ناگہانی اور اتفاقی نہ تھا۔ بلکہ جو کچھ ہوا۔ وہ بہ علم و بقصد ہوا، شہادتِ حسینی کے متعلق حضرت مخبر صادق کی پیشین گوئی جو سید الشہداء کی روز ولادت سے شروع ہوئی تھی۔ بار بار اس کا اعادہ ہوتا رہا۔ جیسا کہ ہم سر الشہادتین کے حوالے سے اوپر لکھ چکے ہیں۔ یہ پیشین گوئیاں جو باعلان ہوئیں ان سے جناب ختمی مآب کے اہل بیت اطہار و ازواج مطہرات اور صحابہ کبار سب واقف و آگاہ تھے۔

امام بیہقی شعب الایمان میں شعبی علیہ الرحمۃ سے نقل کرتے ہیں۔ کہ

عبداللہ ابن عمر مدینہ کو آرہے تھے، ان کو خبر لگی کہ حسین علیہ السلام نے سفر عراق کا عزم فرمایا ہے، وہ ان سے راستہ میں آملے، اور زبدہ میں دو تین آپ کے ساتھ رہے اور حضرت سے کہنے لگے کہ اللہ نے اپنے رسول کو دنیا اور آخرت دونوں کو اختیار کرنے میں مختار کیا تھا۔ مگر آنحضرتؐ نے صرف آخرت کو اختیار فرمایا۔ آپ سیدِ عالم کے جگر گوشہ ہیں۔ آپ لوگوں میں سے کسی ایک کو دنیا نہیں ملے گی اور خدائے تعالیٰ نے آپ صاحبوں سے اس کو نہیں ہٹایا۔ مگر ایسی چیز کے لئے جو آپ کے واسطے بہت بہتر ہے۔ آپ یہاں سے واپس تشریف لے چلیں حضرت نے انکار کیا ابن عمر نے کہا میں وداع ہوتا ہوں شہید سے!!

ابنِ عمر کا آخری فقرہ صاف دلالت کر رہا ہے کہ وہ بھی اس آنے والے واقعہ سے بخوبی آگاہ تھے، خصوصاً جناب سید الشہداؑ کو تو یقین کامل تھا۔ کہ میری شہادت مقدر ہو چکی ہے۔ جو کسی طرح ٹل نہیں سکتے۔ سفرِ عراق کے وقت دوستوں عزیزوں کے بے حد اصرار بھی آپ کا اپنے ارادے پر قائم اور ثابت رہنا اُسی حکم کے تابع تھا، جو اس واقعہ کے متعلق آپ کے علم میں تھا۔ اور آپ نے عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن جعفر سے کنایتاً اور محمد ابن حنفیہ سے صراحتاً ذکر فرما دیا تھا، موسیو ماربین کا یہ لکھنا۔

''کہ حسینؑ نے باعلان کہہ دیا تھا کہ میں عنقریب خدا کی راہ میں قتل کیا جاؤں گا
مگر ناحق بات کی پیروی نہ کروں گا''

بالکل مطابق واقعہ ہے، مورخ موصوف نے اپنے اس قول کے تائید میں آگے چل کر کہا:۔
کہ حسینؑ اپنے مقتول ہونے کی ہمیشہ پیشین گوئی کیا کرتے تھے، اور جس وقت سے مدینہ کو چھوڑا۔ صاف صاف کہتے ہے کہ میں قتل ہونے کے لئے جا رہا ہوں۔ اور اپنے سب ہمراہیوں سے بھی اتمام حجت کے لئے یہی بیان کرتے تھے۔ تاکہ اگر کوئی جاہ و جلال کی حرص و لالچ سے ہمراہی چاہتا ہو تو جدا ہو جائے اور یہی بات ان کے وردِ زبان تھی کہ قتل گاہ کا راستہ میرے سامنے ہے۔ اور یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ اگر حسینؑ کا یہ ارادہ نہ ہوتا اور غور و فکر اور علم و ارادہ سے قتل ہو جانے پر آمادہ نہ ہوتے تو اِس طرح اپنا قتل گوارا نہ کرتے۔ اور لشکر کے جمع کرنے میں کوشش فرماتے نہ یہ کہ جو لوگ ہمراہ تھے۔ ان کو بھی متفرق و پراگندہ کر دیتے۔ چونکہ کوئی قصد سوائے قتل ہو جانے کے جو ان کے خیالات کا مقدمہ تھا ان کے مدنظر نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے یہ سمجھ کر کہ اس کا بڑا مؤثر ذریعہ بیکسی اور مظلومی ہے اسی کو اختیار کیا، حسینؑ اپنے دوستوں سے جو مانع سفر ہوئے یہی فرماتے رہے کہ میں قتل ہونے کو جا رہا ہوں چونکہ ان لوگوں

کے خیالات محدود تھے اور حسینؑ کے مقاصدِ عالیہ پر ان کو اطلاع نہ تھی۔ اس سفر سے ممانعت پر اصرار کرتے تھے جس کا آخری جواب حسینؑ کی طرف سے یہ تھا کہ خدا کی مشیت یہی ہے اور میرے نانا نے مجھ کو یہی فرمایا ہے، اور جب وہ اصرار کرتے تھے کہ جب آپ مقتول ہونے کے لئے جا رہے ہیں تو عورتوں اور بچوں کو ساتھ نہ لے جائیے تو جواب دیتے تھے۔ کہ خدا کی مشیت یہی ہے کہ میرے اہل و عیال اسیر و مقید ہوں حسینؑ کے یہ کلمات چونکہ اس وقت روحانیت کی حیثیت سے تھے سب لاجواب تھے اور کسی کو مجالِ دم زدن نہ ہوتی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ مصائب انہوں نے سلطنت و بادشاہی کے لئے برداشت نہیں کئے اور نہ بغیر سوچے سمجھے ہوئے اس ہلکہ عظیم میں قدم رکھا۔

امر دوم واقعہ کربلا کے اسباب کیا تھے اور کن وجوہ سے یہ خونی اور دردناک واقعہ پیش آیا وہ سطحی اور سرسری نظر میں بالکل صاف ہیں اور ہر شخص بآسانی کہہ سکتا ہے کہ امام عرش مقام کا بیعت یزید سے انکار اور کوفیوں کا ہوا خواہیِ حسینؑ کے متعلق جوش و خروش سے اظہار۔ اس جنگ کے اسباب ہیں لیکن نہیں کچھ اور بھی ایسے اسباب ہیں جن پر عمیق نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اور جو ایک حد تک اس واقعہ کے اصل اسباب کہے جا سکتے ہیں افسوس ہے کہ ان درد انگیز مظالم کے ابتدائی علل و وجوہ کو تلاش کرتے ہوئے ہمیں ایک ایسے مقام پر پہونچنا پڑتا ہے جس کا اعادہ ہم کسی طرح کرنا نہیں چاہتے تھے مگر مجبوراً اپنے سلسلۂ بیان میں لاتے ہیں اور وہ بھی نواب مولوی شیخ احمد حسین خاں تعلقدار پریانواں کے رسالہ البلاء المبین سے جس کو ممدوح نے تمہید واقعات کربلا میں صفحہ ۲۶ سے ۴۲ تک وضاحت سے تحریر کیا ہے مگر ہم اس کے چند اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔ وھو ہذا۔

اگرچہ شہادتِ حسینی کا تیرہ و تار واقعہ ۶۱ھ ہجری میں واقع ہوا لیکن اس دیجور قیامت کی شام ظلمت اسی وقت سے شروع ہو چکی تھی، جب خورشید رسالت غروب ہوا۔ اور جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ نے اس دارِ فانی سے، عالم جاودانی کو انتقال فرمایا گیا اس کی تفصیل

کی بھی ضرورت ہے اگر ہے تو میں اس مقام پر جناب مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کی زبان سے وہ مختصر تقریر ادا کیے دیتا ہوں جس کو انہوں نے رویائے صادقہ کی چودہویں فصل میں تحریر فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"جو ہستی سب سے زیادہ پیغمبر صاحب کی وفات سے متاثر ہوئی وہ فاطمہ تھیں۔ والدہ پہلے انتقال کر چکی تھیں۔ اب ماں اور باپ دونوں کی جگہ پیغمبر صاحب تھے، اور باپ بھی کون۔ دین و دنیا کا بادشاہ، ایسے باپ کا سر سے سایہ اُٹھ جانا۔ اسپر حضرت علیؑ کا خلافت سے محروم رہنا اور سنگ بر جراحت ترکۂ پدری یعنی فدک کا دعویٰ کرنا اور مقدمہ ہار جانا کسی دوسرے کو ایسے پیہم صدمات پہنچتے تو زہر کھا کر مر جاتا مگر ان کا صبر و ضبط ان ہی کے ساتھ تھا۔ پھر بھی رنجوں میں گھل گھل کر چھ مہینے کے اندر اندر انتقال فرما گئیں اور جتنے دن زندہ رہیں اُن لوگوں سے جنہوں نے ان کو رنج دیئے تھے، نہ بولیں اور نہ بات کی یہاں تک کہ ان لوگوں کو اپنے جنازہ پر آنے کی بھی مناہی کر دی اور شب کے وقت مدفون ہوئیں"

اس سے آگے تحریر فرماتے ہیں۔

سخت افسوس کی بات ہے کہ اہل بیت کو پیغمبر صاحب کی رحلت کے بعد ہی ایسے ناملائم واقعات پیش آئے کہ ان کا وہ ادب و لحاظ جو ہونا چاہیئے تھا اس میں ضعف آگیا اور شدہ شدہ منجر ہوا اُس ناقابل برداشت واقعہ کربلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں ملنی دشوار ہے

جس طرح جناب رسولخداؐ کے بعد ہی اہل بیت نبوی کو مکروہات کا پیش آنا مسلّم ہے اسی طرح اس میں بھی کلام نہیں کہ ان حضرات نے کوئی موقعہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں کنایتہً یا صراحتہً قطع حجت نہ فرمایا ہو چنانچہ مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی رویائے صادقہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت علی کی خلافت کے دعویدار ضرور تھے اور

کیوں نہ ہوتے پیغمبر صاحب کے بعد۔ داماد کہو، بیٹا کہو، بھائی کہو یہی تھے"

اور مولوی احسان اللہ صاحب گورکھپوری نے اپنی کتاب تاریخ اسلام کے صفحہ ۳۰۷ میں تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"حضرت علی کو پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ہی خلافت کا دعویٰ تھا۔ مگر نہ اس طرح کہ کوئی فساد کریں بس اسی قدر کہ وہ اپنے کو حقدار سمجھتے تھے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافتوں میں بھی ان کو تامل تھا"

علامہ ابن عبدالبر کتاب استیعاب میں لکھتے ہیں کہ:۔

قال علی کرم اللہ وجہہ ان عزّ وجلّ لما قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قلنا نحن اھلہ و اولیاءہ فلا ینازعنا سلطانہ احد فابی علینا قومنا فولوا غیرنا و ایم اللہ لولا مخافۃ ان یعود الکفر و یبور الدین لغیرنا فصبرنا علی بعض الالم +

حضرت علی نے فرمایا کہ جب رسولخداؐ نے رحلت فرمائی تو ہم نے آنحضرتؐ کے اہل اور ولی ہونے کا اظہار کیا کہ رسولؐ کی جانشینی کی بابت نزاع کرنے کا ہم سے زیادہ کوئی مستحق نہیں لیکن قوم نے ہماری بات نہ سنی اور ہماری سواد و سروں کو والی بنا لیا خدا کی قسم اگر قوم کے تفرقہ کا اندیشہ نہ ہوتا اور یہ خوف نہ ہوتا کہ مبادا کفر پھر عود کرے اور دین برباد ہو جائے تو بے شک قوم کی اس کارگزاری کو ہم بدل دیتے۔ آخر ہم کو آلام پر صبر کرنا پڑا۔

شوریٰ کے زمانہ میں بھی حضرت علیؑ نے کوئی شکوہ اپنی حق تلفی کا اٹھا نہیں رکھا چنانچہ تاریخ ابوالفدا، تاریخ کبیر ابن جریر طبری وغیرہ میں صاف صاف لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی مدبرانہ پالیسی نے حضرت علی ابن ابی طالب کو امر خلافت سے محروم فرمایا۔ تو جناب امیر علیہ السلام نے

اپنی مخالف پارٹی کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا "لیس ھذا اوّل یوم بظاھرتم علینا فیہ فصبر جمیل"۔ آج یہ کچھ پہلا دن نہیں ہے جسمیں تم نے ہمیں مغلوب کرنے کو آپس میں سازشیں کی ہوں خیر صبر ہی بہتر ہے جب خود حضرت علی کی خلافت تسلیم کی گئی تو فوراً ہی جنگ مخالفانہ سے روبکاری ہوئی اور آپ کو مجبوراً دست بقبضہ ہونا پڑا۔ اور رشدہ شدہ یہ نوبت پہنچی کہ آپنے شقی ترین امت کے ہاتھ سے شربتِ شہادت نوش فرمایا اور آپکی وصیت کے موافق آپ کے بڑے صاحبزادے امام حسنؑ جانشین ہوئے امام حسنؑ کے خلیفہ ہوتے ہی لوگوں نے ان سے منہ پھیر لیا۔ اور ایسا منہ پھیرا کہ مجبوراً ان کو گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی اور اس پر بھی چین نہ آیا، تو ان کو زہر دلوادیا اور باوجود وصیت اپنے جد امجد کے پہلو میں بھی دفن نہ ہونے پائے امام حسنؑ کے شہید ہوتے ہی اعدائے دین نے امام حسینؑ کو نرغہ میں لے لیا اور آخر جو نتیجہ ہونا تھا وہ ہوا۔

اس کے بعد نواب صاحب ممدوح تحریر کرتے ہیں۔

کہ جناب رسالتمآبؐ نے کس کس طرح اپنے اہلبیت کے ساتھ تمسک اور ان کے اقتدا کی تاکید فرمائی تھی اور ان کے کیا کیا حق امت پر ظاہر کر دئیے تھے کیا یہ نہیں فرمایا تھا کہ میں تم میں دو عظیم الشان چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک قرآن دوسری اپنی عترت اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گی، یہاں تک میرے پاس کوثر پہ وارد ہوں اس حکم کا منشا ظاہر یہ تھا کہ قرآن تمہارے لئے ایسا عمدہ قانون چھوڑتا ہوں جو ضروریات زندگی میں تمہارا سب سے بڑا رفیق ہے، اور قرآن کے سمجھانے کے لئے اہل بیت (دیکھو تاریخ السلام مولوی احسان اللہ وکیل گورکھپور)

مگر افسوس ہے کہ اس کا مطلب امت کی سمجھ میں نہیں آیا ورنہ قران خوانی اور کلمہ گوئی کو بغیر تمسک اہل بیت کے کوئی وقعت سے نہیں دیکھتا کیونکہ علیؑ حسنؑ اور حسینؑ کے مخالفین بھی سب کے سب کلمہ گو اور قرآن خوان تھے۔

کیا حضور نبوی نے ارشاد نہ فرمایا تھا کہ میرے اہل بیت کی مثال سفینۂ نوح جیسی ہے جو اس پر سوار ہوا۔ اس نے نجات پائی اور جس نے اس سے تخلف کیا، وہ غرق ہو گیا، آخر امتی ان ہدایات کا کیا مطلب سمجھتے تھے۔ یہی کہ علیؑ سے مخالفت فاطمہ سے مخاصمت اور حسنؑ سے عداوت قائم کریں اور حسینؑ کے ساتھ تو وہ کریں جو کافر اور مشرک بھی نہ کرتے۔

حیرت تو یہ ہے کہ اکابر صحابہ تک جن میں سے بعض کے اسماء گرامی عشرہ مبشرہ کی صفات اضافی سے موصوف کئے جاتے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کو برا سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ حضرات طلحہ و زبیر نے کوفہ اور بصرہ کی صوبہ داریوں کے نہ ملنے سے حضرت علی کی بیعت توڑ دی۔ جیسا کہ تاریخ امام ابن جریر طبری تاریخ کامل ابن اثیر جزری اور تاریخ حافظ ابن کثیر وغیرہ سے ثابت اور واضح ہے اور تاریخ ابن شحنہ، تاریخ ابوالفدا، تاریخ ابن اثیر جوزی۔ تاریخ ابن جریر طبری تاریخ ابن کثیر اور تذکرۂ خواص الامۃ وغیرہم میں مفصل موجود ہے کہ حسان ابن ثابت کعب ابن مالک، سلمہ ابن مخلد، نعمان ابن بشیر، فضالہ ابن عبید، کعب بن عجزہ زید ابن ثابت عبد اللہ ابن سلام سہیل ابن سنان، اسامہ ابن زید، قدامہ ابن مظعون مجزہ ابن شعبہ، رافع ابن خدیج، ابو سعید خدری وغیرہم نے جناب امیر کی بیعت سے قطعاً انکار کیا۔ ابوموسی اشعری تو علانیہ منحرف ہی تھے، چنانچہ استیعاب ابن عبد البر میں ہے

کان ابوموسی الاشعری منحرفاً عن علی کرم اللہ وجہ

مولوی احسان اللہ صاحب تاریخ اسلام میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے بہت زور مارا تھا کہ لوگ حضرت علی کا ساتھ نہ دیں، امیر معاویہ اور عمرو بن العاص کی عداوت اظہر من الشمس ہے حضرت سعد ابن ابی وقاص اور عبد اللہ ابن عمر نے علی ابن ابی طالب کی بیعت کو قطعی طور سے مکروہ تصور فرمایا چنانچہ تذکرہ خواص الامۃ سبط ابن جوزی میں ہے کہ:-

قال الزھری والعجب ان عبد اللہ ابن عمر و سعد ابن وقاص لہ بایعا	زہری کہتے ہیں کہ تعجب ہے کہ عبد اللہ ابن عمر اور سعد ابن ابی وقاص نے علی سے تو بیعت

علیًا و بایعا یزید ابن معاویہ +	نہ کی اور یزید ابن معاویہ سے بیعت کرلی

امام مسعودی مروج الذہب میں لکھتے ہیں۔

تقاعد عن بیعتہ جماعۃ عثمانیۃ منہم سعد ابن ابی وقاص و عبداللہ ابن عمر و بایع یزید بعد ذالک	جناب امیر کی بیعت سے تو ایک جماعت نے تقاعد کیا جس میں سعد ابن ابی وقاص اور عبداللہ ابن عمر تھے۔ اور اس کے بعد عبداللہ

نے یزید سے بیعت کرلی۔

اور حافظ ابن کثیر شامی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ

بایع الناس علیا المدینۃ و تربص نفرلہ یبایعوہم ابن عمر و سعد ابن ابی وقاص۔	لوگوں نے مدینہ میں علی کی بیعت کی۔ مگر ایک گروہ نے بیعت سے توقف کیا جس میں ابن عمر و سعد ابن ابی وقاص تھے۔

اور فتح الباری شرح صحیح بخاری میں یزید سے حضرت عبداللہ ابن عمر کی بیعت کا یوں حال لکھا ہے۔

و بایع مدینہ یزید بعد موت معاویۃ لاجتماع الناس علیہ"۔	عبداللہ ابن عمر نے بعد وفات معاویہ ان کے بیٹے یزید سے بیعت کرلی اس لئے

کہ اس کی خلافت پر لوگوں کا اجتماع ہوگیا تھا۔

دیکھئے عبداللہ ابن عمر جیسے جلیل القدر صحابی اور مفتی نے امیر المومنین علی ابن طالب کی بیعت نہ کی اور امیر شام کی اطاعت واجب خیال فرمائی۔ چنانچہ ان کے ایسے مطیع اور فرمانبردار تھے کہ ان کے فرزند رشید یزید کو امام برحق تسلیم کرکے بہ طیب خاطر اس کی بیعت کرلی اور فقط بیعت ہی پر اکتفا نہ کی بلکہ انہماک کے ساتھ مخالفین یزید کو اس کی اطاعت و بیعت پر ترغیب دیتے تھے۔ اس کے بعد یزید کی خلافت پر بحث کرکے نواب صاحب موصوف لکھتے ہیں:-

سچ تو یہ ہے کہ امام غزالی ابن عربی ملا علی قاری اور شیخ ابن حجر مکی کے اقوال

پر کیا نظر کی جائے۔ جب کہ ابتداء ہی بجائے نصرت در خلافت کے انحراف اور بغاوت کی ہوا چل چکی تھی۔ قیامت تو یہ ہے کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جدا ہوتے ہی ان کی ودیعت اور امانت میں خیانت کی نگاہیں پڑنے لگیں اور اہل بیت رسالت کو ان کے دائرۂ عظمت سے ہٹا دیا گیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مطلع صبح نبوت پر شام ظلمت کا دمدار ستارہ نمودار ہوگیا۔ یعنے نیابت نبوت کی مقدس مسند پر خاندان بنی امیہ کا وہ ننگ اسلام ممبر قابض ہوا جس نے خاندان رسالت کی تباہی و بربادی۔ استیصال و تخریب تذلیل و توہین میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا (البلاغ المبین صفحہ ۲۶ تا ۳۴)

نواب مولوی احمد حسین صاحب کا مندرجہ صدر مضمون۔ بادی النظر میں ناگوار اور تلخ ضرور ہے مگر واقعیت کے رنگ سے خالی نہیں کیونکہ خاندان رسالت پر تمام آنے والے مصائب کا مقدمۃ الجیش اور علت العلل فی الواقع ان کا ان کے مرکز عظمت اور منصب خلافت سے ہٹایا جانا ہی قرار پا سکتا ہے کیونکہ اسی غیر معین نظام خلافت کا طفیل تھا کہ بنی امیہ کو جو بنی ہاشم کے موروثی تشنۂ خون تھے۔ اس وقت تمام اسلامی دنیا میں ایک خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھے اسلامی سیاسیات کے بست و کشاد میں دخل پانے کا موقعہ ملا۔ اور اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ خلافت ثانیہ میں بنی امیہ کے پولٹیکل اقتدار کا سنگ بنیاد رکھا جانا اور خلافت ثالثہ میں اس کا ایک مستحکم و استوار حصن حصین بن جانا ہی واقعہ ہائلہ روز عاشور کا اصلی اور حقیقی سبب ہے۔

بنی ہاشم اور بنی امیہ کی باہمی رقابت و عداوت جو ارث خاندانی کی طرح رگ و ریشہ میں اثر کئے ہوئے تھے۔ ایسی آشکارا اور شہرت یافتہ ہے کہ ہماری کسی صراحت کی محتاج نہیں بنی امیہ کبھی دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ مؤلفۃ القلوب (لالچی مسلمان) اور اپنے کفر اصلی پر قائم تھے۔ اس لئے جب ان کو دنیائے اسلام پر کامل اقتدار حاصل ہوگیا، تو انہوں نے وہی زمانہ جاہلیت کی پرانی رسمیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر اختیار کیں۔

چونکہ وہ اہل بیت رسالت کو محافظ اسلام اور اپنے ارادوں کی تکمیل میں سد سکندری سمجھتے تھے۔ اس لئے بنی ہاشم خصوصاً بنی فاطمہ کا استیصال ان کا موروثی اور سیاسی نصب العین تھا۔ بنی ہاشم کا اپنے درجہ اور اعزاز سے ہٹایا جانا اور سلسلۂ خلافت کا ایک غیر معین اصول پر قائم ہونا اپنے نیتجہ کو ایسی حالت پر لے آیا کہ قسمت آزمائی کے میدان میں بنی امیہ کامیاب اور بنی ہاشم پر غالب آئے اور اپنے آئندہ امور کے لئے راستہ صاف کرلیا۔ تیسری خلافت کا بنی امیہ میں سلم ہونا۔ اس امر کی ضمانت کا بل تھا۔ کہ ہر کام اور ہر مقام میں بنی امیہ دخیل ہوتے جائیں، اور بہ نسبت پہلی تیمی اور عدوی خلافتوں کے دو بالترتیب دو سال تین ماہ اور دس سال چھ ماہ۔ رہیں ان کو تقریباً بارہ سال کا ایسا کافی زمانہ مل جائے کہ وہ آئندہ کے لئے اپنی جگہ کو ایسا مستحکم کرلیں جو ایک صدی تک جنبش نہ کرسکے۔

یہ لوگ اس دیرینہ عداوت وکدورت کی وجہ سے گو بظاہر اسلام کے ساتھ خلوص وعقیدت ظاہر کرتے تھے مگر باطن میں ان کو عار معلوم ہوتا تھا کہ جس دین پر بنی ہاشم کا سکہ ہو وہ بھی اسی کی پیروی کریں۔ مگر حصول امارت وسلطنت کے لئے اس کے سوا اور کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے بظاہر مخالفت نہیں کرسکتے تھے۔ کیونکہ پہلی تمام مخالفتیں بے کار ثابت ہوچکی تھیں لیکن جب عزت کا اعلےٰ زینہ اور ترقی کا رفیع تر مقام ان کے ہاتھ آگیا اور اپنے جاہ وجلال کو مستحکم کرچکے تو کھلم کھلا احکام اسلام سے سرکشی شروع کردی۔ ابوسفیان صخر بن حرب سرگروہ بنی امیہ جو ابوجہل اور ابوہشام کے بعد سب سے بڑا دشمن اسلام اور مخالف بانیٔ اسلام تھا اگرچہ فتح مکہ کے بعد بظاہر مسلمان ہوگیا تھا۔ مگر تادم مرگ اپنے اصلی کفر پر قائم رہا۔ دوسری خلافت کے زمانہ میں اس کے دو بیٹوں۔ یزید اور معاویہ کا یکے بعد دیگرے شام کے زرخیز صوبہ پر گورنر مقرر ہونا۔ اور تیسری خلافت کے طولانی زمانہ میں خاندانی مراعات سے فائدہ اٹھا کر اس قدر زور اور قوت حاصل کرلینا کہ چوتھی خلافت میں۔ قصاص خون حضرت عثمان کا حیلہ کرکے خلیفہ وقت سے مقابلہ ومقاتلہ کرنا۔ لڑائی

کی صورت اپنے حق میں بگڑتی ہوئی دیکھ کر براہ چالاکی ختم کرانا۔ خاتمہ جنگ کے بعد حکمین سے نہایت شرمناک طریقہ کے ساتھ اپنے حق میں فیصلہ کرالینا۔ پھر سب سے بڑھ کر اپنے فاسق وفاجر بدعقیدہ وبدافعال بیٹے کو دنیائے اسلام پر جبراً مسلط کردینا۔ یہ سب واقعات ایسے ہیں کہ ان کی مسلسل کڑیاں ایک دوسرے سے بلکہ اس عظیم الشان واقعہ کی خوفناک زنجیر پہنچاتی ہے امیر معاویہ نے اپنی زندگی میں جو کوششیں یزید کی بیعت ولیعہدی کے متعلق کیں اور جن چار بزرگان حجاز نے جو اس وقت تمام اسلامی دنیا میں ایک خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس نے انکار کیا اس کا مفصل حال ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ مکرر اعادہ تحصیل لاحاصل ہے۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ جو وقار اور جو عزت حسین علیہ السلام کو فرزند رسول اللہ ہونے کی وجہ سے تمام مسلمانوں میں حاصل تھی وہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت زبیر کے بیٹوں کو نہ تھی اس لئے امیر معاویہ کے جانشین کو جو کدوکاوش حسینؑ سے بیعت لینے کی بابت ہوسکتی تھی وہ دوسروں کے ساتھ ممکن نہ تھی جس طرح یزید کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے حسینؑ کا ہٹانا ضروری تھا۔ اسی طرح حسینؑ کے واسطے ایک فاسق اور دشمن اسلام کی بیعت واطاعت اختیار کرنا ناممکن تھا۔ بہرحال یہی واقعات ہیں جن کو اس یادگار لڑائی کا اصلی سبب قرار دیا جاسکتا ہے۔

امر سوم:۔ طرفین کا اس جنگ سے کیا مقصود تھا کے متعلق زیادہ بیان کی ضرورت نہیں۔ تمام واقعات خود پکار رہے ہیں کہ حسین علیہ السلام اسلام کو قائم رکھنا اور بنی امیہ اس کو نیست ونابود کردینا چاہتے تھے، یزید کا مدعا یہ تھا کہ حسینؑ بیعت کرلیں تو پھر مسلمانوں میں اس کے ناشائستہ افعال واقوال پر مخالفت تو درکنار کسی کو نکتہ چینی کی بھی گنجائش اور جرأت نہ رہے گی۔ اور رفتہ رفتہ اسلام کے تمام مقدس احکام معطل بلکہ بنیاد اسلام ہی کھوکھلی ہوجائے گی۔ اور اسلام کے مستحکم وفولادی قلعہ کا ریت کے گھروندے کی طرح منہدم ومسمار ہوکر نشان تک نہ رہے گا لیکن حسینؑ کا نصب العین اور مقصود اور ہی کچھ تھا۔ انہوں نے حمایت اسلام میں اپنا آخری قطرۂ خون تک گرانا منظور فرمالیا اور وہ بات منظور نہ کی جس سے اسلام کی سراسر توہین ہی نہیں

بلکہ بیخ کنی ہو اور شجر اسلام کو جو نفاق و ارتداد کی بادِ سموم سے خشک ہو جانے والا تھا۔ اپنی ذات اپنی اولاد اپنے عزیزوں اور اپنے دوستوں کے خون سے سینچ کر سرسبز و شاداب کیا۔

بلاشبہ حسینؑ کی عظمت ان کی شہادت میں ہے کیونکہ جس نوعیت اور جس ہیئت میں حسینؑ کی شہادت ہوئی وہ بجائے خود عدیم المثال ہے۔ مگر حسینؑ کا اعلیٰ تر درجہ محض شہادت میں نہیں بلکہ اس بلند تر مفہوم میں ہے کہ حسینؑ اولاً مدبر ہیں ثانیاً شہید۔ ثالثاً۔ غرض شہادت ایسی اہم اور ارفع ہے جس کی نظیر شہدائے اولین و آخرین میں نہیں پائی جاتی۔ رابعاً عزم راسخ، عزتِ نفس، استقلال اور حمایت ملت کے کامل ترین نمونہ کا اظہار۔ شہید کون ہے وہ جو اصول کے لئے قربان ہو جاتا ہے۔ مدبر کون ہے وہ جو اپنے ذمہ داری کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ کسی طرح اس پر ان آفات کا الزام نہ لگایا جاسکے جو اس کے فرائض کے ضمن میں دکھائی دیں اور جو حتی الوسع اس بات کے لئے تمام عقلی اور امکانی پہلو اٹھا رکھے جو دفع آفات کے لئے ممکن سمجھے جاسکیں دنیا میں شہید بھی گزری ہیں مدبر بھی گزری ہیں اور ہوں گے مگر ایسے بہت کم گزری ہیں، جو مدبر بھی ہوں اور شہید بھی اور یہ تو بہت ہی شاذ ہے کہ مدبر کو شہادت کی جرأت ہو، اور ہو بھی تو غالباً اور یقیناً ایسا کوئی نہیں ہوا۔ جو حسینؑ کے اتفاقات میں حسنؑ جیسا شہید اور مدبر اور مدبر شہید کیا جاسکے حسینؑ کا زمانہ تدبر جس طرح گزرا۔ اور جس ناقابل برداشت اور تلخ زمانہ کو انہوں نے گزارا وہ کسی باحمیت اور ذی حس انسان کو پیش نہ آیا ہوگا۔ یہی حیرت انگیز سنجیدگی تھی جس کی نسبت لارڈ میکالے نے افراط مبالغہ سے نہیں بلکہ تفریط سے کہا ہے: "کہ اسلام میں اس سے زیادہ سنجیدہ معاملہ نہیں گزرا" یورپین لوگوں میں ایسے شاذ مورخ ہیں جو غیر یورپین یا غیر قومی واقعات کے اعتراف میں سخاوت کو راہ دیں۔ مگر واقعات اور اثر نے موسیو ماربین اور جمیس کار کرن جیسے لوگ پائے جن کی منصفانہ تحریروں سے محتاط یورپ بھی مستثنےٰ نہیں رہا۔

امر چہارم (طرفین بغیر جنگ بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکتے تھے یا نہیں) کے متعلق اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ بنی امیہ کا مقصد بغیر جنگ یوں حاصل نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ حسینؑ کے وجود کو اپنی اغراض کا منافی جانتے تھے، ان کو یقین کامل تھا کہ حسینؑ کسی طرح بیعت پر راضی نہ ہوں گے اس کا آخری نتیجہ لڑائی کی صورت میں رونما ہوگا۔ اور ہمارا مقصود اصلی جو تخریب اسلام اور استیصالِ بنی ہاشم کے قتل کے متعلق ہے، خود بخود حاصل ہو جائے گا۔ ادھر حسینؑ اب زیادہ طرح دینا گناہِ عظیم اور اسلام کی بیخ کنی سمجھتے تھے اس لئے آخر الحیل السیف پر بہ مجبوری عمل کرنا پڑا۔ یہی اسباب تھے جنہوں نے اس جنگ کو اٹل کر دیا تھا۔ تاہم حسینؑ نے آخر دم تک کوشش کی کہ ان کے نانا کے کلمہ گو راہ راست پر آجائیں۔ اہل بیت رسالت کا خون ناحق اپنی گردنوں پر نہ لیں اور جہنم کا ایندھن نہ بنیں مگر افسوس ہے کہ ان بد بختوں پر کچھ اثر نہ ہوا کیونکہ ان کا منشاء اصلی بغیر جنگ حاصل نہ ہوسکتا تھا۔

امر پنجم (طرفین کہاں تک اپنے اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے) ظاہر بیں لوگ اس سوال کا جواب بہت آسانی سے بلا تامل دے سکتے ہیں کہ یزید کامیاب ہوا۔ اور حسینؑ ہار گئے۔ خاندانِ رسالت پر ایسی تباہی آئی جس کی پھر تلافی نہ ہوسکی۔ لیکن کیا درحقیقت یزید کی دلی آرزو پوری ہوئی، کیا واقعی یزید نے اہلِ بیت نبوت کا خاتمہ کرکے شجر اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالا۔ نہیں یہ اس کا خیال خام تھا وہ اپنے دل میں خوش تھا کہ اس کے آباء و اجداد کا بویا ہوا تخم منافقت سرسبز ہوا۔ اسلام اب دنیا سے بالکل مٹ جائے گا۔ لیکن فرزندِ رسول کی قولی و فعلی دعوت اپنا کام کر چکی تھی۔ اس کو محسوس نہ ہوا کہ حسینؑ نے کیا کیا۔ اسلام مٹا نہیں بلکہ حسینؑ نے اس کی بنیاد کو ایسا مستحکم اور استوار کر دیا۔ جو کسی زبردست سے زبردست طاقت کے ہلائے بھی نہیں ہل سکتی۔ حسینؑ نے نہ دین و تمدن صداقت و امانت، سخاوت و قناعت ایثار و ہمدردی، حمیت و غیرت، صبر و استقلال تسلیم و رضا تحمل و شجاعت اور اطمینان قلب کے بہترین نمونے دنیا میں قائم کر دئے بلکہ حسینؑ

نے اپنی ذات اور اپنے اقربا ور رفقا کی قربانیاں چڑھا کر ایمان و نفاق کے حقیقی معنی ظاہر کر دئے اور ایک عالم کو دکھلا دیا کہ مومن کون ہے اور منافق کون ہے۔ شہدائے کربلا کے خون نے فعلی شہادت دی کہ سچے مومن یہی ہیں اور ان کی مخالفت، کفر و نفاق حسینؑ نے چند گھنٹہ میں وہ فعلی دعوت دی جو آنحضرتؐ نے ۲۰ سال میں دی تھی، اور اس تھوڑے عرصہ میں توحید۔ عدل۔ نبوت، امامت، قیامت، صوم صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ، جہاد، تہذیب، اخلاق، تمدن اور سیاست وغیرہ وغیرہ تمام اعمال واجبہ و مستحبہ کو قولاً و فعلاً ثابت کر کے دکھایا کہ دین یہ ہے، اور دیندار ایسے ہوتے ہیں۔

حسینی دعوت اُسی روز ختم نہیں ہوگئی۔ یہ دعوت، دعوت دائمی تھی۔ جو ہمیشہ قائم اور جاری رہے گی، اور اطرافِ عالم میں برابر جاری ہے حسینؑ شہید ہو گئے۔ ان کے یار و انصار سب آغشتۂ خاک و خون ہوئے یزید بظاہر فتحیاب ہوا۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں ہوا حسینؑ زندہ ہیں اس کی دعوت جاری ہے ان کا نام روشن بلکہ روشن تر ہوتا جاتا ہے، یزید مر گیا۔ اس کا نام مٹ گیا۔ کوئی شخص حتیٰ کہ کافر بھی اس کا نام لینا پسند نہیں کرتا۔ اور جو لیتا ہے۔ برائی سے یاد کرتا ہے اس کے نام کے ساتھ ہر زبان پر لفظ پلید یا لعنت اللہ شامل ہے اور نام حسینؑ کے ساتھ ہر زبان پر صلوٰۃ اللہ علیہ منضم۔

حسینؑ کے نام لیوا اور ہوا خواہ ہر روز اطراف عالم میں بڑھتے جاتے ہیں جن کی تعداد کروروں سے متجاوز ہے، لاکھوں مکانوں میں خاص حسینؑ کا ہی ذکر ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی دن دنیا میں ذکر حسینؑ سے خالی نہیں جاتا اور ایک دن ایسا آتا ہے جس میں ہر فرد بشر حسینؑ کو یاد کرتا ہے گویا دعوت حسینی ہر کان تک پہونچ جاتی ہے۔ ہر طبقہ، ہر مذہب، ہر قوم اور ہر ملک میں حسینؑ کا ذکر خیر ہوتا ہے۔ منکرین چاہتے ہیں کہ اس شمع ہدایت کو بجھا دیں اور اُس آفتاب پر خاک ڈالیں مگر ان کی یہ کوشش بے سود ہے اس صداقت کو دنیا آشکارا دیکھ رہی ہے کیسے کیسے جابر حکام وقت اور بادشاہوں نے نام حسینؑ کو مٹانے

کی کوششیں کیں مگر اس نور کی تابندگی بڑھتی گئی۔ واللہ مُتم نورہٖ ولو کرہ الکافرون ذبح عظیم کی قربانی قبول ہوئی، دعوت حسینی نے اپنا اثر دکھلایا۔ منافقین کی ناک رگڑی گئی۔ اور دشمنان اسلام ذلیل و خوار ہوئے۔

امر ششم (اس واقعہ نے کیا نتائج پیدا کئے) کوئی حادثہ یا واقعہ اتفاقاً وقوع میں آئے یا بالارادہ اور وہ ارادہ یا وقوع خواہ کسی بڑی طاقت کی طرف سے ہو یا کسی چھوٹی طاقت کی جانب سے ضرور ہے کہ اس کا کچھ نہ کچھ اثر اور نتیجہ پیدا ہو۔ شہادتِ حسینی تاریخ عالم کا ایک عظیم الشان واقعہ اس لئے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس شہادت نے کیا اثر اور کیا نتیجہ پیدا کیا، گو اس کا جواب ہمارے مذکورۂ صدر مضامین میں متفرق طور پر آچکا ہے، تاہم یہاں اجمالاً اتنا ذکر کرنا ضروری ہے کہ اس شہادت نے حق کو اپنے مرکز پر قائم کر دیا۔ دین محمدی کی گرتی ہوئی دیوار نہایت استحکام کے ساتھ سنبھل گئی حق و باطل کا امتیاز اعلان و اشتہار کے ساتھ آشکارا ہو گیا۔ لوگوں کو بنی امیہ کی گمراہی اور خاندانِ رسالت کے ساتھ معاندانہ برتاؤ آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہو گیا لوگوں کے خیالات پر اس کا شدید اور سخت اثر پڑا۔ گویا اس شہادت نے اسلام کے نیم مردہ قالب میں تازہ روح پھونک دی اور فرزند رسول نے بیعتِ یزید سے انکار اور مصائب و شدائد پر حیرت انگیز استقلال نے مسلمانوں پر ظاہر کر دیا کہ فاسق و فاجر ہرگز خلیفہ رسول نہیں ہو سکتا گو امت کا اجماع اور تسلط فی الارض ہوا کرے۔

اسی شہادت کا نتیجہ ہے کہ آج اسلام کہیں اپنی اصلی اور کہیں اپنی بگڑی ہوئی صورت میں نظر آتا ہے، ورنہ اسلام اسی زمانہ میں رجعتِ قہقری کر کے اپنے اصلی مقام پر آجاتا اور تمام دنیا پر بدستور سابق کفر و فسق کی گھنگور گھٹا چھا جاتی، جو لوگ یزید کو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین سمجھ کر، اپنا امام نہ صرف دنیاوی بلکہ دینی پیشوا جانتے تھے۔ اس کے ملحدانہ افعال اور فاجرانہ اقوال سے متاثر ہو کر الناس علیٰ دین ملوکھم کے پورے مصداق بن جاتے اور رفتہ رفتہ مذہبی احساس میں اس قدر جمود پیدا ہو جاتا کہ وہ (آج کل کے

عیسائیوں کی طرح محض نام کے مسلمان رہ جاتے اور شاید نام کے بھی نہ رہتے۔

یہی وہ مہتم بالشان نتیجہ ہے جو کسی لڑائی نے اپنے بعد دنیا میں نہیں چھوڑا۔ اور جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ بنی امیہ اسلام کو مٹانے کے عوض خود مٹ گئے آج ان کا کوئی نام لینے والا بھی نظر نہیں آتا۔ اور حسینؑ کو ہم کیا غیر مذہب والے جو اُن کے نانا کی رسالت کو بھی نہیں مانتے تعظیم و تکریم سے یاد کرتے۔ موسیو ماربین نے شہادت حسینی کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے جو رائے ظاہر کی ہے وہ بھی قابلِ غور ہے وہ لکھتا ہے۔

حسینؑ کے قتل ہوتے ہی اور ان دردانگیز واقعات کے پیش آتے ہی اور ان کی عورتوں اور بیٹیوں کے اسیر ہوتے ہی بنی امیہ کے باطن کا حال طشت از بام ہوگیا۔ اور ان کے اعمال ناشائستہ کے قبائح عالم پر روشن ہو گئے۔ سیاسی احساسات اور مخالفت (رِوُولیوشن) کا مادہ مسلمانوں میں پیدا ہوگیا چنانچہ چند ہی روز کے بعد سلطنت یزیدی کے خلاف شورشیں شروع ہوگئیں، بنی امیہ کو مخربِ اسلام سمجھ کر لوگ ان کی بدعتوں اور اختراعی اُمور کا رَدّ کرنے لگے۔ انہیں ظالم و غاصب اور ان کے برعکس بنی ہاشم کو مظلوم اور مستحقِ ریاست جاننے لگے۔ بلکہ حقیقی روحانیتِ اسلام ان ہی میں سمجھی گئی۔ گویا مسلمانوں نے حیات تازہ اور نئی زندگی حاصل کی۔ اور اسلام کی روحانیت کیلئے ایک نئی شان پیدا ہوگئی۔ اسلام کی ریاستِ روحانی جو دفعتاً زائل ہوگئی تھی اور مسلمان جو اسلام کے جذبۂ روحانیت کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ اس خاص نورانیت اور شان کے ساتھ اس کی تجدید ہوئی جس طرح حسینؑ کے مصائب کی عظمت تمام روحانیینِ سلف کے مصائب پر افضل و مسلّم ہے، اسی طرح اس ہیجانِ مخالفت کی عظمت جو حسینؑ کے بعد پیش آئی۔ تمام پہلے (رِوُولیوشن) سے بڑھ گئی بلکہ اس کا زمانہ بھی زیادہ اور اثرات بھی ان سے زیادہ تھے۔

اِن وجوہ سے آلِ محمد کی مظلومیت کا اعلان تمام عالم میں ہوگیا۔

پہلا نتیجہ اس ہیجانِ مخالفت (رِوُولیوشن) کا یہ ہوا کہ ریاستِ روحانی جو عوالم سیاست میں بڑی مہتم بالشان چیز ہے، از سرِ نو بنی ہاشم خصوصاً اعقابِ حسینی میں مسلم ہوگئی (مورخِ موصوف کی غرض ائمہ اہل بیت سے ہے) اب تک بھی بنی ہاشم بالخصوص وہ لوگ جو حسینؑ کی نسل سے ہیں ایک خاص نظر روحانیت سے تمام مسلمانوں میں دیکھے جاتے ہیں اور چند سال بھی نہ گزرے تھے کہ باوجود اس اقتدار اور وسعت کے خاندانِ یزید سے سلطنت نکل گئی اور ایک صدی سے کم میں تمام بنی امیہ پر زوال آگیا، اور اس طرح نیست و نابود ہوئے کہ آج اُن کا نام و نشان بھی موجود نہیں اور جب کبھی کتابوں میں ان کا نام آجاتا ہے تو مسلمان ایک کلمۂ شماتت اس کے ساتھ منضم کر دیتے ہیں یہ سب حسینی سیاست و تدبر کے نتائج ہیں، کہا جا سکتا ہے کہ اربابِ ادیان و روحانیین میں سلف سے آج تک ایسا انجام بیں عاقبت اندیش مستقل مزاجی سرگزشت کے ساتھ تاریخ نے یادگار نہیں چھوڑا!"

امرِ ہفتم! (یہ جنگ مذہبی تھی یا سیاسی) اس سوال کے جواب کی تحریر سے پہلے ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ مذہب کیا چیز ہے، لفظ مذہب کے لغوی معنی راہ۔ روش۔ طریقہ وغیرہ ہیں مگر اصطلاح میں نفسِ انسان کی ایک خاص روش یا طرز خیال کو مذہب کہتے ہیں۔ ایک فلسفی نے مذہب کی تعریف ان جامع و مانع مگر مختصر الفاظ میں کی ہے کہ "وہ ایک خاص تعلق ہے جو عبد و معبود کے درمیان قائم ہے"۔ بالفاظ دیگر کسی قدر زیادہ وضاحت سے "مذہب اُن خاص خیالات کا نام ہے جو انسان کے دل میں ایک بالاتر ہستی کے ماتحت اپنی عام ذمہ داری اور ادائے فرض کی نسبت ہوتے ہیں اور ان خیالات کا اظہار عمل کی صورت میں ہوتا ہے" گویا مذہب ایک شاہراہ ہے جس پر انسان چلتا ہے بعض اوقات دین و ایمان بھی مذہب

کے مرادف بولے جاتے ہیں۔ بہر حال لفظ مذہب سے ایک قادر مطلق کی ہستی کا یقین مراد ہے اور چونکہ جزائے اعمال کا خیال اسی یقین کیساتھ وابستہ ہے اس لئے حشر و نشر یا معاد کا اعتقاد بھی مفہوم مذہب میں داخل ہے اس اعتبار سے خدا کی ہستی اور جزا و سزا کا انکار لامذہبی ہے جس کو دہریت اور مادیت سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ مذہب ایک ایسا با وقعت اور ضروری سوال ہے جس پر ہر فرد بشر کو غور و خوض کرنا لازم ہے، دنیا میں میری حیثیت کیا ہے دوسری مخلوقات سے میرے تعلقات کیا ہیں میں کہاں سے آیا، اور کہاں جاؤں گا۔ میرے گرد و پیش کیا کیا چیزیں ہیں۔ میرا آغاز کیا تھا اور انجام کیا ہونے والا ہے، موت و حیات کا مفہوم کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب ہر شخص کو کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے۔ انسان کیسا ہی کاہل اور کیسا ہی خود غرض اور کتنا ہی خود بین، کیوں نہو، تاہم ان سوالات سے اس کو مفر نہیں۔ یہ سوالات اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے، فرقہ لاادریہ (جو ایک قادر مطلق کی ہستی میں شک رکھتا ہے) اور فرقہ دہریہ (جو اس کے وجود کا منکر ہے) اپنے اپنے مذاق کے موافق ان سوالات کے جواب کچھ نہ کچھ ضرور دیتے ہیں گو ان کے جواب کیسے ہی ناتمام اور کیسے ہی ناقابل اطمینان کیوں نہوں۔

تجربہ شاہد ہے کہ کائنات سے بالاتر ایک اعلےٰ وجود کا تصور انسان کے دل سے محو نہیں ہو سکتا۔ ایک دہری بھی اس وجود کو ایک اعلےٰ قوت مبدا اول، سبب اول۔ یا علت العلل کے نام سے موسوم کرتا ہے اگرچہ وہ اس وجود میں ان صفات کاملہ کو جو اہلِ مذہب ذات خداوندی میں ثابت کرتے ہیں تسلیم نہیں کرتا۔ تاہم اس کا اتنا ہی اقرار کہ عالم محسوسات سے بالاتر ایک اعلےٰ قوت موجود ہے۔ خدا کی ہستی پر ایک طرح کی وجدانی یا اندرونی شہادت ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ مذہب کا سکہ منکروں کے دلوں پر بھی بیٹھا ہوا ہے۔ اور ان کا نفس بھی اس کے اثر سے خالی نہیں گو وہ بظاہر اس کے منکر ہیں۔

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا ؎ آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تجھ کو تعبیر ؎ انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

ممکن ہے کہ انسان کسی خاص مذہب کو ترک کر دے اور اپنے پہلے اعتقاد کو باطل یا وہم پرستی قرار دے کر اس سے متنفر ہو جائے، جیسا کہ بعض اوقات دیکھنے میں آتا ہے مگر یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ بالکل خالی الذہن ہو جائے اور اس کے دل میں قطعاً کوئی اعتقاد نہ رہے، اگر ایک ظرف پانی سے بھرا ہوا ہو اور اس کا پانی گرا دیا جائے تو ہوا پانی کی جگہ فوراً داخل ہو جائے گی۔ ظرف کا بالکل خالی رہ جانا محال ہے انسان کا ذہن بھی بمنزلہ ایک ظرف کے ہے۔ ادہر ایک خیال یا اعتقاد اس میں سے نکلا، اُدہر دوسرا داخل ہوا۔ بہر حال ایک اعلےٰ وجود کا تصور کسی نہ کسی حیثیت سے دل میں ضرور قائم رہتا ہے۔

خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کے ساتھ ہی جزائے اعمال کا خیال انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے یعنے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ میں اپنے افعال کا ذمہ دار ہوں۔ دنیا چند روزہ ہے ایک دن اس پاک ہستی کے سامنے جس کی طرف بازگشت ہے۔ مجھے اپنے افعال کی جوابدہی کے لئے ضرور حاضر ہونا پڑیگا۔ جیسا بیج اس دنیا میں بویا ہے، ویسا ہی پھل دوسری دنیا میں ملنے والا ہے۔ یہ خیال بھی وجودِ خدا کے خیال کی طرح ایک حد تک انسانی فطرت میں داخل ہے۔ کوئی شخص اس خیال کو اپنے دل سے محو نہیں کر سکتا وہ کتنے ہی کوشش کرے مگر ممکن نہیں یہ خیال اس کے دل سے نکل جائے۔ ایک دہری یا لاادری بھی اس خیال کی جھلک اندر رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص (پابند مذہب ہو۔ یا لامذہب۔ مذبذب ہو، یا متشکک۔ دہری ہو یا لاادری) کوئی نیکی کرتا ہے مثلاً بھوکے کو کھانا کھلانا۔ ننگے کو کپڑا پہنانا۔ بیمار کی تیمارداری۔ یا مظلوم کی حمایت تو اس کے دل کو کم و بیش خوشی ضرور ہوتی ہے۔ مگر جب وہ کسی بدی کا ارادہ کرتا ہے، مثلاً چوری دغابازی مردم آزاری قتل و غارت وغیرہ تو اس کا (کانشنس) وجدان ضمیر یا نفس لوامہ اس کو ضرور ملامت کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل نہ کرے اور اس فعل کا مرتکب ہو جاتی مگر اس کا ضمیر بُری باتوں سے روکتا ضرور ہے! البتہ انسان کی متواتر حق تلفی کی وجہ سے، یہ اندرونی آواز دھیمی پڑ جاتی ہے اور اس کا زور کم ہو جاتا ہے۔ آخر یہ حالت کیوں ہے جہاں تک غور کیا جاتا ہے۔ اس کا

بڑا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال انسان کی فطرت میں ضرور ہے کہ میں کسی صاحبِ قدرت کے سامنے اپنے بُرے بھلے افعال کا ذمہ دار اور جوابدہ ہوں وہ اپنی زبان سے اس بات کا اقرار کرے یا نہ کرے مگر اس کی فطرت اور طرزِ عمل سے ایک حد تک اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

اِس کے علاوہ اگر قانونِ اخلاق کے اصول پر غور کیا جائے تو اُن سے مذہب کی ضرورت ثابت ہوتی ہے، ہر شخص بالطبع اس بات کا طالب ہے، کہ اس کی زندگی دنیا میں امن و امان سے بسر ہو، اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے وہ یا تو حالتِ تجرّد کو پسند کریگا یا حالتِ تعلق کو حالت تجرّد سے یہ مراد ہے کہ دنیا اور ما فیہا سے قطع تعلق کر کے جنگلوں یا پہاڑوں میں جا بسے، جہاں نہ خور و نوش کا فکر ہو۔ نہ بال بچوں کا غم۔ بھوک لگی تو جنگل کی بناس پتی کھالی۔ پیاس لگی تو بہتے چشموں سے بجھالی۔ سب سے آزاد اور سب سے اُلگ تھلگ یہ حالت گو بظاہر کیسی ہی اچھی معلوم ہو مگر منشائے فطرت کے خلاف ہے اول تو ہر شخص ایسا کر نہیں سکتا، دوسرے یہ طرزِ عمل دنیا کی ترقی میں ایک زبردست سدِ راہ ہی نہیں بلکہ اس کی تعمیل سے نظامِ عالم ہی درہم و برہم ہو جائیگا کسی نے خوب کہا ہے "جو دنیا سے کنارہ کش ہو کر گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھتا ہے۔ وہ یا تو فرشتہ ہے۔ یا حیوان" بہرحال یہ حالت انسان کے مناسب حال نہیں اب ہی حالتِ تعلق یہ البتہ انسان کی ضرورت اور اس کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہے کیونکہ وہ فطرتاً مدنی الطبع بنایا گیا ہے۔ باہمی امداد کے بغیر اس کا کام چل ہی نہیں سکتا۔ اس لئے اس کو تعلقات کے بغیر چارہ نہیں لیکن ان تعلقات کے فرائض اور ذمہ داریوں کے پورا کرنے کے لئے ایک قانون کی ضرورت ہے جس پر ہر شخص عمل کرے اور خود غرضی کی وجہ سے دوسروں کے حقوق میں دست اندازی نہ کرنے پائے۔ تاکہ ہر شخص کے جان و مال و آبرو محفوظ رکھ سکے اور امن قائم رہے، اس قانون کو قانونِ تمدن۔ یا قانونِ اخلاق کہتے ہیں۔ مذہب کی علتِ غائی اس قانون کو پیش کرنا اور اس کی تعمیل کرانا ہے، غرضیکہ مذہب اصل ہے اور تمام امور جو تمدن سے تعلق رکھتے ہیں اس کی فرع۔

المختصر انسان کو اپنی فطری ضرورتوں کی انجام دہی کے لئے مذہب کی طرف رجوع کرنے

اور اس پر عمل پیرا ہونے کی سخت ضرورت ہے، کیونکہ دنیا کے انتظام کی کُل زیادہ تر مذہب کے ہی ذریعہ سے چلتی ہے لہذا مذہب کے بغیر انسان کا کام چل ہی نہیں سکتا۔ جن اخلاقی مسائل، قوانینِ شریعت اور اصولِ تمدن پر مذہب زور دیتا ہے ان کو دہری اور لامذہب بھی عموماً تسلیم کرتے ہیں، ان لوگوں کو بھی طوعاً و کرہاً اُن اصول و قوانین کی تعمیل کے بغیر چارہ نہیں۔ مثلاً ماں باپ کی اطاعت استاد کا ادب محسن کا شکریہ، دوسروں کی معافی قصور سلوکِ ہمسایہ کرنا۔ چوری نہ کرنا۔ جھوٹ نہ بولنا۔ غیبت سے بچنا۔ خونِ ناحق سے پرہیز۔ وغیرہ وغیرہ جو مذہب کی رُوحِ رَواں ہیں ان کو لامذہب بھی۔ نظامِ تمدن کے قیام و استحکام کے لئے ایسا ہی ضروری سمجھتے ہیں جیسا اہلِ مذہب، لہٰذا مذہب کی ضرورت اور لامذہبی پر اس کی فوقیت کی یہ ایک قوی دلیل ہے۔ قانونِ اخلاق کی ضرورت تو خدا پرست اور منکرِ خدا دونوں کے نزدیک مسلّم ہے مگر فرق اتنا ہے کہ خدا پرست اس کو باقاعدہ مانتا ہے یعنی قانون کے ساتھ مقنّن کے وجود اور اس کی حکمت و قدرت وغیرہ صفاتِ کاملہ کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن لامذہب صرف قانون کو مانتا ہے اور مقنّن کے وجود کا منکر ہے اِس لئے خدا پرست کا عقیدہ مستحکم اور پائدار ہے اور دہری کا عقیدہ کمزور اور ناپائدار بنا بر ایں کہا جاسکتا ہے کہ لامذہبوں کا عقیدہ الیسا ہے جیسا تارِ عنکبوت۔ اگر نیکی کو عمارت کہا جائے تو مذہب کو اس کی بنیاد کہنا صحیح ہوگا، یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی عمارت کی بنیاد مضبوط چٹان پر رکھنے کے بجائے ریتلی زمین پر رکھی جائے تو وہ قائم نہیں رہ سکتی۔ جلد بیٹھ جائیگی۔ اسی طرح اگر اخلاق قانون یعنی نیکی کی بنیاد مذہب کے بجائے کسی اور شے پر رکھی جائیگی تو اس کے استحکام کی بھی کوئی توقع نہیں ہو سکتی

بہرحال ایسا عالمگیر قانون جو فطرت و عقل کے مطابق اور عدل و انصاف پر مبنی ہو اس کا مقنّن وہی ہو سکتا ہے جو اس عالم کا علۃ العلل اور مسبب الاسباب ہو، اور اس قانون کے معانی و مفہوم کے مفسّر کا تعین بھی اسی کی ذات سے متعلق ہے۔ اسی مفسّر کو ہم لفظ نبی یا رسولؐ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ موجوداتِ عالم سے جمادات میں صرف رُوحِ جمادی موجود ہے۔ نباتات میں رُوحِ جمادی و نباتی ہی، حیوانات میں رُوحِ جمادی۔ نباتی۔ اور حیوانی پائی جاتی ہے، انسان میں

روح جمادی۔ نباتی۔ حیوانی اور انسانی موجود ہیں، رسول یا نبی میں، ان چار کے علاوہ پانچویں روح اور ہوتی ہے جس کو روح اللہ کہا جا سکتا ہے، یہ روح دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی۔ اس لئے نبی ایک ایسی مخلوق ہے جو انسان بھی ہے۔ اور انسان سے بالاتر بھی۔ یہ روح یعنی قوتِ نبوت کسی ریاضت، عبادت، یا تحصیل علم سے حاصل نہیں ہو سکتی جس طرح جمادات میں سے کوئی خود ترقی کر کے نباتات میں شامل۔ یا کوئی حیوان خود ترقی کر کے انسانوں کے زمرہ میں داخل نہیں ہو سکتا اسی طرح عام انسان خود ترقی کر کے یا دوسری مخلوقات کی مدد سے نبی نہیں بن سکتا۔ نبوت ایک عطیۂ الٰہیہ ہے۔ کسی چیز سے نہیں، جب سے دنیا میں نسل آدم کا ظہور ہوا۔ دین حقہ کی طرف قولی و فعلی دعوت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ یہ بات اور ہے کہ کوئی اس سے خود مستفید نہیں ہوا۔ جس طرح نبی ایک خاص مخلوق ہوتا ہے اسی طرح اس کا نائب بھی خاص مخلوق ہونا چاہیئے۔

نبی فطرتاً نبی ہوتا ہے، وصی یا امام بھی فطرتاً امام ہوتا ہے جس طرح عام انسان ترقی کر کے نبی نہیں بن سکتے، اسی طرح وہ ترقی کر کے امامت کا منصب بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ نبی اور اس کا قائم مقام دونوں مذہب اور قانونِ الٰہی کے محافظ اور اس کے تبلیغ و اشاعت کرنے والے ہوتے ہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر نبی اپنے پیشرو نبی کی تصدیق کرتا ہے اور آنے والے کی بشارت دیتا رہا ہے یہ سلسلہ جناب ختمی مآب تک جاری رہا۔ آنحضرتؐ نے حضرت عیسےٰ کی تصدیق کی۔ اور آئندہ کے لئے لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ فرمایا۔ اس لئے آنحضرت پر اور بھی زیادہ لازم ہوا کہ اپنے بعد قولی و فعلی دعوت کو جاری رکھنے کا انتظام فرما دیں۔ چنانچہ حضرت نے اپنی رحلت کے قریب فرمایا کہ میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک کتاب خدا دوسرے میرے اہل بیت اگر تم ان دونوں سے متمسک رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے اس حکم سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن مجید قولی دعوت ہے اور عترت رسول فعلی دعوت ؛؛

یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ تدین اور تمدن دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے ضروری ہے نبی جو منجانب خدا صاحب امر ہوتا ہے۔ تدین اور تمدن دونوں میں ہوتا ہے یہ نہیں کہ دینی امور میں ہم اس کی اطاعت کریں اور دنیادی میں نافرمانی نبی کو روحانیات اور سیاسیات دونوں پر اقتدار کامل حاصل ہے، وجہ یہ کہ جہانداری و سیاست ہی عام احکام کو عمل میں لانے کا بہترین میدان ہے، گو مذہب سیاست کے بغیر بھی محدود اور مخدوش حالت میں قائم رہ سکتا ہے مگر ممکن الوقوع وسعت اور عالمگیر مفاد بغیر سیاسی اقتدار کے قائم نہیں رہ سکتا بحالتِ سیاست ہی یہ انسانی زندگیوں پر اثر ڈال سکتا۔ اور ان کے حقوق کی حفاظت اور فرائض کا تعین کر سکتا ہے اس کے زیرِ سایہ حدود اللہ کی حمایت و صیانت ہو سکتی۔ اور ان کے توڑنے والوں کو سزا مل سکتی ہے اگر تدین کے ذریعہ سے دین کی تبلیغ ہوتی ہے۔ تو سیاست کے وسیلہ سے دین کی حفاظت، اگر سیاست دشمن کے ہاتھ میں ہے تو ہمارا تدین بالعموم خطرہ میں ہے،

یہی وجہ تھی کہ جناب ختمی مآب کو تدین و تمدن تبلیغ دین۔ سیاست عامہ دونوں پر اقتدار کلی حاصل تھا۔ البتہ دنیاوی صیغوں میں ان کی حکومت عام دنیاوی بادشاہوں کی طرح نہ تھی۔ بلکہ آپ حقیقی معنوں میں خلافتِ الٰہیہ کے دارا تھے۔ اگر عترتِ رسول کو بھی اسلامی سیاسیات پر ویسا ہی اقتدار حاصل رہتا تو کسی قدر بہتر ہوتا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اور اس کے نتائج اسلام کے واسطے جس طرح مہلک اور ضرر رساں ثابت ہوئے وہ محتاجِ تشریح نہیں ہیں۔ اب عترتِ رسول کے لئے دو راہیں تھیں۔ یا تو خلافتِ رسول اللہؐ کے واسطے تلوار اٹھائیں اور حمایت و صیانتِ اسلام کے لئے سیاست اختیار کریں۔ یا اپنے منصب سے دست بردار ہو کر۔ خاموشی کے ساتھ تبلیغِ دین میں مصروف رہیں۔ مگر ان مقدس بزرگواروں نے دوسری شق کو اختیار فرمایا اور اپنے مخالف کی تمام سختیوں کو بڑے صبر و تحمل سے برداشت کیا۔ یزید کا تخت نشین ہو کر اسلامی سیاسیات پر اقتدار کامل نہ دین کے ہی لئے مہلک ضرب تھی حسین علیہ السلام جو بانی اسلام کے نواسے وارث حقیقی اور جانشین اصلی تھے ان کے واسطے یہ سب سے اہم مشکل کا وقت

تھا۔ اور وہ سوچ رہے تھے کہ کون سی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ اسلام مٹنے سے محفوظ رہے۔ اگر مخالفِ اسلام اور فاسق و فاجر کی بیعت و اطاعت اختیار کی جاتی ہے تو مذہب اسلام اپنے اصلی مقام کو رخصت تہقری کرتا ہے اور اگر بیعت نہیں کرتے تو ایک زبردست دشمن سے معرکہ آرا ہونا پڑتا ہے اس لئے اب آپ کے سامنے تین راہیں تھیں یا تو بیعتِ یزید کر کے اسکے تمام حرکات کو جو صریح خلاف تھیں جائز تسلیم کر لیں یا اس کے مقابلے کے لئے بنی ہاشم اور دوسرے قبائلِ عرب کو جمع کر کے ایک لشکر تیار کریں یا اپنی جان اسلام پر قربان کر دیں اور حمایتِ دین کے واسطے آخری عظیم الشان قربانی دیں پہلی راہ اسلام کے لئے سم قاتل تھی دوسری شق اختیار کرنے سے بھی داعی و ہادی کی مصلحت پوری نہ ہوتی، لوگ اس کو سلطنت کی جنگ سمجھ لیتے۔ اس لئے آپ کو اس آخری فیصلہ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اپنی جان اپنی اولاد اور اپنے مال کو اسلام پر قربان کر دیں اس لئے ایک ہم ہی کیا کسی کو بھی اس کہنے میں تامل نہ ہو گا کہ حسینؑ دینِ اسلام کو قائم رکھنا اور بنی امیہ اور اس کو بالکل نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے جس کا آخری نتیجہ اس لڑائی کی صورت میں نکلا۔ اس واسطے یہ کوئی ملکی لڑائی نہ تھی۔ بلکہ مذہبی جنگ تھی۔ مگر جہادِ مدافعت نہ جہادِ تبلیغ۔

امر ہشتم:- (اس جنگ کی ذمہ داری کس فریق کے ذمہ عائد ہوتی ہے اور امام علیہ السلام کی روش نزاعی تھی یا دفاعی)

جہاں تک تمام واقعات پر نظرِ غائر سے تبصرہ کیا جاتا ہے ہر ایک واقعہ خود پکار رہا ہے کہ اس جنگ کی ذمہ داری کا بوجھ بادشاہِ وقت یزید کے ذمہ ہے، اور فرزند رسول اللہ کی روش ہرگز نزاعی نہ تھی اسکے وجوہ اور دلائل حسبِ ذیل ہیں۔

حضرت امام حسین اور یزید کے معاملات مکہ سے شروع نہیں ہوتے، بلکہ مدینہ سے مکہ سے حضرت مسلم کو روانۂ کوفہ ہوتے دیکھ کر بعض خیال اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حضرت نے طلبِ خلافت کے لئے نزاعی روش پر پیش قدمی کی اور یہی غلطی کی ابتدا ہے جس میں سانحۂ واقعات کی طرف

سے بے خیالی ایک غلط استنباط کی محرک ہوتی ہے، حالانکہ اگر واقعات کی ابتدا بجائے مدینہ کے مکہ ہی سے ہوئی ہوتی تاہم یہ بات قابل غور تھی کہ جن صورتوں میں حضرت مسلم کو روانہ کیا ان کی نسبت یہ کہنا کہ آپنے نزاعی روش اختیار کی، کیا درحقیقت ایک فاش اور شرمناک غلط فہمی نہیں ہے۔ کیا یہ حسینؑ تھے جنہوں نے مدینہ میں رہنے پر قناعت نہ فرمائی یا انہوں نے مدینہ میں بیٹھ کر سامانِ حرب کی فراہمی شروع کی نہیں بلکہ وہ یزید تھا جس نے اپنے عامل کو یہ حکم بھیجا کہ حسین کو یا زندہ ..... گرفتار کرے یا ان کا سر میرے پاس بھیج دے، اگر وہ میری بیعت سے انکار کریں۔ یہ حسین نہ تھے جنہوں نے فرمایا کہ عنقریب ہم میں اور ہمارے دشمنوں میں جنگ ہوا چاہتی ہے اور ایسے خیالات کے اظہار سے وہ اپنے مددگاروں اور دوستوں کو آئندہ جنگ و جدل کے لئے تیار کر رہے ہوں بلکہ وہ یزید تھا جس نے ایسے خیالات اپنی فوج اور افسروں کے سامنے ظاہر کئے اور ان سے مستعدی کا عہد لیا، اگر حسین قیامِ مدینہ سے قیامِ مکہ تک یہ ارادہ اور عزم فرماتے کہ ہم کوفہ جائیں اور اہل کوفہ سے مدد لیکر یزید کی سلطنت کو اولٹ دیں تو آپ کے لئے نسبتاً یہ آسان تھا کہ مدینہ سے ہی براہِ راست کوفہ کو روانہ ہو جاتے نہ یہ کہ مکہ جا کر اس کا انتظار کرتے کہ کہیں مدینہ سے کوئی متعاقب فوج یا خود عامل مکہ کی حکومت یزید کے حکم سے گرفتار کرے کہیں اس کا تذکرہ نہیں ہے کہ امیر معاویہ کی موت سے اس وقت تک کہ ولید کا بیعت کے لئے حضرت پر اصرار ہوا یا مدینہ سے مکہ تک اثنائے سفر میں یا مکہ کے دوران قیام میں۔ حضرت نے کبھی یہ ظاہر نہ فرمایا کہ آپ مکہ معظمہ کو فوجی مرکز قرار دینا چاہتے ہیں حالانکہ اگر آپ کی یہ غرض ہوتی کہ اپنے وطن میں اپنے مددگاروں کو جمع کریں، یا مکہ میں ایسی روش اختیار کی جائے۔ تو ان دونوں مقامات میں بہ نسبت کوفہ کے تھوڑی ہی سہی مگر مدد کی قوی امید ہوتی جن میں سے اگر ایک وہ مقام تھا۔ جس کی عالمگیر شہرت آپ کے جد بزرگوار کی ذات اقدس سے پیدا ہوئی تھی تو دوسری جگہ تمام بلاد اسلامیہ سے آپکے نانا کے کلمہ گو پہلے جمع ہو رہے تھے۔ کہ ارکان حج بجالائیں۔ حضرت نے نہ صرف اس وقت جب تک کہ آپ ۳ شعبان کو مدینہ سے جلاوطن ہوئے۔ کوئی کوشش ایسی نہیں کی جس سے

آپ پر نزاعی روش کا حرف رکھا جا سکے۔ بلکہ مکہ معظمہ میں بھی آپ نے جب فرمایا۔ یہی فرمایا کہ بس مکہ میں رہوں گا جب تک رہنے دیا جاؤں گا۔ یا جب عبد اللہ ابن زبیر نے مدد کا وعدہ کیا تو آپ نے یہی جواب دیا کہ مکہ میں خوں ریزی جائز نہیں ہے یا یہ فرمایا کہ میں وہ مینڈھا نہیں ہونا چاہتا جس سے حرمت خانہ کعبہ ضایع ہو اب ہم ہر صاحب عقل اور صاحب انصاف سے عقل و انصاف کا واسطہ دیکر پوچھتے ہیں کہ کوئی شخص جو کسی مقام کے متعلق ایسے خیالات رکھتا ہو کیا وہ ایسی جگہ کو اسلئے پسند کریگا کہ اُسے فوجی مرکز قرار دے اور اگر ایسا ہی تھا کہ حضرت نے اُسے فوجی مرکز قرار دینے کا ارادہ کیا تھا تو ہمیں اس کے متعلق کوئی واقعہ یا قرینہ بتایا جائے ہم اس کے ثبوت میں ایک لفظ کو بھی قبول کر لینے پر آمادہ ہیں اگر تمام اسلامی تاریخوں سے ہمارے سامنے پیش کیا جائے کہ حضرت نے مسلمانوں کے مجمع کو جو حج کے لئے جمع ہو رہا تھا، کسی ایک فقرہ یا ایک لفظ سے یزید کے خلاف برانگیختہ کیا یا اپنی مدد کے لئے کوئی اپیل کی۔ کیا کوئی شخص جس کو قدرت نے عقل سلیم عطا کی ہو، یہ باور کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے کہ جس نے خلافت و سلطنت کی تمنا کی ہو، وہ ایسے نادر موقعہ کو جس سے بڑھ کر ہاتھ آنا ممکن نہیں اس طرح ضائع کر دے۔

خیر مجمع حجاج کو جانے دو جہاں پیغمبر اسلام کے نواسہ کا مسلمانوں سے اپنے مدد کے لئے استغاثہ بہت کچھ اثر دکھا سکتا تھا۔ اور وہ سوچ سکتے تھے کہ ہم ایک رسمی عبادت کو پورا کر کے کیا کریں گے جب ہم سے وہ فریاد کر رہا ہے جو کعبۃ اللہ کو بتوں سے پاک کرنے والے کا گوشت و خون اور روح ہے اپنے دشمن گھیرے ہوئے ہیں اس کی مدد اہم ترین فرض ہے۔ سب نہ سہی تھوڑے ہی متاثر ہوتے اور حسینؑ اسی کو غنیمت سمجھتے کہ کچھ نہیں ہے سے تو کچھ ہے بہتر ہے۔ ہم اس خیال سے باز آتے ہیں اور اتنا پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ مورخین اسکے تو قائل ہیں کہ حضرت کے مکہ پہنچتے ہی لوگوں کا ہجوم ہونے لگا۔ اور عمائد و اکابر حجاز شرف قدمبوسی حاصل کرنے کے لئے حاضر ہونے لگے مگر کیا کوئی لفظ کوئی فقرہ کوئی خطبہ ایسا پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس سے حضرت

نے اس مجمع کو مخاطب کیا ہو اور اس سے مدد چاہی ہو۔ اس سے یہ امر صاف ہو گیا کہ حضرت کے قیام مدینہ یا قیام مکہ کے زمانہ میں آپ کی طرف سے کوئی تحریک خلافت طلبی کے متعلق نہیں ہوئی البتہ زمانہ قیام مکہ میں کوفہ والوں کی جانب سے تحریک ہوئی جسے حضرت روک نہ سکتے تھے مگر اس کو آپ نے منظور نہ کیا، قاصدوں کو کوئی جواب نہ دیا، خطوط پھینک دئے یا صاف انکار کر دیا مدینہ میں حضرت کے طرز عمل سے جو کچھ واضح ہے، وہ یہ ہے کہ اگر آپ بلا بیعت چھوڑ دئے جاتے تو بہ حیثیت ایک نیوٹرل کے سکونت گزیں رہتے اور ہر گز ترکِ وطن اختیار نہ کرتے، آپ کو نہ یزید کی حکومت سے موافقت ہوئی، نہ مخالفت اور یہ روش ویسی ہی رہتی جیسے ترک اختیار کے بعد حضرت امام حسنؑ کی تھی مگر چھیڑ چھاڑ کی ابتدا یزید کی طرف سے ہوئی۔ اور باوجود یکہ حضرتؑ نے جلا وطنی کو منظور فرمایا۔ تاہم اپنے ہم وطن دوستوں سے اپنی تائید کے متعلق کسی استغاثہ کی کوشش روانگی کے آخر وقت تک نہ کی جن لوگوں نے ساتھ دیا۔ اپنی خوشی سے دیا۔

خطرہ کے وقت اپنی جان بچانے کی کوشش انسان ہو یا حیوان۔ ہر ذی روح کی فطرت میں داخل ہے۔ حضرتؑ نے بھی یہی کیا۔ مگر کسی ایسے مقام پر جو آل سفیان کی حکومت سے باہر ہو۔ پہنچ جانا ممکن نہ تھا اس لئے آپ نے یہ تصفیہ کیا کہ مکہ میں پہنچ کر پناہ لیں جہاں یہ امید ہو سکتی تھی کہ یزید جو اسلامی دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔ شاید اس لحاظ سے کہ مکہ میں خوں ریزی جائز نہیں، خانہ کعبہ کی حرمت کو میرے قتل سے ضائع نہ کرے۔

مدینہ آپ کا وطن تھا یہاں بمقابلہ مکہ کے زیادہ اثر ہونا چاہیئے تھا۔ مگر آپ کو مدینہ والوں سے کیا امید ہو سکتی تھی جنہوں نے نہ کبھی آپ کے والد بزرگوار کا ساتھ دیا۔ برادر عالی مقدار کا۔ قیام مکہ کے متعلق بھی پورے اطمینان کی کوئی وجہ نہ تھی۔ کیونکہ وہ ایسا مقام نہ تھا جو یزید کے رقبۂ حکومت سے جدا ہو جس طرح اس نے عامل مدینہ کے نام حکم بھیجا تھا کہ حسینؑ کو میری بیعت پر مجبور کر دو ویسا ہی حکم عامل مکہ کے نام بھی آ سکتا تھا۔ اس لئے آپ کا فیصلہ یہ تھا کہ جب

اس وقت تک مکہ میں قیام کروں گا جب تک وہاں رہنے دیا جاؤں۔

اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ عمر بن سعید الاشدق نے جو ولید بن عقبہ کی جگہ عامل مدینہ ہو کر گیا تھا۔ مدینہ سے حضرت کو امان نامہ لکھ کر واپسی مدینہ کی رائے دی تو اس کا امان نامہ اس لئے قابلِ اعتنا نہ تھا کہ کسی عامل کے کسی انفرادی فعل کی مرکزی حکومت ہمیشہ ذمہ دار نہیں ہوا کرتی، خصوصاً جب کہ کسی عامل کے فعل سے مرکزی حکومت کا حکم مختلف و متضاد ہو۔ یزید اپنے عامل سابق ولید کو حسینؑ کی گرفتاری یا قتل کا حکم دے چکا تھا اور اس کے تساہل کی وجہ سے اسے معزول کر دیا تھا ایسی صورت میں اگر عمر بن سعید کا امان نامہ یزید کی لاعلمی پر مبنی تھا۔ تو اس کا کیا یقین ہے کہ وہ یزید کا حکم معلوم ہو جانے پر بھی اپنے اس امان نامہ پر قائم رہتا۔ اور اگر قائم بھی رہتا تو اس کی کیا ذمہ داری تھی کہ یزید بھی اس کو قبول کر لیتا۔ اس کے علاوہ عمر بن سعید کے خط کو دیکھتے ہی حسینؑ کا بغیر ثبوت کے قبول کر لینا سیاسی بے احتیاطی ہوتی۔ کون جانتا کہ وعدہ امان سے حسینؑ کو دھوکا دیا جا رہا ہے یا کیا۔

اگر بفرضِ محال حسین علیہ السلام نے یزید کی سلطنت کو اُلٹ دینے کا قصد کیا تو یہ کوشش کب تھی کیسی تھی اور اپنے کامیابی کے لئے کون سے وسائل اختیار کئے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے خوف و تشدد کی حالت میں جس میں حضرت بسر کر رہے تھے کسی غیور اور باحمیت انسان کو سوائے تین صورتوں کے اور کوئی صورت ممکن نہ تھی، یا تو وہ خموشی سے خود کو دشمن کے حوالے کر دیتا۔ یا کسی تاریک گوشہ میں روپوش ہو کر ناقابلِ برداشت مصیبتیں گوارا کرتا۔ یا عزت کے ساتھ دشمن سے جنگ مدافعانہ کر کے مارا جاتا۔ حسینؑ کی غیرت و حمیت نے اس کو گوارا نہیں کیا کہ خود کو مسیح ابن مریم کی طرح گرفتار کرا کے دشمن کو اپنی اسیری پر مضحکہ کا موقعہ دیں حسینؑ کے لئے اس وقت یہ بھی ممکن نہ تھا کہ بنی امیہ کے قلمرو سے کہیں باہر چلے جائیں۔ کیونکہ نقل و حرکت کی نگرانی کے لئے دشمن ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے، اور اس نگرانی کی سختی زیادہ روز بروز ہوتی جاتی تھی اور نہ دشمن کے سامان منازعت کا مقابلہ کرنے کے بعد حسین کی یہ غیرت عدیم المثال جرأت

اس تصفیہ کی ابتدا بھی نہایت غیورانہ اور شجاعانہ تھی اُس کے بعد واقعات جس طرح خوفناک اور ہول انگیز صورت اختیار کرتے گئے ان قدم کے ڈگمگا دینے والی حالتوں میں حسینؑ کے اس ابتدائی پُر غیرت تصفیہ میں استقلال و اصرار کا ترقی کرتا جانا ایک ایسی حیرت خیز بات تھی جو تاریخِ عالم میں حسین کے لئے ہی مخصوص ہے۔

مکہ میں آپ کا قیام کئی مہینہ رہا اور نصفِ شعبان سے نصف ذی قعدہ تک کوئی لفظ کوئی انداز کوئی حرکت ایسی ظاہر نہ ہوئی جس سے یہ سمجھا جاتا کہ حسین کسی نزاعی روش کا خیال رکھتے ہیں لیکن یہی زمانہ آپ کے لئے موقع کے احساس اور مدبرانہ تصفیہ کا تھا حسینؑ جانتے تھے کہ یزید میرے متعلق اپنے حکم کو بھول نہیں گیا، وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ دشمن میری اثر اور وقار سے بخوبی واقف ہے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مکہ کوئی فوجی چھاؤنی نہیں ہے بلکہ میرے لئے کسی سخت کارروائی کو بصرہ یا کوفہ سے فوج منگانے کی ضرورت ہوگی یا ہو سکتی ہے۔ یہ ہی انتشار کا زمانہ تھا کہ یکایک اہل کوفہ کے مراسلوں نے ایک دوسری صورت کا رنگ جمایا۔ ایسے اضطراب کی حالت میں ذریعۂ تسکین کی طرف نگہ اوٹھنا۔ انسانی فطرت میں داخل ہے۔ لیکن حسینؑ میں حکومت و ریاست کی فریفتگی کا نہ ہونا ان کی ایسی صبر آزما حالتوں میں خموشی سے بخوبی ظاہر ہے بلکہ ایسے وقت میں جبکہ مدد کا وعدہ ہو رہا تھا، اور غالب قرائن تھے۔ کہ مدد مل سکنے پر بھی آپ کا اُسی طرح لاپروائی پر قائم رہنا۔ آپ کی قوتِ نفس کا ایک بیّن ثبوت ہے حالانکہ اگر محض طلبِ خلافت کے لئے حضرت اس وقت آمادگی بھی ظاہر فرماتے تو وہ سراسر حق بجانب تھی کیونکہ اس سے اس عہد نامہ کا نفاذ مقصود تھا۔ جو امام حسنؑ اور امیر معاویہ میں ہوا تھا۔ اور جس کی رُو سے حسین کو معاویہ کے مرنے کے بعد خلیفہ ہونا چاہئے تھا یہ معاویہ اور یزید کی بدعہدی تھی کہ انہوں نے حسینؑ کے حقوق کا لحاظ نہیں کیا۔ نہ حسینؑ پر یہ الزام قائم کیا گیا کہ انہوں نے اپنے حق کے طلب کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔

باوجودیکہ ایسا کرنے میں حسینؑ حق بجانب تھے مگر حسینؑ سے یہ امید کرنا کہ وہ خلافت

طلبی کے لئے بزورِ شمشیر آمادہ ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔ تمام واقعات سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کرنا ہے ہادیٔ برحق کے فرزند نے جو خود بھی اپنے عہد کا ہادی تھا، اپنی روحانی ریاست میں لوگوں کے انصرامِ امور کو اس وقت تک شریک نہیں کیا جب تک کہ لوگ متفقہ آواز سے اس امر پر مُصر نہ ہوئے کہ وہ ان کے تمام دینی و دنیاوی اُمور کا ذمہ دار بنے۔ جنابِ امیر نے بھی باوجود ابوسفیان کے وعدۂ مدد کے۔ اپنی حق طلبی پر آمادگی ظاہر نہ کی تھی۔ کہ اسے بزورِ شمشیر حاصل کیا جائے جب تک کہ خود لوگوں نے ہم آہنگی سے خلافت کو لا کر آپ کے قدموں پر نہ ڈال دیا۔

حضرت امام حسنؑ نے خلافت کو اس وقت ترک کیا جب انہوں نے لوگوں کو اپنی اطاعت میں تساہل کرتے پایا۔ حضرت امام حسینؑ باوجود اپنے حقوق اور اہل کوفہ کی استدعا اور باوجود حالتِ اضطرار کے ان تمام باتوں کو پائے اقدس کے نیچے مضبوطی سے دبائے رہے۔ اور اگر اس حالت میں آپ کی خموشی میں حصولِ خلافت کا خیال پوشیدہ تھا بھی، تاہم یہ طرزِ عمل آپ کے اعلےٰ تدبر پر دلالت کرتا ہے جس سے وہ اپنی آغازِ کوشش میں اپنے اوپر کمالِ احتیاط سے کوئی حرف آنے نہیں دیتے تھے، وہم دوسری چیز ہے، واقعات پر غور و مطالعہ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اگر آپ اپنے نانا کے روضہ کی مجاوری سے دور ہٹائے جانے پر متاسف تھے۔ تو مکہ سے جلاوطنی بھی آپ کی ویسی ہی تاسف انگیز تھی۔

جب متواتر تجربہ سے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ آپ کو بیعت کی ذلت سے کسی طرح مفر نہ ہوگا۔ اور ضرور قتل کیا جاؤں گا تو دوسری طرف اہل کوفہ کی ہم آہنگی ایک ایسی صورت اختیار کر رہی تھی جس کو طالبانِ ہدایت کی متفقہ آواز کہنا چاہیئے اور یہ صدائے احتجاج گویا اس بات کا استغاثہ تھا۔ کہ ہمیں مظالم اور بے دینی سے بچایا جائے، ان کا یہ فقرہ سچائی کی بُو سے خالی نہ تھا کہ اگر آپ نہ آئے تو قیامت کے دن خدائے قدوس کے حضور میں ہم آپ پر دعویٰ کریں گے کہ حسینؑ نے ظلم کیا اور ہم پر ظلم ہوتا ہوا دیکھ کر خموش بیٹھے رہے، اس استغاثہ کے بعد حسینؑ کا آمادہ ہونا

کسی اہل نظر کے خیال میں خود غرضی اور جاہ طلبی کے احساس سے نہیں ہو سکتا بلکہ مظلوم کی مدد۔ ہدایت اور ایثار سے۔

حسینؑ کے حقیقی منصب شجاعت اور ہمدردی کے لحاظ سے ابد کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہا تھا اگر آپ بھی (حسینؑ) اہل کوفہ کی اس عام صدائے اپیل کی سماعت نہ کرتے۔ یا اس استغاثہ کی طرف سے لاپروائی برتتے یا کوئی عذر کر کے ٹال دیتے، تو آپ کا یہ فعل جماعتِ انسانی کی افسوسناک حالت سے لاپروائی اور غیر شجاعانہ روش سمجھا جاتا اور ہر شخص یہ گمان کر لیتا کہ حسینؑ نے اپنے نانا کے کلمہ گویوں کی اس ضروری درخواست سے اس لئے اعراض کیا کہ اس میں خطرہ کا امکان تھا اب حسینؑ کے لئے کیا چارہ تھا یہ کہ وہ مسیح ابن مریم کی طرح خود کو دشمن کے رحم اور انصاف کے حوالہ کر دیتے اور اس کے منتظر رہتے کہ کانٹوں کا تاج پہنایا جا کر تمسخر کیا جائے یا اپنی عزتِ نفس اور وقارِ منصبی کی حفاظت کے لئے اپنے قول پر کمال ثابت قدمی سے قائم رہ کر اخلاقی اور روحانی شجاعت کے انتہائی جوہر دکھائیں۔

یہی اخلاقی و روحانی شجاعت ہے جس نے آپ کی شہادت کے بعد ہمدردی کا جوش پیدا کر دیا اور ایک ایسا شدید اور زبردست ہیجان ہوا جس نے بنی امیہ کی عظیم الشان سلطنت کو اُلٹ دیا۔ اگر حسینؑ اہل کوفہ کے استغاثہ پر توجہ نہ کرتے تو انہیں مکہ میں یا کہیں اور مفر تھا ہی کب۔ اگر کہیں اور شہید ہوتے تو یہ کہا جاتا کہ اتنے مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر کے استغاثہ پر جس کی ہدایت کی ذمہ داری کا بارِ عظیم آپ کے کندھوں پر تھا۔ توجہ نہ کی اور اپنے ضروری فرض کے پورا کرنے میں لاپروائی سے کام لیا مگر جب قریب کوفہ شہید ہوئے۔ تو قوم کی شکر گذاری اور اپنی بلند حوصلگی پر تمام عالم کو ابدالآباد تک گواہ بنا لیا۔

پھر بھی حضرتؑ نے اس سے زیادہ نہیں کیا کہ مسلم ابن عقیل کو اس ہدایت کے ساتھ کوفہ روانہ فرمایا کہ وہ مسجد میں امامت کریں اور ان مقدمات میں جو فرائض وغیرہ کے متعلق ہوں شرعی فیصلہ دیں نعمان بن بشیر جو یزید کی طرف سے کوفہ کا گورنر تھا بدستور حاکم رہنے دیا جائے۔

مدعا یہ کہ بجز امور شرعی کے اور کسی امر میں دخل دینے کا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا۔ نعمان کے متعلق کسی ایسی ہدایت کا ہونا جس سے اس کے اختیارات میں مداخلت و مزاحمت ہو۔ یا تو اس وجہ سے تھا کہ سوائے اُمور شرعی کے اور کسی امر میں دخل دینے کا ارادہ ہی نہ تھا یا یہ کہ نعمان ہماری جانب مائل ہے، یا کم سے کم ہمارا دشمن نہیں ہے اور چونکہ وہ کوفی ہے اس کا اُسی جگہ پر قائم رکھنا حالت کو حتے الوسع غیر متحرک رکھے گا۔ جسے کسی قسم کا اضطراب انگیز ہیجان نہ ہوگا۔ رہا یہ امر کہ اگر حضرت کا ایسا خیال تھا تو اہلِ بصرہ کو مدد کے لئے خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی لیکن جب حسینؑ صاف طور پر یہ دیکھ رہے تھے کہ ہم کس حالت میں ہیں تو کیوں نہ اہل بصرہ کی نبض ٹٹولتے۔ بایں ہمہ اپنے خط میں جو خاص بات تحریر کی تھی وہ یہ تھی کہ میں تم کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی دعوت دیتا ہوں اس استغاثہ سے بھی اتمام حجت مقصود تھا تاکہ لوگ اس بات سے ناواقف نہ رہیں کہ اسلام کی باگ کن ہاتھوں میں ہے، اور ذوی القربیٰ کے ساتھ کیا برتاؤ ہو رہا ہے۔ دوسری غرض یہ تھی کہ لوگ آئندہ کے ظاہر نتائج سے واقف ہو کر صورت معاملات سے ناواقفیت کا عذر نہ کر سکیں۔

بہرحال اس تنقیح کا لب لباب یہ ہے کہ حسینؑ صورتِ معاملات سے اس بات کا تصفیہ کر چکے تھے کہ میں کہیں رہوں مگر قتل سے بچ نہیں سکتا۔ اب آپ کے لئے تین راہیں تھیں بیعت یزید کر لیتے یا لشکر فراہم فرماتے، یا شہادت پر تیار ہو جاتے، آپ نے آخری بات قبول فرمائی پہلی بات تو آپ کو ہرگز گوارا ہی نہیں تھی، اور دوسری بات ممکن ہی نہ تھی۔ کیونکہ جس تھوڑے وقت میں آپ محصور ہوتے جاتے تھے۔ اس کے بعد اور نیز اس لحاظ سے کہ لوگ ایک زمانہ سے اہلِ بیت رسالت کے اثر سے دور ہو رہے تھے۔ اتنے وقت میں جو حسینؑ کو مل سکتا تھا کسی کامیابی کا قرینہ نہ تھا اور اسی پر حضرت کو یقین بھی تھا۔ جس سے آپ کچھ بھی کوشش نہیں فرماتے تھے، یہ بھی فرماتے جاتے تھے کہ میں عنقریب شہید ہوں گا اور اگر شہادت کو صاف لفظوں میں نہ بھی فرماتے تھے تو ایسے لفظ استعمال کرتے تھے

کہ عنقریب ایک وعدہ پورا ہونے والا ہے یا جو مجھے حکم دیا گیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ اس تصفیہ کا نتیجہ یہ ظاہر بھی ہو سکتا تھا کہ یزید کامیاب ہو اور حسین اور اس کے تھوڑے سے رفقا مارے جائیں اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقعہ ملے کہ حسینؑ (معاذ اللہ) اپنی بغاوت میں ناکام رہے۔ جو لوگ حسینؑ کی اس کوشش کے نتیجہ کا انتظار کر رہے تھے وہ بھی اس شہادت کے بعد یزید سے کشیدگی بے سود سمجھ کر اس کی اطاعت پر جھک پڑتے، اور اس طرح وہ آخری امید اور تھوڑا سا مخلصانہ اور شجاعانہ قیام جو اہل بیت اور اسلام کی محبت کے متعلق تھا ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتا اور یہ گویا اہلِ بیت اور اسلام کے نظامِ روحانی کی شکست ہوتی لیکن حسینؑ نے ان تمام شکستوں کو اپنی شکست کے مقابلہ میں ہیچ سمجھا حسینؑ نے عظیم الشان قربانیاں دیں۔ تاکہ اس مہتم بالشان مقصد کے نتائج کو کمزور نہ ہونے دیں ان ہی قربانیوں کی عظمت نے ایک ایسا ہیجان پیدا کیا جو لوگوں میں حسین کی مدد نہ کرنے کی ندامت اور بنی امیہ سے نفرت پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔ جس کام کو یزید اپنی فوج اور خزانہ اور تدبر سے نہ کر سکا اُسے حسینؑ نے اپنی قربانی سچائی استقلال ایک بڑی درجہ کی حیرت انگیز حمایت اور مظلومیت سے پورا کیا۔

بہرحال ان تمام واقعات کی تنقید و تنقیح سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ ابتدا یزید کی طرف سے ہوئی اور حضرتؑ نے جو روش اختیار فرمائی وہ دفاعی تھی، نزاعی نہ تھی، نہ آپ کا سفر کوفہ جارحانہ پیش قدمی کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے اس جنگ کی ذمہ داری یزید پر عائد ہوتی ہے حسینؑ کی یہ منشا ہرگز نہ تھی کہ حصول خلافت کے لئے سلطنت کے خلاف ہتھیار اٹھائے جائیں، یا اپنے حقوق کو بزور شمشیر منوایا جائے۔ آپ کو بیعتِ یزید سے صرف اس بنا پر انکار تھا کہ اس کے اعمال وافعال فاجرانہ ہیں اگر آپ کو بیعت پر مجبور نہ کیا جاتا تو آپ بھی اپنے پدر بزرگوار اور برادر عالیمقدار کی طرح خموشی سے زندگی بسر کر دیتے مگر افسوس ہے کہ مخالفوں نے چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ اور اُن مظالم کا مظلمہ اپنی گردن پر لیا جن کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی موسیو ماربین نے بھی اسی خیال کی تائید کرتے ہوئے بڑی خوبی سے وضاحت کی ہے وہ لکھتا ہے۔

"بہت بڑی دلیل اس بات پر کہ حسین قتل گاہ تک گئے، اور ہرگز ان کا قصد سلطنت اور ریاست حاصل کرنے کا نہ تھا۔ یہ ہے کہ حسینؑ اپنے اس علمِ سیاست اور تجربہ سے جو انہیں اپنے والدِ عالی مقدار اور برادرِ نامدار کے زمانہ سے بنی امیہ کے ساتھ جنگ و جدل کرنے کا متعلق تھا، خوب جانتے تھے کہ اپنے فقدانِ سامان اور یزید کے اُس عظمت و اقتدار کے ہوتے ہوئے اس کے ساتھ مقابلہ کسی طرح ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ حسین اپنے پدرِ بزرگوار کی شہادت کے بعد اپنے مقتول ہونے کی ہمیشہ پیشین گوئی کرتے تھے اور جس وقت آپ نے مدینہ سے نقل و حرکت کی صاف صاف بآوازِ بلند فرماتے تھے کہ میں قتل ہونے کے لئے جا رہا ہوں اور اپنے سب ہمراہیوں سے بھی اتمامِ حجت کے لئے یہی بیان کرتے تھے تاکہ جو کوئی جاہ و جلال کی حرص و طمع کی وجہ سے ہمراہی چاہتا ہو جدا ہو جائے، اور یہی بات ان کی وردِ زبان تھی کہ قتل گاہ کا راستہ میرے سامنے ہے، اگر حسین غور و فکر اور علم و ارادہ کے ساتھ مقتول ہو جانے پر آمادہ نہ ہوتے تو اس طرح اپنا قتل گوارا نہ کرتے اور لشکر کے فراہم کرنے میں بقدرِ امکان کوشش عمل میں لاتے۔ نہ یہ کہ جو ہمراہ تھے ان کو متفرق و پریشان کر دیتے، ظاہر ہے کہ وہ محبوبیت کا مرتبہ جو اس زمانہ میں حسینؑ کو مسلمانوں میں حاصل تھا۔ اگر اس کے ساتھ اپنی قوت بڑھانا چاہتے تو ایک بڑا لشکر فراہم کر سکتے تھے۔ مگر اسی صورت میں اگر وہ مقتول ہوتے تو یہی کہا جاتا کہ سلطنت اور بادشاہی کی خواہش میں مقتول ہوئے اور وہ مظلومیت جس کا نتیجہ عظیم الشان انقلاب تھا حاصل نہ ہوتی۔ حسینؑ نے سوائے ان لوگوں کے جن کی جدائی امکان سے باہر تھی کسی کو اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ مثل فرزند برادر، بھتیجوں، بنی اعمام اور چند مخصوص احبابِ باوفا تا آنکہ ان سے بھی فرمایا کہ تم بھی چھوڑ کر جدا ہو جاؤ مگر انہوں نے منظور نہیں کیا، اور وہ بھی ایسے حضرات تھے کہ مسلمانوں کے نزدیک تقدس اور جلالتِ قدر کے اوصاف رکھتے تھے اور یہ مصائب انہوں نے سلطنت و بادشاہی کے لئے برداشت نہیں کئے اور نہ بغیر سمجھے ہوئے انہوں نے اس مہلکۂ عظیم میں قدم رکھا، جیسا کہ ہمارے بعض مورخین نے خیال کر لیا ہے۔"

امر نہم "ہم کو اس عظیم الشان واقعہ سے کوئی سبق ملتا ہے یا نہیں اور ملتا ہے تو کیا؟ اس زمانہ میں مذہبی خیال روز بروز دھندلا ہوتا جاتا ہے دنیا خدا پرستی کو چھوڑ کر خود پرستی کی طرف مائل نظر آتی ہے زندگی کا مدعا حق پرستی نہیں بلکہ خود پرستی قرار دیا گیا ہے بداخلاقی یوماً فیوماً روبہ ترقی ہے ایثار و ہمدردی فروتنی وغیرہ فضائل خود کے اصلی جوہر محو اور فنا ہوتے جاتے ہیں۔ تہذیب جدید کا جو محض ظاہری ملمع ہے انسانی قلوب پر سکہ بیٹھتا جاتا ہے۔ تہذیب اور اخلاق یہ دو لفظ آج کل زبانِ زد خاص و عام ہو گئے ہیں مگر ان کا صحیح مفہوم بہت کم لوگ سمجھتے ہیں بعض اشخاص کے نزدیک رہبانیت ہی کمالِ اخلاق ہے بعض کا اخلاقی دستور العمل یہ ہے کہ حیوانی خواہشوں کو بغیر کسی مزاحمت کے پورا کیا جائے ایک گروہ نے اہل فرنگ کی کورانہ تقلید کو تہذیب و اخلاق کا معیار قرار دے لیا ہے مگر حق یہ ہے کہ یہ لوگ مرکزِ اعتدال سے منحرف ہو کر افراط و تفریط کے دائرہ میں آوارہ اور سرگردان اور اخلاق کے سیدھے اور صاف راستہ کو چھوڑ کر بداخلاقی کی ٹیڑھی اور خطرناک راہوں میں سرگشتہ و حیران ہیں۔

جہاں تک نظر غائر اور فکرِ صائب سے کام لیا جائے ہر شخص اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ نظامِ تمدن کا روحِ رواں حسنِ عمل ہے اور تمام انبیا، مجددین اور مصلحین اس کی تعلیم و تلقین کرتے آئے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ حسنِ عمل کیا چیز ہے، اس کا جواب مختلف مذاہب نے مختلف طور پر دیا ہے دنیا میں جس قدر مذہب و ملل ہیں ان کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک قسم کے مذاہب وہ ہیں جو لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتے ہیں، دوسری قسم کے وہ ہیں جو کسی کو اپنے گروہ میں شامل ہونے کے لئے دعوت نہیں دیتے۔ پہلے قسم کے مذاہب کو مذاہبِ تبلیغی اور دوسرے قسم کے مذاہب کو مذاہب غیر تبلیغی کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

مذاہبِ تبلیغی کا منشا یہ ہے کہ اہل عالم کی عقلیں اُن کی زیر حکومت اور زیرِ اثر ہوں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم حسنِ عمل کا نشان دیتے ہیں، یہ حسنِ عمل بھی خود اصولِ نظری و عملی پر منحصر ہے اور اس کی مختلف حیثیتیں ہیں جن کو ہر ایک نظام تمدن نے اپنے لئے اختیار کیا ہے۔

یہ مختلف نظام جو لوگوں کو فلسفہ یا مذہب کے نام سے اپنی طرف دعوت دیتے ہیں تین قسم پر منقسم ہیں۔

اول مذہب "بدھ" جو ملک ہند میں صوبہ بہار سے ظاہر ہوا۔ اور ہندوؤں کے بعض فرقے اور حکمائے یونان اور زمانۂ حال کے اہل یورپ میں سے بعض لوگ جو خود کو "تھیاسوفسٹ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس مشرب کو کم و بیش مانتے ہیں، بدھ مذہب والوں کی تعداد ان کے مرکز سلطنت چین اور ایشیا کے مشرق میں تمام دنیا کی آبادی کے ایک تہائی حصہ میں پچاس کروڑ تک پہونچتی ہے، اس مذہب کو جناب ختمی مآب کی بعثت سے تقریباً بارہ سو سال بیشتر اور حضرت مسیح کی ولادت سے تخمیناً چھ سو برس پہلے گوتم نے جس کو بدھ (عقل کل) کہتے ہیں جاری کیا تھا اس مذہب کا خلاصہ یہ ہے:-

"یہ دنیا دکھ اور مصیبت کا گھر ہے جس چیز کو تم خوشی یا راحت کہتے ہو وہ بھی رنج و پریشانی پیدا کرنے والی ہے ہر ایک راحت کا انجام زحمت ہے بلکہ وہی راحت یا لذت کچھ عرصہ کے بعد ناخوشی بن جاتی ہے اور اس زحمت سے نجات پانا دشوار ہے کیونکہ ہم سب تناسخ (آواگون) کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں جو شخص ظاہر میں مرجاتا ہے وہ اسی طرح باقی رہتا ہے اور فوراً دوسری شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ پس ان مصیبتوں سے جس کو فرحت و خوشی یا رنج و زحمت کے نام موسوم کیا گیا ہے نجات کی کیا سبیل ہے؟

بدھ اس کا یہ جواب دیتا ہے۔

جب آدمی دنیا کے رنج و راحت سے علیحدہ ہو جاتا ہے تو سکون و اطمینان اور وقار کی استعداد اس کے نفس ناطقہ میں مستقیم ہو جاتی ہے اس طرح سے کہ جب دوسرے حالتِ جنم میں ظاہر ہوتا ہے تو اس زندگی میں سکون و اطمینان و وقار زیادہ تر اور رنج و راحت کا احساس کم تر ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح تیسری اور چوتھی زندگی (جنم) میں عمل کرنا چاہیئے یہاں تک کہ بہت سے قرن گزرنے کے بعد کسی ایک قرن میں اس کا ذہن رنج و راحت کا ادراک نہیں کرتا۔ اور اس وقت (نروان) یعنی

نجات حاصل ہو جاتی ہے یہ روح فنا ہو جاتی ہے اور عقل خالص باقی رہ کر مادہ عالم کے ساتھ مخلوط ہو جاتی ہے۔

الغرض بدھ مذہب ازلی و ابدی قوانین کو مانتا ہے۔ عالم کو قدیم جانتا ہے جزا و سزا کا اعتقاد رکھتا ہے اور اس جزا و سزا کو ایسا سمجھتا ہے جیسے حرارت جو اضطراری طور پر خواہ مخواہ آگ سے باہر نکلتی ہے یہ مذہب ایک ایسے خالقِ ذی حیات اور صاحب ادراک کا قائل نہیں جو عالم ممکنات سے بالاتر ہے اور جس نے یہ تمام قوانین فطرت معین کئے ہیں اور یہ بھی کہتا ہے کہ اگر انسان نفس کشی کے ذریعہ سے مدارج کمال کو پہونچنے کے بعد حقائق امور کی معرفت حاصل کر کے ان پر حاوی ہو جائے، تو وہ خود اک خدائے علیم و قدیر ہو جاتا ہے اور اس کا حکم لاکھوں اور کروروں برس اس مادہ میں جاری رہتا ہے ان لوگوں کے بہت سے عقیدے بہائی تعلیم میں داخل کر دئے گئے ہیں یہ لوگ اولیا کی پرستش کرتے ہیں اور ان کے نزدیک زندگی کی غرض صرف یہی ہے کہ زندگی کو فنا کر دیا جائے اور روح کو باقی رکھا جائے اکثر وحدت وجودی کے قائل اور بزرگان صوفیہ نامعلوم طور پر بدھ کے اکثر خیالات کے شیدا ہیں مگر اسلام ان کے دلوں پر ایسی مستحکم اور مضبوط گرفت رکھتا ہے کہ وہ ذات واجب کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے مگر بدھ مذہب میں ایک ذی شعور خالق اور الہامی ہدایت کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی گئی۔

دوئم ایک اور مذہبی نظام ہے جس کا داعی کوئی خاص شخص نہیں ہے۔ بلکہ وہ بجائے مذہب کے در اصل ایک فلسفیانہ تخیل ہے جو عالم کو ایک دوسرے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ جو پہلے مذہبی نظام (بدھ مذہب) کے نقطۂ نظر کا مخالف اور اس کا مدمقابل ہے۔ اس مذہب نے یونان میں حضرت مسیح سے کئی سو برس پہلے قوت پکڑی اور وہ اپیکیورس کی طرف منسوب ہے اس نظام کے ماننے والوں کو لاادریہ (اپیکیورین) النفس پرست یا مادئین بھی کہہ سکتے ہیں اس وقت یہ مشرب یورپ اور امریکہ میں نہایت استحکام رکھتا ہے۔ اور

اہل ایشیا کی طبیعتوں میں بھی جو یورپ کے فلسفۂ سطحی کے مقلد ہیں عملی طور پر یہی فلسفہ ایک اعلیٰ اور بلند مقام حاصل کرتا جاتا ہے ان لوگوں کے عقائد کا خلاصہ یہ ہے۔

دنیا عارضی اور چند روزہ ہے، ہم نہیں جانتے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ہے یا نہیں، اگر ہو تو بھی امر ہمارے عیش میں مخل نہ ہونا چاہیئے۔ ہم کو چاہیئے کہ اس زندگی کو پوری خوشی و شادمانی سے بسر کریں۔ اچھے مکانات، دلفزا باغ، عمدہ عمدہ تھیٹر، نمائشیں مسکرات بقدر اعتدال اور دوسرے لذائذ از قسم عورات و طعام و لباس و سامانِ پسندیدہ اپنے لئے مہیا کریں اس تھوڑے سے زمانہ کے بعد کوئی دوسرا مقام ہمیشہ کے عیش و آرام کے لئے نہیں ہے۔

اس نظامِ تمدن کی بدولت سب لوگ اپنی نفسانی یا قومی اغراض کے لئے کش مکش میں مبتلا رہتے ہیں حصولِ منفعت کا خیال ان کی زندگی کا ماحصل ہے، خالق کو چھوڑ کر لذائذ دنیوی اور مادیات کے بندے بن جاتے ہیں اپنی خود غرضی اور ہوا و ہوس کے سامنے عدل و انصاف بلکہ جملہ مکارم اخلاق کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اس قسم کی کش مکش اور تصادم ایک عرصہ تک ملک کی فلاح اور ترقی کا باعث ہوتا ہے مگر تھوڑی مدت کے بعد آپس میں کشاکش اور چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی ہے اور بالآخر یہ تمام تمدنی اسباب وحشیانہ حرکات باہمی جنگ و جدل اور ملک و دولت کی تباہی کا باعث ہو جاتے ہیں۔

سویم — ان دونوں مذکورۂ بالا نظاموں کے علاوہ ایک اور مذہبی نظام ہے جو لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتا ہے، یہ نظام اُس خطہ میں ظاہر ہوا۔ جو ہندوستان اور یونان کے درمیان واقع ہے۔ حضرت ابراہیم کی مقدس نسل نے جو ملک کنعان میں قیام پذیر تھی اور جس کے بعض اشخاص صحرائے عرب میں مقیم ہوئے تھے اس نظام کی بنیاد ڈالی چونکہ نظام اس سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کی تین مختلف صورتیں ہیں ان میں سے

پہلی موسوی تعلیم ہے نظامِ موسوی، توحید الٰہی کا معتقد ہے اور خدا و بندے کے درمیان ایک واسطہ کا بھی قائل ہے جس کو رسول کہتے ہیں۔ یہ مذہب اس بات کو مانتا ہے کہ دنیا میں اخلاق و معاشرت کے تمام اصول ایسے لوگوں (رسولوں) کی ہدایت سے جاری ہوئے ہیں جو خود قادرِ مطلق سے حقائق حاصل کرکے لوگوں کو تعلیم دیتے تھے۔

اس مذہب کی باطنی اور روحانی حقیقت مسیحیت ہے۔ حضرت مسیح نے اس بات پر زور دیا کہ تزکیہ نفس کیا جائے اور لوگ احکام کی حقیقت اور ان کے صحیح مفہوم پر عمل کریں۔ یہودی علماء و مشائخ کا عمل زیادہ تر ظاہری احکام پر تھا۔ یہ کنعانی یا سامی نظام ایک خاص نسل کی وساطت سے اشاعت پذیر ہوا۔ جو احساسِ دینی اور حقائق الٰہی کے ادراک میں تمام عالم سے ممتاز تھی مگر جب نظر بصیرت سے دیکھا جائے تو یہ دونوں نظام (نظام موسوی و نظام عیسوی) بجائے خود صحیح اور بنی اسرائیل اور نوع انسان کی بہبودی کا باعث تھے۔ تاہم ان میں سے ہر ایک نظام نامکمل تھا اور اس قابل نہ تھا کہ ہر زمانہ میں اہلِ عالم کے لئے تنہا کافی و وافی ہو، ان دونوں نظاموں کی تکمیل ایک ایسے نظام کے ذریعہ سے عمل میں آئی جو قانونِ شریعت اور قانون معرفت دونوں ہم آغوش رکھتا تھا یا بالفاظ دیگر حکمت اور تزکیہ نفس (موسوی شریعت و ناموس اور عیسوی روحانیت و معرفت) دونوں کا جامع اور شامل رکھنے والا مذہبِ محمدی (اسلام) ہے، اس مذہب کا خلاصہ ان مختصر الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔

"زندگی جو انسان کو عطا کی گئی ہے عبث اور بے کار نہیں اور یقیناً انسان اپنے خالق کی طرف رجوع کرنے والا ہے"

اسلام نفس کشی سے مطلق انکار نہیں کرتا بلکہ اس کو معتدل اور رفاہِ عام کا محکوم رکھتا ہے
اسلام نے حظِ نفس کو منع نہیں کیا بلکہ اس کو بھی اعتدال اور فلاحِ عام کا محکوم قرار دیا ہے۔ اسلام نے انسانی ترقی کا ذریعہ ان نفوس مقدسہ کی تعلیم و ہدایت کو قرار دیا ہے جو

خدائے تعالٰے کی طرف سے حقائق کو حاصل کرکے لوگوں کو تعلیم دیتے اور خود بھی حسن عمل اور تہذیب اخلاق کے اعلٰے ترین نمونہ تھے۔ ہادی اسلام نے اپنی رسالت کا مقصد تکمیل اخلاق کو ہی بتایا ہے آپ فرماتے ہیں:۔

"بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ مجھے اسواسطے نبی بنا کر بھیجا گیا ہے کہ اخلاق کی خوبیوں کو کمال تک پہنچا دوں"

ارسطاطالیس کا قول ہے کہ اگر فضائل اخلاق کے دس حصے کئے جائیں تو نو حصہ عدالت کے ہیں اور ایک حصہ میں باقی ماندہ فضائل ہیں نہیں بلکہ عدالت ہی تمام فضائل کا مجموعہ ہے اور اگر رذائل کے دس حصے کئے جائیں تو نو حصہ جور کے ہیں جو عدالت کی ضد ہے۔ اور ایک حصہ میں باقی رذائل ہیں نہیں بلکہ جور ہی تمام رذائل کا مجموعہ ہے۔ چونکہ عدالت تمام فضائل کے باہمی اعتدال کا نتیجہ ہے جو افراط و تفریط سے بچاتا ہے، اور اسی لئے جو عدالت کی ضد ہے جملہ نقائص کا خلاصہ ہے عدالت کی تمام قسموں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تمام فضائل اخلاق کا لب لباب ایک چھوٹی سی حدیث میں جمع ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

التعظیم لامر اللہ و الشفقۃ علی خلق اللہ، خدا کے حکم کی تعظیم اور خلق خدا پر مہربانی"

اس حدیث میں اخلاق کے وسیع دریا کو چند لفظوں کے کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ کیونکہ عدالت یا تو ان معاملات میں ہوگی، جو عبد اور معبود کے درمیان ہیں یا ان معاملات میں جن کا تعلق انسان اور دوسری مخلوق سے ہے، حدیث مذکور کا پہلا حصہ پہلی قسم کی عدالت (حقوق اللہ) ہے اور دوسرا حصہ دوسری قسم کی عدالت (حقوق العباد) سے تعلق رکھتا ہے۔

جس طرح سرخیل مصلحین و مجددین سید المرسلین و النبیین جامع فضائل اخلاق اور مکمل اوصاف اخلاق تھے ویسے ہی آپ کے اہل بیت طاہرین حسن عمل اور اخلاق محمدی کا بہترین نمونہ تھے حسینؑ نے اسی مکمل الاخلاق معلم روحانی اور مدرس حقانی کے دامن تربیت میں نشو و نما پائی انوار وحی و تنزیل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کلمات الٰہیہ کو کلمۃ اللہ کی زبان سے سنا اور جس طرح بچہ جسمانی تربیت اپنے ماں باپ سے پاتا ہے ویسے ہی حسینؑ نے روحانی اور اخلاقی تربیت اپنے جد بزرگوار سے پائی اور انوار نبوت ان کے لوح قلب پر اس طرح چمکے کہ حسینؑ بھی کمال احمدی اور اخلاق محمدی کا آئینہ بن گئے ایسی حالت میں حسینؑ سے بڑھ کر فلسفہ اخلاق کا جاننے والا اور اس کا عملی نمونہ کون ہو سکتا ہے وہ خود جس طرح اخلاق مکمل تھے ویسے ہی دوسروں کے لئے مکمل اخلاق بھی تھے، ان کا کوئی فعل اور کوئی عمل ایسا نہ تھا۔ جس میں روحانی اور اخلاقی تعلیم کی روح موجود نہ ہو تاریخ عالم کا ہر واقعہ نتیجہ خیز اور ہر سانحہ سبق آموز ہے تو کیا شہادت حسینی کے عظیم الشان واقعہ نے ہمارے لئے کوئی سبق نہیں چھوڑا بے شک چھوڑا۔ ہم اس شہادت کے فلسفہ اور نتائج پر جہاں تک غور کرتے ہیں اسے روحانی اور اخلاقی تعلیم کا بحر ناپیدا کنار پاتے ہیں۔

اس شہادت کی علت غائی صرف یہی نہیں ہے کہ محرم کا چاند نظر آیا اور ماتمی لباس پہنا۔ مجلس عزا منعقد کی، مرثیے اور نوحے پڑھے۔ آنسو بہائے، سر پیٹا، سینہ کوٹا۔ اور بس لگر اس شہادت کا مدعا صرف اتنا ہی ہے اور ہم نے اس سے یہی سبق حاصل کیا ہے، تو دنیائے اسلام کے لئے یہ دوسری مصیبت ہے جو حادثۂ عاشورہ سے کم نہیں اور اس واقعہ کی ذلت و اہانت ہے مصائب و آلام سر پیٹنے اور آنسو بہانے کے لئے نہیں آتے۔ بلکہ ان کی ایک اہم غرض ہوتی ہے جو ان میں پوشیدہ رہتی ہے۔ شہادت حسینی امت محمدیہ کو یہ سبق دیتی ہے کہ انسان کو ہمیشہ راستی پر قائم رہنا اور اپنے ضمیر و زبان کو ہر حالت میں ایک رکھنا چاہیے۔ اور راستی پر قائم رہنے کے لئے اپنے آخری قطرۂ خون سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیے تسلیم و رضا کی خو ڈالنا، ہمت و استقلال سے کام لینا، عزت و آبرو کے لئے جان قربان کر دینا چاہیے حسینؑ نے اپنے استقلال اور طرز عمل سے یہ سبق دیا کہ اپنی ضمیر کی شہادت پر ایک راست باز

انسان کس طرح ثابت اور قائم رہ سکتا ہے۔ رضا بالقضا کا عملی نمونہ کیا ہے، قوم و مذہب کے لئے قربانیاں کس رنگ سے کی جاتی ہیں صداقت پرستی میں کن کن دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے اور ان کا مقابلہ کس طرح کرتے ہیں، بُری تحریکات اور بُری جذبات کا خیر مقدم نہ کرنے سے بعض وقت انسان کن کن آفات و مصائب میں گرفتار ہو سکتا ہے۔ اور اُن کی مدافعت کے کیا طریقے ہیں۔ مذہب کی حمایت اور پرستاری کا حقیقی مفہوم اصلی نمونہ کیا ہے ایک باحمیت انسان کو مادی اور معادی رنگ میں کہاں تک ضرورت ہے برائی کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہیئے۔ حمایتِ مذہب حمایتِ حق، عبادت شجاعت غیرت صبر استقلال ضبط خودداری، عزتِ نفس دفعِ ذلت، احقاقِ حق، ابطالِ باطل۔ حلم۔ تواضع۔ وقار۔ ایثار قناعت، حیا، سخاوت، ہمدردی، عفو اولوالعزمی وغیرہ جس قدر فضائل اخلاق ہیں وہ سب پُر آشوب وقت میں حضرت کی ذاتِ اقدس سے ظاہر ہوئے۔ گویا آپ نے خود عملی نمونہ بن کر اپنے نانا کی اُمت کو ان تمام صفاتِ حسنہ کا ایسا سبق دیا جس کی نظیر اولین اور آخرین میں نہیں ہے یہی باتیں اس شہادتِ کبریٰ کی جان اور رُوح ہیں اور یہی وہ باتیں ہیں جس کی وجہ سے یہ شہادت دوسری شہادتوں سے سرآمد و ممتاز ہے اور اخلاق کامل کا ایسا مکمل عملی نمونہ دنیا کی اور کسی شہادت میں نہیں پایا جاتا۔

اب ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ حسین کے نام لیوا حسین کی غلامی کا دعویٰ کرنیوالے حسین کے مصائب پر رُونے والے حسینؑ کے نام پر دولت لٹانے والے۔ جو اس شہادتِ عظمیٰ کو اپنے لئے ذریعہ نجات اور اس غم میں بُکا و اَبکا کو بہترین عبادت سمجھتے ہیں۔ اس شہادت کے نتائج سے کہاں تک سبق حاصل کرتے، اور ان اخلاقی و روحانی تعلیمات پر جو حسینؑ کے اس عظیم الشان کام میں مضمر اور پوشیدہ ہیں کس حد تک عمل پیرا ہوتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم زبانی جمع خرچ کے سوا عملی و فعلی تاسّی نہیں پاتے۔ بے شک محبت ایک قوی جذبہ ہے اگر خالص اور بنائے اصول پر ہو تو تاسّی پر مجبور کرتا ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ یہ حسینؑ کی کیسی

محبت ہے جس میں تاسّی کا لگاؤ نہیں، سب سے اول نماز کو ہی لیجئے جو ستونِ اعظم ایمان ہے۔ حسینؑ نے ایسے پُرخطر وقت میں کہ بنائے نماز کے زمانہ سے آج تک کسی نمازی پر نہیں گزرا عین سجدہ میں سر کٹوا دیا اور عملاً ظاہر کر دیا کہ نماز اور اس کے وقت کی پابندی مذہب اسلام کا کس قدر ضروری رکن ہے۔ مگر حیرت و تعجب ہے کہ ان کے نام نہاد کے شیدائی اکثر و بیشتر تارک الصلوٰۃ پائے جاتے ہیں حسینؑ نے حمایت حق میں ناقابل برداشت مصائب اٹھا کر ہم کو صداقت و حق پرستی کی تعلیم دی مگر ہم میں کتنے ہیں جو صداقت کے حامی ہوں۔ ایثار و ہمدردی جو اس شہادت کے ممتاز نتائج ہیں ہم میں بالکل نہیں پائے جاتے یَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَکَ کہہ دینا بہت آسان۔ مگر کرنا مشکل ہے افسوس ہے کہ ہم میں ایسے افراد بکثرت پائے جاتے ہیں جو قولاً تو حسینؑ کے پیرو، مگر فعلاً یزید کے مُرید ہیں یزید نے جو کچھ کیا وہ ایک عظیم الشان سلطنت کے واسطے مگر ہم صرف تھوڑے سے فائدے کے لئے اس کے بھی استاد بنے ہوئے ہیں اس کو حسین کے حق کا غاصب سمجھ کر بُرا کہتے ہیں لیکن خود دوسروں کے مال اور حقوق کا غصب کر لینا بائیں ہاتھ کا کھیل جانتے ہیں، احکام شریعت سے تساہل۔ بلکہ سرتابی۔ ایک دوسرے پر ظلم بداخلاقی بدنیتی خبثِ باطن اور حسد کو اپنا شعار بناتے ہوئے دعوائے غلامی حسینؑ کرنا، سرابِ بے حقیقت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ یاد رکھو کہ یزیدی افعال کی پیروی کرنا اور حسینی اعمال کو پس پشت ڈالنا حسینی گروہ کا کام نہیں۔

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی ٭ کیں رہ کہ تو می روی بترکستان است

امرِ دہم: اسلام کو اس واقعہ کی کوئی یادگار قائم کرنا چاہیئے یا نہیں۔ اور اس یادگار کی کیا نوعیت ہونا مناسب ہے۔

دنیا میں جس قدر بڑے واقعات و حادثات رونما ہوئے وہ دو حیثیتوں سے انسانی جماعتوں میں مشہور ہیں یا تو محض ایسے واقعات ہیں کہ جن کو صرف وہی لوگ واقف ہیں جن کو تاریخ سے دلچسپی ہے یا ایسے واقعات ہیں جن کو کتابی صفحات کے علاوہ کوئی یادگار قائم کرکے

زندہ رکھا گیا ہے اور ان کی عظمت و اہمیت لوگوں کو خود بخود اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اگر مشاہیر عالم کی طولانی لسٹ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا نے میدان شہرت میں مختلف طریقوں سے صدہا بزرگوں اور ناموروں کی یادگاریں قائم کی گئی ہیں ان متبرک یادگاروں سے پایا جاتا ہے کہ واجب الاحترام مشاہیر نے انسانی جماعتوں کے واسطے کیا کیا اور اپنے ہی ابنائے جنس کے ہاتھوں سے کیسی کیسی تکلیفیں اور مصیبتیں اوٹھائیں جس قدر واقعہ کی اہمیت اور صاحب واقعہ کی عظمت ہوتی ہے اسی قدر اس کی یادگار بھی عظیم بالشان اور مؤثر ہوتی ہے۔ اگر یادگاریں ایک ستون یا ایک مینار یا ایک بُرج یا سرائے یا مسافر خانہ وغیرہ تک ہی محدود رہتی ہیں۔ سیّاح اور مسافران ستونوں یا میناروں کو دیکھ کر صرف اتنا تصور کر لیتے ہیں کہ یہ کسی نامور کی یادگار ہے جب اس مقام سے گزر جاتے ہیں تو انہیں خیال بھی نہیں رہتا کہ پہلے حصہ میں کیا دیکھا تھا۔ تاریخوں میں بھی اسی قسم کے ذکر پائے جاتے ہیں لیکن یہ اذکار صفحاتِ کتاب تک محدود اور اس کے پردہ میں مستور رہیں۔ دنیا میں بے شمار نامور ہیرو گذرے ہیں مگر ان کی زندگی کے حالات سے کتنے آدمی واقف ہیں معدودے چند۔

ان تمام یادگاروں کے خلاف حسینی واقعہ کی یادگار ایک ایسی عالم گیر یادگار ہے جو صرف تاریخی صفحوں اور نقش و نگار میں ہی محدود نہیں اس کا اثر میدان کربلا تک ہی ختم نہیں ہوا۔ بلکہ اس واقعہ نے ہر مومن کے دل کو بجائے خود کربلا بنا دیا۔ یہ یادگار لوح قلوب پر ایسی کندہ ہوئی ہے کہ قیامت تک نہ مٹے گی قدرت کی طرف سے اس واقعہ کی نسبت مسلمانوں کے دلوں میں جو ہمدردی اور رقت رکھی گئی ہے اس کا اندازہ مسلمان ہی کر سکتے ہیں جس طرح موسم کی تبدیلی پر انسان کے رگ و ریشہ میں خون دورہ کرتا ہے اسی طرح حسینی ایام میں ایک عام جوش اور ہیجان پیدا ہو جاتا ہے مسلمانوں کے رگ و ریشہ میں ہمدردی خون کی طرح دوڑنے لگتی ہے جس طرح بجلی تمام اعصاب میں مؤثر ہو جاتی ہے اسی طرح حسینی ہمدردی ہر ایک مسلمان کے

دل میں جوش مارتی ہے بچوں کو دیکھو جن کو نیک و بد اور برے بھلے کی کچھ بھی تمیز نہیں۔ وہ بھی اس ہمدردی کے نشہ میں سرشار نظر آتے ہیں یہ ہمدردی کوئی بناوٹی امر نہیں اور نہ تصنع کا اس قدر اثر پیدا ہو سکتا ہے یہ ہمدردی وہ ہمدردی ہے جو قدرت نے ہر مسلمان کے دل میں ودیعت فرمائی ہے یہ جوش وہ ہے جو کسی مزاحمت سے رُک نہیں سکتا۔ یہ وہ ولولہ ہے جس کو کوئی مخالف مٹا نہیں سکتا یہ وہ پُر درد واقعہ ہے کہ دشمن بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ جو کچھ ہے خدائی قدرت کا کرشمہ ہے اور کیوں نہ ہو جب حسینؑ نے اس قدر مجروح و مجبور ہونے پر بھی آخر دم تک رضاء الٰہی کے جادۂ مستقیم سے قدم نہ ہٹایا اور ایسی حالت میں کہ قاتل تیغ بکف سر جدا کرنے کو پاس کھڑا ہے اپنی گردن سجدۂ معبود میں جھکا دی حسینؑ نے سب کچھ خدا کی راہ میں دے دیا تو "ھَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانِ" خدا اُس کا متکفل کیوں نہ ہوتا اور کیوں نہ اس کے واقعہ شہادت اور نام میں ایسی تاثیر اور کشش رکھ دیتا کہ کوئی دل اس سے خالی نہ رہے۔

کربلا کی عظیم الشان قربانی و ایثار جان و مال ایسا زرین کارنامہ ہے کہ تیرہ سو برس گزر جانے پر بھی اس کی یاد ایسی ہی تازہ ہے کہ گویا کل کا واقعہ ہے کربلا کے صداقت کیش شہیدوں نے اُس سنسان سرزمین میں اپنی خون سے ایسا میموریل قائم کیا ہے جس کے مقابلہ میں تمام یادگاریں ہیچ و لاشے ہیں۔

یادگاروں کے قائم کرنے کا خواہ وہ کسی قوم و ملت سے متعلق ہوں، مذہبی ضرورت سے قائم کی گئی ہوں یا قومی لحاظ سے ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ تمام آنے والی نسلیں جب تک وہ یادگار قوم کے تغافل سے محفوظ اور اپنی قوت اثر کے لحاظ سے قائم رہ سکتی ہے اس سے فائدہ حاصل کر سکیں، کم از کم سال میں ایک مرتبہ اس یادگار کے ہیرو کا کیرکٹر ان کی پیشِ نظر ہو جائے وہ اس کی ارادی اور عملی قوتوں پر غور کریں اپنے جذبات کی تصحیح اور شعار کی اصلاح میں اس کے واقعات سے مدد لیں اور کبھی زمانہ اور وقت اس کا مقتضی ہو

تو دنیا کے سامنے ویسی ہی شاندار اور زریں مثال پیش کر سکیں۔ محرم کا حسینؑ ایسے ہی کیریکٹر کا انسان تھا جس کے واقعات کا مطالعہ اور جس کی یادگار کا مشاہدہ ہر قوم و ملت کی افراد کے لئے یکساں مفید اور سبق آموز ہے۔ حسینؑ نے انسانیت کی حفاظت، حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت میں ایسی شاندار قربانیاں کی ہیں اور نوعِ انسان کو فلسفۂ اخلاق کا بہترین سبق دیکر وہ بین الاقوامی پوزیشن حاصل کر لی ہے کہ آج وہ تنہا مدینۂ و کربلا کا شیعہ اور سنّی مسلمانوں یا ہندوؤں اور دوسری اقوام کا حسینؑ نہیں ہے۔ بلکہ ایک انگریز کے قول کے مطابق کل دنیا کا حسینؑ ہے۔

گو ایسا پُر درد واقعہ جس کی یاد ہر مومن کے لوحِ قلب پر اس طرح کندہ ہے کہ کالنقش علی الحجر کا حکم رکھتی ہے بظاہر کسی رسمی یادگار کا محتاج نہیں لیکن یہ ایک ناشکر گذاری ہوتی اگر مسلمان اپنے محسن ہیرو کی جو اسلام کو نئے سر سے زندہ کرنے والا اور اس کی بقاء ہستی کا باعث ہے اور جس کی عظیم الشان اور لاثانی مثال پر اسلامی تاریخ جس قدر فخر و ناز کرے تھوڑا ہے، کوئی یادگار قائم نہ کرتے۔ مسلمانوں نے یادگار قائم کی اور ایسی کی کہ دوسری قومیں اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتیں۔ مگر یہ امر تاسف خیز ہے کہ جدت طرازی نے اس میں اس قدر رنگینیاں بھر دیں کہ اس کی اصلی صورت کو مسخ کر دیا۔

یہ یادگار جو مجالس عزا تعزیہ ضریح، علم، دلدل وغیرہ کے نام سے ہر سال تازہ کی جاتی ہے اس میں یقیناً کچھ ایسی باتیں ہیں جو نہ عقلاً درست ہیں نہ شرعاً۔ یہ صورتیں ولولہ انگیز اور جذبات غم کی برانگیختہ کرنے والی ہیں۔ ہم کلیتاً اس کے خلاف نہیں۔ ہمارا حتمی فیصلہ ہے کہ ایسی عالی مرتبت ہیرو کی یادگار میں جتنا زیادہ اہتمام کیا جائے۔ کم ہے۔ اور اس کا عدم احیا ایک بڑی قومی ناسپاسی ہے۔ لیکن اتنا کہنے سے نہیں رُک سکتے۔ کہ یادگار کی نوعیت اس ہیرو کی شان کے شایاں اور اس کے مقصدِ جلیل پر مبنی ہونی چاہئے اور اس کی تمام باتوں میں وہ مفید سبق مدنظر رہنا چاہیئے۔ جو اس ہیرو نے حمایتِ حق

تردیدِ باطل، ہمدردی قوم، ایثارِ نفس اور سب سے آخر مگر اہمیت میں سب سے بڑھ کر۔ صبر و تسلیم کے متعلق اپنے متبعین کو سکھلایا ہے۔

ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اس ماتمی یادگار کے سلسلہ کو بالکل مسدود کر دیا جائے تو وہ حزن انگیز اسباب جو ہر سال واقعہ عاشورہ کی یاد کو تازہ اور جذباتِ غم میں ہیجان اور ولولہ پیدا کرنے والے ہیں کمزور ہو کر، رفتہ رفتہ فنا ہو جائیں گے بے شک اس ماتمی یادگار کی ضرورت اور اشد ضرورت ہے ہاں طریقہ وہ ہونا چاہئے جو آئمہ اہل بیت کا تھا مجلسِ عزا کو بزم مشاعرہ اور جلسۂ موسیقی نہ بنایا جائے۔ دوسرے رسوم کو ایسے سادہ اصول سے کیا جائے جو ہر قسم کی لغویات تصنع اور نمود و نمائش سے مبرا ہوں نہ ایسے طریقہ پر کہ مخالف مضحکہ اڑائیں۔ ہم اپنے برادرانِ ملی و قومی سے نہایت ادب کے ساتھ اپیل کرتے ہیں کہ:۔ ان تمام امور پر نظرِ ثانی کر کے ایسا فیصلہ دیں جو موجودہ رفتارِ زمانہ سے مناسب حال ہو۔ نام حسینؑ پر روپیہ صرف کریں لیکن اس طریقہ پر کہ اُسے اسراف و تبذیر سے تعبیر نہ کیا جائے یہ سچ ہے کہ لا اسراف فی الخیر۔ مگر اس پر عمل کرنیکا بھی موقعہ و محل ہے۔ سو تمام مراسم یادگاری اس طرح ادا کی جائیں کہ بدعات سیئہ اور حرکات نامشروع کی حد تک نہ پہونچیں اور اس مصرعہ کی مصداق نہ بنیں کہ "ماتم کریں حسینؑ کا لوٹیں حسن پورہ"۔ ہم کو گفتگو ہے تو اس میں ہے کہ ہم ان حسینی یادگار کے ایام میں بعض ایسے شرمناک حرکات دیکھتے ہیں جو حیا سوز اور ناقابل بیان ہیں یہ کیوں ہے اس وجہ سے کہ اس یادگار کے مفہوم کے سمجھنے میں غلطی کی جاتی ہے اعتدال کی صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر افراط و تفریط کے جنگل میں سرگرداں ہیں اور اس شہادت کے اصلی اغراض و مقاصد پر نظر نہیں کرتے، وہ اصحاب خوش نصیب ہیں جو کربلا کے عظیم الشان معرکہ کو اس کے حقیقی رنگ میں دیکھتے ہیں اور وہ لوگ بدنصیب اور کوتاہ خرد ہیں۔ جو نادانی حماقت سے اس واقعہ ہائلہ کو اپنے حق میں خسر الدنیا والآخرۃ کا موجب بناتے ہیں۔

قاتلان حسینؑ مسلمان تھے اس میں کیا حکمت تھی

جس طرح دنیا کی تاریخ میں معرکہ کربلا بہ اعتبار واقعات عدیم المثال ہے اسی طرح انسانی جماعت میں یہ سرگزشت بھی سرمایۂ حیرت ہے کہ ایک مذہب کے متبعین نے جنہیں خیر الامم ہونے کا دعویٰ تھا۔ اپنے ہی پیغمبر کے نواسے اور اس کی ذریت پر وہ مظالم کئے۔ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتے، اور جن کو سُن کر سنگدل سے سنگدل اور مخالف سے مخالف بھی انگشت بدندان ہیں فی الحقیقت یہ بات کچھ کم تعجب کی نہیں کہ بانیٔ اسلام کی وفات کو صرف ۵۰ سال گزرے ہوں اور اس کی شرفِ صحبت سے فیضیاب ہونے والے سینکڑوں کی تعداد میں زندہ موجود ہوں اور اس کے کلمہ گو اور نام لیوا اُسی کے فرزند اور اُسی کے اہل بیت پر آب و دانہ بند کر کے اُن ہولناک مظالم کے موجد کہلائیں جن کے مقابلہ میں اولین اور آخرین کی سفاکیاں بے رحمیاں اور ظلم آرائیاں گرد ہو جائیں۔

آخر ایسا کیوں ہوا۔ اس سوال کا جواب بہت صاف ہے اور اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے۔ کہ اہل بیت رسالت اور خاندان نبوت کے ساتھ مسلمانوں کی بے اعتنائی۔ اور کم توجہی ابتدا سے ہی شروع ہو گئی تھی اور باوجودیکہ آنحضرتؐ نے بارہا اپنے اہل بیت کی عزت و محبت کے متعلق تاکید و ہدایت فرمائی پھر بھی کلمہ گویان امت کا ان کے ساتھ ایسا سلوک اس قابل ہے کہ اس پر جس قدر تعجب کیا جائے کم ہے جو لوگ علیؑ حسنؑ اور حسینؑ کے ساتھ رسولِ خداؐ کا عاشقانہ تعلق اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے اور ان بزرگواروں کے متعلق آنحضرتؐ کے ارشادات کو اپنے کانوں سے سُنا تھا افسوس ہے کہ ان کا برتاؤ جیسا کہ چاہیے تھا کبھی خوشگوار نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ محبتِ اہل بیت کے بدلے عداوتِ اہل بیت مسلمانوں کے عقیدہ میں داخل ہو گئی۔ بلکہ اس سے آگے قدم بڑھا کر ممبروں پر علانیہ سب و شتم ہونے لگا۔ محبت اہل بیت الحاد و زندقہ سے بڑھ کر اور بڑے سے بڑے سیاسی جُرم سے زیادہ سنگین اور ناقابل معافی قرار دی گئی۔

جن لوگوں نے علی مرتضیٰ کا تعلق اور رسول خداؐ سے ان کی خصوصیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور فضائل علی کو آنحضرت کی زبانی اپنے کانوں سے سُنا تھا۔ انہوں نے علیؑ سے بیعت تک نہ کی تھی۔ درانحالیکہ یزید اور عبدالملک جیسوں کی بیعت کو بخوشی گوارا کر لیا۔ ان بزرگواروں میں

(۱) سعد ابن ابی وقاص (۲) عبداللہ ابن عمر (۳) عبداللہ ابن سلام (۴) صہیب بن سنان اسامہ بن زید (۶) قدامہ بن مظعون (۷) مغیرہ بن شعبہ (مہاجرین)

(۱) حسان بن ثابت (۲) کعب بن مالک (۳) مسلمہ بن مخلد (۴) محمد بن مسلمہ (۵) نعمان بن بشیر (۶) زید بن ثابت (۷) رافع بن خدیج (۸) فضالہ بن عبید (۹) کعب بن عجزہ (۱۰) مسلمہ بن سلامہ (انصار)۔

جیسے اکابر و مشاہیر اسلام شامل ہیں۔ انہوں نے جناب امیر سے بیعت تک نہ کی امداد دینا تو درکنار یہاں تک کہ آپ نے دل برداشتہ ہو کر مدینہ سے ہجرت اختیار کی۔ کوفہ کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ اور پھر جیتے جی مدینہ میں قدم نہ رکھا۔

حضرت امام حسنؑ کے ساتھ بھی جو بے التفاتی کا سلوک رہا وہ محتاج تشریح نہیں۔ جس سے تنگ آ کر حضرت کو خلافت سے دست بردار ہونا پڑا۔ پھر بھلا حسینؑ کے زمانہ میں ان لوگوں سے کیا امید ہو سکتی تھی۔ سمرہ بن جندب صحابی رسول تھے، اور آنحضرتؐ کی عاشقانہ محبت حسینؑ کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے، ان کی نسبت علامہ ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغۃ میں لکھتے ہیں۔

کان سمرۃ بن جندب ایام سیر الحسین الی الکوفۃ علی شرطۃ عبید اللہ ابن زیاد و کان یحرص الناس علی الخروج الی الحسین وقتالہ +	سمرہ بن جندب صحابی رسول حسین کی تشریف آوری عراق کے زمانہ میں ابن زیاد کی طرف سے کوتوال تھے اور لوگوں کو حسینؑ پر خروج اور ان سے لڑنے پر ترغیب دلاتے تھے۔

انس بن مالک جو اکابر صحابہ میں شمار کئے جاتے ہیں اور جن کی روایت کی ہوئی حدیثیں

صحاح ستہ میں بھری پڑی ہیں۔ مجلس ابن زیاد میں حاضرباش تھے جس روز اہل بیت اطہار کی رُوبکاری ابن زیاد کے دربار میں ہوئی وہ بھی تماشائیوں کے ساتھ موجود تھے۔ مگر حضرت کی مدد نہ کی۔ علامہ عینی نے عمدۃ القاری فی شرح صحیح بخاری میں سبط ابن جوزی سے نقل کیا ہے۔

اما کان لرسول اللہ صلعم علی انس من الحقوق ان ینکر علی ابن زیاد فعلہ و یقیمہ لہ ما دفعہ من قرعہ ثنایا الحسین بالقضیب؛

رسولخداؐ کے حقوق سے انس کے ذمہ یہ تھا کہ ابن زیاد کے فعل پر اس کو ملامت کرتے۔ جو اس نے سر مقدس حسین کے ساتھ کیا کہ چوب بید سے دندان مبارک کھولے۔ اور کسی نے اِس فعل سے نہ رُوکا۔

جب انس قبل واقعہ کربلا کوفہ میں موجود تھے اور رسولخدا کی اولاد پر فوجوں کی چڑھائی کا بندوبست آنکھوں سے دیکھ رہے تھے پھر کیوں نصرتِ حسین کو نہ گئے۔ اگر کہا جائے کہ بوجہ کبرسن امداد سے معذور تھے تو رسولخدا کی نواسیوں کو بے پردہ دیکھنے کے لئے جانے کی کیا ضرورت تھی اِس کے علاوہ جابرابن سمرہ، زید بن ارقم، زید بن خالد، نعمان بن بشیر، براء بن عازب کہ یہ بھی اصحاب رسول اللہ ہیں ان کے ماسوا شرع بن ہانی۔ شریح بن حارث۔ علقمہ بن قیس، مسروق ابن اجدع۔ سوید بن غفلہ، عبداللہ بن شداد، ابو عبیدہ بن عبداللہ بن مسعود اکابر تابعین میں شمار کئے جاتے ہیں یہ سب اِس وقت کوفہ میں مقیم تھے۔ مگر حسینؑ کی نصرت کو نہ گئے اور خاموش بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے، اور کسی نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی۔

اسی طرح جب حسینؑ نے عراق کی طرف کوچ فرمایا۔ بزرگان و مشاہیر حرمین بخوبی واقف تھے کہ کوفی یقیناً بے وفائی کریں گے۔ اسی بنا پر ابن عمر ابن زبیر ابن عباس، ابوسعید اور ابو واقد وغیرہ نے حضرت کو روکا اور عبداللہ ابن عمر نے صاف کہہ دیا کہ میں شہید کو رخصت ہوتا ہوں۔ مگر باوجود اس علم کے ان بزرگان اسلام نے نصرت و معیت سے روگردانی

کی، اگر عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن جعفر اور جابر انصاری بوجہ نابینائی معذور تھے۔ تو عبداللہ ابن حنظلہ، عبداللہ ابن مطیع، ابوسعید، ابو واقد اور دوسرے حاضرین حرمین کو کون امر مانع تھا کہ بدسلوکی یزید کو فرزند رسول کے ساتھ جان کر بھی خاموشی اختیار کی۔ گویا ہلاکت فرزند رسول ان سرداران اسلام کے خیال میں ایک معمولی اور خفیف بات تھی۔ ان کے علاوہ بریدہ بن حصیب اسلمی مسلمہ بن مخلد انصاری، ابوبردہ اسلمی مسعد بن مخرمہ صحابی اسید بن زہیر اوسی۔ ابوسعید بن لیلی انصاری برافع بن خدیج انصاری۔ عیاض بن ساریہ سائب بن یزید مدنی، سنان بن سلمہ مصری وغیرہ یہ سب صحابی زندہ موجود تھے مگر ان حضرات کو ذریت رسولخدا کے دشمنوں کی مدافعت کا خیال بھی نہ آیا دوسرے تابعین یا شرفائے اسلام کا تو ذکر ہی کیا ہے اور صرف ان بزرگواروں نے نصرت اہلبیت کا حق ادا کیا جنکے لئے یہ فوز عظیم مقدر ہو چکا تھا۔ چنانچہ حرمین شریفین کے باشندوں کو جن پر رسولخداؐ کے حقوق زیادہ تھے اس بے اعتنائی کی یہ سزا ملی کہ واقعہ حرا میں سیکڑوں صحابی اور ہزاروں دوسرے شرفا اور باشندے قتل ہو گئے۔

افسوس ہے کہ اُس وقت ایسے بھی مسلمان تھے جو اپنے پیغمبر کے نواسہ کا قتل اور اپنے رسول کی ذریت کی ہتکِ حرمت کو باعث دخول جنت اور موجب ثواب عظیم سمجھتے تھے جس کی نسبت متعدد تاریخی شہادتیں موجود ہیں اور ہم ان کو سلسلہ واقعات شہادت میں اپنے اپنے موقعہ پر بیان کریں گے۔ یہ عداوت اور خصومت بنی امیہ تک ہی محدود نہ تھی۔ اِس لئے بغض و عناد اہل بیت کا الزام سراسر اُن ہی کے سر تھوپ دینا انصاف سے بعید ہے۔ کیونکہ مرتکب قتل اہل عراق ہوئے شامی ان میں شامل نہ تھے پھر ہم کس طرح اِس بدکرداری کو جس کا بدنما داغ دامن اسلام سے کبھی چھوٹ نہیں سکتا۔ نواصب شام سے منسوب کر سکتے ہیں۔

ایسے نام نہاد مسلمانوں سے جن کو مسلمان کہنا اسلام کی توہین اور انسان کہنا انسانیت کی تحقیر ہے۔ اہل بیت رسول اللہ کیساتھ ایسی زیادتیاں اور بے ادبیاں سرزد ہونا۔ کچھ

محل استعجاب نہیں اور اس میں خداوند کریم کی ایک خاص حکمت و مصلحت تھی کہ حسینؑ ان ہی لوگوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے جو ان کی قدر و منزلت وقعت و عزت کو بخوبی جانتے تھے آپ کا اپنے ہی ہمقوم اور بظاہر اپنے ہی ہم ملت اور نانا کی کلمہ گو امت کے ہاتھوں سے جام شہادت پینا اس شہادت کی صداقت کا ایک اعلےٰ معیار ہے۔ اگر آپ دوسری قوم اور دوسرے مذہب والوں کے ہاتھ سے شہید ہوتے تو یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ مخالفوں کا یہ فعل نادانستگی کی حالت میں ہوا۔ اور اس واقعہ کی اس قدر وقعت اور دلچسپی نہ ہوتی۔ غضب تو یہ ہے کہ یہ ملعون گروہ خود کو اُسی گھرانے کا نام لیوا اور پیرو کہتا تھا۔ جس کے رُکنِ اعظم حسینؑ تھے ان کو معلوم تھا کہ یہ وہی حسینؑ ہیں جن کو آنحضرت خوشی سے اپنے دوشِ اقدس پر اٹھائے پھرتے تھے، یہ وہی حسینؑ ہیں جس کے لئے رسولخداؐ نے فرمایا تھا کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں یہ وہی حسین ہیں کہ جب آنحضرتؐ فاطمہؑ کے گھر میں تشریف لے جاتے تھے تو پوچھا کرتے تھے کہ فاطمہ! میرے ریحان (حسنؑ و حسینؑ) کہاں ہیں یہ وہی حسین ہیں جن کے خاندان والوں کے لئے قرآن مجید میں آیہ تطہیر نازل ہوئی ہے یہ وہی حسین ہیں جنہیں آیہ مباہلہ (اَبْنَاۤءَنَا وَاَبْنَاۤءَکُمْ) میں خدائے تعالےٰ نے فرزندِ رسول قرار دیا ہے باایں ہمہ کہ وہ بدبخت یہ سب کچھ جانتے تھے۔ اُن کی آنکھوں پر ایسا پردہ پڑا تھا کہ انہوں نے حسینؑ و اہلبیت رسالت کے ستانے اور اذیت دینے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ وَعَلٰی سَمْعِہِمْ وَعَلٰۤی اَبْصَارِہِمْ غِشَاوَۃٌ وَّلَہُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔

خود سالارِ لشکر قریشی النسب سادس الاسلام سعد ابن ابی وقاص کا بیٹا اور خاندان رسالت کا قریبی رشتہ دار تھا مگر حکومت صوبہ رے کا لالچ ایسا غالب آیا کہ لوگوں کی فہمائش پر بھی آنکھیں نہ کھلیں اور ابن زیاد کے پاس گیا تو یہ اشعار پڑھتا ہوا گیا ؎

اترک ملک الری و الری رغبتی — ام ارجع مذموما بقتل حسین
وقتلہ نار التی لیس دونہا — حجاب و ملک الری قرۃ عین

کیا میں ملک رے کو چھوڑ دوں اور ملک رے کی ہی مجھے خواہش ہے یا حسینؑ کو قتل کر کے مذموم واپس آؤں ان کے قتل کرنے سے میں دوزخ میں جاؤں گا جس کا کوئی مانع نہیں ہے۔ اور ملک رے کی حکومت میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

خاص قاتل شمر جب حضرت کے گلوئے مبارک پر خنجر پھیر رہا تھا تو (بقول ابو مخنف) یہ اشعار پڑھتا جاتا تھا۔

اقتلک الیوم ونفسی تعلم — علما یقینا لیس فیہ مزعم
ان اباک خیر من تکلم — بعد النبی المصطفیٰ المعظم
اقتلک الیوم وسوف اندم — وان ثوی عذاب جہنم
انیضک بالتراب بعصبۃ — ولا لاولاد النبی ارحم

آج میں تمہیں قتل کر رہا ہوں اور میرا نفس بغیر کسی شبہ کے بالیقین جانتا ہے کہ تمہارا باپ کل بولنے والوں میں نبی مصطفےٰ معظم کے بعد ممتاز ہے آج میں تمہیں قتل کر رہا ہوں اور عنقریب مجھے ندامت ہوگی اور اس کے بعد عذاب جہنم بھگتنا پڑیگا، تمہارا خون زمین پر گرا رہا ہوں اور اولاد نبی پر رحم نہیں کرتا۔ اس سے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ دنیا و آخرت کے بدبخت دیدہ و دانستہ کس طرح اندھے اور بہرے بن گئے تھے۔

شجاعت و بہادری کی صفت صرف یہی نہیں ہے کہ تلوار کا تلوار سے اور نیزہ کا نیزہ سے مقابلہ کیا جائے بلکہ بہادر کی ایک اعلےٰ صفت یہ ہے کہ مخالفین پر رحیم اور معاندین پر کریم ہو۔ ہر ایک مصیبت اور تکلیف کو حوصلہ و استقامت سے برداشت کرے، بے صبری اور کمزوری و اضطراب اس کے قدم کو جادہ استقلال سے نہ ہٹا سکیں یہ سب اوصاف حسینؑ کی ذات مقدس میں جمع تھے حسین اپنے دشمنوں کو ہتیاروں سے جواب بھی دیتے تھے باوجود اس

کے اُن پر رحیم اور مہربان تھے کیا کوئی شخص ان مظالم و مصائب کے ہجوم پر بھی اپنے دشمنوں کی بہبودی چاہے گا یا اس کے انتقامی جذبات دوسرے اوصاف کو مغلوب نہ کر لیں گے۔ مگر نہیں یہ صرف حسینؑ ہی کا حوصلہ اور حسینؑ ہی کی ہمت تھی کہ انہوں نے آخر دم تک اپنے نانا کے کلمہ پڑھنے والوں کو آخرت کے وزر و وبال سے بچانے کی کوشش کی اور بار بار اتمام حجت اور مشفقانہ نصیحت فرماتے رہے آپ کا ارشاد کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ میں کس گھرانے اور کس خاندان کا ہوں کیا تم میری بزرگی و عزت سے ناواقف ہو، تم خدا کو کیا جواب دو گے؟ اپنی جان اور اپنی عاقبت پر رحم کرو اس امر کو ثابت کر رہا ہے کہ آپ اپنے دشمنوں پر رحیم تھے۔ اور آپ کو ان تکالیف و شدائد کے اٹھانے پر بھی اپنے بزرگ نانا کی امت کے بہبودِ آخرت کا خیال رہا۔ اشقیائے امت نواسے کے قتل کے درپے ہو رہے ہیں اور وہ مصلح کامل اور رحم مجسم اُسی دُھن میں مصروف ہے جس دھن میں اس کا نانا اُمتی اُمتی۔ کہتا۔ حق ہی جا ملا۔ کیا حسینؑ کے حوصلہ اور اس بردباری کو کوئی بہادر پہنچ سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ انسان کا کام نہ تھا بلکہ اس تائیدِ ایزدی کا تھا جو حسینؑ کے رگ و ریشہ میں بھری گئی تھی انسانی کا یہ طبعی امر ہے کہ جب اُس کے سامنے اُس کے اہل و عیال کو قتل کرنے اور گھر بار لوٹنے کی دھمکی دی جائے تو وہ ہر ایک بُری بھلی بات اور مشورہ کو قبول کر لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے مگر یہ حسینؑ ہی کا حوصلہ اور استقلال تھا کہ باوجود ان تمام خطرات کے جو پیش نظر تھے، اُس امر کو منظور اور گوارا نہ کیا جو اسلام کے لئے مہلک اور باعثِ توہین و تذلیل تھا اور اس کی کچھ بھی پروا نہ کی کہ خاندان پر مصیبت آئے گی گھر لوٹا جائے گا عورتیں اور بچے اسیر ہوں گے۔

افسوس ہے کہ یہ سب کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہوا۔ اور وہ ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی عمر ۶۰ ہی سال کی تھی۔ خود سالار فوج اُس اسلامی ہیرو کا بیٹا تھا۔ جسے سابق الاسلام اور داخلِ عشرۂ مبشرہ ہونے کے علاوہ رسول خدا کے ماموں زاد بھائی ہونے کا شرف حاصل تھا اور جو اسلامی تاریخ میں فاتح عجم کے ممتاز لقب

ہمیشہ پکارا جائیگا۔ اسی طرح اور حاضرین بھی خود رسول خدا اور صحابہ کرام کے دیکھنے والے اور حسینؑ کے درجہ اور حسینؑ کی عظمت کو جاننے والے تھے۔ اسی وجہ سے حسینؑ کو بڑے اصرار سے بلایا تھا۔ پھر بھی انہوں نے وہ کیا جو اسلام کی بڑی سے بڑی مخالف قوم بھی نہ کرتی، سب کچھ جانتے پر انجان بن گئے ایک کاذب اور فاسق کی رضاجوئی کے لئے دینی حمایت درکنار قومی حمیت کو بھی خیرباد کہہ بیٹھے، اپنے تمام عہود و مواثیق سے پھر گئے۔ حسینؑ کے مدارج و مراتب کو کماحقہ جانتے تھے۔ حسینؑ کے بچوں اور حرم کی جو دردناک حالت تھی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ حسینؑ کی مشفقانہ اور رحیمانہ نصیحتیں اور درد انگیز تقریریں کانوں سے سُن رہے تھے۔ لیکن پتھر کی مورت کی طرح نہ ان کے قلوب پر کچھ اثر ہوتا تھا نہ آنکھیں اور کان متاثر ہوتے تھے۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اپنے نبی کی ذریت کی وہ توہین کی کہ بقول مولوی نذیر احمد دہلوی ایسی نالائق حرکت مسلمانوں سے ہوئی کہ اگر سچ پوچھو تو دنیا میں مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہے اگر یہ شہادت مسلمانوں کے ہاتھ سے نہ ہوتی تو اس کو اس قدر اہمیت اور وقعت نہ دی جاتی اور اس شہادتِ عظمیٰ کو ایسی تکمیلِ اتم کا درجہ حاصل نہ ہوتا اور یہ سمجھا جاتا کہ مخالفین اسلام نے بانئ اسلام سے اپنا بدلہ لیا۔

کیا خاندان حسینؑ نماز نہ پڑھتے تھے، کیا وہ روزہ نہ رکھتے تھے۔ کیا ان میں حاجی، حافظ قاری اور محدث نہ تھے، ضرور تھے۔ مگر ان کی یہ عبادتیں رسمی ورزش سے زیادہ وقیع نہ تھیں جن کو عبادت کے سطحی مفہوم سے بھی نسبت نہیں دی جا سکتی جن لوگوں نے اپنے ہی نبی کے نواسہ کو قتل کیا اپنے ہی رسولؐ کے ذریت کی تذلیل و توہین میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ تو کیا اُن کو مسلمان کہا جا سکتا ہے نہیں بلکہ ان کو مسلمان کہنا اسلام کی توہین کرنا ہے۔ اسی خاندان نبوت کا صدقہ اور طفیل تھا۔ کہ بنی امیہ صاحب طبل و علم ہوئے مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ یزید نے حسینؑ کے خلاف یعنے حیثیتِ انسان، انسانیت کے ساتھ کیسا برتاؤ۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ دشمنان حسین سے بجز خود غرضی، دنیا طلبی، بغض و عداوت، قساوت، شقاوت، ظلم و سفاکی

بے رحمی، بے حمیتی نامردی اور خلاف انسانیت افعال کے رحم و کرم، عفو، احسان اور انسانیت ظاہر ہوئی ابن سعد باوجود اپنے پشتارہ اجتہاد، روایت، حدیث اور صحابی زادگی کے ایسا نہ تھا کہ اپنے ولی نعمت کا احسان یاد رکھتا یہ گروہ اصول کی رُوح کو تو پس پشت ڈالے ہوئے ہی تھا۔ اس پر خوفناک فریب یہ دے رہا تھا کہ اکثر نے رسماً ایک سیاسی ذریعہ سمجھ کر عبادتِ ظاہری سے لوگوں کی آنکھوں میں خاک اور مُنہ میں لگام دیدی تھی بانی نماز کے فرزند کو عین حالتِ نماز میں قتل کیا جائے اور اظہارِ مسرت کے لئے تکبیر کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں کسی نے سچ کہا ہے ؎

جاؤا برأسك يا بن بنت محمد | مترملا بدمائه ترميلا
ويكبرون اذا قتلت وانما | قتلوا بك التكبير والتهليلا

اے دختر رسول کے فرزند تیرا سر لے کر آئے ہیں جو اپنے خون میں لتھڑا ہوا ہے۔ وہ تجھ کو قتل کر کے تکبیریں کہتے ہیں سچ یہ ہے کہ تیرے ساتھ تکبیر و تہلیل کو بھی قتل کر ڈالا۔

شہادتِ حسینی سے انکار

یہ تو تیرہ سو برس پہلے کے مسلمانوں کا ذکر ہوا جو دورِ صحابہ اور اسلام کے سیاسی عروج کا بہترین عہد تھا اب اس زمانہ کے بعض مسلمانوں کو لیجئے۔ کہ انہیں شہادت حسینؑ ہی سے انکار ہے۔ میدانِ کربلا میں شہید ہو کر حسینؑ نے جو مرتبہ شہادتِ کبریٰ کا پایا جس کی وجہ سے آپ کا نام نامی آفتابِ جہاں تاب کی طرح عالم میں روشن ہے۔ اس شہادتِ کبریٰ کے مرتبہ کو مٹایا جاتا ہے۔ محبتِ حسینی کا خون کیا جاتا ہے تنظیم حسینی کو خاک میں ملایا جاتا ہے۔ مخبر صادق کی پیشین گوئی شہادتِ حسینی کی تکذیب اور ترغیبِ محبتِ حسینی سے مخالفت کی جاتی ہے پہلے بھی کچھ لوگ مُنکر ہوئے تھے۔ مگر وہ اور صورت تھی۔ اب جو انکار کیا جاتا ہے اس کی دوسری

شان ہے۔

علامہ ابن بابویہ قمی کتاب عیون میں ابو صلت ہروی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت امام موسی رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ کوفہ میں ایک جماعت کا خیال ہے کہ:- حسین بن علی علیہ السلام شہید نہیں ہوئے۔ خدا نے حنظلہ بن سعد شامی کو حضرت کی صورت میں منتقل کر دیا اور آپ کو عیسے بن مریم کی طرح آسمان پر اُٹھا لیا اور ان لوگوں کو اس آیہ پر استدلال ہے۔ "وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا" حق تعالیٰ کافروں کو مومنوں پر غلبہ نہیں دیتا۔ حضرتؑ نے فرمایا وہ لوگ جھوٹے ہیں اور پیغمبر خدا کی تکذیب کرتے ہیں۔ کیونکہ آنحضرتؐ نے بار بار قتلِ حسینؑ کی خبر دی تھی، خدا کی قسم حسینؑ شہید ہوئے اور وہ بزرگوار بھی شہید کئے گئے جو حسین سے بہتر تھے (یعنی علی بن ابی طالب) اس آیہ کا مقصد یہ ہے کہ مومنوں پر کفار کی کوئی حجت نہیں۔

کتاب اکمال الدین اور احتجاج وغیرہ میں محمد ابن ابراہیم۔ ابن اسحٰق طالقانی سے منقول ہے کہ میں ایک روز مع جماعتِ احباب شیخ ابوالقاسم حسین بن روح نائب حضرت صاحب الامر کی خدمت میں حاضر تھا یکایک ایک آدمی نے اُٹھ کر شیخ ابوالقاسم سے سوال کیا

سائل:- میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں۔

ابوالقاسم:- پوچھو!

سائل:- آیا حسینؑ بن علیؑ ولیِ خدا ہیں۔

ابوالقاسم:- بے شک۔

سائل:- قاتل ان جناب کا دشمن خدا ہے یا نہیں۔

ابوالقاسم! بلاشبہ۔

سائل:- کیا یہ جائز ہے کہ خدا اپنے دشمن کو اپنے دوست پر مسلط کرے۔

ابوالقاسم:- خدا اپنے دشمن کو اپنے دوست پر مسلط نہیں کرتا بلکہ اپنے دوستوں کا

مصائب سے امتحان لیتا ہے اور یہ امتحان ان کی صداقت کا معیار ہے۔ جیسا کہ طبقۂ ابرار کے ساتھ ہوا۔ دشمن کا یہ تسلط ایک ظاہری غلبہ ہے، ورنہ وہ خود آخر کار مخذول و مقہور ہو کر غضبِ خدا کا مورد اور جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔

بہر حال یہ ایک خیالِ باطل تھا جو کچھ عرصہ تک چند لوگوں میں محدود رہا۔ مگر اس واقعہ کی عام شہرت اور تواتر نقل و روایت نے رفتہ رفتہ اس کو فنا اور محو کر دیا۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز یہ ہے کہ اب تیرہ سو برس کے بعد مرزا امراؤ بیگ تخلص حیرت دہلی کے ایک گم نام آدمی کو جو نہ طبقۂ علماء میں شمار کرنے کے قابل ہے نہ زمرۂ محققین میں بلکہ ایک اخبار کا اڈیٹر اور معمولی قابلیت کا شخص تھا شہادت حسینی کے انکار پر اصرار ہوا۔ اور اس نے ۲۳ جولائی ۱۹۰۵ء کے کرزن گزٹ دہلی میں انکار شہادت کے متعلق ایک مضمون شائع کیا جو ملخصاً ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

تیرہ سو برس کے بعد ایک حیرت انگیز راز کا افشاء

اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ جو عقیدہ یا خیال ہزار دو ہزار برس سے کسی قوم میں چلا آتا ہو وہ غلط نہ ہو مثلاً بت پرستی کئی ہزار برس سے دنیا میں رائج ہے اور کروڑہا بندگان خدا اس پر دل کر یقین اور ایمان رکھتے ہیں۔ مگر پھر بھی یہ مسئلہ سراسر غلط ہی ہے لہذا اگر کوئی عقیدہ ایسا ہو جس کو صدہا سال سے لوگ مانتے ہوں اور کروڑہا بندگان خدا کا اس پر یقین رہ چکا ہو تب بھی اس میں بہت کچھ تحقیق کی گنجائش ہے اور اس کے متعلق ایک بالتفصیل بحث کرنے کی جگہ موجود ہے، اس اصول متعارفہ سے فائدہ اٹھا کر ایک مشہور و معروف واقعہ کی جو تیرہ سو برس سے یکساں مسلّم چلا آتا ہے۔ تحقیق کرنا چاہتے ہیں اگرچہ ہمیں یہ یقین ہے کہ ہمارا جدید طرز استدلال اور عجیب و غریب تحقیق

دیکھ کر ناظرین چونک پڑیں گے۔ مگر ہم ان سے التجا کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے نہایت صبر اور توجہ سے ہماری اس تحقیق کو دیکھا۔ تو کم سے کم ان کو اتنا ضرور فائدہ پہونچے گا کہ عظیم غلط فہمی جاتی رہے گی۔ اور تیرہ سو برس کے رازِ سربستہ کا انکشاف ہو جائے گا جس واقعہ پر ہم بحث کرنا چاہتے ہیں اس کا تعلق حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت سے ہے۔ ایک طولانی اور گہری تحقیق کے بعد ہمیں اس بات کا پتہ لگ گیا کہ حضرت امام حسین شہید نہیں ہوئے، اس جملہ کو پڑھ کر چونکنے کی کوئی بات نہیں۔ پہلے ہماری رام کہانی سن لو۔ اس کے بعد اپنی رائے قائم کرنا ہماری تحقیق کا سلسلہ سب سے پہلے سنیوں اور شیعوں کی حدیثوں سے شروع ہوتا ہے۔ سنیوں کی حدیثوں کی کتابیں تو اس واقعہ کی نسبت ایک حد تک خاموش ہیں ہاں کہیں کہیں کنایہ اور اشارے سے کام لیا گیا ہے۔ اور سنیوں کی جن احادیث میں حضور انور رسولخدا صلے اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی نسبت پیشین گوئیاں درج ہیں وہ حدیثیں سب کی سب یا تو موضوع ہیں۔ یا ضعیف اور اگر کسی حدیث کو مرتبہ حسن نصیب ہوا بھی ہے (حالانکہ یہ مرتبہ حدیث کے لئے کوئی اعلیٰ درجہ کا نہیں ہے) تو بھی اس حدیث سے کوئی صاف روشنی شہادت کے واقعہ پر نہیں پڑتی، اب رہیں شیعوں کی کتب احادیث ان میں شہادت کے واقعہ کے متعلق متضاد روایتوں کا وہ طومار بے تمیزی جمع کیا ہے جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ہم تاریخوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں اس بلا کا اختلاف ہے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بات کو مانیں اور کس بات کو نہ مانیں۔ مورخوں نے جیسا کہ عام دستور ہے مثل بے وقوف بھیڑوں کے ایک دوسری کی تقلید کی ہے۔ مگر کسی بڑے سے بڑے مورخ کو بھی یہ بات نصیب نہیں ہوئی کہ بجائے خود روایتوں کے جانچنے

کا ایک صحیح معیار قائم کرنا اور تنقید کی پٹی کو آنکھوں سے کھول دیتا جو معیار طبیعات نے گذشتہ تاریخی واقعات کو جانچنے کا قائم کیا ہے اس معیار سے اگر جانچا جائے گا تو شہادت کے متعلق ایک واقعہ کی بھی صحت کا ہونا ناممکن محض ہے۔

یہاں تک تو صحیح ہے کہ حضرت امام حسین سخت پریشان ہو کر مدینہ سے مکہ میں تشریف لائے اور وہاں آپ کے پاس شیعیان علیؑ کے دستخطی صدہا خطوط بلاوے کے آئے۔ آخر آپ عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن عمر کے سمجھانے سے بھی باز نہ آئے اور بال بچوں کو لے کر سیدھے شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب آپ بمقام سریف پر پہنچے، تو حر عبیداللہ ابن زیاد کا سپہ سالار دو ہزار سواروں کے ساتھ نمودار ہوا جب امام حسین نے یہ دیکھا کہ مجھے سواروں نے گھیر لیا ہے تو آپ نے حر سے کہا کہ میں تم ہی لوگوں کا بلایا ہوا آیا ہوں مجھ کو واپس چلا جانے دو حر نے جواب دیا کہ میں اپنے گورنر کے حکم کو نہیں ٹال سکتا۔ تو حضرتؑ نے تین شرطیں پیش کیں ایک شرط تو یہ ہے (جیسا کہ ابوالفدا وغیرہ نے لکھا ہے) کہ مجھے ادھر ادھر گھاٹیوں میں چلا جانے دو۔ دوسری شرط یہ بھی کہ مجھے یزید کے پاس لے چلو۔ حر نے یہ تینوں شرطیں عبیداللہ ابن زیاد کے پاس لکھ کر بھیج دیں وہاں سے حکم آیا کہ ہم منظور نہیں کرتے۔ حر نے ابن زیاد کا حکم امام حسینؑ کو پڑھ کر سنا دیا اس پر آپ کو بہت صدمہ ہوا اور آپ نے ایک رات کی مہلت جنگ سے مانگی چنانچہ مہلت دیدی گئی۔ شب کو پوشیدہ طور پر حضرت امام حسینؑ اور حر کی ملاقات ایک خیمہ میں ہوئی، بڑی قیل و قال کے بعد یہ امر طے پایا کہ آپ مستورات اور بچوں کو چھوڑ کر یا دو تین آدمی جیسا مناسب ہو ساتھ لے کر قسطنطنیہ کی طرف چلے جائیں آپ کی مستورات کی حفاظت کا میں ذمہ دار ہوں۔ حضرت امام حسینؑ نے یہ فرمایا کہ غیرت تقاضہ نہیں کرتی کہ اپنے بچوں اور عورتوں کو دشمن کے پنجے میں چھوڑ کر چلا جاؤں حر نے کہا اس وقت آپ تنہا اپنے کنبہ کی حفاظت نہیں کر سکیں گے اور اگر آپ نے پانچ ہزار فوج کے مقابلہ میں تلوار اٹھائی اور میدان میں مارے گئے۔

تو ایسا قتل بطور خودکشی کے سمجھنا چاہیے، کیونکہ آپ یزید سے جنگ مدافعت نہیں لڑتے بلکہ اس پر آپ حملہ کر کے آئے ہیں۔ چنانچہ جو کچھ میں کہتا ہوں، اُسے گوش گزار کر لیجئے۔ آپ کے اور آپ کے خاندان کے لئے یہی بہتر ہے۔ چنانچہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے منظور کر لیا اور آپ حر سے مستورات کی حفاظت کا عہد لے کر اپنے چند بچوں کے ساتھ قسطنطنیہ چلے گئے دوسرے دن حر چاہتا تھا کہ کسی طرح باقیوں سے لڑائی نہ ہو مگر ابن زیاد کے تشدد سے شمر جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا اور حضرت امام حسینؑ کی غیر موجودگی میں عبداللہ ابن جعفر کے بیٹوں اور آپ کے بھائیوں اور بھتیجوں نے سختی سے مقابلہ کیا اور سب کے سب میدان جنگ میں کام آئے پھر یزیدی سپاہ کے افسروں نے کل مستورات کو بحفاظت دمشق پہنچا دیا۔ یزید نے ان کے ساتھ ہمدردی کی اور ان کو بہت کچھ دے دلا کر بحفاظت مدینہ پہنچا دیا۔ یہ ہماری سالہا سال کی تحقیق اور جانکاہی کا نتیجہ ہے جو ہم نے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہم نے جو کچھ اس کے متعلق تحقیق کی ہے وہ ابھی محفوظ ہے اسے ہم کتاب کی صورت میں آئندہ شایع کریں گے۔

یہ ہے وہ نیا شگوفہ جو مرزا حیرت کی جدت طرازی نے ہندوستان کی اسلامی دنیا میں چھوڑا ہے اور یہ ہے اس کی سرمایۂ ناز تحقیقات کا لب لباب جس کو ناظرین نے ملاحظہ فرمایا۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ بعض واقعات جو نہایت ہی مشہور اور سینکڑوں برس سے سنیوں اور شیعوں میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔ سرے سے بے بنیاد اور محض بے اصل ہیں۔ ہم اس کو بھی مانتے ہیں کہ طبقہ علماء کے بڑے بڑے اراکین مفسرین ہوں یا محدثین ہوں مورخین ہوں یا دوسرے مصنفین متقدمین ہوں یا متاخرین ان کو یکے بعد دیگرے۔ بلا سوچے سمجھے نقل کرتے آئے ہیں اور ان کی صحت و عدم صحت کو معیار اصول پر نہیں جانچا اس

ایسے مہتم بالشان اور خاص واقعات کے متعلق بھی ناقابلِ اعتبار ہیں تو سارے واقعات کے مشتبہ اور ناقابلِ اطمینان ہونے میں کیا شک رہا۔

"قیاس کن زگلستانِ مَن بہارِ مرا"

مرزا حیرت نے امام عالی مقام کا قسطنطنیہ چلا جانا بہرحال کسی کتابی روایت سے ہی اخذ کیا ہے، ورنہ اس کو کوئی الہامی طاقت حاصل نہیں تھی اور اسی واحد روایت پر قیاسی شواہد و دلائل قائم کر لئے ہیں ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جس روایت کی بنا پر یہ تمہید اٹھائی گئی ہے وہ کیونکر صحیح ہے، اور اس کی توثیق کے کیا ذرائع ہیں۔ مرزائے مذکور نے جس کتاب کی اشاعت کا وعدہ کیا تھا۔ حیرت ہے کہ اس کو شائع کیوں نہ کیا، تاکہ دیکھا جاتا کہ ان حجج و دلائل کی صحت کا جن کے استدلال پر مرزا کو اس قدر ناز اور دعویٰ تھا کیا معیار قائم کیا گیا ہے۔ اور اس کے پاس کون کون سی شہادتیں موجود ہیں اور ثقہ و غیر ثقہ راویان کی جرح و تعدیل کس طریقہ سے کی گئی ہے جس کے مقابلہ میں تمام متقدمین اور متاخرین کی تحقیق و تدقیق تقویم پارینہ خیال کر لی گی مرزا حیرت کو اس جدت آفرینی سے اتنا فائدہ ضرور پہنچا کہ اس نے اخباری دنیا میں ہلچل ڈال کر شہرتِ عام حاصل کر لی گو اس کا روئے سخن شیعوں کی طرف تھا کہ اس اشتعال انگیز کارروائی سے ان کو برانگیختہ کیا جائے۔ مگر حضراتِ اہل سنت نے بھی مرزائے مذکور کی اس انوکھی تحقیق کے خلاف شیعوں سے زیادہ پروٹسٹ میں حصہ لیا اس عام طوفانِ مخالفت کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کے ابطال و تردید میں متعدد رسالے لکھے گئے۔ اخبارات میں پرزور مضمون چھپے اور مرزا کو مناظرہ کے لئے چیلنج دیا گیا۔ اہل سنت کے دو رسالے جن میں مرزا کی خوب خبر لی گئی ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔ ایک ابوالبرہان مولوی سلطان الدین صاحب مبین عثمانی النارنولی کا رسالہ "سلطان مبین" دوسرا شاہ محمد حسن صاحب پھلواروی کا رسالہ "شہادت حسین" کہ ان دونوں بزرگواروں نے عالمانہ اور محققانہ بحث کر کے دنداں شکن جواب دئے ہیں۔

تساہل اور تسامح کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ غلط اور بے بنیاد قصے عوام تو عوام، خواص کے اذہان و قلوب میں ایسے راسخ اور استوار ہو گئے کہ اب ان کا انکار گویا بدیہات کا انکار ہے اور شہرتِ عامہ کو دیکھتے ہوئے ان کی تصحیح یا تردید ایک امرِ دشوار اور نسلِ انسانی کے دل و دماغ سے ان کا ازالہ ناممکن نظر آتا ہے۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا واقعہ شہادتِ سید الشہدا بھی فرضی یا خود ساختہ افسانہ ہے اور کیا اس کے وقوع کو بھی محالِ عقلی یا محالِ عادی سمجھ لیا جائے یا ہم ان محدثین اور مورخین کو جو حدیث اور تاریخ کے امام مانے جاتے ہیں۔ کاذب و دروغگو مان لیں اور ان کی تالیفات کو جن کے سوا ہمارے پاس معلومات کا اور کوئی ذریعہ و سرمایہ نہیں، انبارِ موضوعات جان کر کذب و افترا سے زیادہ وقعت نہ دیں۔ اور اس بات کو تسلیم کر لیں کہ اساتذۂ فن کی تالیفات کا سارا سلسلہ وساوس و اوہام کا اور کورانہ تقلید کا نتیجہ ہے۔ تمام روایتیں سرے سے غلط، راوی جھوٹے۔ اور لکھنے والے کوچہ تحقیق سے نابلد تھے۔ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ سارے واقعات جن کی واقعیت سے مرزا حیرت کو بھی انکار نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی صحت کہاں تک قابلِ اطمینان قرار پا سکتی ہے اگر کوئی مخالفِ اسلام وجودِ بانیٔ اسلام کا انکار کر دے اور آنحضرت صلعم کے معجزات و واقعات کو مصنوعی اور من گھڑت افسانہ بنا دے کیونکہ موجودہ نسلوں نے نہ رسول اللہ کی زیارت کی نہ آپ کی معجزات کو آنکھوں سے دیکھا۔ بلکہ جو کچھ ان تک پہنچا وہ سب ان ہی محدثین اور مورخین کے ذریعہ سے۔ تو مرزا حیرت اور اسکے مویدین اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں کسی واقعہ کے فروعات میں اختلاف کا ہونا اس کے وجود کی نفی اور اس کی اصلیت کے بطلان کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی تمام تاریخیں اختلافات سے پُر ہیں، خود اسلامی تاریخ کے واقعات اختلافات سے خالی نہیں۔ آنحضرت کی تاریخ ولادت اور تاریخِ رحلت ہی کو دیکھو کس قدر مشکوک و مشتبہ ہیں لیکن جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ سب ان ہی محدثین اور مورخین کی مساعیٔ حسنہ اور جہدِ بلیغ کے واسطے سے۔ اگر ان کی تحریر

سب سے اول مرزا کو ان احادیث کی صحت میں جو آنحضرت صلعم نے پیشین گوئی شہادت کے متعلق ارشاد فرمائی ہیں کلام ہے اور لکھا ہے کہ یہ حدیثیں سب کی سب یا تو موضوع ہیں یا ضعیف اس کا جواب شاہ محمد حسن صاحب یہ دیتے ہیں۔

"دیکھنا چاہیئے کہ یہ پیشین گوئی شہادت کس قدر کثرتِ طرق سے مروی ہے۔ اگر اس پر تواترِ معنوی کا ہی حکم لگایا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ حضرت امیرالمومنین علی مرتضیٰ خود حضرت امام حسینؑ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ۔ حضرت انس، حضرت امہات المومنین، حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ، حضرت زینب بنت جحش اور والد عبداللہ ابن عباس حضرت ام الفضل اس پیشین گوئی کے رواۃ ہیں اور ہر طبقہ کے محدثین اس کو اپنی کتابوں میں سند کرتے آئے ہیں۔ مثل امام احمد بن محمد بن حنبل۔ ابن ابی شیبہ۔ عبد ابن حمید کشی، ابو داؤد۔ ابن سعد، طبری، امام حاکم، عبدالرزاق، ابونعیم۔ ابویعلی۔ ابن عساکر۔ طبرانی خطیب۔ بیہقی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ اور پھر ان سے اکابرین محدثین اور علمائے محققین نقل کرتے آتے ہیں جیسے ابن تیمیہ، ابن قیم، النووی ابن صلح۔ سبکی ابن سبکی، قاضی عیاض۔ بیضاوی، غزالی، ابن عربی۔ قرطبی ذہبی۔ مزی، ابن اثیر، ابن حجر عسقلانی۔ ابن حجر مکی عینی، سخاوی سمہودی شعرانی، جلال الدین سیوطی، شیخ علی متقی، شیخ عبدالحق۔ شاہ ولی اللہ۔ اور شاہ عبدالعزیز وغیرہم رحمہم اللہ اجمعین۔ اور کسی محدث نے ابتدائے زمانہ تالیف و تصنیفِ احادیث سے لے کر آج تک پیشین گوئی شہادت کو موضوع نہیں کہا بعض طرق کا واہی یا ضعیف ہونا اور بات ہے۔ تمام طرق اور اصل واقعہ کو کسی نے موضوع یا غلط نہیں سمجھا۔ موضوعاتِ صغانی ابن جوزی۔ موضوعاتِ سخاوی، موضوعاتِ سیوطی، موضوعاتِ ملا علی قاری اور موضوعات

شعرانی وغیرہم شائع اور ذائع ہیں مگر ان کتابوں میں اصل واقعہ کی حدیث کو نہ موضوع کہا گیا اور نہ اشارتاً و کنایتاً کسی نے بھی اس پیشین گوئی کا انکار کیا علمائے اندلس جو خاص بنی امیہ کی سطوت و جبروت میں تھے۔ وہ بھی اس واقعہ کو نہ چھپا سکے اور اکابر محدثین اور علمائے اندلس مثل ابو عمرہ، امام قرطبی ابن حزم حمیدی، ابن عربی مالکی، ابن عربی صوفی، ابن عبدربہ، مقری وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ اپنی تصانیف و تالیفات میں برابر شہادت امام حسین علیہ السلام کا ذکر کرتے آئے اور ان کی کتابیں ہم لوگوں کے ہاتھوں میں موجود اور ذائع و شائع ہیں (رسالہ شہادت حسین صفحہ ۴۰)

واقعات کی نسبت مرزا حیرت کو یہ حجت ہے کہ اُن میں بے شمار اختلافات ہیں جو معیار طبیعات گذشتہ تاریخی واقعات کو جانچنے کا قائم کیا ہے اس معیار سے اگر جانچا جائے گا تو شہادت کے متعلق ایک واقعہ کی بھی صحت کا ہونا ناممکن محض ہے شاہ صاحب نے ثبوت شہادت کے روایتوں کے متعلق بھی جیسی کچھ عالمانہ اور محققانہ تنقید کی ہے وہ مسلمانوں کی ہدایت کے لئے کافی ہے۔ مولوی مفتی سلطان الدین صاحب عثمانی مرحوم نے مرزا حیرت کے اس حیرت انگیز خیال کا ابطال ایک اور ہی طریقہ سے کیا ہے۔ چونکہ کتب احادیث اور تواریخ کے حوالہ جات سے مرزا کی تو تو میں میں بند ہونے کی امید نہ تھی۔ اس لئے مولوی صاحب نے آیہ کریمہ:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ -	اے ایمان والو جب تم دیکھو کہ کوئی گروہ تم سے لڑنے کو آیا ہے تو ثابت قدم رہو اور خدا کو بہت یاد کرو شاید تم فلاح پاؤ۔

سے استدلال کر کے ثابت کیا ہے کہ جب خدائے قدوس نے اہل ایمان کے لئے یہ فرمان جبروت نشان نافذ فرمادیا کہ جب تمہارا کسی گروہ سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور ہرگز

نہیں ہو سکتا کہ فرزند رسولخدا جس کو رہنمائے مسلمین اور پیشوائے مومنین کہنا اس کے لئے باعث افتخار نہیں بلکہ اہل ایمان واسلام کا افتخار ہے اس حکم الٰہی سے مخالفت کرکے کوفیوں کے لشکر جنگی کے مقابلے سے ہٹ جائے اور جان بچاکر قسطنطنیہ کی طرف راہی ہو۔ اگر کوئی یہ حجت پیش کرے کہ یہ حکم کفار کے مقابلہ کا ہے اور کربلا میں مسلمانوں سے مقابلہ تھا اس مقام پر کیونکر منطبق ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں وَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا نہیں فرمایا جس وجہ سے یہ حکم مقابلہ کفار کیساتھ مخصوص سمجھا جائے بلکہ اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَۃً فرمایا اور فئہ کے ترجمہ گروہ ہے عام اس سے کہ کافر ہوں یا مسلم واجب القتال اس لئے اس حکم میں معرکہ کربلا بلاشبہ داخل ہے اس پر بھی اگر معترض یہ کہے کہ یہاں فئۃ سے مراد فئۃ کفار ہی ہے۔ کیونکہ یہ آیت حکایات معرکہ بدر کے ضمن میں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیات قرآنیہ کا نزول تو مورد خاص میں ہوا ہے، مگر حکم ان کا عام مانا گیا ہے۔ آنحضرت صلعم کے زمانہ سے آج تک شریعت محمدی میں یہی عملدرآمد ہے اور ہزاروں مسئلہ اسی قاعدہ کی رُو سے قرآن مجید سے اخذ کئے گئے ہیں اس قاعدہ کی رُو سے اگرچہ اس آیت کا نزول حکایتِ معرکہ بدر میں ہوا ہو۔ لیکن یہ حکم قیامِ قیامت تک ہر اُس معرکہ قتال پر صادق ہوگا۔ جو مسلمانوں کے مقابلہ میں ہو یہ آیت جن آیات کے ذیل میں واقع ہے وہ آیتیں معرکۂ بدر سے پہلے۔ یا معرکہ بدر کے وقت نازل نہیں ہوئیں کہ اس آیت کو جنگ بدر کی تعلیم سمجھ کر یہ کہا جائے کہ بدر میں معرکہ کفار سے تھا اس لئے فئۃ سے فئۃ کفار ہے۔ بلکہ وہ سب آیات جن میں یہ آیت داخل ہے۔ حکایت معرکۂ بدر میں ہیں جس سے ظاہر ہے کہ یہ آیت بعد معرکۂ بدر نازل ہوئی کیونکہ کسی واقعہ کا بیان اس واقعہ کے وقوع کے بعد ہوا کرتا ہے اس لئے صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ یہ آیت بعد معرکہ بدر جو اور معرکہ مسلمانوں کو پیش آئے یا قیامت تک پیش آئیں ان کی تعلیم ہے اور اس تعلیم میں "اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا" نہیں فرمایا بلکہ فئۃ کا عام لفظ ارشاد ہوا۔ تو اس آیۃ کے صاف معنے یہ ہوئے کہ اے ایمان والو جب تم کسی گروہ سے مقابل ہو خواہ وہ کافر ہوں یا مسلمانانِ واجب القتال تو اس وقت تم ثابت قدم رہو، پھر آگے فرماتے ہیں۔

کہ چونکہ یہ مسئلہ تمام اہل سنت کا بالاتفاق مسلّمہ ہے کہ معرکہ کربلا میں حسین علیہ السلام بر سرحق تھے اور جن لوگوں نے آپ کو شہید کیا وہ بر سرِ ناحق اس لئے کوفیوں کے واجب القتال ہونے میں کیا شبہ رہا۔

بہر حال اپنی عورتوں بچوں، بھائیوں بھتیجوں اور بھانجوں کو دشمنوں کے نرغہ میں چھوڑ کر صرف اپنی جان بچانے کے لئے روپوش ہو جانا ایسا حقارت آمیز ننگ و عار ہے۔ جسے کوئی معمولی شخص بھی بشرطیکہ اس کو غیرت اور شجاعت کا احساس ہو گوارا نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ رسولخدا کا نواسہ شیرِ خدا کا بیٹا جس کو تمام فضائل خلاق اپنے جد بزرگوار اور پدر عالی مقدار سے میراث میں پہنچے ہوں اور جس کے رگ و ریشہ میں غیرت اور شجاعت خون کی طرح دَوڑ رہی ہو اس دائمی ذلت و حقارت کو منظور کر لیتا۔ یہ مرزا حیرت جیسے ہی لوگوں کا کام ہے کہ فرزند سید المرسلین کی تحقیر و توہین کو اپنے خیالِ باطل میں نئی تحقیق اور نیا انکشاف سمجھ کر اس پر نازاں ہوں ورنہ ہر مسلمان خیال کر سکتا ہے کہ حسین جیسے غیور و شجاع سے جو تمام اخلاق و فضائل میں اپنے جد نامدار کا بہترین نمونہ تھے ایسی بے حمیتی جبن اور بزدلی کا سرزد ہونا محال عادی کیا محال عقلی ہے (فافہم وتدبر)

چونکہ یہ بحث طوالت طلب ہے اس لئے ہم مجبوراً اسی پر اکتفا کرکے ناظرین کو توجہ دلاتے ہیں کہ جس کا جی چاہے وہ رسالہ سلطان مبین۔ مولوی سلطان الدین صاحب نارنولی۔ کتاب شہادت حسین۔ شاہ محمد حسن صاحب پھلواروی اور رسالہ ثبوت۔ شہادت مولوی محمد ہارون صاحب زنگی پوری کو جو مرزا کے جواب میں تحریر ہوئی ہیں ملاحظہ کرکے اپنا اطمینان کرلے اور اس امر کو سمجھ رکھے کہ اگر مرزا حیرت جیسے لاکھ مخالف پیدا ہو کر اس شہادت کی اہمیت کو مٹانے میں سر توڑ کوشش کرینگے، تو اپنی مساعی لاحاصل میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ مرزا حیرت سے ایسے نازک زمانہ میں جب کہ مسلمانوں کا رشتۂ تعلقاتِ باہمی روز بروز کمزور اور نااتفاقی کی خلیج وسیع ہوتی جاتی ہے، ایک عبث اور فضول بحث کو چھیڑنا کس قدر

افسوسناک حرکت ہے۔ کاش مرزائے مذکور نے اپنے دماغ اور وقت کو کسی ایسے کام میں صرف کیا ہوتا جس سے قوم کو نفع پہونچتا تو کس قدر اچھا ہوتا۔ مگر وہاں تو مطلب سعدی دیگر است مقصود تو تھا کہ شیعوں اور سنیوں کو لڑوا دیا جائے اور یہ صورت اسی ایجاد بندہ اگر گندہ سے ہو سکتی تھی اس لئے اپنی ڈہائی اینٹ کی مسجد الگ ہی بنائی مگر اس کا خیال غلط نکلا۔ شیعہ اور سنی آپس میں اُلجھنے کے بدلے اُسی سے لپٹ پڑے۔

جنت میں بھی یقین ہے صبوحی کشان عشق ؎ اک میکدہ جدا لب کوثر بنائیں گے

ذکر حسینی سے مخالفت

اس وقت جب کہ آفتابِ علم نے اُفق مغرب سے سر نکالا ہے اور صدیوں کی تاریکی جہالت کے بعد ہر جگہ علم کا اوجالا پھیل گیا ہے۔ اس میں اولوالعزم عالی ہمت اور قومی جاں نثاروں کی تصویریں جن کی بے انتہا کوششوں اور سرفروشیوں کی نسل انسانی ممنون ہے، ہم کو صاف نظر آتی ہیں۔

ہم میں ہزاروں ایسے بھی ہیں جو ان کی تاریخی حالات کا مطالعہ اپنا خاص مشغلہ سمجھتے ہیں اور ان کی خیالی تصویروں کے نظارہ سے ان کا جی نہیں بھرتا۔ کتابوں کی ورق گردانیاں ان کے قلوب پر ایک خاص اثر ڈالتی ہیں یہاں پر ہم مثالاً نپولین اعظم شاہنشاہِ فرانس اور قیصر ولہم شاہنشاہ جرمنی کو پیش کرتے ہیں جن کی مثال نے یورپین دنیا میں علو ہمتی کی روح پھونک دی اور در حقیقت ان کی بہادری، عالی ہمتی۔ بلند خیالی اور اولوالعزمی حیرت انگیز اور قابل حسنت ہے۔

نپولین کے اس جملہ کی کہ دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں تمام دنیا مشکور ہے اور اسی جملہ کی بدولت بہت سے مشکل کام نہایت ہی آسانی سے انجام پا گئے ہیں۔

لیکن دنیا نے اس کو صفحہ ہستی سے ایسا مٹایا کہ جب ہم کو کتاب دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے یا ہم دنیا کی ترقی خواہوں کی سوسائٹی میں چلے جاتے ہیں تو اس کا تذکرہ سنتے ہیں۔ ورنہ ہم نپولین کا نام سنتے ہی نہیں اگر اس کے بعد ہم کو تلاش ہوتی ہے تو کسی صفحہ کاغذ پر اس کی تصویر مل جاتی ہے جس کو دیکھ کر ہمارے منہ سے نپولین کا نام نکلتا ہے اور اگر یورپ کا سفر کریں تو اس کے اسٹیچو پیرس، لندن روم وغیرہ میں ملتے ہیں اور دریافت کرنے پر کوئی ہم کو پتہ دیتا ہے کہ یہ نپولین کا سنگین بت ہے، اگر زیادہ سے زیادہ اس کی قبر تک پہونچ جائیں۔ تو تھوڑی دیر کے لئے مجملاً اس کے کارنامے ہمارے دل و دماغ میں گھومنے لگتے ہیں۔

قیصر ولہم کے کارنامے نپولین اعظم سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں، گو ابھی اس کی مخالفت کا مادہ سارے یورپ میں ساری ہے، مگر وہ وقت دور نہیں ہے ممکن ہے اس کی عزت نپولین سے زیادہ کی جائے۔ تاہم نتیجہ اس کا بھی وہی ہوا اور ہوگا جو نپولین کا ہوا۔ افسوس کیسے کیسے شاہان اولوالعزم کیسے کیسے بہادران قوم کیسے کیسے حکیم اور فلسفی۔ کیسے کیسے مجدد ریفارمر۔ کیسے ریاضی اور ہیئت داں دنیا کی اسٹیج پر آکر کیسے کیسے دلفریب اور حیرت افزا ایکٹ کر گئے، اور پھر خاک کے پیوند ہو کر اس طرح ملے کہ ڈھونڈے ان کا پتہ نہیں ملتا، اکثر کا تو نام و نشان بھی نہیں گویا دنیا میں آئے ہی نہ تھے یا دنیا میں آکر کچھ کیا ہی نہ تھا جن کے نام یادگار رہیں ان کو اپنے کارہائے نمایاں کا صرف یہ صلہ ملا۔ کہ تاریخی صفحات پر ان کے نام درج ہو کر صندوق میں یا الماری میں بند کر دیئے گئے ایک انگریز لکھتا ہے:-

"جب میرا دل گھبراتا ہے تو میں ویسٹ منسٹرابی میں (جہاں انگلستان کے مشاہیر قوم مدفون ہیں) چلا جاتا ہوں، بڑی بڑی اونچی قبریں خواہ وہ پتھر کی ہوں یا تانبے کی مجھ سے اپنے مدفون کے متعلق صرف اتنا کہہ دیتے ہیں کہ یہ شخص فلاں دن پیدا ہوا۔ اور فلاں دن مر گیا اور بس یہی اس کی یادگار ہے"!

افسوس کوئی ان کا نام لیوا بھی نہیں، اور ہے بھی تو ان ہی صورتوں میں جو ہم نے نپولین کے

بارہ میں بیان کیں۔

لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں اور تاریخی یادگاروں پر گہری نظر ڈالیں اور اپنے ضمیر کو اپنا رہبر بنالیں تو ان ہی تاریخی صفحوں پر ایک ایسی مثال بھی ملے گی جو اپنی نوعیت میں بے مثال ہے اور اس کا ہیرو ایسا بہادر مستقل مزاج، اولوالعزم اور جاں نثار قوم وملت تھا کہ آج اس کو دنیا سے اٹھے ہوئے تقریباً تیرہ سو برس گزر چکے، تاہم اس کا ذکر ہماری وردِ زبان ہے۔ اس ذکر میں ہماری کوئی غرض نہ بھی ہو تا ہم اپنی خوبیوں کے سبب سے وہ نام خود بخود بلاارادہ زبان پر آہی جاتا ہے۔ ہم نہیں یاد کرتے وہ زبردستی یاد دلاتا ہے۔ ہم بھاگتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ ساتھ ہے اور کچھ تو ایسے بھی ہیں جو اس وقت سے برابر کوشش کر رہے ہیں کہ یہ ذکر ہمارے سامنے سے کیا، بلکہ دنیا سے اٹھ جائے۔ مگر یہ چمکتی ہوئی روشنی آفتاب نصف النہار کی طرح سب کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ہے وہ کونسا ذکر ہے (ذکر حسینؑ) کون حسین۔ خدا کا عاشق جانباز، راہِ معبود میں مٹ جانے والا، حامی اسلام اور اس کو دنیا میں قائم رکھنے والا کیا کیا کوششیں اس نام اس غم کے مٹانے میں نہیں کی گئیں کون کون سی تدبیریں ہیں جو اس ذکر کو نسیاً منسیاً کرنے میں اٹھا نہ رکھی گئیں۔ اسلام کے ایک مشہور بزرگوار کی نسبت شیخ ابن حجر مکی صواعق محرقہ میں لکھتے ہیں۔

وَقَالَ الغزالی وغیرہ ویحرم علی الواعظ روایۃ مقتل الحسن وَالحسین وَ حکایتھا مَاجری بین الصَّحَابَۃ من المشاجر والتخاصم فانہ یھیج علی بغض الصحابۃ وَالطعن فیھم۔

امام غزالی وغیرہ فرماتے ہیں کہ حالات مقتل حسنینؑ اور واقعات مشاجرات ومخاصمات صحابہ کا بیان کرنا واعظ وغیرہ پر حرام ہے کیونکہ بے شک ایسی باتیں بغض وطعن صحابہ پر برانگیختہ کرتی ہیں۔

لیکن اس حق کے فدائی اور راہ راست کے ہادی نے کس طرح اور کس عالم میں اپنا فرض ادا کیا اور کیسا مقناطیسی اثر اپنے نام کے ساتھ چھوڑا۔ کہ آج اس کے مخالف بھی۔ اس کے

نام کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے نام لیواؤں کے ساتھ علم اور تعزیہ کے آگے پیچھے حسین حسین کہتے چلے جاتے ہیں، وہ کون سا جادو ہے، جو تیرہ سو برس سے آج تک باوجود ہزارہا انقلابات کے دنیا کے اِس سرے سے اُس سرے تک کام کر رہا ہے جس کا اثر نسلاً بعد نسل جوں جوں دنیا شائستہ اور مہذب ہوتی جاتی ہے ایک نئی ادا اور ایک نئی شان سے دنیا کی اسٹیج پر دلوں کو مسخر کرتا ہوا بڑھتا چلا جا رہا ہے وہ جادو حسینؑ کا وقتِ نزع جب کہ جلاد خنجر پھیر رہا تھا۔ اپنے خشک ہونٹوں کو حرکت دینا تھا وہ حرکت کیا تھی اِن الفاظ کا نکلنا تھا

"خداوندا میں نے اپنا وعدہ پورا کیا چونکہ تو صادق الوعد ہے اب تو اپنا وعدہ ایفا کر۔ میرے جدامجد کی امت کو بخش دے شکر ہے کہ میں تیرے دربار میں سرخرو حاضر ہوتا ہوں"

حق یہ ہے کہ یہ کام کربلا کے ہیرو کا ہی تھا اسلام ہمیشہ اس کا ممنون رہے گا۔ آج اسلام کا نام باقی نہ رہتا مگر اسی کی ذات عالی تھی کہ آج اس کے طفیل میں ہم اسلام کی سیاسی اور مذہبی عزت دیکھ رہے ہیں یہی وجہ تھی کہ رسولخداؐ حسینؑ کی عزت کرتے تھے اور حُسَیْنٌ مِنِّیْ وَاَنَا مِنَ الْحُسَیْنِ بار بار فرماتے تھے۔

جب سے کرۂ ارض پر انسانی نسل کا نشوونما ہوا بے شمار حادثات وواقعات رونما ہوئے اور جب تک یہ دنیا قائم ہے یہ سلسلہ بھی یوں ہی جاری رہے گا۔ مگر دنیا میں آج تک کوئی ایسا ہیرو ایسا بہادر ایسا حامی مذہب ایسا مستقل مزاج ایسا عاشق باری زمانہ نے نہیں پیدا کیا جس کی یادگار دوسری قومیں بھی قائم کرتی ہوں اور اس کے لئے اپنا مال لٹاتی ہوں البتہ یہ شرف اور یہ درجہ قدرت نے صرف حسینؑ کو ہی بخشا حسینؑ ہی دنیا میں وہ فردِ کامل گذرا ہے جس کی نظیر لانے سے دورِ زمانہ کی سالانہ اور روزانہ گردشیں قاصر ہیں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ حسینؑ کے دوست تو دوست ہی ہیں اس کے مخالف اور وہ تو ہیں جن کو حسینؑ کے خداحسینؑ کے ناناحسینؑ کے مذہب اور خود حسینؑ سے کوئی سروکار

نہیں حسین کی عالی ہمتی اور بلندیٔ عزم کی مالا جپتی ہیں اس کے مصائب پر روتی ہیں اس کی یادگاریں قائم کرتی ہیں اور بڑے خلوص و اعتقاد سے اس کے نام پر اپنا روپیہ اور اپنا وقت صرف کرتی ہیں بس کہ اس شعر کا

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ؛ ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

عملی ثبوت ملتا ہے کیا کسی کی یہ طاقت ہے کہ حسینؑ کے اثرِ مظلومیت کو صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ کیا کسی کی یہ مجال ہے کہ اس عظیم الشان واقعہ کو ایک عالم کے دل سے محو کر دے ایسی فضول کوشش ہرگز ضرر رساں نہ ہوگی گو ایسے لوگ ہمیشہ رہے اور اب بھی ہیں جو ذکرِ حسین کی مخالفت کو ایک رسمی ورثہ سمجھتے ہیں لیکن صدیوں کا تجربہ ہم کو بتا رہا ہے کہ حسین کے ساتھ جوشِ عقیدت پرجوش محبت و ہمدردی ہمیشہ غالب رہا اور اب بھی باوجود طرح طرح کی مخالفتوں اور مزاحمتوں کے ذکرِ حسین اُس جہاز کی طرح جو سخت طوفان کے بعد نسبتاً کمزور تلاطم میں خوشحالی سے پانی کو چیرتا ہوا چلا جائے روز افزوں ترقی پر ہے۔

باوجودیکہ کوئی ظاہری قوت محرک نہیں، نہ خود حسین دنیا میں موجود ہے۔ نہ ان کا کوئی وکیل ہے جو باقوت و صولت سمجھا جائے اور نہ کسی سلطنت کا دباؤ اور دبدبہ ہے، نہ کسی قسم کی حصول دولت کی طمع اس میں ہے ایک عالم ہے کہ قہراً اس امر پر مجبور ہے کہ وہ حسینی واقعات پر ہر سال بلکہ ہر مہینہ بلکہ ہر ہفتہ بلکہ ہر روز بلکہ ہر ساعت روشنی ڈالتا رہے کوئی حسین کے واقعاتِ شہادت کے نظم میں مصروف ہے، کوئی اُسے نثر میں ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہے کوئی اُسے بیان کرنے کی سعی میں مصروف ہے کوئی مصائب پر رو رہا ہے کوئی ماتم کر رہا ہے کوئی سر پر خاک ڈالے ہوئے ہے، کوئی مشہدِ حسینی کی زیارت کا تہیہ کرتا ہے کوئی تعزیہ علم ضریح کی درستی میں مشغول ہے کوئی اہتمامِ مجالس میں ہمہ تن منہمک ہے غرض ایک عالم ہے کہ حسینی ارادوں کے پورا کرنے میں اس طرح سرگرم ہے کہ گویا خود حسینؑ سامنے موجود ہیں اور وہ حکم دے رہے ہیں اور واجب الامتثال حکم دلوں کو مسخر کئے ہوئے مسلسل کام

رہا ہے حالانکہ فی الواقع ایسا نہیں نہ خود حسین اس وقت دنیا میں بظاہر موجود ہیں۔ نہ کوئی ظاہری قوت کسی قسم کا دباؤ ڈال رہی ہے۔ نہ بیّن طور پر کوئی امید نفع عاجل کی نظر آتی ہے۔ بلکہ بجائے نفع کے بہت زیادہ مقدار میں اپنا مال خرچ ہوتا ہے اپنا وقت صرف ہوتا ہے جس کا حتی معاوضہ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تو کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ یہ تمام کام بلا سبب اور بلا کسی زبردست باطنی تحریک کے انجام پا رہے ہیں ہرگز نہیں بلکہ ان تمام کاموں کی محرک ان تمام امور پر بقوتِ قاہرہ قلوب عامہ کو مسخر کرنے والی صرف وہ خدائی مشیت ہے جو سب پر غالب ہے۔

یہ امر تجرباتِ کثیرہ اور مشاہداتِ روزمرّہ سے متیقّن ہو چکا ہے کہ اس بارہ سو برس کے اندر جس نے یہ کوشش کی کہ حسینی آثار کو مٹا دے یا کم سے کم اس میں کمی ہی پیدا کر دے وہ خود منہ کے بل گرا اور اپنی سعی بے سود اور جہد لاحاصل میں ناکام رہا۔ یاد کرو ان سلاطینِ اسلام کے دور جن کے ہاتھ میں عرب و عجم اور تمام شمالی افریقہ کی باگ تھی جن کی سطوت و ہیبت سے دوسرے تاجدارانِ عالم خائف و لرزاں تھے جب ان لوگوں نے یہ قصد کیا کہ حسینی اثر کو جو عالم میں پھیلا ہوا ہے مٹا دیں اور انہوں نے اپنی ایڑی چوٹی تک کا زور صرف کر دیا تو آخر کیا نتیجہ ہوا یہی نا کہ خود فنا ہو گئے ان کی عظیم الشان سلطنتیں نیست و نابود ہو گئیں ان کے تخت اوندھے ہو گئے اور وہ ایک تاریک غار میں بند کر دئے گئے مگر حسینی آثار و اذکار پر ذرہ برابر بھی اثر نہ پڑا۔ وہ جس طرح اس وقت تھا اسی طرح آج بھی موجود ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ اس لئے وہ اہل دنیا جن کے پاس نہ شان و شوکت ہے نہ سلطنت نہ دولت ہے نہ زور نہ قوت، نہ علم و عمل نہ فوج ہے نہ حشم۔ اس امر کے ساعی نظر آتے ہیں کہ امام مظلوم کے آثار پر برا اثر ڈالیں اور دنیا کی اس سب سے بڑی شہادت کو غلط اور بے بنیاد ثابت کر دیں وہ کیا کر لیں گے سوائے اس کے کہ ندامت سے سر جھکا لیں اور ذلیل و خوار ہوں شاید ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں "با آل نبی ہر کہ درافتاد برافتاد"

واقعاتِ شہادت میں اختلاف

اور اُن کے اسباب

حضرت امام حسینؑ کی دردانگیز شہادت کا افسوسناک حادثہ جس طرح تاریخِ عالم میں عموماً اور تاریخ اسلام میں خصوصاً عدیم المثال سمجھا جاتا ہے اس سے زیادہ تعجب خیز اس واقعہ کی روایتوں کا اختلاف ہے، عام کتابوں سے قطع نظر کرکے فریقین کی وہ مستند کتابیں جو اسلامی تاریخ کی جان سمجھی جاتی ہیں اس قدر مختلف البیان ہیں کہ دیکھنے والے ششدر رہ جاتے ہیں کوئی لائق سے لائق مورخ بھی۔ کیسے ہی معقول وسائل و ذرائع فراہم کرلے مجتہدانہ رائے قائم کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اگرچہ متقدمین و متاخرین کے لائق مصنفوں نے نہایت جانکاہی سے رطب و یابس کے چھانٹنے میں حتی الوسع کوشش و سعی سے کام لیا ہے۔ تاہم حتمی رائے اور فلسفیانہ اجتہاد کے کافی ہوجانے کی وجہ موجّہ بہت دشوار ہے۔

واقعات کربلا کے بیان سے سینکڑوں کتابیں بھری پڑی ہیں لیکن اگر دو مستند سے مستند کتابوں کو بھی سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو تمام واقعات کی تحریریں اول سے آخر تک متفق اللفظ نہیں ایسی حالت میں اگر ہم فلسفہ تاریخ کے اصول کو پیش نظر رکھ کر ان واقعات کو معیارِ حقیقت پر جانچیں تو کہاں تک اور کس کس روایت کی صحت و غیر صحت پر حجت و استدلال سے کام لیں واقعاتِ کربلا کے دوران تحریر میں ہم نے مقتل ابومخنف لوط ابن یحیٰی ازدی، تاریخ کبیر ابوجعفر طبری، مروج الذہب مسعودی۔ تاریخ کامل ابن اثیر۔ تاریخ ابن خلدون، تاریخ ابوالفدا، تاریخ اعثم کوفی، دُولِ اسلام ذہبی۔ تاریخ الخلفا سیوطی، عیون والحدائق، اخبار الدول قربانی، تاریخ ابن واضح عباسی، فتوح البلدان بلاذری کتاب معارف ابن قتیبہ۔ اعلام الورا۔ اِعلام الاعلام۔ تذکرہ خواص الامۃ ابن جوزی۔ نجوم الزواہر، مرات الجنان یافعی۔ شرح شافیہ ابی فراس تاریخ

معینی۔ صواعق محرقہ ابن حجر مکی، شرح سفر السعادۃ شیخ عبدالحق محقق دہلوی۔ سر الشہادتین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ مفتاح النجات فی مناقب آل عبا مرزا معتمد خاں بدخشی۔ تذکرہ قرطبی وفیات الاعیان قاضی ابن خلکان۔ مناقب السادات قاضی شہاب الدین دولت آبادی۔ تاریخ ابی خاتم مکی، روضۃ الصفا خاوندشاہی، روضۃ الشہداء، ملاحسین کاشفی۔ مسند ابن عساکر۔ مطالب السئول فی مناقب آل رسول کمال الدین شافعی، جمع الجوامع سیوطی، فردوس الاخبار دیلمی، معجم صغیر طبرانی، دلائل النبوۃ بیہقی، ینابیع المودۃ۔ شیخ الاسلام سلیمان قندوزی اسلامبولی سیرۃ ابی الملک کلبی، نورالابصار شیخ شبلنجی المصری، جواہر العقدین، علامہ نورالدین۔ نورالعین فی مشہد الحسین ملا ابواسحاق اسفراینی۔ مناقب حافظ ہمدانی۔ سعادت الکونین فی فضائل الحسنین مفتی اکرام الدین خاں دہلوی وسیلۃ النجاۃ ملا مبین لکھنوی از اہل سنت، کتاب مناقب ابن شہرآشوب، کتاب اقبال سید ابن طاؤس، کتاب لہوف سید ابن طاؤس۔ کتاب امالی شیخ صدوق، کتاب امالی علامہ طوسی، کتاب عوالم عبداللہ ابن نوراللہ، بحارالانوار علامہ مجلسی، حیات القلوب علامہ مجلسی، ناسخ التواریخ، مرزا محمد تقی سپہر مازندرانی۔ جلاء العیون عبداللہ بن محمد۔ مقتل ابن شہرآشوب، طوفان البکا جوہری۔ کتاب خرائج قطب راوندی۔ مثیر الاحزان جعفر ابن نما۔ بشارۃ المصطفےٰ شیخ عماد الدین طبری۔ مصباح متہجد ابوجعفر بن حسن طوسی، منہاج الصلاح علامہ حلی۔ محرق القلوب ملا مہدی نراقی، مجالس المتقین ملا محمد تقی برغانی۔ مخزن البکا ملا محمد صالح قزوینی، اسرار الشہادۃ اخوند ملا آقا دربندی منتخب شیخ فخرالدین طریحی، قمقام الزخار شہزادہ فرہاد مرزا، ریاض الشہادۃ ملا محمد حسین قزوینی اکلیل المصائب محمد بن سلیمان تنکابنی، مجالس مفجعہ سید العلماء لکھنوی، مقاتل الطالبین ابوالفرج اصفہانی کامل الزیارۃ ابن قولویہ، کشف الغمۃ علی بن عیسیٰ اربلی، کتاب ارشاد شیخ مفید، کتاب المزار سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، انوار نعمانیہ سید نعمت اللہ جزائری، ماتین فی مقتل الحسین مولوی غلام حسین کنتوری، مہیج الاحزان اخوند ملا حسن یزدی، بحر المصائب

مولوی امداد علی لکھنوی (شیعہ) کو دیکھا مگر سب میں اس قدر اختلافات پائے کہ اس کے خیال سے بھی دماغ چکراتا ہے۔

آخر اسلامی واقعات کے اس سب سے بڑے اور مہتم بالشان حادثہ کی نوعیت اس قدر ڈانواں ڈول اور سلسلۂ روایات کے لاانتہا مختلف البیان ہونیکی کیا وجہ ہے۔ تمام دنیا کی قوموں میں مسلمان اپنی قومی تاریخ کی صحت پر جس قدر ناز کریں تھوڑا ہے مسلمانوں نے ہی اس فن کو بہ حیثیت فن زندہ کیا۔ پھر کیا سبب ہے کہ یہ مشہور سانحہ جو ہر سال مسلمانوں میں گھر گھر بیان کیا جاتا ہے اور ان کے نبی کے خاص خاندان اور ذریت سے تعلق اور سیاسی نہیں بلکہ ایک بڑی حد تک مذہبی شان رکھتا ہے اس قدر مشتبہ اور مشکوک ہے۔

اِس اہم مسئلہ پر جہاں تک غور کیا جاتا ہے بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مردان اہل بیت اور انصار امام سب میدان کارزار میں کام آچکے تھے۔ سید الساجدین حالت بیماری میں خیمہ کے اندر تھے حسن مثنیٰ یا وہ لوگ جو درجہ شہادت پر فائز نہ ہوئے ان سے کوئی واقعہ مروی نہیں اور اگر ہے تو شاذ فوجِ مخالف کے جو لوگ کوفہ میں آئے انہوں نے جس طرح ان خبروں کو مشہور کر دیا ویسے ہی شہرت پذیر ہو گئیں، چونکہ یہ حادثہ نہایت عظیم الشان تھا اس واسطے بہت جلد اس کا اعلان و اشتہار ہو گیا جس شخص نے جیسا سنا دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے بیان کر دیا بیانِ واقعات میں کسی راوی سے سہو ہوا کسی کے طرز بیان نے واقعہ کی اصلیت کو افراط و تفریط سے مسخ کر دیا۔ کسی کو راوی کا اصل مدعا سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی کسی نے واقعہ کو پُراثر بنانے کے لئے مبالغہ سے کام لیا، کسی نے شدتِ احتیاط سے واقعہ نفس الامری کو نامعتبر سمجھا۔ اور اس میں اپنے خیال کے مطابق کمی کر دی اور ایسا ہونا کچھ تعجب خیز بھی نہیں کیونکہ مشاہدہ خود اس کا شاہد ہے اگر کسی جگہ کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے، تو اس کے متعلق طرح طرح کے مختلف اور متضاد افواہیں مشہور ہو جاتی ہیں، زید کچھ کہتا ہے تو بکر کچھ اور۔ اس کے علاوہ صدہا باتیں

طبعزاد تراشی گئیں واقعات کی تدوین عرصۂ دراز کے بعد ہوئی۔ اسوقت تک یہ سب واقعات سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے چلے آئے اور تغیر الفاظ کے ساتھ مفہوم میں بھی تغیر پیدا کرتے رہے جب مولف کو جو خبر جس ذریعہ سے مل گئی اس نے وہی لکھدی رفتہ رفتہ اختلافات کی اس قدر کثرت ہو گئی کہ سچ کو جھوٹ سے اور جھوٹ کو سچ سے علیحدہ کرنا مشکل ہو گیا۔

حمید ابن مسلم ازدی جو عبیداللہ ابن زیاد کی طرف سے غالباً خدمتِ واقعہ نگاری پر مامور تھا اکثر واقعات کا راوی ہے مگر اس کے اقوال بھی نہایت اختلاف کے ساتھ مشہور ہیں۔

ابو مخنف لوط ابن یحییٰ ازدی نے جو ان دنوں کوفہ میں موجود تھے۔ مورخانہ حیثیت سے اپنی کتاب مقتل میں تمام حالات کو سلسلہ وار لکھا ہے مگر وہ کربلا میں خود موجود نہ تھے اس لئے یہ سب واقعات انہوں نے بھی سماعی لکھے ہیں لہذا مقتل ابو مخنف پر بھی پورا وثوق نہیں پھر لطف یہ کہ مقتلِ ابو مخنف کے متعدد نسخہ پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف البیان ہیں اور ان سے صاف پایا جاتا ہے کہ خود ابو مخنف ان واقعات کے جامع نہیں بلکہ کسی اور ہی شخص نے ان کے بیان کردہ سماعی واقعات کو قلمبند کر دیا ہے۔

مختصر یہ کہ شہادتِ امام حسینؑ کے متعلق تمام واقعات ابتدا سے انتہا تک اس قدر اختلاف سے پُر ہیں کہ اگر ان کو فرداً فرداً بیان کیا جائے تو کئی ضخیم دفتر فراہم ہو جائیں اکثر واقعات مثلاً اہل بیت پر تین شبانہ روز پانی کا بند رہنا فوجِ مخالف کا لاکھوں کی تعداد میں ہونا۔ جناب زینبؑ کے صاحبزادوں کا نو اور دس برس کی عمر میں شہادت پانا، فاطمۂ کبریٰ کا عقد روز عاشور قاسم ابن حسن کے ساتھ ہونا، عباسِ علم بردار کا اس قدر جسیم اور بلند قامت ہونا کہ باوجود سواری اسپ دور کابہ آپکے پاؤں زمین تک پہونچتے تھے جناب سید الشہدا کی شہادت کے موقعہ پر آپکی خواہر گرامی جناب زینب بنت امیر المومنین کا سر و پا برہنہ خیمہ سے نکل کر مجمعِ عام میں چلا آنا شمر کا سینۂ مطہر پر بیٹھ کر سر جدا کرنا آپکی لاش مقدس سے کپڑوں تک کا اتار لینا نعش مطہر کا لکدکوب سُمِ اسپاں کیا جانا۔ سرادقات اہلبیت

کی غارتگری اور بنی زادیوں کی چادریں تک چھین لینا ۔ شمر کا سکینہ بنت حسین کے مُنہ پر طمانچہ مارنا ۔ سکینہ کے عمر تین سال کی ہونا ، روانگی اہل بیت کے وقت جناب زینب کی پشت پر دُرّے لگائے جانا اہل بیتِ رسالت کو بے مقنع و چادر ننگے اونٹوں پر سوار کرنا ۔ سید الساجدین کو طوق و زنجیر پہناکر ساربانی کی خدمت دیا جانا علاوہ کوفہ و دمشق کے اثنا راہ میں جا بجا اہل حرم کو نہایت ذلت و خواری سے تشہیر کرنا ۔ مجلس دمشق میں عرصہ دراز تک بنی زادیوں کا قید رہنا ، ہندہ زوجہ یزید کا قید خانہ میں آنا یا اس کا اہلبیت کی روبکاری کیوقت محل سرائے شاہی سے سر دربار نکل آنا ۔ سکینہ کا قید خانہ ہی میں رحلت پانا ۔ سید الساجدین کا سرہائے شہدا لے کر اربعین (۲۰ صفر) کو کربلا میں واپس آجانا اور چالیسویں روز لاشہائے شہدا کو سپرد خاک کرنا وغیرہ وغیرہ نہایت مشہور اور زبان زدِ خاص و عام ہیں حالانکہ ان میں سے بعض سرے سے غلط بعض مشکوک بعض ضعیف بعض مبالغہ آمیز اور بعض من گھڑت ہیں ۔

اصل یہ ہے کہ اس زمانہ میں صرف روایات ہی پر تاریخ کا حصر تھا جس مورخ کو جس معقول ذریعہ سے جو بات معلوم ہوئی اور اُس نے اس کو اپنے خیال میں معتبر سمجھا لکھ دیا ۔ شدہ شدہ ان اختلافات و شبہات کی انتہا نہ رہی ۔ ذاکرین نے صرف رُلانے رلانے کو مدنظر رکھ کر واقعات کی صحت و غیر صحت کو پس پشت ڈال دیا ۔ اور جو واقعہ ہاتھ آیا بے سمجھے سوچے ، سادگی یا رنگ آمیزی سے بیان کرنا شروع کیا ۔ عوام کو جانے دو ۔ جو لوگ اہلِ علم کے طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں وہ بھی اسی لکیر کو پیٹتے رہے ۔ اب رہے شاعر تو ان کا اصول ہی یہ ٹھہرا کہ جو بات عام طور پر مشہور ہو خواہ وہ صحیح ہو یا غلط اس کو نظم کر دیں اس کے علاوہ جدت طرازی لازمۂ شاعری ہے ، جو مضمون آفرینی کے ساتھ واقعات میں تراش و خراش کئے بغیر نہیں رہتی ، کیونکہ اس واقعہ کو اسلام کے ہست و بود سے ایک خاص اور گہرا تعلق ہے اس لئے جسقدر کتابیں اس موضوع پر تحریر

ہوئیں وہ یقیناً تاریخ اسلام کے کسی اور واقعہ کے متعلق نہیں لکھی گئیں اس وقت تک مختلف زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ان کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہے تاہم یہ امر کسقدر افسوسناک ہے کہ عموماً مورخین و مصنفین نے قلتِ تدبر کی وجہ سے رطب و یابس سب کو بھر دیا اور صحیح و غیر صحیح روایتوں میں تمیز نہ کی ، اکثر نے بکا اور ابکا کے سوا کوئی دوسرا مقصد پیش نظر ہی نہیں رکھا ۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ بات ہے کہ :- شیعوں میں جو واقعات آئمہ اہل بیت سے مروی ہیں اور جن کو حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ بھی اسی طرح مختلف البیان ہیں جس طرح عام راویوں کے بیان کردہ واقعات ۔

خاص واقعاتِ کربلا پر آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا ہے ، غلط روایات کی تردید کی جاتی ، ضروری واقعات کی صحت و غیر صحت کو تنقیدی اصول سے جانچا جاتا ، اور اس اہم اور نہایت ضروری کام کو قومی اور مذہبی خدمت سمجھ کر غلط اور مشتبہ واقعات کی تنقید و تصحیح کا اہتمام کیا جاتا یہی وجہ ہے کہ مستند سے مستند اور معتبر سے معتبر کتابوں میں رطب و یابس سب موجود ہے اس لئے ضرورت ہے کہ نہایت کثرت سے تاریخ و مقتل کی کتابیں فراہم کی جائیں اور پھر کامل تحقیق و تنقید سے ایک مستند کتاب تیار کی جائے مگر سینکڑوں کتابوں کا استقصا کے ساتھ دیکھنا اور ان سے معلومات کا اقتباس کرنا ایک شخص کا کام نہیں ۔ کیا حسینؑ کے نام لیوا جوان کے نام پر ہزاروں روپیہ لٹاتے اور اس ذکر خیر کو باعثِ اجرِ عظیم جانتے ہیں اتنی تکلیف گوارا نہیں کر سکتے ۔ کیا ان کو کبھی ایسی توفیق ہوگی ۔ کہ ایک علمی جماعت تیار کر سکیں جو تحقیقاتِ جدید کے کل اسلحہ سے تیار ہوں اور دوسرے مشاغل سے بے فکر ہو کر اسی کام میں پوری سرگرمی اور انہماک سے کام لیں کیا لکھنؤ کا وہ مقدس اور واجب الاحترام خطہ ، جو قوم کا مذہبی سرگروہ اور مسند علم کا مالک ہے اتنی زحمت گوارا نہیں کر سکتا کہ اس مہتم بالشان کام کو اپنے ہاتھوں میں لے کر انصرام کو پہونچائے اور ان غلط اور بے سر و پا افواہوں کی جو خاندان رسالت سے منسوب

کی جاتی ہیں حجت ہائے قاطع کے ساتھ تردید کرکے پڑھنے اور سننے والوں کو آخرت کے وزر و وبال سے بچانے کی کوشش کریں۔

فلسفۂ تاریخ نصاب تعلیم کا اب ایک ضروری اور لازمی جزو ہے نئی نسلیں جو نئی تعلیم کی روشنی سے مستفیض ہو رہی ہیں ان کے جدت پسند دماغ اور تحقیق طلب طبائع، بے سروپا قصوں کو کبھی تسلیم کرنے والے نہیں نہ ان کو اس سے کوئی سروکار ہے کہ فلاں امام ایسا لکھ گئے ہیں اور فلاں مجتہد ایسا فرماتے ہیں کیونکہ جب تنقیح وتنقید اور جرح وتعدیل کی گنجائش ہو تو کسی مصنف کی شخصیت اس کی تحریر کو آئندہ تصحیح و تردید سے بے نیاز نہیں کر سکتی، پھر کیوں نہ مستقبل کی ضروریات پر لحاظ رکھ کر ایک ایسی جامع اور صحیح کتاب جو آئندہ نسلوں کو شکوک وشبہات کے تاریک گڑھے سے بچ کر مشعل ہدایت کا کام دے، مرتب و مدون کی جائے۔

چند مشہور غلط واقعات کی تنقید

یہ واقعات ایک عرصہ دراز کے بعد لکھے گئے۔ اس لئے مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہ تھی بلکہ اکثر زبانی روایتیں تھیں اس قسم کا موقعہ جب پیش آتا ہے یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلمبند کئے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں پہلے تحریریں لے لی جاتی ہیں جن کے راویوں کے نام ونشان تک نہیں معلوم۔ پھر ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کرلئے جاتے ہیں جو قرائن وقیاس کے مطابق ہوتے ہیں کچھ عرصہ کے بعد یہی خرافات ایک عجیب تاریخی کتاب بن جاتے ہیں چنانچہ یورپ کے اکثر تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں لیکن مسلمانوں نے اس فن کا جو معیار قائم کیا وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے۔ اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے، جو خود شریک واقعہ تھا وہ اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک

تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے اس کے ساتھ ہی یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے ہیں کون لوگ تھے، کیسے تھے۔ کیا مشاغل تھے، چال چلن کیسا تھا۔ حافظہ کیسا تھا سمجھ کیسی تھی، ثقہ تھے، یا غیر ثقہ تھے سطحی الذہن تھے، یا دقیقہ بین، عالم تھے یا جاہل ان جزوی باتوں کا پتہ چلانا۔ بہت دشوار بلکہ ناممکن تھا، مگر علماء اکرام نے بڑی جانکاہی سے راویوں کے متعلق ہر قسم کی معلومات بہم پہونچائی، اس تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال (بیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہوا جس کی بدولت آج لاکھوں آدمیوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں تحقیق واقعات کا دوسرا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہیں آخر رفتہ رفتہ، درایت کے اصول منضبط ہوئے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل زندگی اور اس کے متعلق اس تحقیقات کی ضرورت نہیں کہ اسکے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر۔

(۱) جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

(۲) جو روایت اصول مسلمہ کے خلاف ہو۔

(۳) محسوسات ومشاہدہ کے خلاف ہو۔

(۴) قرآن یا حدیث متواتر کے خلاف ہو۔

(۵) روایت رکیک المعنیٰ۔

(۶) جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہو کہ کسی اور نے نہیں کی اور نہ یہ راوی اس شخص سے ملا ہو۔

(۷) جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت تھی۔ باینہمہ ایک راوی کے سوا اور کسی نے یہ روایت نہ کی۔

(۸) جس روایت میں ایسا قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا تو سینکڑوں آدمی اس کو روایت کرتے باوجود اس کے صرف ایک ہی راوی نے اس کی

روایت کی ہو۔

(۹) وہ روایت جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز کا تھا۔

(۱۰) وہ روایت جس کی تردید کے قرائن زیادہ ہوں۔ مثلاً تاریخوں میں ایک یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ سے معاف کر دیا تھا ملا علی قاری اس روایت کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ بیان مندرجہ ذیل وجوہ سے باطل ہے۔

(۱) اس معاہدہ پر سعید بن معاذ کی گواہی بیان کی جاتی ہے حالانکہ وہ غزوہ خندق میں وفات پا چکے تھے۔

(۲) دستاویز میں کاتب کا نام معاویہ ہے حالانکہ وہ بعد فتح مکہ اسلام لائے۔

(۳) اس وقت تک جزیہ کا حکم ہی نہیں آیا تھا، جزیہ کا حکم جنگ تبوک کے بعد قرآن مجید میں نازل ہوا۔

(۴) دستاویز میں تحریر ہے کہ یہودیوں سے بیگار نہیں لی جائے گی حالانکہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں بیگار کا رواج ہی نہ تھا۔

(۵) عرب کے دور دراز حصوں میں جب جزیہ معاف نہیں ہوا حالانکہ ان لوگوں نے چنداں مخالفت نہ کی تھی تو خیبر والے جو اسلام کے سخت مخالف تھے۔ کیونکر معاف ہو گئے

(۱۱) جس درجہ کا اہم واقعہ ہو شہادت بھی اسی درجہ کی اہم ہونی چاہیئے۔

(۱۲) سب سے اہم اور قابل بحث یہ بات ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے اس میں کس قدر حصہ اصل واقعہ کا ہے اور کس قدر حصہ راوی کا قیاسی کیونکہ تفحص اور استقراء سے بعض جگہ یہ صاف نظر آتا ہے کہ راوی جس بات کو واقعہ کی حیثیت سے بیان کرتا ہے وہ درحقیقت اس کا قیاس ہے واقعہ نہیں۔

(۱۳) ثقہ راوی سے بھی مفہوم و مقصد روایت کے سمجھنے یا بیان کرنے میں غلطی کا ہو جانا

ممکن ہے۔ چنانچہ ثقات کی روایت سے جب کسی موقعہ پر انکار کیا جاتا ہے تو اسی بنا پر

(۱۴) واقعات کی تنقید میں یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ جو واقعہ کسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس کا اس سے سرزد ہونا اس کی شان اس کے مرتبہ اور اس کی عادت کے خلاف تو نہیں ہے۔

(۱۵) واقعہ بیان کردہ پر محال عقلی یا محال عادی ہونے کا تو اطلاق نہیں ہے۔

ایک اور صورت روایت احاد کی ہے، روایت احاد وہ ہے جس کے سلسلہ اسناد میں صرف ایک راوی پر مدار روایت ہو یعنی کوئی دوسرا راوی موید روایت ہو۔ بہر حال حجیت روایات کے لئے حسب ذیل اصول کا پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

(۱) واقعات کو صرف معتبر و مستند کتابوں میں دیکھنا چاہیئے نہ کہ ہر کتاب کو ذریعہ معلومات قرار دیا جائے۔

(۲) کتابیں خواہ کیسی ہوں اور ان کے مؤلف خواہ کتنی ہی بلند پایہ ہوں۔ محتاج تنقیح ہیں اور ان کی روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔

(۳) بصورت اختلافات ثقہ رُوات کی روایتوں کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔

(۴) واقعات کی ترتیب میں سلسلۂ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

(۵) نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہیئے۔

(۶) روایت میں اصل واقعہ کس قدر ہے۔ اور راوی کی ذاتی رائے اور فہم کا کس قدر جزو شامل ہے۔

(۷) اسباب خارجی نے خواہ مذہبی ہوں خواہ سیاسی، واقعہ کی نوعیت پر اپنا اثر ڈالا یا نہیں اور اگر ڈالا تو کس قدر

(۸) جو روایت عام وجوہ عقلی مشاہدہ عام، اصول مسلمہ، اور قرائن حال کے خلاف ہو محتاج تصحیح و تنقیح ہے۔

(۹) اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق و تعدیل سے اس کا اطمینان کر لینا چاہیئے کہ راوی سے ادائے مفہوم میں غلطی تو نہیں ہوئی ہے۔

(۱۰) روایاتِ احاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائنِ حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کر لینا چاہیئے۔

(۱۱) بصورتِ اختلاف صرف وہ روایت قابل اعتبار ہو سکتی ہے جو قرائن عقلی اور نقلی سے مطابق ہو وَاِلّا فَلَا۔

(۱۲) ہم صرف اسی پر اکتفا نہیں کر سکتے، کہ ابن شہر آشوب نے یہ لکھا ہے اور ابن طاؤس یہ فرماتے ہیں یا ابن اثیر ایسا لکھ گئے ہیں یا ابن خلدون کا یہ بیان ہے بلکہ ہم کو واقعہ بیان کردہ کی صحت کے تمام امکانات و قرائن پر خود بھی نظر غائر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

فنِ تاریخ و روایت پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں ان میں سب سے قوی اثر حکومت کا ہوتا ہے گو مسلمانوں کو اس پر ہمیشہ فخر کا موقعہ حاصل رہے گا کہ اُن کا قلم تلوار سے نہیں دبا۔ حدیثوں کی تدوین بنی امیہ کے زمانہ میں ہوئی جنہوں نے پورے نوّے برس تک سندھ سے اندلس تک بنی فاطمہ کی توہین کی، اور ہر جمعہ کو بر سر منبر جناب امیر پر لعن کہلوایا۔ ہزاروں حدیثیں منقصتِ اہل بیت اور منقبتِ امیر معاویہ میں وضع کرائیں، عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں مگر نتیجہ کیا ہوا۔ عین اسی زمانہ میں محدثین نے علانیہ منادی کرا دی کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں آج حدیث کا فن اس خس و خاشاک سے پاک ہے۔ اور بنو امیہ اور بنو عباس جو ظل اللہ اور جانشین رسول اللہ تھے، اسی مقام پر نظر آتے ہیں جہاں ان کو ہونا چاہیئے تھا۔ تاہم یہ عالم گیر اثر بالکل نہ اس وقت زائل ہوا اور نہ اب ہے۔

اسی طرح خارجی اسباب میں ایک بڑا سبب مذہبی اثر ہے جو حکومت کے اثر سے بھی زیادہ زہریلا اور خطرناک ہے اس اثر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بیان کرنے والے پر مذہبی جذبات اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ وہ صدق و کذب اور حق و باطل میں تمیز نہیں کرتا جو لوگ مذہباً اس کے ہم خیال نہیں ہوتے ان پر حتی الوسع برائیاں عائد کرتا ہے، ان کے خصائل کو بصورت رذائل اور ان کی قومی و انفرادی کارناموں کو سبک و خفیف کر کے ظاہر کرتا ہے بلکہ بعض اوقات ہی ان کی صورت ہی مسخ کر دی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اپنے ہم مذہبوں کے حرکات و واقعات کو تصنع، تکلف اور توغل کی رنگ آمیزی سے خوشنما اور دل کش بنانے کی بڑی سرگرمی سے کوشش کیجاتی ہے۔ یہ مذہبی جنبہ داری اور خوش اعتقادی بڑھتے بڑھتے کورانہ تقلید اور ہذیان کے درجہ تک پہونچ جاتی ہے۔ ہر لغو اور بیہودہ روایت کو آمنّا و سلّمنا کہہ کر سر تسلیم خم کر دیا جاتا ہے۔ دوسروں کے غیر معمولی واقعات قابلِ مضحکہ اور اپنے واجب الاحترام سمجھے لگتا ہے۔ یہ خوش اعتقادی عجیب عجیب مجہولات کے جال میں پھنسا دیتی ہے، اس دلدل میں پھنس جانے کے بعد انسان نہ کسی تحقیق سے کام لیتا ہے نہ توثیق سے۔

گو یہ بحث بہت طول و طویل ہے اور تنقید روایات کے اور بھی اصول و ضوابط بیان کئے جا سکتے ہیں لیکن ہم انہی چند اصول پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ ان ہی کو عام تاریخی واقعات کی صحت و غیر صحت کا معیار سمجھا جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ نا اہلوں نے اپنی بیہودہ روایات سے صحیح اور غیر صحیح واقعات کو خلط ملط کر دیا اور لغو قصے کہانیاں ادھر اُدھر سے لے کر اور خود وضع کر کے بھر دئے آنے والی نسلوں نے ان کے بعد ان کے اخبار و آثار کی پیروی کی اور جیسا سنا سلسلہ بسلسلہ ہم تک پہونچا دیا، نہ واقعات کے اسباب کو جانچا اور نہ غلط روایات کی تنقید کی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر تاریخیں تحقیق سے خالی ہیں۔ تنقیح کا تو ذکر ہی کیا ہے بے شمار روایتیں اغلاط و موہومات سے بھری پڑی ہیں۔ عام طور پر تقلید پھیلی ہوئی ہے۔ مگر حق ہمیشہ غالب ہے

اور کوئی اس کا مقابلہ نہ کرسکا۔ ناقلین رطب و یابس جو چاہیں نقل کریں، مبصرین کھوٹا کھرا پرکھ لیتے ہیں اور ان کا احساس صحیح صدق و کذب کو جدا جدا کر دیتا ہے۔ اگر نقل روایت پر ہی اعتبار کر لیا جائے اور اصول عادت، قواعد سیاست، تمدن کی طبیعت اور انسان کی احتیاجی حالت کو حکم نہ بنایا جائے اور غائب کو حاضر اور حال کو ماضی پر قیاس نہ کیا جائے تو لغزش و غلطی اور شاہراہِ صدق و صواب سے دور جا پڑنے کا قوی احتمال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے علماء کو خواہ وہ مفسر ہوں یا محدث یا مورخ تحریر واقعات میں سخت مغالطے واقع ہوئے۔ جو روایت معتبر و غیر معتبر سامنے آئی اُن لی اسے معیارِ اصول پر نہ پرکھا۔ نہ کائنات کی طبیعت پر جانچ کی نہ غور و فکر و بصیرت سے کام لیا۔ اس لئے حق و ثواب سے دور جا پڑے اور اوہام و اغلاط کے چنگل میں کھیلنے لگے معمول و عادات سے نکل کر وسوسوں میں پھنس گئے۔ نہ خطائے عمداور خطائے محض میں فرق کیا۔ نہ روایات میں واسطہ کی پروا کی نہ تنقیح و تعدیل سے کام لیا۔

یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا، عام تاریخی کتابوں کی حالت ہے مگر ایک صحیح واقعات کے متلاشی کے لئے یہ امر کس قدر حیرت افزا اور پریشان کن ہے کہ واقعاتِ کربلا جن کو تاریخ اسلام میں بوجہ تعلق خاندان رسالت ایک خاص وقعت و اہمیت حاصل ہے تاریخِ عالم کے تمام سلسلہ میں سب سے زیادہ مختلف الروایات ہیں جس مورخ نے جس روایت کو اپنے خیال میں معتبر سمجھا لکھ دیا۔ تمام اختلافات کو دکھلا کر تنقید و تنقیح کی زحمت گوارا نہیں کی تاکہ جو روایت اصولِ درایت پر ٹھیک اُترتی، وہی قولِ فیصل سمجھی جاتی افسوس ہے کہ ہم بھی اس عظیم الشان مہم کا بیڑا اٹھانے سے قاصر اور تمام اختلافی روایتوں کی جرح و تعدیل سے معذور ہیں کیونکہ اس کام کے لئے بہت بڑے سامان اور بڑی فرصت کی ضرورت ہے اور قدرت نے ہم کو ان دونوں نعمتوں سے محروم رکھا ہے۔ البتہ مذکورۂ بالا اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف چند مشہور غلط یا مشکوک و مشتبہ واقعات

کی تنقید ہمارے امکان میں ہے۔

قوم کا زیادہ حصہ جاہل ہے اگرچہ حسینؑ کی کوئی مصیبت ایسی نہ ہوگی جس کو اس کا ہر فرد نہ جانتا ہو لیکن نہ اس کو اسبابِ شہادت معلوم ہیں نہ ان کڑیوں کی خبر ہے جس کے چھوڑ دینے سے یہ خوفناک زنجیر بن جاتی ہے وہ لوگ جن پر لکھے پڑھے کا اطلاق ہوتا ہے وہ بھی عموماً تاریخ خصوصاً فلسفہ تاریخ پر توجہ نہیں کرتے بلکہ اس کی معلومات کا سرمایہ یا تو میر اور مرزا کے مرثیہ یا بحور الغمۃ و بحر المصائب یا ذاکرین کا بیانِ زبانی ہے، اس میں شک نہیں کہ ایسے لوگ بھی بکثرت ہیں جو ان واقعات اور اسباب و نتائج کو نظرِ غائر سے دیکھنے والے ہیں تاہم غُلو اور مبالغہ ان پر بھی خاص اثر کئے ہوئے ہے۔

واقعہ خوانوں میں سب ایسے نہیں ہیں جو افراط و تفریط سے بچ کر انتخابِ اعتدال کا صحیح حس رکھتے ہوں ان کے اس خیال نے کہ رونے اور رُلانے میں جس قدر اہتمام کیا جائے اور جس طرح کوشش اس میں صرف ہو وہ سب مقبول ہے مصائب یا فضائل کی داستانوں میں تحقیق سے لاپروا رکھا اس کے علاوہ انہیں ذمہ دار اور صاحبِ حس لوگوں کی خاموشی سے پوری پوری مدد ملی اور وہ روز بروز بے احتیاط اور دلیر ہوتے گئے۔ اور یہی خود سری اور غلط بیانی آخر کار واقعہ خوانوں کی ایک مستند شان ہو گئی لیکن ایک محتاط سلیم العقل اور صاحبِ حس کے خیال میں آئی ہوئی یا سُنی سنائی باتوں کا اگل دینا کافی نہیں بلکہ ان پر غور کرنا اور سمجھنا ضرور ہے۔ یہی حال مصنفین کا ہے اور نہایت افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں نے محض اس خیال سے کہ فضائل و مناقبِ اہلبیت کی اشاعت ہو اور ایسے واقعات بیان کئے جائیں جن سے سامعین کے دل پر چوٹ لگے اور گریہ آور ہوں باوجود علم و خبر اور قوتِ تمیز صحیح و سقیم مطلق ادھر توجہ نہ کی اور اپنے خیال میں ہر قسم کی بے اصل روایتوں اور جھوٹی حکایتوں کو جائز سمجھ کر صحیح واقعات کے ساتھ خلط و ملط کر دیا۔ اور کہنے والوں کو گنجائش مل گئی کہ فلاں قبلہ و کعبہ ایسا لکھ گئے ہیں اور فلاں سرکار

شریعت مدار نے ایسا اور ویسا تحریر فرمایا ہے فلاں علامہ کا یہ قول ہے اور فلاں فاضل کی کتاب میں ایسا درج ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مؤلف کتاب چند مشہور کتابوں کو سامنے رکھ کر واقعات کو ان سے نقل کر دیتا ہے مگر نہ تو اس کو اصول فن کی خبر ہوتی ہے نہ مؤلفین کے حالات کی اطلاع اس وجہ سے رطب و یابس میں تمیز نہیں کرتا۔ اور جس واقعہ کو عجیب و غریب اور نئی خبر سمجھتا ہے بلا تامل لکھ دیتا ہے حالانکہ نہ کچھ اس کی اصلیت ہوتی ہے نہ بنیاد اس واسطے اس کی کتاب میں مفتریات و موضوعات بہ کثرت ہوتے ہیں مثلاً اسرار الشہادۃ ایک مشہور عالم اخوند ملا آقائے دربندی کی مؤلفہ ہے، فاضل موصوف نے اپنی اصل کتاب میں فوج کوفہ کی تعداد چھ لاکھ سوار اور دو کرور پیادے لکھ دی ہے اب ذاکرین کو موقعہ ہے کہ بلا سوچے سمجھے کہہ سکتے ہیں، کہ فاضل دربندی نے ایسا لکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آقائی موصوف ایک مشہور عالم اور جید فاضل سمجھے تھے، لیکن ان کی کتاب علمائے فن اور نقادانِ تاریخ کے طبقہ میں کیونکر نگاہِ وقعت سے دیکھی جا سکتی اس سے زیادہ حیرت انگیز لطیفہ یہ ہے کہ آخوند مذکور خود نقل کرتے ہیں کہ میں نے کسی زمانہ میں ایک عالم کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ یوم عاشورہ بہتّر گھنٹہ کا طولانی تھا، میں اس وقت متعجب ہوا تھا اور یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر اب جب میں تمام واقعات روز عاشورہ پر غور کرتا ہوں تو مجھے اطمینان ہو جاتا ہے کہ درحقیقت وہ نقل صحیح تھی کیونکہ یہ تمام واقعات جو اس روز رونما ہوئے بغیر اس قدر مدت کے پورے نہیں ہو سکتے اور کتاب جواہر الایقان کے صفحہ ۱۸۴ - ۱۸۵ - ۱۸۶ میں بھی بڑا زور دیا ہے اور ایک طویل بحث کی ہے اس سے فاضل موصوف کی صحتِ رائے کا اندازہ کر لینا چاہیئے، بعض کتابوں پر یہ خیال کیا گیا ہے کہ یہ فلاں اور فلاں مستند عالم کی تصنیف ہیں اور ان پر اعتبار کر لیا گیا حالانکہ حقیقت ایسا نہیں ہے۔

علما کے تسامح کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ چونکہ اس ذکرِ خیر کی علتِ غائی یہ ہے کہ گریہ کر کر مومنین اور سامعین ماجور و مثاب ہوں اس لئے روایت کسی طرح کی ہو اس کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں مگر اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ محض خیال ہی خیال ہے، ایک جھوٹ بات کو اُن ذوات قدسی کی طرف منسوب کرنا انتہا درجہ کی گستاخی اور توہین ہے اگر واقعہ سچا ہوگا تو سنانے والا اور سننے والا دونوں مثاب ہوں گے ورنہ دونوں گناہگار۔

یہ خیال کس قدر رکیک اور بے معنی ہے کہ واقعاتِ شہادت صحیح ہوں۔ یا موضوع ضعیف ہوں یا مشکوک سب کا بیان کرنا جائز اور بہر حال موجب ثواب ہے کیونکہ اس کی علتِ غائی۔ جذباتِ غم کو ہیجان میں لانا ہے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس ادعا کا مفہوم کیا ہے اور اس کی تائید میں کون سی عقلی و نقلی حجت پیش کی جا سکتی ہے۔ صرف ان ہی واقعات کا بیان باعث اجر جزیل ہو سکتا ہے، جن کی صحت پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہو۔ لیکن جو روایتیں ضعیف یا مشکوک یا موضوع ہیں اور روایتاً و درایتاً صحیح نہیں مانی جا سکتیں۔ ان کے جواز کا کون سی شریعت فتویٰ دے سکتی ہے۔ ضعف یا شک کا مفہوم حالت تذبذب کا مرادف ہے جب ہم کو اس میں شک ہو کہ جو کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں وہ سچ ہے۔ یا جھوٹ تو لازمۂ احتیاط یہی ہے کہ ہم اس کی تحریر و تقریر سے احتیاط کریں مبادا خدا کے سامنے گرفت میں آئیں اور اس کی بابت باز پرس کی جائے، جب ضعف و شک کی یہ حالت ہے تو جو روایات یقیناً موضوع یا غلط ہیں اور متعدد قرائن و دلائل سے ان کا ابطال ہوتا ہے ان کا بیان کرنا قطعاً حرام ہونے میں کیا شک ہے۔

غلط اور موضوع ہونے کا مفہوم کیا ہے۔ یہ ہی نا کہ وہ جھوٹ ہیں، بہتان ہیں اور افترائے محض ہیں کیا عقلاً اور نقلاً کوئی ایسی دلیل اور وجہ موجہ موجود ہے جس سے کذب و افتراء کے جواز کا فتویٰ دیا جا سکے، کذب و افتراء اور وہ بھی اُن ذوات قدسی آیات پر جن کی عزت اور جن کا احترام مذہبی فرائض میں داخل ہو۔ اس کذب و افترا کی نسبت

جو عامۃ الناس (زید بکر) پر کیا جائے جرم کو اسی قدر سنگین کر دینے والا ہے جس قدر کہ جرم کی نوعیت ہے مگر اہل بیت رسالت کی نسبت دیدۂ و دانستہ کسی جھوٹے قول اور جھوٹے واقعہ کو منسوب کر دینا معمولی بات نہیں بلکہ مخرج عن الایمان ہے۔ قرآن مجید صاف اور کھلے لفظوں میں کذب و افترا سے اجتناب کی تعلیم دیتا ہے۔

(۱) اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ۔	بے شک خدا اس کو ہدایت نہیں کرتا جو فضول خرچ اور جھوٹا ہو۔
(۲) لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ۔	جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہے۔
(۳) اِنَّ لَعْنَۃَ اللّٰہِ عَلَیْہِ اِنْ کَانَ مِنَ الْکَاذِبِیْنَ	بے شک اس پر خدا کی لعنت ہے۔ اگر وہ جھوٹوں میں سے ہے۔

یہ تو عام جھوٹ کی مذمت کی گئی ہے لیکن اگر ذات باری تعالےٰ جناب ختمی مآب آئمہ طاہرین اور ذریت رسالت کی نسبت افترا کیا جائے تو اس کا کیا ٹھکانہ ہے سورۂ انعام میں ارشاد ہے۔

(۱) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی کَذِبًا بِاٰیَاتِہٖ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (سورۂ ہود میں ہے)	جو شخص خدا پر جھوٹ اور بہتان لگائے اس کی نشانیوں کو جھٹلائے اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا۔ ایسے ظالم ہرگز نجات نہ پائیں گے۔
(۲) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اُولٰٓئِکَ یُعْرَضُوْنَ عَلٰی رَبِّھِمْ وَیَقُوْلُ الْاَشْھَادُ ھٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ کَذَبُوْا عَلٰی رَبِّھِمْ اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ	جو شخص خدا پر بہتان باندھے۔ اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا ایسے لوگ اپنے پروردگار کے حضور میں پیش کئے جائیں گے اور گواہ لوگ اظہار کریں گے

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ باندھا سن رکھو کہ ظالموں پر خدا

(۳) اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ	اس میں شک نہیں کہ جو لوگ خدا پر بہتان باندھتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ دنیا میں فائدہ تو تھوڑا ہی مگر آخرت میں ان

کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (سورۂ زمر میں ارشاد ہوا ہے)

(۴) فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَذَبَ عَلَی اللّٰہِ وَکَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَہٗ اَلَیْسَ فِیْ جَھَنَّمَ مَثْوًی لِّلْکٰفِرِیْنَ ؕ	اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ باندھے اور جب اس کے پاس سچی بات آئے تو جھٹلا دے کیا جہنم کافروں کا

ٹھکانہ نہیں ہے (ضرور ہے)

کتاب کافی شیخ کلینی۔ کتاب محاسن علامہ برقی، تفسیر عیاشی، کتاب ارشاد شیخ مفید، کتاب امالی۔ ابو علی طوسی، کتاب بشارت المصطفےٰ عماد الدین طبری آملی، کتاب غوالی اللآلی ابن ابی جمہور احسائی وغیرہم بہ تغیر الفاظ جناب سولخدا اور جناب امیر سے مروی ہے کہ جو شخص رسولخدا اور آئمہ ہدا پر برابر دیدہ و دانستہ افترا بندی کرے اور جو بات انہوں نے نہیں فرمائی، یا جو فعل انہوں نے نہیں کیا اس کو ان سے منسوب کرے تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے

شیخ کشی کتاب الرجال میں حضرت امام جعفر صادق ؑ سے نقل کرتے ہیں کہ رسولخدا نے فرمایا ہے کہ جو ہم اہل بیت پر کسی جھوٹی بات کا اتہام لگائے وہ قیامت کے روز اندھا اور یہودیوں کے ساتھ محشور ہوگا مختصر یہ کہ نہی عن الکذب میں بہت سی آیتیں اور حدیثیں موجود ہیں پھر ان مفتریات کو کیونکر جائز سمجھا جاتا ہے۔

اس طویل لیکن ضروری تمہید کے بعد ہم اپنے اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں ماحصل مدعا یہ ہے کہ واقعات شہادت از ابتدا تا انتہا اس قدر اختلافات اور موضوعات سے پر ہیں کہ صحیح اور غیر صحیح میں امتیاز دشوار اور کٹھن ہے یہ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی واقعہ کی

چند یا کم سے کم دو مختلف اور متضاد صورتیں بیان کی جاتیں تو ان میں صرف ایک صحیح ہوگی باقی غلط اب دیکھنا یہ ہے کہ ان میں سے کس کو قابل اعتبار اور کس کو ناقابل اعتبار سمجھا جائے اس جانچ اور تنقید کا معیار قرائن و شہادت اور اصول مذکورۂ صدر ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے واقعہ شہادت کے متعلق بیشمار مختلف روایتیں مشہور ہیں اگر ان سب کو فراہم کرکے ہر روایت کو اصولِ درایت پر جانچا جائے تو بڑے سامان اور وقت کی ضرورت ہے۔ پھر بھی صدہا روایتوں کی تنقیح و تعدیل یقیناً ایک شخص کا کام نہیں اس لئے ان سے قطع نظر کرکے یہاں صرف ان واقعات کی جو عام طور پر مشہور ہیں اور جن کو ذاکرین عموماً مجالس میں بیان کرتے ہیں اور ان ہی کو بار بار مرثیوں میں دہرایا گیا ہے تنقید کافی ہے۔

(۱) حضرت امام حسین علیہ السلام کا روانگی مکۂ معظمہ کے وقت ایک بیمار بیٹی کو جس کا نام فاطمہ صغریٰ تھا مدینہ میں چھوڑ جانا۔

(۲) روانگی کے وقت اہل بیت رسالت کی سواری کا تزک و احتشام۔

(۳) پسران مسلم کی کوفہ میں شہادت۔

(۴) حضرت کا داخل کربلا ہو کر اس قطعہ زمین کو جو شامل حائر ہے خرید فرمانا۔

(۵) فریقین کی فوجوں کی تعداد۔

(۶) اہل بیت پر تین شبانہ روز پانی بند رہنا۔

(۷) صبح عاشورہ کو جناب زینب کے دونوں بیٹوں کی تمنائے علم برداری دونوں کا ایک ساتھ جنگ کرنا دونوں کی عمر ۹-۱۰ برس کی ہونا۔

(۸) ہاشم بن عتبہ کی جنگ۔

(۹) عقد قاسم ابن الحسن و فاطمہ بنت الحسین۔

(۱۰) علی اکبر کون ہیں۔ سید سجاد۔ یا علی الشہید۔ زینب خاتون کا شہادت علی اکبر کے وقت خیمہ سے نکل آنا قصۂ دختر بادشاہ حلب۔

(۱۱) جناب زینب کا حضرت کو آخری رخصت کے وقت گھوڑے پر سوار کرنا۔

(۱۲) زعفر جن کا حضرت کی کمک کو آنا۔

(۱۳) حضرت کے ہاتھ سے لاکھوں دشمنوں کا مارا جانا۔

(۱۴) قاصدِ صغریٰ کا آنا۔

(۱۵) حضرت جبرئیل کا میدان کربلا میں نزول۔

(۱۶) عبداللہ ابن حسن کی شہادت اور ان کی عمر۔

(۱۷) جناب زینب کا بھائی کی شہادت کے وقت سر برہنہ مجمع عام میں نکل آنا۔

(۱۸) قصۂ شہربار

(۱۹) تاراجی خیام۔ تاراجی لباس نعش مبارک۔ پامالی نعش مقدس۔

(۲۰) مخدرات اہل بیت کو مکشوف الوجوہ شتران بے عماری و کجاوہ پر سوار کرنا۔ سید الساجدین کو خدمت ساربانی دیا جانا اور جا بجا تشہیر۔

(۲۱) قصۂ اُمّ حبیبہ، خادمہ جناب سیدہ۔

(۲۲) قصۂ شیریں کنیز جناب شہربانو۔

(۲۳) زندان شام سکینہ کا مجلس میں وفات پانا۔ واقعہ کربلا کے وقت سکینہ کی عمر۔

(۲۴) ہندہ زوجہ یزید کا سر دربار نکل آنا۔ یا زندان میں ملاقات اہلبیت کے لئے جانا۔

(۲۵) واپسی روز اربعین، دفن نعش ہائے شہدا۔ دفن سر مبارک۔

ان میں سے بہ استثناء چند سب واقعات پر مجملاً یا مفصلاً اپنی اپنی جگہ جرح و تعدیل کی حدیں کیجائیگی لیکن یہاں بھی بقدر ضرورت بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) حضرت نے مدینہ سے روانگی کے وقت ایک بیٹی فاطمہ صغریٰ کو بوجہ علالت اپنی نانی ام المومنین جناب ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ اس واقعہ کو نظماً و نثراً دردانگیز اور رقت خیز پیرایہ میں بڑے شد ومد کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن

یہ روایت بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ مقتل اخطب خوارزمی، روضۃ الشہدائے ملا حسین واعظ یا اور جن کتابوں میں یہ واقعہ پایا جاتا ہے ان میں سے کسی نے بھی سند مسلسل و معتبر کا حوالہ نہیں دیا، نہ مشہور و مستند تاریخوں میں کہیں اس کا تذکرہ درج ہے۔ اس سے قطع نظر کرکے علم الانساب کی کتابوں کو دیکھا جائے تو ان میں بھی فاطمہ صغریٰ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ شیخ مفید کتاب ارشاد میں، ابن شہر آشوب کتاب مناقب میں، حافظ عبد العزیز ابن اخضر معالم العترۃ میں، سبط ابن جوزی تذکرہ خواص الامۃ میں اور صفوۃ الصفوۃ میں، نور الدین ابن صباغ مالکی فصول المہمہ میں، محمد رضائے حسینی جلاء العیون میں تحریر کرتے ہیں کہ حضرت کے صرف دو بیٹیاں فاطمہؑ اور سکینہ تھیں۔ جو تمام مصائب و شدائد میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ کربلا میں حاضر رہیں۔ علامہ محمد بن سلیمان تنکابنی اکلیل المصائب میں لکھتے ہیں: "و اینکہ می گویند۔ فاطمہ صغریٰ در مدینہ ماند و بیمار بود اصلے ندارد"۔ البتہ ملائے مجلسی بحار میں، حافظ محب الدین ذخائر عقبےٰ میں، محمد ابن طلحہ شافعی مطالب السئول میں، علی بن عیسےٰ اربلی کشف الغمہ میں ابن خشاب وغیرہ فاطمہ اور سکینہ کے علاوہ تیسری بیٹی زینب کا نام لکھتے ہیں۔ مگر فاطمہ صغریٰ کا تذکرہ کسی نے نہیں کیا۔ ہم نے جہاں تک مورخین و نسابین کی مستند اور معتبر کتابوں کو دیکھا اور اس اختلاف کی چھان بین کی۔ ہمارے خیال میں بھی حضرت کی صرف دو ہی بیٹیاں فاطمہ اور سکینہ تھیں جن کو حضرت نے اپنے ساتھ ہی سفر میں لے لیا تھا۔ اور تیسری کوئی بیٹی نہ تھیں جن کو آپ وطن میں چھوڑ جاتے۔

صاحب ناسخ التواریخ کی تحقیق کا بھی نتیجہ یہی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"مکشوف باد کہ آنچہ این بندہ بے بضاعت باستقراء و استیعاب رنج برد و اختیار نمود آنست کہ حسین علیہ السلام را چہار پسر بود۔ علی اکبر الشہید و علی اوسط ہو الامام و علی اصغر و عبد اللہ سہ تن از ایشاں در یوم طف شدند

و آنحضرت را از دو دختر افزوں نبود نخستین فاطمہ و آں دیگر سکینہ"۔

مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ مجتہد عصر لکھنؤ کا بھی خیال ہے۔ چنانچہ آپ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:-

روایات متکاثرہ و معتبرہ سے ثابت ہے کہ جناب فاطمہ حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے ہمراہ معرکہ کربلا میں موجود تھیں۔ اور ان کا مدینہ میں بوجہ مرض کے رہ جانا کسی ضعیف روایت میں بھی نہیں دیکھا۔ ہاں بحار الانوار میں ایک روایت مشتمل بر ذکر غراب ایسی پائی جاتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب فاطمہ صغریٰ مدینہ میں تھیں لیکن یہ روایت غراب عجیب ہے۔ جیسا کہ مجلسی علیہ الرحمہ نے خود اس کی تصریح جلاء العیون میں فرمادی ہے چنانچہ بعد اس روایت کے فرماتے ہیں "و ایں حدیث خالی از غرابتے نیست بجہت مخالفت با اخبار دیگر"، چونکہ یہ روایت مقتل اخطب خوارزم سے ماخوذ اور ضعیف السند ہے، اور روایات کثیرہ معتبرہ سے مخالف لہذا مقبول نہیں ہو سکتی اور جناب سید الشہداء علیہ السلام کی صاحبزادیاں بنابر قول مشہور دو تھیں ایک حضرت فاطمہ صغریٰ دوسری حضرت سکینہ (رسالہ ہدایات ناصریہ مطبوعہ یوسفی پریس دہلی صفحہ ۴)

بہر حال چونکہ یہ روایت تمام مشہور و مستند کتابوں کے خلاف ہے اس لئے اس کے ناقابل اعتبار اور ساقط الاعتبار ہونے میں کیا شک رہا اگر اس کی روایت بہ سند مسلسل کہیں مل بھی جائے تو بھی اس وجہ سے کہ حضرت کی کوئی تیسری بیٹی جس کا نام فاطمہ ہو تھی ہی نہیں پھر اس سند کو کیونکر مستند سمجھا جائے گا۔

(۲) ان ہی مصنوعی اور اختراعی قصوں میں یہ روایت بھی ہے کہ جو حضرت کی ہجرت مکہ سے تعلق رکھتی ہے اور جس کو آقائے دربندی نے عبد اللہ ابن سنان کوفی سے نقل

کیا ہے۔ اس روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ کی روانگی کے وقت چالیس محملیں مخدّرات عصمت کی سواری کے لئے تیار تھیں جن میں حریر اور دیبا کے پردہ آویزاں تھے اس کے بعد کنیزوں کا ہجوم اور سواری کا تزک واحتشام دکھایا گیا ہے یہ راوی ہمراہ تھا۔ یہاں تک کہ اس نے روزِ عاشورہ اہل بیت کی سواریِ بے محمل کو بھی دیکھا تعجب ہے کہ اس لغو اور بے سروپا روایت کو بھی فاضل موصوف نے بلا تامّل لکھ دیا اور تمام ذاکرین بڑے شدّومد سے اس کو بیان کرتے ہیں حالانکہ مندرجۂ ذیل قرائن ایسے موجود ہیں جن پر لحاظ کرتے ہوئے اس روایت کے دروغ بے فروغ ہونے میں ذرا بھی شک نہیں رہتا۔

(ا) راوی صرف ایک ہے اور وہ بھی غیر ثقہ۔

(ب) یہ روایت کتاب اسرار الشہادۃ ملا آقائے دربندی کے سوا اور کسی کتاب میں مذکور نہیں اور مورخین فریقین میں سے کسی نے اس کو قلمبند نہیں کیا۔

(ج) راوی رسولخدا کی نواسیوں کو سوار ہوتے دیکھنا اپنا چشمدید واقعہ بیان کرتا ہے حالانکہ ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ کہ مردانِ اہل بیت اور خود حضرت کے موجود ہوتے اور سواری کا اہتمام کرتے ہوئے کوئی غیر اور نامحرم ایسے مقام پر جہاں مخدرات عصمت سوار ہو رہی ہوں ٹھہر کر ان کا تماشہ دیکھتا اور دوسرا شخص بتاتا جاتا کہ یہ زینب ہیں اور یہ ام کلثوم۔ یہ شہر بانو ہیں اور یہ ام لیلیٰ۔

(د) راوی جناب شہر بانو کی سواری کا تزک و احتشام سب سے زیادہ بیان کرتا ہے۔ درحالیکہ وہ معظمہ اس وقت زندہ ہی نہ تھیں۔

(ہ) اہل بیت مدینہ سے نہایت خوف و ہراس کی حالت میں پہر بھر رات گزری دشمنوں سے خفیہ روانہ ہوئے تھے اسی پر جمہور کا اتفاق ہے ایسی اخفا اور پریشانی کی حالت میں اس طرح کا امیرانہ اہتمام اور غیروں کو اس کی آگاہی کیونکر ممکن تھی۔

(و) یہ کروفر اور تکلفات جو آقائے دربندی نے نقل کئے ہیں سلطنت و امارت

کے شایانِ شان اور دنیاوی تفاخر و نمود کے نشان ہیں۔

سیرت خاندان نبوت و امامت کو شاہانہ جاہ و جلال اور امیرانہ تکلفات سے کیا علاقہ کیا اس کو عقل سلیم قبول کر سکتی ہے کہ الفقر فخری فرمانے والے کا نواسہ سلطان الاولیا جیسے تارک الدنیا کا بیٹا دیبا اور حریر کے پردے استعمال کرے اس اسراف و تبذیر کو حضرت سے منسوب کرنا آپ کی سخت توہین ہے۔

(۳) محمد و ابراہیم پسران حضرت مسلم کی شہادت کے متعلق اس کے موقعہ پر حصۂ دوم میں مفصل بحث کی جائے گی۔ یہاں صرف اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ یہ واقعہ قدیم اور مستند کتابوں میں قطعاً نہیں بیان کیا گیا سب سے اول صاحب روضۃ الشہدا نے اس کو نقل کیا ہے لیکن کسی کتاب کی سند تحریر نہیں کی، روضۃ الشہدا کوئی مستند کتاب نہیں اس میں ضعیف اور بے اصل روایات بکثرت بھری ہوئی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ملا صاحب کی اعجوبہ آفرینی اس روایت کی موجد ہو۔ دوسرے مورخوں نے جو اس کی ناقل ہیں محض ملائے موصوف کی تقلید اور پیروی کی ہے سلسلہ روایت کے وثوق و عدم وثوق سے قطع نظر کر کے اصولِ درایت سے بھی اس کی تصدیق مشتبہ اور مشکوک ہے، جب نہ کوئی مسلسل سند ہے نہ کوئی معتبر تاریخی شہادت اور نہ اصول درایت اس کی موافق ہیں تو سوائے اس کے کہ اس روایت کو غلط اور موضوع کہا جائے اور کیا چارہ کار رہ سکتا ہے۔

(۴) حضرت کے داخلہ کربلا کے بعد عام طور پر ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ آپ نے نینوا۔ غاضریہ کے باشندوں کو جو اس زمین کے مالک تھے بلوا کر فرمایا کہ میں یہاں قتل کیا جاؤں گا میرے دوست دور دور سے زیارت کو آئیں گے اس لئے چاہتا ہوں کہ اس زمین کو میرے ہاتھ فروخت کر دو وہ لوگ راضی ہوئے تو آپ نے ساٹھ ہزار درہم مرحمت فرمائے مگر یہ روایت سوائے معمولی کتابوں کے کسی معتبر اور مستند کتاب میں نہیں پائی جاتی مولوی غلام حسنین صاحب مرحوم اپنی کتاب مائتین جلد اول کے صفحہ ۹۴ میں فرماتے ہیں کہ: "پدروایت

کسی کتاب میں مضمون مندرجہ بحر المصائب نہیں پائی جاتی اور آج تک مجھ کو اس کی سند نہیں ملی بہر حال علامہ کنتوری نے اس روایت کو محض بحر المصائب کے حوالے سے نقل کیا ہے حالانکہ بحر المصائب تاریخی کتاب کا درجہ نہیں رکھتی۔ بلکہ وہ بہت سی بے سروپا روایات کا مجموعہ ہے

(۵) میدان کربلا میں کوفیوں کی فوج کس قدر فراہم ہوئی تھی۔ اس کی صحیح تعداد میں شدید اختلاف ہے اور مختلف اندازے۔ چھ ہزار سے چھ لاکھ تک بلکہ نو لاکھ ہیں جن کی مختصر کیفیت حسب ذیل ہے۔

چھ ہزار۔ تذکرہ خواص الائمہ سبط ابن جوزی۔

بیس ہزار۔ لہوف۔ سید ابن طاؤس۔ تاریخ اعثم کوفی۔

بائیس ہزار۔ مرات الجنان یافعی۔ مطالب السئول ابن طلحہ، روضۃ الشہداء ملا حسین

تیس ہزار۔ بحار الانوار علامہ مجلسی۔ ناسخ التواریخ مرزا محمد تقی۔

پینتیس ہزار۔ مناقب ابن شہر آشوب۔

پچاس ہزار۔ شرح شافیہ ابی فراس۔

اکیاون ہزار۔ ناسخ التواریخ

اسّی ہزار۔ مقتل ابو مخنف لوط ازدی۔

یہ اختلافات بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہونچ گئے کہ بعض نے ایک لاکھ بعض نے دو لاکھ۔ بعض نے تین لاکھ بعض نے آٹھ لاکھ اور بعض نے ۹ لاکھ تک لکھ دیا۔ ان سب کی تفصیل مفصل موجب طوالت ہے آقائی دربندی اس مبالغہ میں سب سے آگے بڑھ گئے ان کا قول ہے کہ میدان کربلا میں چھ لاکھ سوار اور دو کروڑ پیادے جدال و قتال کے واسطے موجود تھے۔

اس میں شک نہیں کہ جب حضرت مسلم کوفہ میں آئے اور ان کے ہاتھ پر اٹھارہ ہزار یا ان سے بھی زائد آدمیوں نے بیعت کرلی اور یزید کو اس کی خبر ہوئی تو ممکن ہے کہ اس نے

بڑے لشکر کا تہیہ کیا ہو اگر اس کے کل صوبوں سے جنگی فوج آجاتی تو نو لاکھ سے بھی زیادہ تعداد ہو جانا کچھ بعید نہ تھا۔ غالباً جس قدر افواہیں شمارِ فوج کی بابت مشہور ہوگئیں ان سے بعض مورخوں کو دھوکا ہوا۔ اور انہوں نے بلا سوچے سمجھے جو سنا وہی لکھ دیا غور و تامل سے کام نہ لیا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس مختصر فوج کشی کے واسطے جس میں کسی ساز و سامان بادشاہ سے مقابلہ نہ تھا۔ اس قدر کثیر التعداد اور عظیم الشان لشکر کی ضرورت تھی بھی یا نہیں۔ اور اس کا اجتماع و انتظام ممکن بھی تھا یا نہیں اگر اس زمانہ کے اصولِ سیاسی اور نظام حربی پر نظر ڈال کر تفکر و تدبر سے کام لیا جائے تو یہ معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ مگر اس سے پہلے چند تنقیحات قابلِ غور ہیں۔

(۱) گورنر (عامل) کوفہ کی حدودِ حکومت میں کون کون سے علاقہ داخل اور اس کے اختیارات کس قدر وسیع ہیں۔

(۲) کوفہ میں کوئی فوجی چھاؤنی تھی یا نہیں۔

(۳) اس زمانہ میں فوجی نظام کیا تھا۔ فوجی دستوں کی تقسیم کس طریقہ پر تھی۔ فوجی عہدہ کون کون سے مقرر تھے۔

(۴) افواج کو دوامی تنخواہ ملتی تھی یا ضرورت کے وقت رضا کار (والنٹیر) بھرتی ہو جاتے تھے۔

(۵) سامانِ حرب ذخائرِ رسد اور بار برداری کا کیا انتظام تھا۔

(۶) فوجی نقل و حرکت کے وسائل کیا تھے۔

(۷) عبداللہ ابن زیاد کوفہ میں گورنر مقرر ہو کر کب آیا؟

(۸) عبیداللہ کو اس مہم کی انجام دہی کے متعلق کامل اختیارات حاصل تھے یا وہ امپیریل گورنمنٹ کے احکام کا پابند تھا۔

(۹) گورنر کوفہ نے کتنے عرصہ میں فوجوں کی فراہمی کا انتظام کیا اور اتنے مدت میں اس قدر

فوجوں کا اجتماع ممکن تھا یا نہیں۔

(۱۰) دارالصدر سے فوجوں کے دستے کس طریقہ پر میدان جنگ کو روانہ کئے گئے۔

(۱۱) یہ فوج خاص کوفہ کی ہی تھی یا اس میں دوسری صوبوں کی فوجیں بھی شامل تھیں۔

(۱۲) تمام فراہم شدہ فوج کربلا میں پہونچ گئی تھی یا اس کے بعض دستے۔

اس زمانہ کے اصولِ جہاں داری اور صوبوں کی تقسیم سے پایا جاتا ہے کہ شہر کوفہ تمام علاقہ جات ایران آرمینیہ اور عراق کا دارالصدر تھا۔ عامل کوفہ ان سب ملکوں کا گورنر جنرل تھا اور صرف گورنر کوفہ پر ہی منحصر تھا بلکہ ہر صوبہ کا گورنر اپنے حلقۂ حدود میں سیاہ و سفید کا مختار ہوتا تھا اور اپنے علاقہ کے کلی نظم ونسق اور امن و بدامنی کا وہی جوابدہ اور ذمہ دار تھا اس کو ہر قسم کے ملکی و جنگی اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ کوفہ جغرافیائی حیثیت سے اگرچہ ایک بڑا فوجی مرکز سمجھا جاتا تھا لیکن وہاں کوئی ایسی باقاعدہ چھاؤنی نہ تھی جس میں مستقل فوجیں رہتی ہوں۔ نہ اس زمانہ میں آج کل کی طرح کوئی خاص فوجی نظام مقرر تھا۔ نہ سلطنت کی طرف سے رعایا یا سپاہیوں کو فوجی قواعد کی مشق کرائی جاتی تھی۔ نہ فوجی دستوں کی تقسیم تھی نہ آرمی کور قائم تھے۔ نہ ڈویژن نہ بٹالین تھیں نہ رسالے نہ دوامی فوجی عہدوں کا تقرر عمل میں آتا تھا آج کل کی طرح نہ جنرل تھے۔ نہ کرنل نہ کپتان نہ رسالدار، نہ افسروں اور سپاہیوں کی دوامی تنخواہ مقرر تھی بلکہ فوجی ضرورت کے وقت سردارانِ قبائل اور عمائدِ شہر اپنی جمعیتوں کو لے کر شاہی جھنڈے کے نیچے فراہم ہو جاتے تھے، یہی عملدرآمد کل صوبوں میں تھا، گورنرانِ صوبہ جات مقامی شورشوں کو ایسے ہی سرداروں کی مدد سے فرو کر دیتے تھے، اگر کسی بڑے دشمن سے مقابلہ ہوتا یا کسی دوسرے ملک پر چڑھائی ہوتی تو اس وقت خزانوں کے منہ کھول دئے جاتے جس قدر فوج کی ضرورت مناسب سمجھی جاتی اوسی قدر صوبوں سے طلب کر لی جاتی۔ ہر شخص سپاہی اور فنونِ جنگ کا ماہر و مشاق تھا۔ رعایا میں سے جس قدر سپاہیوں کی ضرورت

ہوتی۔ بطور والنٹیر فوج میں بھرتی ہو جاتے، سردارانِ قبائل یا وہ لوگ جو اپنی قابلیت و شجاعت سے جنگی شہرت حاصل کرتے ان فوجی دستوں کی کمان کرتے تھے۔ لڑائی کے وقت فوجی تقسیم و ترتیب اور صف بندی خاص اصول کے ساتھ ہوتی تھی اور تمام سپاہی اپنے افسروں کے احکام و اشارات کی تعمیل اُسی طرح کرتے تھے جس طرح آج کل کے قواعد دان پلٹن اور رسالے کرتے ہیں۔

سامانِ حرب اور ذخائرِ رسد کے گودام مہیا رہتے۔ مگر بقدرِ ضرورت تاہم ان کا بھی کوئی خاص مکمل نظام نہ تھا۔ فوجی نقل و حرکت میں جو آسانیاں آج کل پائی جاتی ہیں اُن کا وجود ہی نہ تھا

جہاں تک تاریخی شہادتوں پر غور کیا جاتا ہے ان سے ثابت ہے کہ عبید اللہ ابن زیاد نے آخر ماہ ذی قعدہ یا شروع ماہ ذی الحجہ سنہ ۶۰ ہجری میں وارد کوفہ ہو کر نعمان ابن بشیر سے چارج لیا۔ عبداللہ کو یزید کی طرف سے کوفہ کی شورش اور بدامنی کے انسداد کے متعلق کامل اختیارات عطا کئے گئے تھے اور سوائے ان احکام کے جو دربار دمشق سے اس کے پاس پہنچیں ان کی تعمیل اس پر فرض تھی اور تمام معاملات اس کی رائے پر چھوڑ دئے گئے تھے۔ عبیداللہ نے آتے ہی اول تو حضرت مسلم کی گرفتاری اور قتل کی تدبیریں کیں، کوفیوں کو ڈرا اور دھمکا کر۔ بلکہ لالچ سے بھی برگشتہ کر دیا، چندہی روز کے بعد ۹ ذی الحجہ کو حضرت مسلم کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور اس کو یہ پرچہ لگا۔ کہ حسین علیہ السلام مکہ سے کوفہ کی طرف چل پڑے ہیں اس لئے اس کو بڑی عجلت اور چستی سے کام لینا پڑا۔ وقت میں زیادہ گنجائش نہ تھی اس کو اندیشہ تھا کہ اگر حسین کوفہ میں آگئے تو ممکن ہے شہر والے ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں اور پھر یہ معاملہ بالکل قابو سے باہر ہو جائے نہ اتنا وقت تھا کہ مرکزی حکومت کو اطلاع دی جاتی یا دوسرے صوبوں سے فوجوں کی فراہمی کا بندوبست کیا جاتا اُسے کوفیوں کی بدعہدی اور بیوفائی غداری اور زر پرستی پر پورا بھروسہ تھا۔ چنانچہ اس نے کوفیوں کو اپنے جوڑ توڑ سے سلطنت کا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا تھا اب اس نے پہلے تو راستوں کی ناکہ بندی کی اس کے بعد حُر کو ایک ہزار سوار کے ساتھ خاص اس خدمت پر مامور کیا کہ وہ آگے بڑھ کر حسین کا راستہ روک لے۔ اور حتی الامکان ان کو

کوفہ میں نہ آنے دے بلکہ وہ کسی دوسری طرف بھی نہ جانے پائیں اور جس طرح ممکن ہو، کسی ایسے مقام پر پہنچا دئے جائیں جو لڑائی کے لئے موزوں ہو۔ اس عرصہ میں حسین علیہ السلام کوفہ کے قریب پہونچ چکے تھے اور حُر نے دو منزل آگے بڑھ کر راستہ روکا، تو آپ کوفہ سے بائیں طرف ہٹ کر شمال و مغرب کی طرف ۲۳ میل اور آگے بڑھ گئے۔ اور کربلا میں پہونچ کر قیام فرمادیا۔

جب ابن زیاد کو یہ اطمینان ہو گیا۔ کہ حسین کے ساتھ زیادہ جمعیت نہیں ہے اور یہ بھی انتظام کر لیا کہ دوسرے قبائل عرب کے لوگ آپکی مدد کو نہ آسکیں گے۔ تو اُس نے اُن ہی سرداروں کی ماتحتی میں جنہوں نے حسینؑ کو بڑے اصرار سے بلایا تھا۔ اور اب اپنے عہد و پیمان سے پھر چکے تھے جس قدر سوار و پیادے بہم ہو سکے مختلف دستوں کی حیثیت میں کربلا کی طرف روانہ کرنے شروع کردئے چونکہ اس اہتمام و انصرام میں عجلت منظور تھی وقت زیادہ گنجائش نہونیکی وجہ سے کوفی والنٹیروں کے جس قدر دستے وقتاً فوقتاً مرتب ہو سکے تھے صاحب اثر اور ممتاز سرداروں کے زیر حکم بھیجتا گیا یہی وجہ تھی کہ کسی سردار کے ساتھ ایک ہزار کسی کے ساتھ دو ہزار کسی کے ساتھ چار ہزار اور کسی کے ساتھ پانچہزار سپاہی روانہ ہو سکے، اگر اتنی عجلت نہ کی جاتی اور حضرت کے ساتھ بھی معتدبہ لشکر ہوتا تو البتہ دوسرے صوبوں کے باشندوں سے فوجوں کی طلب کرنے کی ضرورت ہوتی۔ اور بے شک اسوقت لشکر کی تعداد بہت زیادہ ہوتی مگر ضروریاتِ وقت اور ان کے متعلق عجلت و جلدی نے ایسا کرنے کی مہلت نہ دی۔ اور صرف کوفیوں کو تہدید و تحریص سے آمادہ کر لیا یہی سبب تھا کہ اس فوج میں سوائے کوفیوں کے کوئی شامی یا حجازی۔ بصری یا مصری عجمی یا ارمنی شامل نہ تھا۔ صرف ایک شہر کوفہ سے لاکھوں سپاہی کیونکر میدان جنگ میں پہنچ سکتے تھے۔ نہ کوفہ اتنا بڑا شہر تھا جیسے فی زمانہ لندن و پیرس ہیں۔ دوسرے صوبوں سے فوجوں کا آنا یا دوسرے گورنرانِ صوبہ جات کے نام فوجوں کی فراہمی کے احکام کا اجرا کسی کتاب کر

پایا نہیں جاتا اور نہ ہمارے پاس اس کے متعلق کوئی تاریخی شہادت موجود ہے جس قدر بھی تھے صرف کوفی تھے ابن زیاد آغاز ماہ ذی الحجہ میں کوفہ پہونچا تھا اور آخر ماہ ذی الحجہ تک اس کو یہ سب انتظام کرنا پڑا۔ ایک مہینہ سے بھی کم میعاد میں اس قدر وسیع پیمانہ پر فوجی انتظام کسی طرح ممکن نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے، کہ اگر کسی سلطنت یا ایسے شخص سے مقابلہ کی ضرورت ہوتی جسکے ساتھ بڑا لشکر ہوتا تو اسی قدر فوجوں کی فراہمی ضروری سمجھی جاتی لیکن جب عامل کوفہ کو یہ معلوم تھا کہ حسینؑ کے ساتھ بہت تھوڑے آدمی ہیں کوفی جن کے بھروسہ پر وہ اُدھر آرہے ہیں اب ان کا ساتھ نہ دیں گے اور وہ سب میرے قابو میں آچکے ہیں تو اُسے دغدغہ اور کھٹکا ہی کیا رہا تھا اس لئے اس نے بقدر ضرورت فوج جس کی تعداد بیس ۲۰ یا بائیس ہزار یا زیادہ سے زیادہ تیس ہزار تھی صرف کوفہ سے فراہم کرکے روانہ کردی پچاس ہزار یا اسی ہزار یا لاکھوں سپاہیوں کی نہ تو ضرورت ہی تھی نہ ۲۰ - ۲۵ روز میں اس قدر آدمی فراہم اور تیار ہو سکتے تھے۔

فی زمانہ مستقل اور دوامی فوجیں مستعد چھاؤنیوں میں ہر وقت حاضر اور تیار رہتی ہیں ذخائر حرب۔ سامانِ رسد اور وسائل باربرداری کا انتظام اعلےٰ پیمانہ پر ہے صیغۂ حرب کی ہر ایک شاخ کا اہتمام ایک مستقل محکمہ کی نگرانی میں ہے ذرائع آمد و رفت کی سہولیت کے واسطے ریلیں اور جہاز موجود ہیں فوری احکام اور خبر رسانی کے لئے برقی تاروں کا جال پھیلا ہوا ہے تاہم کسی خاص مقام پر فوجی اجتماع میں طرح طرح کی دشواریاں حائل اور سدِّراہ ہوتی ہیں اور باوجود اس قدر آسانیوں کے فی الفور جنگی نقل و حرکت نہیں ہو سکتی۔ نہ سامان حرب، رسد اور باربرداری کا انصرام ہو سکتا ہے جس زمانہ میں یہ وسائل و ذرائع تھے ہی نہیں تو کیونکر ممکن تھا کہ ۲۰ - ۲۵ روز یا مہینہ سوا مہینہ میں لاکھوں سوار و پیادے معہ سامانِ رسد میدان جنگ میں پہونچ جاتے کس قدر حیرت اور افسوس ہے

کہ فاضل دربندی جیسا باخبر شخص اغراق کی حد سے بھی گزر جائے اور مہابھارت کے افسانے کو بھی مات کردے جب سے دنیا میں نسلِ انسانی کا نشو ونما ہوا۔ بے شمار ہولناک اور خوں ریز معرکے پیش آچکے ہیں جن میں لاکھوں ہستیاں نذرِ خدنگ و تفنگ ہو گئیں خون کے ندی نالے بہہ گئے۔ خصوصاً پچھلی عالمگیر زد و کشت نے دنیا کی جنگی تاریخ میں فوجی اجتماع کے لحاظ سے سب سے اونچی اور ممتاز جگہ حاصل کی مگر اس میں بھی ایک ہی وقت میں ایک محاذ پر اتنی فوجیں فراہم نہیں ہوئیں اتنی بڑی عظیم الشان فوج کا اجتماع ایک ہی میدان میں نہ قیصرِ جرمنی سے ہو سکا اور نہ زارِ روس سے کربلا میں جہاں ایک طرف صرف ۷۲ یا ۸۲ یا زیادہ سے زیادہ ۱۴۵ آدمی تھے۔ لاکھوں سپاہیوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ممکن ہے کہ اس عرصہ میں ابن زیاد نے بہ نظر حزم و احتیاط مزید فوجی بھرتی کا سلسلہ جاری رکھا ہو اور کچھ دستے تیار بھی کر لئے ہوں مگر حضرت کی شہادت کے بعد اور فوج روانہ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

صاحبِ ناسخ التواریخ کا قول ہے کہ ابن زیاد نے ۱۵ ہزار فوج تیار کی تھی لیکن جن افسروں کے تحت میں یکے بعد دیگرے سپاہ روانہ کی اس کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ نہ ہونے پائی تھی اس کے بعد کہتے ہیں کہ میں نے جہاں تک استقرار اور تحقیق سے کام لیا میری رائے یہ قرار پائی کہ امام حسین علیہ السلام کا لشکر ۱۴۵ آدمی سے زیادہ نہ تھا۔ اور ابن زیاد کی فوج بیس ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اگر مختلف روایتوں کو قبول کر لیا جائے تب بھی ابن زیاد کا لشکر ۱۵ ہزار سے زیادہ نہ تھا لیکن میرا ذاتی اجتہاد یہ ہے کہ ابن زیاد نے ۱۵ ہزار فوج مختلف سرداروں کے تحت میں روانہ تو کی تاہم چونکہ سب لشکر ایک ہی مرتبہ روانہ نہ ہو سکا۔ بلکہ یکے بعد دیگرے روانہ ہو کر میدانِ جنگ میں پہنچتا رہا اس لئے حضرت کی شہادت کے وقت تک میدان کربلا میں تیس ہزار سے زیادہ فوج نہ پہنچ سکی۔ اور حضرت کی شہادت کے بعد تو اس کی کچھ ضرورت ہی نہ رہی (ناسخ التواریخ جلد ۶ صفحہ ۲۳۲)

ملائے مجلسی نے جن سرداران فوج کے نام لکھے ہیں اور ہر افسر کے ماتحت دستہ کو شمار کیا ہے اس سے صرف ۲۰ ہزار کی تعداد معلوم ہوتی ہے جس کے بعد فرماتے ہیں کہ میدانِ کربلا میں ابن زیاد کی بھیجی ہوئی فوج تیس ہزار تھی ناسخ التواریخ اور روضۃ الشہدا میں جن افسروں کے نام لکھے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

تعداد مندرجہ ناسخ التواریخ			تعداد مندرجہ روضۃ الشہدا		
نمبر شمار	نام افسر	تعداد فوج	نمبر شمار	نام افسر	تعداد فوج
۱	عمر بن سعد	۶ ہزار	۱	عمر بن سعد	۵ ہزار
۲	سنان بن انس	۱۰ ہزار	۲	شمر بن ذی الجوشن	۴ ہزار
۳	خولی بن یزید	۱۰ ہزار	۳	حصین بن نمیر	۴ ہزار
۴	شمر بن ذی الجوشن	۴ ہزار	۴	یزید بن رکاب	۲ ہزار
۵	شبث بن ربعی	۴ ہزار	۵	عروہ بن قیس	۲ ہزار
۶	عروہ بن قیس	۴ ہزار	۶	قیس بن حنظلہ	۲ ہزار
۷	حصین بن نمیر	۴ ہزار	۷	نصر بن خرشہ	۲ ہزار
۸	بحر بن کعب	۳ ہزار	۸	حجار بن حر	۱ ہزار
۹	مضاہر بن رہینہ	۳ ہزار			
۱۰	یزید بن رکاب	۲ ہزار			
۱۱	نصر بن خرشہ	۲ ہزار			
۱۲	محمد بن اشعث	۱ ہزار			
۱۳	عبداللہ بن حصین	۱ ہزار			
۱۴	حجار بن حر	۱ ہزار			
	چودہ افسر	۵۵ ہزار		آٹھ افسر	۲۲ ہزار

یہ تو شمار و اعداد کے پرانے تخمینے تھے جو بیان کئے گئے اب جو زمانہ جدید کے مایۂ ناز مورخ مولوی شبلی نعمانی کی سنئے آپ اپنی مشہور کتاب موازنہ انیس و دبیر کے صفحہ ۳۰ میں فرماتے ہیں۔

”کربلا کے واقعات جو میر انیس اور تمام مرثیہ گویوں کی موضوع شاعری ہیں جہاں تک تاریخ و روایت سے ثابت ہوتا ہے نہایت مختصر ہیں“۔

پر صفحہ ۲۱۹ میں لکھتے ہیں۔

”اس موقعہ پر شاید تم کو یہ خیال آئے کہ میر انیس کے رزمیہ میں گو الفاظ کی شکوہ و شان کی کچھ انتہا نہیں مگر اصلیت و واقعیت سے بمراحل دور ہے۔ معرکہ کے لحاظ سے اس واقعہ کربلا کی صرف یہ حیثیت ہے۔ کہ ایک طرف سو سوا سو آدمی تشنہ لب اور بے سر و سامان تھے۔ دوسری طرف تین چار ہزار کا مجمع تھا جو دفعتہً ٹوٹ پڑا اور تین گھنٹہ میں لڑائی کا فیصلہ ہو گیا“۔

پھر آگے لکھتے ہیں کہ: لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں اصلیت اور واقعیت کا لحاظ تاریخی حیثیت سے نہیں کیا جاتا فرض کرو کہ شاہنامے کے سارے واقعات غلط ثابت ہو جائیں۔ تو اس سے فردوسی کے کمالِ شاعری میں کیا فرق آئیگا۔ ہم کو مولوی صاحب جیسے وسیع النظر مورخ سے تعجب ہے کہ انہوں نے اس واقعہ کو اس قدر خفیف سمجھا ہے کہ گویا اس کی تاریخی حیثیت کچھ وقعت ہی نہیں واقعہ کربلا ایک چھوٹی اور ناقابلِ اعتنا لڑائی نہیں ہے جس کا مرثیہ گویوں نے اس قدر طومار باندھ دیا ہے، ورنہ حقیقت میں ایسا نہ تھا معرکہ کربلا کی مثال شاہنامہ کے بے سر و پا واقعات سے دیکھ کر یہ لکھنا صاف ظاہر کر رہا ہے کہ اگر مرزا حیرت کی رائے صحیح ہے تو بھی میر انیس کا کلام باعتبارِ شاعری اچھا ہے واقعہ سے غرض نہیں ہے مولوی صاحب نے فوج مخالف کی تعداد صرف تین چار ہزار تسلیم کی ہے مگر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ یہ خیال ان کو کیونکر پیدا ہوا جہاں تک متقدمین اور متاخرین کی کتابوں کو دیکھا جاتا ہے۔ سپاہ کوفہ کا اس

قدر قلیل التعداد ہونا کسی نے نہیں لکھا۔ علامہ سبط ابن جوزی نے تذکرہ خواص الامت میں سب مورخوں سے کم تعداد یعنی صرف چھ ہزار لکھی ہے مگر وہ بھی مولوی صاحب کے اندازہ سے دو چند ہے۔ اگر اس کو مولوی صاحب کا قیاسی اجتہاد مانا جائے۔ تب بھی کسی تاریخی شہادت کی ضرورت ہے۔ مورخ مختلف اقوال و روایات میں اصول و قرائن کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں نہ یہ کہ اپنی طرف سے فرضی اور قیاسی حکم لگا دیں اس میں شک نہیں کہ اس تعداد میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے۔ روضہ خوانوں اور شاعروں نے واقعات کی صورت کو مسخ کیا ہے لیکن اگر میر انیس کے رزمیہ اشعار اصلیت اور واقعیت سے بمراحل دور ہیں تو مولوی صاحب کی تحریر بھی اصلیت اور واقعیت سے اس کے ہم پلہ ہے۔ اگر میر انیس نے مبالغہ میں زیادہ بڑھا دیا ہے تو مولوی صاحب نے حد سے زیادہ گھٹا دیا ہے جو مورخ کی شان سے بعید ہے۔

جن مورخوں نے حسینؑ اور انصار حسینؑ کے ہاتھ سے مقتولینِ سپاہ کوفہ کی تعداد لکھی ہے۔ مانا کہ وہ مبالغہ آمیز سہی جیسا کہ علامہ ابو اسحٰق اسفرائنی دشمنوں کی لاشوں کا شمار ۸۴ ہزار لکھتے ہیں اور آقائے دربندی تین لاکھ اسی ہزار (تین لاکھ تیس ہزار خود حضرت کے ہاتھ سے اور پچاس ہزار اصحاب و اقربا کے ہاتھ سے) تاہم اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی میزان کسی طرح چار یا پانچ ہزار سے کم نہیں ہوتی ایسی حالت میں مولوی صاحب کا یہ ارشاد کہ سپاہ مخالف تین چار ہزار سے زیادہ نہ تھی صرف ان کی انفرادی رائے ہے۔ جس کی تائید میں نہ کوئی تاریخی شہادت ہے نہ دلیل تھوڑے آدمیوں کا مقابلہ کے وقت زیادہ آدمیوں کا قتل کر ڈالنا کچھ تعجب آمیز اور نرالی بات نہیں۔ تاریخ میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں مولوی صاحب کا یہ لکھنا کہ دوسری طرف تین چار ہزار کا مجمع تھا۔ جو دفعتہً ٹوٹ پڑا۔ اور تین گھنٹہ میں لڑائی کا فیصلہ ہو گیا انوکھی منطق سراسر خلاف واقعہ اور مسلمۂ عام کے برعکس ہے ظاہر ہے کہ گرمی کا موسم تھا۔ دن بڑا ہوتا تھا۔ تین گھڑی دن چڑھا

تھا کہ لڑائی شروع ہوگئی اور تین گھڑی دن باقی تھا کہ حضرت شہید ہوئے اور جنگ کا خاتمہ ہوا۔ اگر شمار کیا جائے تو ۸ یا ۹ گھنٹہ سے کم لڑائی نہیں ہی۔

فوج مخالف کی طرح سپاہِ حسینی کی تعداد میں بھی اکثر مورخ مختلف البیان ہیں جس کی مجملاً کیفیت حسبِ ذیل ہے۔

(۱) حیات القلوب۔ ملّائے مجلسی، عوالم عبداللہ ابن نوراللہ۔ جلاء العیون۔ عبداللہ بن محمد رضا حسینی، روضتہ الشہدا۔ ملا حسین کاشفی، فتوح البلدان بلاذری۔ زبدۃ الفکرہ۔ عبوس منصوری۔ کتاب ارشاد شیخ مفید، تاریخ کامل ابن اثیر جزری۔ تاریخ خمیس شیخ حسین دیار بکری، اخبار الدول قرمانی۔ تاریخ مدائنی:- ۳۲ سوار- ۴۰ پیادے جملہ ۷۲-

(۲) اعلام الورا ابوعلی فضل بن حسن طبرسی ۳۳ سوار ۴۰ پیادے جملہ ۷۳

(۳) عقد الفرید احمد بن عبد ربہ حیوٰۃ الحیوان دمیری ۷۷

(۴) فصول المہمہ۔ نورالدین ابن صباغ۔ رجال شیخ کشی ۷۸

(۵) مرات الجنان عبداللہ یافعی مطالب السؤل محمد ابن طلحہ شافعی ۸۲

(۶) مروج الذہب ابوالحسن علی بن حسین المسعودی ۸۷

(۷) محمد ابن ابی طالب ۳۲ سوار ۸۲ پیادے جملہ ۱۱۴

(۸) تاریخ کبیر محمد ابن جریر طبری ۴۰ سوار ۱۰۰ پیادے جملہ ۱۴۰

(۹) ناسخ التواریخ میرزا سپہر۔ تذکرہ سبط ابن جوزی، اسعاف الراغبین محمد بن علی صبان، لہوف سید ابن طاؤس۔ ۴۵ سوار ۱۰۰ پیادے جملہ ۱۴۵

(۱۰) تذکرہ خواص الامۃ ابن جوزی ۷۰ سوار ۱۰۰ پیادے جملہ ۱۷۰

(۱۱) شرح شافیہ ابی فراس جملہ ۱۰۰۰

ان سب کی تفصیل و تنقیح محتاج طوالت ہے اس لئے ہم اپنی تحقیق و اجتہاد کا خلاصہ صرف اتنا ہی لکھ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ فوج مخالف کی تعداد ۲۰ ہزار سے کم اور تیس ہزار سے

زیادہ نہ تھی اور ناصران امام ۷۲ سے کم اور ۸۲ سے زیادہ نہ تھے۔

(۶) علے العموم یہ بھی مشہور ہے کہ اہل بیت اطہار پر تین شبانہ روز پانی بند رہا اور یہ بندش ۷ محرم کی شام سے شروع ہوکر ۱۰ محرم کی شام تک رہی۔ بے شک ایسا ہی ہوا کہ ۷ محرم کو عبداللہ ابن زیاد کا حکم امتناعِ آب آنے پر عمر سعد نے دریا کے گھاٹوں پر پہرہ چوکی کا انتظام کر دیا جب آٹھویں کی صبح سے نہایت شدت کے ساتھ روک ٹوک دیکھی گئی۔ اور حضرت کے اہلِ بیت اور اصحاب پر پیاس کا غلبہ ہوا تو آپنے اپنے دست مبارک سے پشتِ خیام پر زمین کھودی پانی نکل آنے پر آپنے اور آپ کے سب ساتھیوں نے پیا۔ اور مشکیں اور پکھالیں بھر لیں شام تک سب پانی ختم ہوگیا۔ پیاس کی شدت اور دوسری ضروریات نے مجبور کیا تو حضرت عباس نے پھر کنواں کھودا۔ مگر پانی نہ نکلا رات کو جناب عباس ۳۰ سواروں اور ۲۰ پیادوں کے ساتھ بیس مشکیں لے کر دریا پر گئے اور بزور تیغ پانی بھر لائے۔ یہ پانی بھی رات بھر کے لئے ہی کافی تھا۔ نویں کی صبح کو پھر وہی پانی کا قحط اور پیاس کی شدت موجود تھی، رات کو پانی لانے سے اب دریا پر اس قدر انتظام تھا کہ آٹھ ہزار سے زیادہ جنگی سپاہی دریا کے گھاٹوں کو روکے ہوئے تھے۔ اس طرح نویں تاریخ کی صبح سے دسویں کی شام تک پھر پانی میسر نہ آیا۔ نوین کا تمام دن۔ دسویں کی تمام رات اور دسویں کا تقریباً تمام دن، گویا دو دن اور ایک رات پانی بالکل بند رہا جسکے تقریباً ۱۲ پہر یا ۳۶ گھنٹہ ہوتے ہیں۔

مخدرات کے لئے، بچوں کا ساتھ، گرمی کا موسم خیموں کے گرد خندق کی آگ اور آگ پر سے گزرتے ہوئے لُو کے جھونکے۔ مردوں کے لئے ہنگامۂ جدال و قتال، ہتھیاروں کی تپش، دھوپ کی حِدّت، گرد و غبار کا بادل، لُو کی لپٹیں، زخموں کی کثرت یہ ایسے اسباب تھے جنھوں نے پیاس کی شدت کو بدرجہا بڑھا کر بالکل ہی ناقابل برداشت بنا دیا تھا ورنہ درحقیقت پانی تین شبانہ روز بند نہیں رہا۔ بلکہ ان لوگوں کے لئے جو صبح کے بعد درجہ شہادت پر فائز ہوئے ایک دن اور ایک رات جنہوں نے ظہر تک شہادت پائی ان پر ڈیڑھ دن اور

ایک رات پانی کی بندش رہی البتہ خود حضرت کو ایک دن ایک رات اور دوسرے روز شام تک اجو وقت شہادت تھا) پانی نہیں ملا اور اہل بیت کو اس سے بھی بعد میں قریب مغرب تین شبانہ روز کا دھوکا غالباً لوگوں کو اس حکم سے ہوا ہے جو ابن زیاد نے ۷ محرم کو بھیجا تھا۔ اور اس کی تعمیل اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی اور اسی پر تمام مورخین کا سلف سے آج تک اتفاق ہے۔

(۷) ان ہی موضوع واقعات میں حضرت زینب کے صاحبزادوں کے متعلق تین باتیں عام طور پر غلط مشہور ہو گئی ہیں۔ (۱) وہ علم داری لشکر کے امیدوار تھے (۲) دونوں ساتھ لڑے اور شہید ہوئے (۳) بڑے کی عمر ۱۰ سال اور چھوٹے کی ۹ سال تھی لیکن یہ کوئی تاریخی اور کتابی باتیں نہیں بلکہ مرثیہ گو شاعروں کی مضمون آفرینی کے ساتھ واقعہ آفرینی کے نتائج ہیں ورنہ درحقیقت ان تینوں باتوں کا وجود ہی نہیں، نہ وہ علم کے خواہشمند ہوئے جس سے جناب زینب کی ناخوشی اور فہمائش کی نوبت آتی، نہ دونوں ایک ساتھ لڑائی کو گئے۔ بلکہ پہلے عون معرکہ آرا ہوئے اور ان کی شہادت کے بعد محمد جس طرح یہ دونوں صورتیں بن گھڑت ہیں اسی طرح ان کی کم عمری کا مبالغہ بھی طبع زاد ہے۔ واقعۂ کربلا کے وقت جناب زینب کی عمر ۵۴ یا ۵۵ سال سے کم نہ تھی، وہ حضرت سید الشہداء سے ڈیڑھ دو سال چھوٹی اور آپ کے بعد جناب امیر علیہ السلام کی اولاد میں سب سے بڑی تھیں۔ جوانی کے عام قاعدۂ فطرت کو چھوڑ کر بلا کسی تاریخی ثبوت کے سن کہولت میں ان کی اولاد ہونا۔ کیونکر تسلیم کر لیا جائے نہ کسی مورخ نے ان صاحبزادوں کی عمر ۹۔۱۰ سال لکھی ہے اس کے علاوہ مورخوں نے اس کی بھی تصفیہ نہیں کیا کہ یہ دونوں جناب زینب کے بطن سے تھے۔ یا ان میں سے ایک۔ جیسا کہ ہم دوسری جلد میں بالتفصیل بیان کریں گے۔

(۸) جنگ ہاشم بن عتبہ، بن ابی وقاص۔ محرق القلوب، روضۃ الشہداء اور ریاض الشہادت میں ہاشم کی لڑائی، بڑی شدومد اور شان و شوکت سے بیان کی گئی ہے طرفہ

یہ ہے کہ صاحب ریاض نے جہاں معرکہ ہاشم کو لکھا ہے وہاں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ صاحب روضہ چند معتبر تاریخوں سے اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں، حالانکہ روضۃ الشہداء گھر گھر موجود ہے اس میں اس واقعہ کے متعلق کسی کتاب کا حوالہ درج نہیں ہے کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ملا بیچارہ نے تو ایک کتاب کا بھی حوالہ نہیں دیا اور صاحب ریاض زبردستی چند معتبر کتابوں کا حوالہ اس کے سر تھوپتے ہیں گو فرضاً اگر روضۃ الشہداء میں ایک نہیں دس کتابوں کا حوالہ تحریر بھی ہوتا تو فضول تھا کیونکہ تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ ہاشم جنگ صفین میں واقعہ کربلا سے ۲۴ برس پہلے جناب امیر علیہ السلام کے ہمرکاب شہید ہو چکے تھے اس پر لطف یہ کہ خود صاحب ریاض ملا محمد حسن قزوینی تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"ہاشم بن عتبہ کہ ملقب بہ مرقال بود، در جنگِ صفین علمدارِ جناب امیر المومنین و شجاع دنامدار و از مشاہیر روزگار بود و دراں غزوہ بہ عزِ شہادت فائز گردید"

اس سے زیادہ عجیب یہ کہ اس لڑائی کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ جب عمر سعد نے ہاشم کے مقابلہ پر چار ہزار سوار بھیجے تو حضرت نے بھی اپنے بھائی فضل بن علی کو دس سواروں کے ساتھ کمک پر بھیجا حالانکہ علمائے انساب جنھوں نے بڑی جستجو تلاش اور محنت سے جناب امیر کی اولاد کے نام اور حالات فراہم کئے ہیں ان میں کسی ایک نے بھی فضل کا نام نہیں لکھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب امیرؑ کے صاحبزادوں میں کسی کا نام فضل نہ تھا۔ راوی مفتری نے واقعہ کے ساتھ یہ نام بھی وضع کیا ہے۔

(۹) ان وضعی اور جعلی روایتوں میں سب سے زیادہ مشہور اور قابلِ لحاظ دامادی قاسم کی وہ روایت ہے کہ حضرت نے انصار اور بنو عقیل اور بنو جعفر کے بعد اپنی بڑی بیٹی فاطمہ کا عقد اپنے بھتیجے قاسم بن الحسن سے کر دیا وجہ اس کی یہ بیان کی گئی کہ جب حضرت قاسم نے آپ سے جنگ کی اجازت چاہی۔ اور آپ نوجوان بھتیجے کو اجازت دینے پر رضامند

نہوئے۔ تو قاسم نہایت محزون اور متفکر ہو کر الگ جا بیٹھے۔ اس وقت خیال آیا کہ میرے والد بزرگوار نے وقتِ انتقال ایک کاغذ بطورِ تعویذ میرے بازو پہ باندھ کر فرمایا تھا۔ قاسم! جب تجھ پر سخت مصیبت کا وقت پیش آئے تو اس کاغذ کو کھول کر پڑھنا اور اس میں جو کچھ لکھا ہے اس پر عمل کرنا۔ یہ خیال آکر و کہ اس وقت سے زیادہ اور مصیبت کا کون سا وقت ہوگا اس تحریر کو کھول کر پڑھا۔ تو حضرت امام حسن علیہ السلام کی طرف سے ایک وصیت نامہ تھا جس میں آپ نے تحریر فرمایا تھا۔ کہ میرے بھائی حسینؑ پر ایک وقت ایسا آنے والا ہے تجھ کو لازم ہے کہ اسوقت اپنی جان ان پر قربان کرنے سے دریغ نہ کرنا۔ قاسم اس تحریر کو دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور فوراً خدمتِ عمِ نامدار میں حاضر ہو کر اس تحریر کو پیش کیا آپ اس کو پڑھ کر بہت روئے اور فرمایا تمہارے باپ نے جس طرح تم کو وصیت کی ہے مجھ کو بھی ایک وصیت کی تھی یہ فرما کر خیمہ میں تشریف لائے۔ اور مخدراتِ عصمت کو طلب فرما کر ارشاد کیا کہ میرے بڑے بھائی نے مجھ کو وصیت کی تھی۔ کہ فاطمہ کبریٰ کا عقد قاسم سے کرنا اب یہ اپنے باپ کی وصیت پر عمل کرنے کو تیار ہیں میں بھی چاہتا ہوں کہ اپنے بھائی کی وصیت کو پورا کر دوں۔ یہ فرما کر قاسم اور کبریٰ کا عقد پڑھا اور اس کے بعد حضرت نے بھتیجے کو میدان جنگ کی اجازت دی۔

مگر یہ قصہ محض بے بنیاد ہی، بے اصل اور سراسر بہتان و افترا ہے۔ قدما کی تمام کتابوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں متاخرین نے بھی جس نے روایات و واقعات کی صحت و غیر صحت کا لحاظ رکھا ہے اس روایت کو نقل نہیں کیا۔

کتابِ کامل الزیارۃ ابن قولویہ، ارشاد شیخ مفید۔ کتاب المزار سید مرتضیٰ علم الہدیٰ مثیر الاحزان ابن نما۔ لہوف سید ابن طاؤس، خرائج الجرائح قطب راوندی۔ مناقب ابن شہر آشوب، کشف الغمہ علی بن عیسیٰ اربلی، اعلام الوریٰ علامہ طبرسی، امالی شیخ صدوق امالی شیخ طوسی، بحار علامہ مجلسی انوار نعمانیہ سید نعمت اللہ جزائری، نظم الزہرا ملا رضی قزوینی

طوفان البکا جوہری۔ نہج الصلاح علامہ حلی۔ ناسخ التواریخ، مرزا سپہر کاشانی، قمقام الزخار، شہزادہ فرہاد مرزا۔ (علماء و مورخین شیعہ) تاریخِ کبیر طبری۔ تاریخِ کامل ابن اثیر۔ تاریخ ابن خلدون، تاریخِ ابو الفدا۔ تاریخِ اعثم کوفی، دول السلام ذہبی، اخبار الدول قرمانی۔ مرآت الجنان یافعی۔ صواعقِ محرقہ ابن حجر مکی۔ تاریخ ابی حاتم مکی۔ تاریخِ ابن عساکر دمشقی۔ ینابیع المودۃ شیخ سلیمان قندوزی، نور الابصار شیخ مومن، نور العین علامہ ابو اسحٰق اسفرائنی (وغیرہم علماء اہل سنت) کسی نے بھی اس کا ذکر تو کیا اشارہ تک نہیں کیا، علامہ نوری طبرسی کتاب لولو و مرجان میں لکھتے ہیں:۔

"چگونہ می شود قضیہ با ایں عظمت و قصہ چنیں آشکار امحقق و مضبوط باشد و بنظر تمام ایں جماعت نہ رسیدہ باشد حتی مثل شہر ابن آشوب کہ تصریح کردہ اند کہ ہزار جلد کتابِ مناقب نزد او بود"

مختصر یہ کہ قدیم کتابوں میں تو اس روایت کا بالکل وجود نہیں۔ البتہ آخر زمانہ میں کتاب روضۃ الشہداء سے جو اکاذیب و اباطیل کا خزانہ ہے یہ بلا نکلی۔ اس سے ایک نئی اور دلچسپ بات دیکھ کر شیخ فخر الدین طریحی نے اپنی منتخب میں نقل کر دیا۔ اس کے بعد دوسرے جدت پسند غیر محتاط اور رطب و یابس میں تمیز نہ کرنے والے اشخاص بلا سوچے سمجھے اس روایت کو نقل در نقل کرتے آئے۔ اور یہ کورانہ تقلید آئندہ نسلوں کے لئے حجت ہو گئی ہے۔ بہر حال اس روایت کا ماخذ حسبِ تحریر سید العلماء مولانا سید حسین عرف میرن صاحب بھی روضۃ الشہداء کاشفی ہے۔ چنانچہ آپ مجالس مفجعہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"روایتہ تزویج القاسم لم تذکر فی اکثر الکتب المعتبرۃ ولذا ترکہا مولانا المجلسی لاکن ذکرہا فخر الدین فی جامعہ وکان ماخذہ

تزویج قاسم کی روایت اکثر کتب معتبرہ میں ذکر نہیں کی گئی اسی وجہ سے اس کو علامہ مجلسی نے چھوڑ دیا۔ البتہ فخر الدین نے اپنے جامع میں اس کا ذکر کیا ہے

تاریخ الحسین الکاشفی | اور اس کا ماخذ حسین کاشفی کی تاریخ ہے۔

اسی تاریخ کاشفی سے یہ روایت نکل کر غیر معتبر کتابوں میں مندرج ہونی شروع ہوگئی۔ مورخین اور علمائے اس کی طرف توجہ نہ کی اور دوسری بے اصل روایتوں کی طرح اس کو بھی اپنی کتابوں میں بھر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ روایت جو افترائے محض اور حضرت کی شانِ مبارک میں گستاخی اور توہین ہے۔ ایک واقعہ مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر کے ایسی ذائع وشایع ہوگی کہ اب عام لوگوں کے دماغوں اور خیالوں سے اس کا ازالہ دشوار ہوگیا اور اس کے متعلق طرح طرح کی بدعتیں جو مخربِ ایمان ہیں۔ عزاداری کا ایک جزوِ اہم قرار دیدی گئیں۔ تاہم علما کی ایک جماعت نے اس کی قدح بھی کی ہے ملائے مجلسی جلاء العیون میں فرماتے ہیں:- "روایت دامادی قاسم در کتبِ معتبرہ بہ نظرِ حقیر نہ رسیدہ"، علامہ نوری کہتے ہیں:- "قصہ عروسی قاسم قبل از روز دریچ کتاب دیدہ نشدہ"، ملا رضی قزوینی کہتے ہیں "کتب معتبرہ میں دامادی قاسم کا ذکر نہیں ہے۔ ہم بھی اس کو چھوڑتے ہیں اس لئے کہ ناقل نے کسی راوی کی طرف اسکو منسوب نہیں کیا"، لکھتے ہیں:-

"واز قبیل ہمیں خرافات است انچہ مابین عوام الناس اشتہار گرفتہ کہ فاطمہؑ بنت الحسین را در کربلا با قاسم ابن الحسن عقد بستند"

سیر الائمہ میں ہی:-

"کہ روایتِ دامادی قاسم در کربلا از اکاذیب روایات است"

ناسخ التواریخ میں ہے کہ:-

"حدیث دامادیِ قاسم در کربلا وتزویج کردنِ حسینؑ فاطمہ را با او از اکاذیب روات است وحسین را از دو دختران افزوں بنود یکے فاطمہ زوجہ حسن مثنّٰی وآں دیگر سکینہ بود"

ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا وہ مختصراً ومجملاً ایک تمہید ہے جس کی تشریح وتفصیل آگے کی جائے گی۔ بہر حال اس مسئلہ نے ایک عرصہ سے نزاعی صورت اختیار کرلی ہے۔ ایک گروہ قصۂ عروسی کا موئد اور دوسرا مخالف ہے اس کے متعلق متعدد کتابیں اور رسالے تحریر ہوئے ہیں اور مجتہدینِ عراق وایران سے فتوے طلب کئے گئے، ہر فریق اپنے مفیدِ مدعا دلائل وبراہین پیش کرتا ہے اگرچہ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ کسی مباحثہ اور مناظرہ کو اپنی کتاب میں جگہ دیں یا کسی نزاعی امر میں اپنی تحریر کو قولِ فیصل قرار دیں۔ تاہم ہمارا فرض یہ ضرور ہے کہ تاریخی واقعہ کے اختلاف کو بنظرِ غائر دیکھیں اور صرف اصولِ مقررہ اور تاریخی شہادتوں سے اس کو جانچ کر نہایت آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کردیں اس بحث کے متعلق اس وقت دو کتابیں ہماری پیشِ نظر ہیں ایک۔ رسالہ حجج قاطعہ مرتبہ مولوی ابوالحسن صاحب مجتہد لکھنؤ۔ اس روایت کے اثبات وتائید میں دوسرا النقر بر الحاسم مرتبہ مولوی سید ظہور حسین صاحب قبلہ مجتہد لکھنؤ اس کے ابطال وتردید میں ہم کو ان دونوں بزرگواروں کے تبحر تقدس اور اجتہاد سے کوئی بحث نہیں کیونکہ مذہبی عالم ہونے کی حیثیت سے ہمارے نزدیک دونوں یکساں واجب الاحترام ہیں نہ ہم ایک کو دوسرے پر ترجیح دے سکتے ہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ من حیث الوجوہ کس کے دلائل قوی ہیں اور کس کے حجج وبراہین کو فنِ تاریخ کے نقاد تسلیم کرسکتے ہیں۔

ہم کو افسوس ہی کہ رسالۂ حجج قاطعہ کے دلائل اس کے نام کے موافق حججِ قاطعہ نہیں۔ اور اس کے ذی قدر مؤلف نے اپنے محض قیاسات کی بناء پر اپنے مقلدین اور متبعین کی دل جوئی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک محض بے اصل قصہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لطف یہ ہے کہ وہ خود بھی اس کے وقوع اور عدمِ وقوع میں مذبذب ہیں۔ اور ان کے وجدانِ سلیم نے اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا کہ یہ واقعہ ہوا ہی تھا۔ تاہم احتمالات وقیاسات سے فائدہ اٹھاکر اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ جیساکہ ذیل کے

کے مختصر اقتباسات سے ظاہر ہوگا۔

مولانا ممدوح کا ارشاد ہے کہ ہم اس کے مدعی نہیں ہیں کہ عقدِ قاسم حتماً واقع ہوا۔ اور نہ یہ کہتے ہیں کہ یہ موضوع اور بے اصل ہے حتماً واقعہ نہیں ہوا۔ بلکہ دوسری روایات فضائل ومصائب کی طرح اس میں بھی وقوع اور عدم وقوع کا احتمال ہے لہٰذا جس طرح ان روایات فضائل ومصائب کا پڑھنا جائز ہے اسی طرح عقدِ قاسم کا پڑھنا بھی جائز ہے۔ پھر آگے فرماتے ہیں کہ اگر بیانِ مصائب وفضائل میں روایات وجوب وحرمت اور اعتقادات کی طرح تحقیق وتنقید کی جائے، تو تمام کتب فضائل ومصائب جن کو علمائے بہ ہزار دقت ودشواری جمع کیا ہے بے کار اور غیر معتبر ہو جائیں گی، اور بابِ فضائل ومصائب دیکھا اِبکا مسدود ہو جائے گا گویا آپ کو اس سے یہ مقصود ہے کہ فضائل ومصائب کے متعلق کیسی ہی بے اصل ومزخرف روایت کیوں نہو، اس کا پڑھنا جائز ہے، اور اس کی تحقیق وتنقید کی ضرورت نہیں پھر آگے کتابِ کافی کا حوالہ دیکر لکھتے ہیں کہ جناب امیر سے منقول ہے کہ جب تم کوئی روایت بیان کرو تو اس کی نسبت ناقل کی طرف کردو۔ اگر وہ روایت صحیح ہے تو اس کا نفع وثواب تم کو ملے گا اور اگر جھوٹ ہے تو اس کا نقصان ناقل پر ہوگا نہ کہ تم پر یہی وجہ ہے کہ ابنِ شہر آشوب نے خارجیوں اور غالیوں حتّٰی کہ قاتلان حسین سے روایت کی ہے اس سے ثابت ہے کہ نقلِ روایت میں تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں۔ احتمالِ صدق کافی ہے۔ اس یاد رہوا تمہید کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ روایتِ دامادیِ قاسم بھی مثل اور مصائب اور واقعات کے ہے ہرگز علم وتعیین اس کے کذب کا نہیں ہے ناقلِ معتبر نے اس کو بیان کیا ہے۔ بلکہ ایک جماعت علماء ومجتہدین نے اس کو لکھا ہے اور معتبر جانا ہے اگر یہ روایت بے اصلِ محض ہوتی۔ تو اس قدر علماء اس کو ہرگز نہ لکھتے نہ پڑھنے کی اجازت دیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی دوسرے مصائب کی طرح ہے اور اس کا پڑھنا بھی جائز اور موجبِ ثواب ہے بلکہ اگر بحوالۂ کتاب پڑھا جائے تو بلا خوف جائز۔

اِس کے بعد فرماتے ہیں کہ ملا حسین کاشفی ایک مشہور اور معتبر عالم ہیں وہ جھوٹی روایت نقل نہیں کر سکتے کیونکہ جو شخص اپنے مذہب کا بڑا عالم ہو صاحبِ تصنیفات اور بہ لقب واعظ مشہور ہو وہ ایک جھوٹی روایت جس کا ماخذ معتبر نہ ہو بلا سوچے سمجھے اپنی کتاب میں لکھ دے۔ پھر روضۃ الشہداء کے معتبر اور مستند ہونے پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ بلاشبہ معتبر کتاب ہے، اور اس کا مؤلف بھی معتبر ہے اس کے بعد ایک قیاسی فیصلہ کرتے ہیں کہ ملا کاشفی نے ضرور کسی معتبر کتاب سے لکھا ہوگا گو کسی کے نام کی صراحت نہیں ہے ممکن ہے کہ ملائے موصوف سے پہلے بھی کسی نے اِس روایت کو لکھا ہو اور ہمیں اس کا حال معلوم نہ ہو، کیونکہ تمام کتبِ تاریخ کا استقراء غیر ممکن ہے، بس کوئی وجہ نہیں ہے کہ اتنا بڑا عالم بلا وجہ جھوٹ بولے۔ اگر کسی واقعہ یا روایت کو ہم نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ واقعہ بے اصلِ محض ہو، اکثر ایسا ہوا ہے اور ہوتا ہے کہ بعض روایات اور واقعات سے انکار کیا جاتا ہے اور بعدِ تتبعِ عام وہ واقعہ نکل آتا ہے ایسا ہی واقعہ دامادیِ قاسم کا ہے کسی مورخ معتبر کا کسی واقعہ کے بیان میں منفرد ہونا مستلزم اُس واقعہ کے کذب کا نہیں ہے، جیسا کہ عون بن علیؑ کی شہادت کو سوائے صاحب روضۃ الاحباب کے اور کسی نے نہیں لکھا۔ اور صاحب ناسخ التواریخ نے بوجہ ایک جید عالم ہونے کے اُسی پر اعتماد کر کے اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے اسی طرح ملا کاشفی بھی جلیل القدر عالم ہیں ان کی روایت کو موضوع کہنا کیا معنے رکھتا ہے۔

دامادیِ قاسم کو ایک گروہ علماء ومجتہدین نے لکھا ہے اور پڑھنے کو جائز جانتے ہیں بلکہ بعض مجتہدین پڑھتے بھی ہیں اگر یہ روایت غلط ہے تو کیا کسی کو متنبہ نہ ہوا۔ ایک گروہ کی نسبت غفلت دہوکا اور توہم نہیں ہوسکتا واقعۂ دامادیِ قاسم کا مضمون تاریخی ہے اور مضمون تاریخی کے ثبوت کی دلیل کل علماء کے نزدیک مورخِ معتمد کا بیان ہے۔ صاحب روضۃ الشہداء کا اعتماد ثابت ہے علاوہ روضۃ الشہداء کے علامہ طریحی نجفی بھی اس کے ناقل ہیں ان کے اعتبار میں تو کوئی شبہ نہیں کر سکتا کسی عالم نے اس کے موضوع ہونے کی تشریح نہیں کی۔ بلکہ ایک

جماعتِ علماء اس کو صحیح جانتی ہے اور پڑھنے کی اجازت دیتی ہے۔ خود صاحب روضۃ الشہداء نے اس کے ماخذ کو لکھ دیا ہے بلکہ قاسم کے بیان سے ہی عقد کو ثابت کیا ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ ترجمۂ ابوالمفاخر میں رجز کے اشعار درج ہیں ان میں حضرت قاسم فرماتے ہیں ؎

باساس ولباسِ دامادی ؎ عزم ترتیب راہ خواہم کرد ؎

معلوم ہوا کہ ملاّ ے کاشفی نے ابوالمفاخر خوارزمی کی کتاب سے اس روایت کو لیا ہے۔ اور کتبِ تاریخ میں مقتل ابوالمفاخر ایسا معتبر ہے جس سے کاشفی سا عالم واقعات کو اپنی کتاب میں نقل کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ کا قیاسی اجتہاد یہ ہے کہ چونکہ ناقلِ معتبر نے ابوالمفاخر سے نقل کیا ہے لہذا وہ ضرور معتبر ہے، اگر روضۃ الشہداء کو معتبر نہ مانا جائے۔ حالانکہ کسی عالم نے اس کو غیر معتبر نہیں لکھا تو علامہ طریحی تو معتبر ہیں کیا عجب ہے کہ انہوں نے بھی روایت عروسی کو ابوالمفاخر سے ہی نقل کیا ہو، بہ لفظ رُوِیَ یا نقل کہہ کر انہوں نے بھی نقل کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ روز عاشورہ روز مصیبت تھا۔ روز شادی نہ تھا۔ اور اس واقعہ کا ہونا عقلاً مستبعد ہے، تو اس کا مستبعد ہونا مسلم نہیں۔ حضرتؑ نے کوئی تکلف نہیں کیا بلکہ صرف اپنے بھائی کی وصیت پر عمل کر کے عقد پڑھ دیا۔ اور یہ خیال فرمایا کہ اپنی بیٹی کے رنڈاپے کو بھی گوارا کر لوں تاکہ کوئی مصیبت رہ نہ جائے۔ اور درگاہِ خداوندی سے مہر اجر میں اور زیادتی ہو۔

اَب رَہا یہ امر کہ حضرت کے صرف دو صاحبزادیاں فاطمہ اور سکینہ تھیں۔ اور فاطمہ کا عقد حسن مثنّیٰ سے ہو چکا تھا۔ مگر دختران حضرت کا صرف دو میں انحصار باطل ہے کسی نے دو کسی نے تین کسی نے چار صاحبزادیاں لکھی ہیں، جب فریقین کی تصریحات سے تین اور چار بیٹیوں کا ہونا بھی ثابت ہے تو اس حالت میں کوئی کیونکر یقین کر سکتا ہے کہ دو سے زیادہ صاحبزادیاں حضرت کے نہ تھیں ممکن ہے کہ حضرت نے کسی تیسری بیٹی سے بموجب

وصیت قاسم کا عقد کر دیا ہو۔ اس میں خلاف عقل و نقل کون سی بات ہے جو اس کو جھوٹ اور موضوع کہا جاتا ہے اور عزاداری میں کمی کی جاتی ہے، روضہ اور منتخب میں بھی یہی لکھا ہے ان میں کسی صاحبزادی کے نام کی تصریح نہیں ممکن ہے کہ تیسری یا چوتھی صاحبزادی کو فاطمہ کبریٰ بھی کہتے ہوں بلکہ فاطمہ صغریٰ کا ہونا اس بات کا قرینہ واضح ہے کہ حضرت کی اولاد میں کوئی فاطمہ کبریٰ بھی تھیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت کی صاحبزادیاں دو سے زیادہ ہیں ان ہی زائد کا نام فاطمہ کبریٰ تھا۔ اگرچہ ان کو زینب وغیرہ بھی کہتے ہوں یہ کہنا کہ حضرت کی بیٹیوں میں فاطمہ ایک ہی تھیں ان ہی کو فاطمہ صغریٰ بہ سبب جناب سیدہ صلوٰۃ اللہ علیہا کے کہتے تھے، اور راوی نے ان ہی کو فاطمہ کبریٰ سے تعبیر کیا ہے۔ اس خیال سے کہ وہ جناب سکینہ سے بڑی تھیں نہ یہ کہ فاطمہ کبریٰ کوئی بیٹی ہیں۔ فاسد ہے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء کرام کی ایک جماعت نے عقد قاسم کو اپنی کتب مقاتل میں لکھا ہے اگر یہ موضوع اور جھوٹا ہوتا تو اس قدر علمائے جلیل القدر اپنے مقاتل میں کیوں لکھتے بلکہ بعض نے یہ استدلال بیان کیا ہے کیا کوئی عاقل متدین ان حضرات کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ انہوں نے ایک جھوٹی روایت اپنی کتابوں میں لکھ دی۔

پھر چند علما کے نام لکھتے ہیں یعنی شیخ فخر الدین طریحی نجفی۔ سید ہاشم بن سلیمان۔ ملا محمد تقی برغانی ملقب بہ شہید ثالث۔ حاجی ملا محمد صالح برغانی۔ ملا مہدی ترانی۔ محمد بن سلیمان تنکابنی۔ شیخ جعفر شوستری نجفی۔ سید العلما سید میرن صاحب۔ تاج العلما سید علی محمد صاحب۔ شمس العلما مفتی سید محمد عباس صاحب کہ ان سب بزرگواروں کے فضائل اور تبحر فی العلم کو بیان کر کے لکھتے ہیں کہ ایسے باخبر لوگ کیونکر کسی غلط خبر کو اپنی کتابوں میں درج کر دیتے۔ یا اس کو پڑھنے کی اجازت دیتے۔ اگر سوائے روایاتِ قطعیہ کے اور روایات کا پڑھنا جائز نہیں تو یہ خلاف اجماع ہے۔ باب فضائل و مصائب بالکل مسدود ہو جائے گا۔ فضائل و

مصائب بیان کرنے کا مدار ناقل معتبر پر ہے۔ جب ناقل معتبر بیان کریگا خواہ وہ کسی لفظ سے بیان کرے اس کے پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور ایسے احتمالات تو کل مقاتل پر ہوسکتے ہیں وہ سب غیر معتبر ہو جائیں گے۔

آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ روایتِ عروسیِ قاسم کے پڑھنے کو کسی عالم نے منع نہیں کیا۔ بلکہ خود علما نے پڑھا ہے یہاں بھی (لکھنؤ میں) عہد جناب غفران مآب (مولوی سید دلدار علی صاحب) سے آج تک جس قدر علما اور مجتہدین گزرے ہیں کسی نے منع نہیں کیا۔ سلطان العلما، سید العلما، مولانا سید تقی۔ سید بندہ حسین۔ سید ابراہیم۔ سید محمد جعفر۔ سید ابو صاحبان وغیرہم یہ سب علما سنا گئے اور ان کی مجالس میں پڑھا جاتا تھا۔

یہ ہے حجج قاطعہ کا خلاصہ جس پر مثبتین اور مویدینِ قصّہ دامادی کو ناز ہے لیکن یہ ایک تاریخی واقعہ اور اس کی تحقیق و تنقید سے کسی مسئلہ فقہ یا تفسیر و حدیث پر بحث نہیں جو علماء اور مجتہدین کے فتوؤں اور اس کے جواز و عدم جواز پر استدلال کیا جائے۔ جو لوگ اس واقعہ کو تاریخی نگاہ سے دیکھنے والے اور تاریخی شہادتوں سے اس کی جانچ کرنے والے ہیں وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ ایک نقادِ فن ان کمزور اور بودی تاویلات کو کہاں تک نظرِ وقعت سے دیکھ سکتا ہے۔ دینیات میں تبحر اور مسائل شرعی میں اجتہاد دیگر شے ہے اور تاریخ و فلسفہ تاریخ پر عبور شے دیگر۔ کوئی روایت جب تک کہ درایت کے معیار پر پوری نہ اُترے تاریخی حیثیت سے ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوسکتی خواہ کوئی ملّا یا مجتہد اس کو تحریر فرمادیں یا کوئی علّامہ اور آقا۔

حجج قاطعہ کے علاوہ ایک اور رسالہ مخزن الانوار ہماری نگاہ سے گذرا۔ جو اس قصّہ کے اثبات میں تحریر ہوا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ حکایتِ شادیِ قاسم اکثر مرثیوں میں نظم ہے۔ گو مرثیوں میں اس کے بیانات کو مختلف عنوانوں سے لکھا گیا ہے مگر اصل قصّہ کو علامہ فخرالدین طریحی نجفی نے بیاضِ فخری نجفی میں سیّد ہاشم بحرینی نے مدینہ المعاجز میں ملّا محمد حسن قزوینی نے ریاض الشہادت میں اور فاضل دربندی نے اسرار الشہادت میں اس عروسی کو بدلائل

طویلہ و براہین عقلیہ تحریر کیا ہے اور جناب علیین مکان سید میرن صاحب نے باوجودیکہ اس مضمون کو شاذ فرمایا ہے تاہم اس قصّہ کو اپنی کتاب مجالس مسبّعہ میں جگہ دی ہے اس لئے بعض لوگوں کا ذکرِ عروسیِ قاسم سے منع کرنا قابل قبول نہیں اور مبنی اس کے ضعف کے صرف دو مقام معلوم ہوتے ہیں اول صاحب ناسخ التواریخ کا انکار۔ دوسرے کتاب المآثر والآثار۔ صاحب ناسخ التواریخ اگرچہ وسیع النظر اور محقق فن تاریخ ہیں۔ مگر اتنے جلیل القدر علماء کے مقابلہ میں ان کا قول قابل حجت نہیں ہے۔ صاحب کتاب المآثر والآثار۔ تو نہ زمرۂ علماء و ثقات سے ہیں نہ کوئی مرد جیّد الاستعداد۔ صرف کتب خانہ شاہی کے داروغہ رہے ہیں اس لئے ان کی کتاب ایسی حیثیت نہیں رکھتی جو قابل اعتماد ہو۔

اب ہم تقریر الحاسم لنقضۃ عقد القاسم کے ان محقق و مدلّل اقتباسات کو درج کرنا چاہتے ہیں جو اس قصّۂ بے اصل کے ابطال و تردید میں مولوی سید ظہور حسین صاحب کے پُر زور قلم سے نکلے ہیں اور جس سے صرف ہم کو ہی اتفاق نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص جو فہمیدہ دل و دماغ عقلِ صائب، احساسِ صحیح اور علم تاریخ میں وسعتِ نظر رکھتا ہے، اس کا وجدان تسلیم ان براہینِ قاطعہ کی حقانیت کو بلا تامل تسلیم کرلیگا اور اس کا ضمیر خود شہادت دیگا۔ کہ جو لوگ اس من گھڑت روایت کے اثبات میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اور حضرت کی شانِ مبارک میں اس بہتان و افترا کو ایک خفیف اور معمولی بات ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس کی ترویج و قیام کو عزاداری کا جزو اہم قرار دیتے ہیں وہ کس طرح ایک افسوسناک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ آمدم برسرِ مطلب۔ تقریر الحاسم کی اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

بظاہر اس قصّہ کی ابتدا روضۃ الشہداء سے معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ کتاب مذکورہ مطبوعہ بمبئی باب نہم صفحہ ۳۵۰ میں مرقوم ہے۔

"راوی گوید کہ چوں قاسم بن الحسن چہرۂ برادر خود را دید۔ آہ از نہاد او برآمدہ پیش عم بزرگوار خود آمد و گفت۔ اے شہزادہ دو جہاں مرا دیگر قوت مفارقت

اقارب نماند و زمانہ از سر بر مہر در دہا ہجتم بر خاکِ اندوہ و مصیبتم نشانندہ دستوری دہ۔ تا کینہ برادر باز جوئیم امام حسینؑ گفت، اے جانِ عم تو مراز برادر یادگاری من ترا چگونہ اجازت دہم۔ مادرِ قاسم نیز از درِ خیمہ بیروں دوید و دامن قاسم بر دست بپچیدہ فریاد برکشید، القصہ قاسم اجازتِ حرب نیافت۔ وبخیمہ در آمدہ سر بزانوئے اندوہ نہاد۔ ناگاہ یادش آمد کہ پدر تعویذے بر بازوے وے بستہ بود و فرمود کہ در محلّے کہ اندوہ بسیار بر تو غلبہ کند ایں تعویذ را باز کن و برخوان و بد انچہ در آں جا نوشتہ است کار کن۔ قاسم با خود اندیشید کہ تا من بودہ ام مرا حالتے چنیں نیفتادہ و بدنسیاں بلائے دست ندادہ بیا تعویذ را بخوانم و مضمون آں را بدانم پس آں تعویذ را از بازو باز کردہ و بکشادہ۔ دید کہ امام حسن بخطِ مبارک خود نوشتہ است۔ اے قاسم وصیتے می کنم ترا کہ چوں برادرم و عمت حسینؑ را بینی در کربلا بدست شامیانِ پُر دغا۔ و کوفیانِ بے وفا۔ گرفت رشدہ زنہار کہ سرِ خود در قدم وے اندازی، و جانِ خود را برائے روان وے در بازی و ہر چند ترا از مصاف باز دارد تو مبالغہ نمائے و در الحاح و ابرام افزائی کہ جان فدائے حسین کردن مفتاحِ بابِ شہادت و وسیلۂ اقبال و سعادت است قاسم ایں وصیت نامہ را فرد خواند۔ و از شادی ندانست کہ چہ کند۔ زود از جائے بجست و بخدمتِ شاہزادہ آمدہ نوشتہ بدست وے داد۔ چوں شاہ شہیداں آں مکتوب را بدید، آہِ سوزناک از جگر برکشید۔ زار زار بنالید و گفت اے جانِ عم ایں وصیتِ پدرِ تست بہ نسبتِ تو و می خواہی کہ بدیں وصیت کار کنی و مرا ہم در بارۂ تو وصیتے دیگر فرمودہ و من نیز داعیہ دارم کہ آں را بجا آرم بیا تا ساعتے بدیں خیمہ در آئیم و بدان وصیت قیام نمائیم پس

دست قاسم گرفتہ بخیمہ در آورد و برادرانِ خود عون و عباس را طلبید و مادرِ قاسم را گفت کہ جامہ ہائے نو در قاسم پوش۔ و خواہر خود زینب را گفت کہ عیبہ جامہ امامِ حسن را بیار فی الحال بیاوردند و در پیشِ وے حاضر کردند۔ سر عیبہ را کشاد و دُراعۂ حسن و یک جامۂ قیمتی خود در قاسم پوشانید و دستار زیبا بدستِ مبارکِ خود در سرِ وے بست و دستِ دخترے کہ نامزدِ قاسم بود گرفتہ گفت اے قاسم ایں امانتِ پدرِ تست کہ بتو وصیت کردہ تا امروز نزدیکِ من بود اکنوں بستاں۔ پس دختر را باوے عقد بست و دستش بدست قاسم داد و از خیمہ بیروں آمد۔

مگر اس روایت کا بطلان بھی خود صاحب روضۃ الشہداء کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے اور جس سے دروغ گورا حافظہ نباشد کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ اس عبارت میں ملائے کاشفی نے حضرت قاسم کی دامادی کو بیان کیا ہے مگر حضرت کی دختر کا نام معین نہیں کیا۔ لہٰذا اس تعین میں خود ان ہی کے کلام کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت سید الشہداء کی اولاد دختری میں فقط، فاطمہ اور سکینہ کو بیان کیا ہے اور فاطمہ کے زوجہ حسن مثنیٰؑ ہونے کی تصریح کردی ہے جیسا کہ کتاب مذکور کے صفحہ ۴۳۰ ذکر اولاد حضرت سید الشہداء میں لکھتے ہیں: "۔ او را چہار پسر و دو دختر بودہ" اور اسی صفحہ کی سطر آخر میں لکھتے ہیں کہ:

"وچوں فاطمہ خواہر زین العابدین ہم ز شہر بانو بودہ۔ و بہ حسن بن حسن دادہ اند پس اولاد حسن مثنیٰؑ را پیغامبری و بادشاہی جمع باشد"

ان عبارتوں پر نظر کرنے سے صاحب روضۃ الشہداء کے بیان کا تناقض اور قصۂ مذکور کا موضوع و بے اصل ہونا کسی طرح پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ عبارت مذکورہ سے حضرت کی اولادِ دختری کا فاطمہ و سکینہ میں انحصار اور فاطمہ کا زوجۂ حسن مثنیٰؑ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اس کے بعد ممدوح نے ان لوگوں کے بیان کی تردید کی ہے جس کے کلام سے رسالہ مخزن الانوار میں استدلال کیا گیا ہے ان میں سب سے پہلے شیخ فخر الدین طریحی نجفی ہیں۔ جنھوں نے اس قصہ کو منتخب میں تحریر کیا ہے اور اس مقام پر وہ عبارت یقیناً نقل کی جاتی ہے جو مجالسِ مضجعہ کے مطبوعہ لکھنؤ میں منتخب سے نقل کی گئی ہے۔

قال مولانا فخر الدین فی جامعہ انہ جاء القاسم بن الحسن وقال یا عم الاجازۃ لامضی الی ھؤلاء الکفرۃ فقال لہ الحسین یا ابن الاخ انت من اخی علامۃ وارید ان تبقی لاتسلی بک ولم یعطہ اجازۃ للبراز فجلس مھموما مغموما باکی العین حزین القلب واجاز الحسین اخوتہ للبراز ولم یجزہ فجلس القاسم متالما ووضع راسہ علی رجلیہ وذکران اباہ کان قد ربط لہ عوذۃ فی کتفہ الایمن وقال لہ اذا اصابک الم وھم فعلیک ان تحل العوذۃ واقرئ فافہم معناہ واعمل بکل ما تراہ مکتوبا فیہا فقال القاسم لنفسہ مضی برتبہ من السنین علی ولم یصبنی مثل ھذا الم فحل العوذۃ ففضھا ونظر

مولانا فخر الدین اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ قاسم بن حسن حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ چچا مجھ کو بھی ان کافروں سے لڑائی کی اجازت دیجئے۔ آپ نے فرمایا بھتیجے تو میرے بھائی کی نشانی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو باقی رہے اور میں تجھ سے تسلی پاؤں اور آپنے ان کو میدان میں جانے کی اجازت نہ دی قاسم مغموم روتے ہوئے رنجیدہ دل بیٹھ گئے۔ اس کے بعد حضرت نے قاسم کے بھائیوں کو میدان جنگ کی اجازت دیدی مگر ان کو نہ دی۔ قاسم بادل غمناک بیٹھ گئے، اور اپنے سر کو دونوں زانوؤں میں رکھ لیا۔ اسی عرصہ میں ان کو یاد آیا کہ ان کے والد بزرگوار نے ایک تعویذ ان کے بازو پر باندھا تھا اور فرمایا تھا کہ جب تجھ کو کوئی صدمہ پہنچے تو اس تعویذ کو کھول کر پڑھنا اور اس کے مطلب پر غور

ابی کتابھا واذا فیھا یا ولدی یا قاسم اوصیک انک اذا رأیت عمک الحسین فی کربلا وقد احاطت بہ الاعداء فلا تترک البراز والجھاد لاعداء اللہ واعداء رسولہ ولا تبخل علیہ بروحک وکلما نھاک عن البراز عاودہ لیاذن لک فی البراز لتحظی بالعادۃ فقام من ساعتہ واتی الی الحسین وعرض ما کتب اخوہ الحسن علی عمہ الحسین فلما قرء الحسین العوذۃ بکی بکاء شدیدا ونادی بالویل والثبور وتنفس الصعداء وقال یا ابن اخی ھذہ الوصیۃ لک من ابیک وعندی منہ الیک وصیۃ ولابد من انفاذھا فمسک الحسین علی ید القاسم وادخلہ الخیمۃ وطلب عونا وعباسا وقال لام القاسم الیس للقاسم ثیاب جدد فقالت لا فقال لا فمۃ زینب اتینی بالصندوق فاتت بہ الیہ ووضعت بین یدیہ ففتحہ واخرج منہ قباء الحسن والبسہ

کرنا اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اس پر عمل کرنا۔ قاسم نے دل میں خیال کیا کہ:۔ جس قدر زمانہ میری عمر کا گذرا اس میں ایسی مصیبت کبھی پیش نہیں آئی۔ تب اس تعویذ کو کھولا۔ پڑھا اور غور کیا۔ اس میں لکھا تھا کہ اے میرے بیٹے القاسم میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ جب تو اپنے چچا حسینؑ کو کربلا میں اس حالت سے پائے کہ ان کو دشمنوں نے گھیر لیا ہو تو لازم ہے کہ میدان جنگ میں جانے سے منہ نہ موڑنا حسینؑ اور رسولخدا کے دشمنوں سے جہاد کرنا۔ اپنی جان سے دریغ نہ کرنا اور اگر حسینؑ تجھ کو میدان میں نہ جانے دیں تو تو اس قدر اصرار کرنا کہ وہ تجھ کو جہاد اور حصول سعادت کی اجازت دے دیں یہ پڑھ کر قاسم فوراً کھڑے ہو گئے، حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جو کچھ امام حسنؑ نے تحریر فرمایا تھا اپنے چچا کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت نے اس نوشتہ کو پڑھا شدت سے روئے اور باوازِ بلند گریہ فرمایا یہاں تک کہ آپکی آواز رُک گئی اور فرمایا کہ اے بھتیجے یہ وصیت تیرے

القاسم ولف على راسه عمامة الحسن
ومد بيد ابنته التى كانت مسماة
للقاسم فعقد له عليها وافرد له خيمة
واخذ بيد البنت ووضعها بيد
القاسم وخرج عنها فعاد القاسم ينظر الى
ابنة عمه ويبكى الى ان سمع الاعدأ
يقولون هل من مبارز فرمى بيد
زوجته واراد الخروج وقال دونى
فى الفراق وخاب الظن وانقطعا دية
والقلب منه يشتكى الوجعا وحاسدى
رق لى مما اكابره والكيد قطعه ذكر
الغوى قطايا بين بان اصطبارى
يوم فرقتهم. رفقا بمهجة قلب قلبه
جزعا يا دهر هيجت اخزانى بفرقتهم
ياليت نجم السنوا والبين ما طلعا
واضحت الدار قصر الاالليس لها
سواء البكاء وشعل الحى ما اجتمعا
ياخيبتى اين احبابى وما صنعت
بهم عواذل ايام فقد قطعا و
طلع من الخيمة بحيث ذيل القاسم
ومانعته عن الخروج وهى تقول

باپ نے تجھ کو کی ہے۔ مجھے بھی تیرے لئے
ایک وصیت فرمائی تھی۔ ضرور ہے کہ میں
اس کو پورا کروں۔ یہ فرما کر آپ نے قاسم
کا ہاتھ تھام لیا اور خیمہ میں تشریف لائے
اپنے بھائیوں عون اور عباس کو طلب فرمایا
اور والدۂ قاسم سے ارشاد کیا قاسم کے نئے
کپڑے نہیں ہیں انہوں نے عرض کی نہیں
تب آپ نے اپنی بہن زینب سے فرمایا کہ
میرے پاس کپڑوں کا صندوق اٹھا لاؤ۔
وہ لے آئیں اور ان کے سامنے رکھ دیا۔
آپنے صندوق کھول کر امام حسنؑ کی قبا نکالی
اور قاسم کو پہنائی، پھر ان کے سر پر امام
حسنؑ کا عمامہ باندھا اور اپنی اس بیٹی کا جو قاسم
سے منسوب تھیں ہاتھ تھام کر قاسم سے عقد
کر دیا ایک خیمہ ان کے لئے خالی کرا دیا۔ اور
بیٹی کا ہاتھ تھام کر قاسم کے ہاتھ میں دیدیا
اور خیمہ سے باہر تشریف لے
آئے پس قاسم لوٹے اپنے چچا کی بیٹی کو
دیکھتے تھے اور روتے تھے۔ یکایک انہوں
نے سنا کہ دشمن ہل من مبارز کی آواز دے
رہے ہیں یہ سن کر انہوں نے اپنی زوجہ کا ہاتھ

یا عطر بیالک وما الذى تريد تفعله
قال لها اريد ملاقاة الاعداء فانهم
يطلبون البراز وانى على الميدان
عازم والى دفع الاعداء عازم
فلزمته الزوجة فقال لها خلى
ذيلى فاناعرسنا احزناه نصاحت
وناحت وانت من قلب حزين و
دموعها جارية على خديها فقالت
فى يوم القيامت باى شى اعرفك
وفى اى مكان اراك فمسك القاسم
بيده وضربها على ردنه فقطعها
وقال يا بنت العم اعرضينى
بهذا الردن المقطوعة فانضجع
اهل البيت بالبكاء والعويل لفعل
القاسم وبكى بكاء شديدا ونادى
اه الويل والبثور ثم انه جزع وقال
ايا ما غدرت والدهر غدار۔ فى الرجال
واوقد بالعشانارا۔ مطرحين
على الرمضا كانهم۔ اسود غاب لهم
نور واقمار۔ هذا الفراق من الاحباب
والاسفاه من النصير ومن يحمى عن العار

چھوڑ دیا خیمہ سے باہر آنے کا ارادہ کیا اور فرمانے
لگے۔ فراق نزدیک ہوا اور جو گمان مجھ کو تھا۔
میں اس سے محروم رہا اور امید منقطع ہو گئی اور
میں نے ایسی حالت میں شب بسر کی کہ میرا
دل اس کے درد سے شکایت کر رہا تھا۔ میرا
حاسد بھی مجھ پر آفت لانے لگا۔ ان تکلیفوں
سے جن کو میں برداشت کر رہا ہوں اور
میرے جگر کی یہ حالت ہے کہ اس کو ہیبت
سفر کے ذکر نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔
اے فراق میری بے صبری ان کے فراق
کے دن ظاہر ہو گی ایسے عاشق کی جان
کے ساتھ نرمی سے پیش آ جس کا قلب جزع
و فزع میں ہے۔ اے زمانہ تو میرے غم و اندوہ
کو ان کے فراق کے سبب سے ہیجان میں لایا ہے۔
اے کاش بنتِ سفر اور جدائی کا ستارہ طلوع
نہ ہوتا گھر ویران ہو گیا اب کوئی اس گھر سے انس
کرنے والا نہیں رہا سوائے گریہ و بکا اور
پراگندہ قبیلہ کے جو جمع نہیں ہے ہائے محرومی
میرے احباب کہاں ہیں اور زمانہ کی ملامت
گردوں نے ان کے ساتھ کیا کیا پس وہ سلسلہ منقطع
ہو گیا اس کے بعد خیمہ سے باہر آ گئے۔ اس وقت

یا کربلا للبلا یا فیک تجرعنا
بالمیت لان کا ضعنا نحوک سار
یا کربلا فیک قد کانت منیتنا
یا طول حزنی وقلبی فیک افکار
یا ابنۃ العمان القلب فی حزن
فالقلب فیہ حرارات واکدار

ان کی دُلہن نے ان کا دامن تھام لیا باہر جانے سے روکا اور کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے اور کس کام کا ارادہ کر رہے ہو قاسم نے کہا کہ میں دشمنوں سے مقابلہ کا ارادہ کر رہا ہوں. اور وہ لڑائی کے لئے بلا رہے ہیں اس لئے میں میدان جنگ کا عزم اور دشمنوں کو دفع کرنے کا قصد کر رہا ہوں ان کی عروس نے پھر روکا. قاسم نے فرمایا میرا دامن چھوڑ دو. ہماری عروسی ختم ہوئی اس پر وہ دلی رنج سے روئیں. نوحہ کیا ان کے رخساروں پر آنسو جاری تھے. پھر کہا. میں قیامت کے دن تم کو کس طرح پہچانوں گی اور تم کس جگہ ملو گے. یہ سن کر قاسم نے اپنی آستین چاک کر کے الگ کی اور کہا کہ اے چچا کی بیٹی تم مجھ کو اس آستین سے پہچان لینا. قاسم کی ان باتوں پر اہل بیت میں بہت رقّت اور گریہ وزاری ہوئی. سب بلند آواز سے روئے اس کے بعد قاسم باہر آگئے اور یہ فرماتے جاتے تھے. ہمارے زمانہ نے بے وفائی کی اور زمانہ بے وفا ہے. زمانہ نے مردوں کو فنا کر دیا اور جسم کے اندر آگ بھڑکا دی ہمارے ساتھی ریگ پر پڑے ہوئے ہیں گویا وہ سب شیر نیستاں تھے جنسے نور تابندہ ہے ان کے چہرے چاند ہیں یہ دوستوں کی جدائی ہے. ہائے افسوس کون مددگار ہے. اور کون ہے جو عار سے بچانے کے لئے حمایت کرے ا چوتھا شعر غلط مہمل ہے کوئی معنی نہیں اے کربلا تجھ میں ہم سب کی موت ہے. ہائے میرا ملال کس قدر طویل ہے اور میرا قلب تجھ میں شگافتہ ہے اے چچا کی بیٹی البتہ میرا دل حزن وملال میں ہے اس لئے دل میں گرمیاں اور کدورتیں ہیں.

واضح ہو کہ منتخب کے اکثر نسخوں میں اس قصّہ کی ابتدا بہ لفظ نقل یا رُوِی کی گئی ہے اور مجالس مضجعہ میں جو اشعار ہیں وہ اکثر نسخوں میں نہیں بہرحال صاحب منتخب کا اس قصہ

کو تحریر کرنا کئی وجوہ سے قابلِ استدلال نہیں.

(۲) اونہوں نے لفظ رُوِی یا نُقِل درج کیا ہے جس سے ان کے نزدیک اس روایت کا ضعیف یا مشکوک الصحت ہونا ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ لفظ رُوِی یا نقل. یا جاءت الروایت یا وُرِدَ کذا وغیرہ کا استعمال خبر ضعیف یا مشکوک الصحۃ میں کیا جاتا ہے اور یہ مسئلہ علماء فریقین کا متفق علیہ ہے.

(۳) صاحب منتخب نے غالبًا اس قصّہ کو روضۃ الشہداء سے نقل کیا ہے. جیسا کہ سید العلماء نے مجالس مضجعہ میں فرمایا ہے. لاکن ذکرھا فخر الدّین فی جامعہ وَکان ماخذہ تاریخ الحسین الکاشفی چونکہ بیان روضۃ الشہداء کی تردید کی جا چکی ہے اس لئے جب اصل نامعتبر ہے، تو فرع کے نامعتبر ہونے میں کہاں تک ہا.

(۴) بالفرض یہ روایت منتخب میں روضۃ الشہداء سے ماخوذ نہ ہو تب بھی کوئی عاقل اس کو صحیح نہیں مان سکتا. اِس لئے کہ منتخب کی عبارت جو مجالس مضجعہ سے نقل کی گئی ہے ایسے اشعار پر مشتمل ہے جو حضرت قاسم کی جلالتِ قدر کے سراسر منافی ہیں کیونکہ ان اشعار میں ایسے عاشقانہ مضامین مذکور ہیں جن کو عاشق سرگشتہ کے سوا کوئی بیان نہیں کر سکتا. بالخصوص جناب سید الشہداء اور اہل بیتِ اطہار کے سامنے. ایسے اشعار کا زبان پر جاری کرنا نہایت بے شرمی بے باکی اور جسارت ہے جس کے لوث وآلودگی سے حضرت قاسم کا دامنِ طہارت مبّرا اور منزّہ ہے.

(۵) اِن اشعار میں ایسے عیوب اور نقائص موجود ہیں جو کسی طرح اہلِ زبان کی طرف منسوب نہیں ہو سکتے بلکہ یہ اشعار کسی قاعدے سے بھی درست نہیں. اس مطلب کو وہ لوگ بہتر جان سکتے ہیں جو فنِ عروض میں فی الجملہ مہارت رکھتے ہیں علی الخصوص مصرع "یا طول حزنی وقلبی فیک افکار" کا مضحکہ شواکل ہونا محتاج بیان نہیں اس لئے کہ لفظ افکار جو کلمۂ فارسیہ ہے کسی عرب اہل زبان کا کام نہیں.

(۱) اس داستان میں زوجہ قاسم کا تمام اہل بیت کے سامنے قاسم کے دامن کو پکڑ لینا جانب میدان جانے سے مانع ہونا ان کے فراق میں جزع و فزع کرنا۔ یوم حشر کی معرفت کے لئے قاسم کا قطعہ آستین کو ان کے حوالہ کر دینا اور اہل بیت کا اس فعل کے بعد بشدت گریہ وزاری کرنا مذکور ہے مگر ایسے افعال کا سب بزرگوں کے سامنے فاطمہ بنت الحسین اور قاسم ابن الحسن دونوں بزرگواروں کی جلالت قدر اور حیائے فطری کے بالکل منافی ہے۔

(۲) سید ہاشم بحرینی ہیں جنہوں نے اس قصہ کو مدینۃ المعاجز میں نقل کیا ہے لیکن وہ بھی منتخب سے لیتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں "قال الصفری روی انہ" چونکہ منتخب کے متعلق اوپر لکھا جا چکا ہے اس لئے ان کے بیان سے تعرض کی چنداں ضرورت نہیں۔

(۳) ملا محمد حسین قزوینی ہیں۔ انہوں نے بھی اس قصہ کو روضۃ الشہدا اور منتخب سے نقل کیا ہے مگر ان کی کتاب ریاض الشہادۃ جلد دوم صفحہ ۱۷۶ سے جو عبارت شروع ہوئی ہے وہ قابل غور ہے۔

"اما کیفیت آں واقعہ جاں سوز پس باید دانست کہ علمائے شیعہ در کتب مقتل و موزخین در تواریخ مختلف نقل کردہ اند و حکایت دامادی او را نیز فاضل مجلسی مذکور نساختہ و فرمود کہ حدیث آں بنظر نرسیدہ اما شیخ فخر الدین طریحی کہ از علمائے امامیہ است و مرد بزرگے است در فخری نقل و مستند بروایت نمودہ و ملا حسین کاشفی نیز در روضۃ الشہدا از کتب ثقتہا و تواریخ ایراد نمودہ و مکرر مذکور شد کہ سخن موزخین در امثال ایں امور خالی از اعتبار نیست بلکہ از بعضے احادیث بہتر است و وثوق و اعتماد بآں بیشتر است بہماں طریق کہ در آں دو کتاب بنظر رسیدہ نقل می شود و کیفیت آں بایں نسبت است کہ چوں نوبت شہادت برادر زادگان آں جناب

رسید قاسم بن الحسن کہ دراں وقت بحد تکلیف نرسیدہ بود، دوازدہ یا سیزدہ سال بیشتر از عمر شریفش نگذشتہ بود و چوں دید"

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

چوں شاہ شہیداں آں مکتوب را دید۔ آہ حسرت از دل پر درد برکشید و زار زار گریست۔ و گفت اے جان عم ایں وصیتے کہ برادرم بتو کردہ است دو بارہ من، و تو می خواہی کہ بوصیت او عمل نمائی۔ مرا نیز در بارہ تو وصیتی نمودہ می خواہم آں را بجائے آورم۔ و وصیت او ہمیں آنست کہ فاطمہ دختر من کہ پدرت او را نامزد تو کردہ بود، بعقد تو درآورم و بتو دہم۔ پس دست قاسم را گرفت و او را باندرون خیمہ برد۔ و برادر خود عباس و عون را طلبید۔ خطبہ در نہایت فصاحت و بلاغت ادا فرمود و فاطمہ را بمہر شہادت بقاسم عقد کرد"

آگے کہتے ہیں۔

"پس زنان حرم فاطمہ را زینت نمودند"

پھر آگے لکھتے ہیں:۔

"مادر قاسم چوں ازیں قضیہ اطلاع بہم رسانید سیلاب اشک از دیدہ خونناز بارید و زار زار گریست و بخدمت شاہ شہیداں آمد"

لیکن قصہ مذکور کے ثبوت میں صاحب ریاض الشہادت کے کلام سے استدلال کرنا چند وجوہ درست نہیں۔

(۱) صاحب ریاض نے قاسم کا عقد فاطمہ بنت الحسین کے ساتھ ہونا بیان کیا ہے۔ حالانکہ حضرت کی اولاد میں فاطمہ صرف ایک ہی تھیں اور ان کا عقد قبل واقعہ کربلا۔ مدینہ منورہ میں حسن مثنیٰ کے ساتھ ہو چکا تھا۔ اسی طرح فاطمہ بنت الحسین اور حسن بن حسن کا کربلا میں

بمعیتِ جناب سید الشہداء موجود ہونا اور حسن بن حسن کا رہائی پاکر مدینہ کو مراجعت کرنا۔ علمائے فریقین کی تصریحات سے ثابت ہے بلکہ خود صاحبِ ریاض نے واقعہ کربلا کے بعد تا مدت دراز زندہ رہنا تحریر کیا ہے چنانچہ ریاض الشہادۃ جلد دوم صفحہ ۲۷۱ میں مرقوم ہے:۔

"حسن زخم بسیارے در جہاد برداشت و بے ہوش در معرکہ افتاد تا آں کہ نزاع منقضی شد آں وقت اورا اسیر نمودہ بردند و او ماند و عمرے بسیار کرد و اولادِ بسیار ازو بہم رسید"

(۲) صاحب ریاض نے اس روایت کو روضہ اور منتخب سے نقل کیا ہے اور ان کی تردید اوپر کی جاچکی ہے۔

(۳) صاحب ریاض نقلِ روایت میں امین نہیں بلکہ اپنی طرف سے کچھ اور اضافہ کرنے والے ہیں ان کی عبارت منقولہ کے فقرہ "لہذا بہماں طریق کہ دراں دو کتب بہ نظر رسیدہ نقل می شود" پس قصۂ مذکورہ کے روضۃ الشہداء اور منتخب سے بدون تصرف اور بے کم و کاست نقل کرنے کا اظہار کیا ہے، درحالیکہ ان کی عبارت میں کئی ایسے امور ہیں جو روضہ اور منتخب میں بالکل مذکور نہیں مثلاً وصیتِ امام حسن میں فاطمہؑ کا بالتخصیص نامزد ہونا حالانکہ روضہ اور منتخب میں کسی بیٹی کا نام نہیں خصوصاً روضۃ الشہداء میں وصیت مذکورہ کا دوسرے مقام پر بھی اجمالاً تذکرہ ہوا ہے۔ مگر وہاں بھی دخترِ مشارٌ الیہا کا کوئی نام نہیں بیان کیا گیا چنانچہ روضۃ الشہداء مطبوعہ بمبئی بابِ ششم فضائل حضرت امام حسنؑ صفحہ ۲۳۲ میں یہ عبارت درج ہے:۔

"و نقلے ہست کہ ام کلثوم را گفت اے خواہرِ نامدارِ من و یادگارِ مادرِ بزرگوارِ من فرزندم قاسم را حاضر گرداں۔ امِ کلثوم بفرمود تا قاسم را حاضر آوردند حسن اورا در بر گرفت و روے بر روے وے نہادہ بہائے ہائے بگریست بعد ازاں دستِ قاسم بگرفت و بدستِ حسین داد و گفت اے برادر فلانہ دختر ترا نامزدِ پسر خود قاسم کردم چوں وقت آید گوے سپاری"

امام حسینؑ کا قبلِ عقد خطبہ پڑھنا حالانکہ روضہ اور منتخب میں خطبہ پڑھنے کا قطعاً ذکر نہیں ہے عقدِ مذکور کا مہر شہادت پر واقع ہونا در آنحالیکہ روضہ اور منتخب میں اس عجیب و غریب مطلب کا کہیں وجود نہیں اس کے علاوہ اس مطلب کی لغویت صاف ظاہر ہے کیونکہ شریعت مطہرہ میں مہرِ شہادت پر عقد درست نہیں، پھر اس کا حضرت کی طرف منسوب کرنا کس قدر بے ادبی اور جسارت ہے۔ مادرِ قاسم کا وقتِ عقد موجود نہ ہونا۔ اور بعد وقوع اس پر اطلاع پانا حالانکہ روضہ اور منتخب میں مادرِ قاسم کا عند العقد موجود ہونا مذکور ہے، زنانِ حرم کا فاطمہ کو زینت کرنا اس کا بھی روضہ اور منتخب میں اصلاً تذکرہ نہیں ہے۔ اس مطلب کو بھی صاحبِ ریاض نے دوسرے مطالب کی طرح اپنی طرف سے مستزاد کیا ہے۔ بہرحال وجوہِ مذکور پر نظر کرنے سے صاحب ریاض الشہادۃ کے کلام کا ساقط از اعتبار ہونا کسی طرح مخفی نہیں رہ سکتا۔

اس کے علاوہ روضۃ الشہداء اور منتخبِ طریحی کی عبارتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ میں جناب امام حسنؑ کا جناب سید الشہدا کی جن صاحبزادی کو حضرت قاسم سے نامزد کرنے کا ذکر ہوا ہے وہ صاحبزادی حضرت امام حسنؑ کے زمانۂ حیات میں موجود تھیں۔ چنانچہ روضۃ الشہداء کے بابِ ششم کی عبارت منقولہ کا فقرہ:۔

"و گفت اے برادر فلانہ دختر ترا نامزد پسر خود قاسم کردم۔ چوں وقت آید بوے سپاری"

اس مطلب پر بصراحت دلالت کرتا ہے اور منتخب کی عبارت "و مسک بید ابنۃ التی کانت مسماۃ للقاسم" سے بھی ان صاحبزادی کا حضرت امام حسن کی حیات میں موجود ہونا اور آنحضرتؐ کا ان کو قاسم سے نامزد کرنا مستفاد ہوتا ہے۔ حالانکہ خود صاحبِ روضۃ الشہداء کی عبارت سے جناب سید الشہداء کی اولاد میں کوئی صاحبزادی ایسی نہیں معلوم ہوتیں جو حضرت امام حسنؑ کے عہد میں قاسم سے نامزد ہونے کی صلاحیت

رکھتی ہوں اس مطلب کی توضیح یہ ہے کہ صاحبِ روضہ نے اپنی کتاب کے خاتمہ میں جناب سید الشہداء کی اولادِ دختری کو صرف دو صاحبزادیوں میں منحصر کیا ہے جن سے فاطمہ اور سکینہ مراد ہیں۔ ان دونوں صاحبزادیوں میں سے فاطمہ کا عقد حسن مثنیٰؑ کیساتھ ہونا خود صاحبِ روضۃ الشہداء نے کئی مقام پر بیان کیا ہے اور سکینہ بنت الحسینؑ کا عقد عبداللہ بن حسنؑ کے ساتھ واقع ہونا آئندہ مذکور ہوگا۔ چونکہ حسن مثنیٰؑ اور عبداللہ دونوں کا معرکۂ کربلا میں موجود ہونا مسلّم و محقق ہے لہٰذا فاطمہ یا سکینہ کا قاسم سے نامزد ہونا محض بے معنے ہے۔ اس کے علاوہ سکینہ کے قاسم سے نامزد ہونے کا کوئی مورخ قائل نہیں بلکہ فاطمہ بنت الحسینؑ کا حضرت امام حسنؑ کی حیات میں موجود نہ ہونا ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ فاطمہ بنت الحسینؑ کی مادرِ گرامی ام اسحٰق سے جنہیں حضرت امام حسنؑ کی زوجیت کا شرف حاصل تھا اور حضرت امام حسینؑ نے بڑے بھائی کی شہادت کے بعد حسب وصیت عقد کرلیا تھا۔ اس حساب سے امام حسنؑ کی شہادت سے فاطمہ کی ولادت کا کم سے کم دس مہینہ دس روز یا تیرہ مہینہ دس روز بعد واقع ہونا ثابت ہوتا ہے جب یہ صورت ہے تو حضرت امام حسنؑ کا ان کو قاسم سے نامزد کرنا کیونکر درست ہوسکتا ہے۔ اور چونکہ سکینہ بنت الحسینؑ فاطمہ سے چھوٹی تھیں اس لئے امام حسنؑ کا ان کو نامزدِ قاسم کرنا بدرجۂ اولےٰ معقول نہیں ہوسکتا بہرحال ان دونوں صاحبزادیوں کا حضرت امام حسنؑ کی حیات میں قاسم سے نامزد ہونا کسی طرح درست نہیں۔

صاحبِ روضۃ الشہداء نے کتاب مذکور کے باب اول میں حضرت کی ایک دختر ہفت سالہ کا بحالت بیماری مدینہ میں رہ جانا بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ روضۃ الشہداء مطبوعہ بمبئی باب اول صفحہ ۲۲ میں مرقوم ہے۔

"در اخبار آمدہ کہ چوں شہزادہ حسینؑ از مدینہ بیروں آمدہ عزیمت کوفہ نمود اورا دخترے بود ہفت سالہ و بجہت رنجوری کہ اورا عارض شدہ بود

نتوانست کہ با خود ہمراہ بُرد۔ درخانۂ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا بگذاشت"

اس کے بعد غراب کی حکایتِ غریبہ بیان کی ہے، بہرحال اگر روایتِ روضۃ الشہداء کے سقم و فساد سے قطع نظر کی جائے تب بھی اس دختر ہفت سالہ کو نامزد قاسم کرنا دو وجہ سے درست نہیں ہوسکتا، اول یہ کہ دختر مذکورہ کی ولادت تقریباً ۵۴ھ ہجری میں قرار پائی ہے جس کی بناء پر ان کا سن واقعۂ کربلا کے وقت ہفت سالہ قرار پاسکتا ہے حالانکہ حضرت امام حسنؑ نے ۵۰ھ ہجری میں رحلت فرمائی تھی۔ خود صاحبِ روضہ نے بھی حضرت کی شہادت ۵۰ھ ہجری میں واقع ہونا تحریر کیا ہے چنانچہ کتاب مذکور کے خاتمہ مقصدِ اوّل صفحہ ۴۲۲ میں مرقوم ہے۔

"وفاتش شب شنبہ بست دہم صفر سن خمسین من الہجرت"

اس حساب سے دختر مذکورہ کی ولادت کا زمانہ حضرت کی وفات کے زمانہ سے تقریباً چار سال بعد قرار پاتا ہے۔ لہٰذا دختر مذکورہ کا امام حسن کی حیات میں موجود ہونا ہی اور حضرت کا ان کو قاسم سے نامزد کرنا سراسر فاسد ٹھہرا۔ دوسرے یہ کہ صاحبزادی موصوفہ حسب تصریح صاحبِ روضۃ الشہداء مدینہ میں تھیں تو ان کا عقد کربلا میں روزِ عاشورہ کیونکر صحیح ہوگا۔

ملّائے کاشفی نے کنز الغرائب سے ایک اور دختر چہار سالہ کا جناب سید الشہداء کی اولاد میں ہونا نقل کیا ہے چنانچہ کتاب روضۃ الشہداء کے صفحہ ۴۱۲ میں مرقوم ہے۔

"در کنز الغرائب آوردہ کہ یزید اہل بیت را در درونِ کوشکِ خود جائے مقید ساختہ بود و امام حسین دخترے داشت چہار سالہ و بسیار اورا دوست داشتے۔

صاحبِ منتخب نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن انہوں نے اس صاحبزادی کی عمر

تین سال کی لکھی ہے بہرحال یہ صاحبزادی بھی حضرت امام حسن کی حیات میں موجود نہ تھیں صاحب روضۃ الشہداء نے ان چار صاحبزادیوں کے علاوہ اور کسی صاحبزادی کا حضرت کی اولاد میں ہونا اصلاً نقل نہیں کیا۔ اس مختصر بیان سے بھی قصۂ دامادی کا بے اصل محض ہونا ثابت ہوتا ہے۔

(۴) فاضل دربندی ہیں جنہوں نے اس قصہ کے اثبات میں بہت سے مہملات ومزخرفات کو تحریر کیا ہے جو بالکل پادر ہوا ہیں اور ان ہی کو صاحب مخزن الانوار نے دلائل طویلہ اور براہین عقلیہ کے ساتھ تعبیر کیا ہے فاضل موصوف کے دلائل حسب ذیل ہیں

(۱) اہل بیت رسول اللہ کے مصائب جلیلہ اس قضیہ کے واقع ہونے کے بھی مقتضی ہیں بایں معنی کہ دختر کا بعد تزویج فوراً بیوہ ہو جانا بھی ایک مصیبت عظیم ہے۔ کربلا میں تمام مصائب عظیمہ نازل ہوئیں لہٰذا اس مصیبت کا واقع ہونا بھی ضرور ہوا لیکن یہ خیال بالکل فضول اور لغو ہے آل رسول پر جو مصائب واقع ہوئے وہ اگرچہ عظیم اور شدید تر ہیں لیکن اس سے ہر مصیبت عظیمہ کا ان حضرات پر واقع ہونا لازم نہیں آتا۔ اور نہ در حقیقت ایسا ہوا۔ قیاسات پر واقعات کو ترتیب کر لینا اور جو بات چاہنا اپنے دل سے گھڑ کر واقعہ عظیمہ کی صورت میں ان ذوات قدسی آیات سے منسوب کر دینا کسقدر جسارت ہے۔

(۲) ذاکرین اس قصہ کو ہر زمانہ میں علماء اور صلحا کے سامنے بیان کرتے رہے۔ مگر ان لوگوں نے نہ کبھی ان ذاکرین کو منع فرمایا اور نہ اس واقعہ کو کذب وافترا کی طرف منسوب کیا۔ یہ استدلال بھی سراسر مہمل اور واہی ہے اس لئے کہ واقعہ کربلا کے بعد سے ملائے کاشفی کے زمانہ تک کسی ذاکر کا اس قصہ کو پڑھنا یا بحضور علماء پڑھنا ثابت نہیں اور اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی علماء کا اس کو کذب وافترا کی طرف منسوب نہ کرنا قابل قبول نہیں کیونکہ جس زمانہ سے اس قصہ کا چرچا ہوا اس ہی زمانہ سے علما نے اس کی مخالفت بھی شروع کر دی ہے۔ فرض کرو کسی وجہ سے علماء حاضرین نے ذاکرین

کو منع نہ کیا ہو لیکن اس سے اس قصہ بے سروپا کا قابل اعتماد ہونا کس طرح ثابت ہو گیا۔ کیا علماء زمرۂ مسامحین ومغفلین سے خارج ہیں۔ فاضل دربندی کے ہم مذاق بھی بعض علماء گزرے ہیں جن کی وجہ سے بہت سی بے سروپا روایتوں اور مہمل ومزخرف حکایتوں کو رواج ہو گیا ہے ایسے لوگوں کا شکوہ قابل سند نہیں۔

(۳) ہر ملک کے شعرا کا ہر زمانہ میں اس قصہ کو نظم کرنا۔ یہ کلام بھی حلیۂ صحت سے عاری ہے، اس لئے کہ صاحب روضۃ الشہدا سے قبل اس قصہ کا کسی شاعر نے ذکر نہیں کیا اور اگر اسے مان بھی لیا جائے تو ان کا قول محل اعتماد نہیں۔ نہ شعراء کی نظم کو کسی واقعہ کی صحت وعدم صحت کے لئے تاریخی شہادت مانا جا سکتا ہے۔

(۴) اس قصہ کے بیان اور تشبیہات کے قائم کرنے پر سیرت شیعہ کا جاری ہونا یہ امر بھی بے معنے ہے اور اس رسم کا قدیم ہونا کسی طرح قابل تسلیم نہیں۔ ورنہ کتب قدیمہ میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا جس کو اس کے قدیم ہونے کا دعویٰ ہو وہ کسی ایک کتاب قدیم میں ہی اس کا تذکرہ دکھا دے۔

(۵) متاخر المتاخرین اور ارباب مقاتل ومورخین میں سے ایک جماعت کثیرہ نے اس کے واقع ہونے کی تصریح کی ہے۔ حتیٰ کہ صاحب کتاب بحر الانساب نے زفاف کے واقع ہونے اور فاطمہ کے حمل اور ولادت فرزند کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ:۔ مولود کے اقربائے مادری نے اس کا نام قاسم ثانی قایم کیا تھا۔ اور یہ وہ ہی مولود ہے جس کو بنی امیہ نے رے میں قتل کیا، اور ان کی قبر مشہور اور زیارت گاہ جمہور ہے جو رے میں منجملہ قرائے شعرانات کسی قریہ میں واقع ہے اور یہ قاسم بہ لقب شاہزادہ قاسم مشہور ہیں لیکن فاضل مذکور کا یہ کلام بھی سراسر کذب وافترا سے مملو ہے کیونکہ کسی واقعہ تاریخی کو فریقین کے قدما ومتاخرین میں کسی شخص کا بالکل ذکر نہ کرنا اس کے بے اصل محض ہونے کی بیّن دلیل ہے۔ اگر متاخرین میں سے کوئی شخص لکھ بھی دے تو وہ پوچ اور لغو ہے۔ اور

بغیر کسی معتبر تاریخی شہادتوں کے ہرگز قابلِ تسلیم نہیں۔ صاحب کتاب بحرالانساب جس نے فاضل دربندی نے فاطمہ کا حاملہ ہونا وغیرہ وغیرہ نقل کیا ہے۔ ایک شخص مجہول الاسم نہایت جری علی الکذب بلکہ شبیہ بہ مجنون ہے اور اس کی کتاب نہایت درجہ مہمل اور ایسی بیہودہ اور لچر مطالب سے بھری ہوئی ہے جو مستند مورخوں کی تصریحات کے بالکل خلاف اور قابلِ مضحکہ ہیں ایسے مجموعہ خرافات سے استدلال کرنا تو کجا وہ اس قابل بھی نہیں کہ اُسے نظرِ توجہ سے دیکھا جائے۔ اس شخص نے حضرت سیّد الشہدا کی اولادِ دختری میں تین صاحبزادیاں نقل کی ہیں سکینہ۔ فاطمہ۔ زبیدہ بعدازاں قاسم کے عقد کو زبیدہ کے ساتھ اور ایک نسخہ میں سکینہ کے ساتھ تجویز کیا ہے۔ جو بالیقین تمام مورخین ونسابین کی تصریحات کے خلاف ہے۔ پھر فاطمہ بنت الحسین کے عقد کا حسن مثنیٰ کے ساتھ واقع ہونا تحریر کیا ہے جو بین الفریقین متفق علیہ ہے اور جناب سکینہ کی بابت لکھا ہے کہ انہوں نے زندانِ شام میں انتقال کیا۔ پھر زبیدہ کا قاسم ثانی کے ساتھ حاملہ ہونا بیان کیا گیا ہے اور زبیدہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے اور کسی نسخہ میں فاطمہ سے قاسم کا عقد اور فاطمہ کا حاملہ ہونا ذکر نہیں کیا چنانچہ کتاب مذکور کے صفحہ ۲۶ میں لکھا ہے:

"و دختران آں سیدِ مظلوماں چنانچہ درسابق مذکور گردید۔ فاطمہ را در مدینہ بحبالہ نکاحِ حسن مثنیٰ درآورد و زبیدہ کہ مادرش شہربانو معروف بہ شاہِ زنان بود بموجب وصیتِ امام حسنؑ در صحرائے کربلا بحبالۂ نکاح مراجعت نمودہ شہربانو و زبیدہ خاتون بر ذوالجناح سوار شدند و اہل بیت را وداع نمودہ رو براہ آوردند۔ ہمہ جا آں مرکب برق رفتار ہامون نوردِ طے طریق کردتا بولایت رے رسید۔ درحوالئ رے کوہے پُرشکوہ وغارے دراں بہ نظرِ شہربانو درآمد مرکب را بہ سوئے آں کوہ راند۔ چوں نزدیک غار رسید بنالید وچوں ابرِ بہاری بگریست و عرض کرد۔ الہا۔ مالکا پروردگارا تو میدانی کہ بعد از حضرتِ امام حسینؑ دیگر زندگی نمی خواہم از تو مسئلت می کنم کہ مرا دریں غار بجرمِ عمیم خود پناہ دہی دورکنف وحفظ خود نگہداری کہ از شرِ مخالفاں محفوظ و درامان تو باشم۔ درساعت بہ امرِ الٰہی آں غار شگافتہ گردید و درے پیدا شد۔ شہربانو خواست کہ در غار رود زبیدہ خاتون دامنش بگرفت وگفت اے مادر مرا بجہ می گذاری غریب وتنہا۔ آخر ترحم مادری کجا رفت۔ شہربانو گفت اے جانِ مادر تو امانت دار قاسمی ترا رخصت نیست کہ ہمراہِ من بیائی۔ آں گاہ شہربانو زبیدہ خاتون را وداع نمودہ داخل غار شد۔ چوں زبیدہ خاتون تنہا بماند۔ روئے بہ شہرِ رے آورد و درآں جا ماند تا زمانے کہ فرزند او متولد گردید و نام آں مولود را قاسم ثانی گذاردند"۔

یہی شخص اس کتاب کے دوسرے نسخہ میں لکھتا ہے:۔

"اما حضرت امام حسنؑ برادر خود امام حسینؑ را وصیت کردہ بود کہ دختر خود سکینہ خاتون را بہ عقد قاسم درآوری"۔

پھر آگے چل کر تحریر کرتا ہے:۔

"آں کہ امام حسینؑ بفرمود تا سکینہ را بہ صورتِ عروساں بیاراستند و دستِ وے را بدست قاسم دادند حضرت امام حسینؑ نگذاشت کہ آں روز قاسم بہ حرب رود۔ قاسم یک شب بحرمِ خود بماند و با جفت خود صحبت داشت بتقدیر خدائے عزّ وجل فرزندے در رحمِ مادر بند شد"۔

اس کے بعد حضرت کے شہید ہو جانے پر شہربانو اور سکینہ کا رے کی طرف جانا شہربانو کا غار میں پوشیدہ ہونا سکینہ کا تنہا رہ جانا اور ان کے بطن سے قاسم ثانی کا پیدا ہونا

بیان کیا ہے اس کے بعد اور بہت سی فضول اور عجیب و غریب باتیں لکھی ہیں جن پر نظر کرنے سے صاحب کتاب کے مجنون مفتری کاذب اور جاہل ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں رہتا اور یہ بہتان بندی ہرگز اس قابل نہیں کہ اس پر توجہ کی جائے تاہم چند باتیں قابل غور ہیں۔

(۱) صاحب بحر الانساب نے زبیدہ کو حضرت کی اولادِ دختری میں شمار کیا ہے حالانکہ کسی عالم کسی مورخ کسی نساب نے زبیدہ کو حضرت کی اولاد میں شمار نہیں کیا۔

(۲) سکینہ کا زندان شام میں وفات پانا درآنحالیکہ جناب سکینہ ۱۱۷ھ تک زندہ رہیں اور اسی پر کتبِ تواریخ و سیر کا اتفاق ہے۔

(۳) سکینہ کے شوہر عبد اللہ بن حسنؑ معرکہ کربلا میں موجود تھے پھر سکینہ کا عقد قاسم کے ساتھ کس طرح ہو سکتا تھا۔

(۴) باتفاقِ مورخین سکینہ کی والدہ حضرت رباب تھیں مگر اس شخص نے جناب شہر بانو کو ان کی والدہ تحریر کیا ہے۔

(۵) جناب شہر بانو کا حضرت کی شہادت کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر کسی پہاڑ کی طرف چلا جانا حالانکہ شہر بانو اس وقت زندہ بھی نہ تھیں، چنانچہ خود فاضل دربندی نے بھی اس کی صراحت کی ہے اور کتاب اکسیر العبادات کی مجلس ششم نہم میں لکھتے ہیں:۔ فانّ امّ الامام قد ماتت فی النفاس فی ولادة الامامؑ

(۶) زبیدہ یا سکینہ کا قاسم بن حسنؑ سے حاملہ ہونا درآنحالیکہ علماء و مورخین قاسم کے نابالغ ہونے کی تصریح کرتے ہیں اور اسی میں لم یبلغْ الحلمُ کا لفظ موجود ہے۔ اس کے علاوہ تمام علمائے انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت امام حسنؑ کی اولاد امجاد میں زید بن حسنؑ اور حسنؑ بن حسنؑ کے سوا تمام بزرگوار لاولد ہے فاضل دربندی نے اپنی دلائل میں ایک دلیل یہ بھی قائم کی ہے کہ بعض بزرگوار

نے خواب میں حضرت سید الشہداءؑ کی زیارت سے مشرف ہو کر اس واقعہ کے متعلق سوال کیا تو آپ نے اس کی تصدیق فرمائی۔ مگر فاضل موصوف کا یہ کلام بھی اضغاثِ احلام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کسی واقعہ کے ثبوت میں خواب و خیال سے استدلال کرنا حیرت انگیز امر ہے، معلوم نہیں کہ آقائے موصوف پر ایسے پریشان خواب کی صداقت کس طرح منکشف ہو گئی۔

اسی قسم کے واقعات فاضل دربندی نے جواہر الایقان اور اسرار الشہادت میں بھی لکھے ہیں اور عجیب و غریب باتوں اور مزخرف و مہمل روایتوں کے نقل کرنے میں ذرا بھی نہیں چوکے۔ جب فاضل موصوف بحر الانساب جیسی لغو کتاب کو اپنی روایات کا ماخذ اور من گھڑت کہانیوں کو قابل اعتماد قرار دیں تو ان کا قول کیونکر قابلِ استناد ہو سکتا ہے۔ ایسی مجموعۂ خرافات کتاب پر اعتماد کرنا اور اس سے ایسی قصص اور حکایات کو اپنی کتاب میں جگہ دینا جو علمائے فریقین کی کسی کتاب میں موجود نہیں اور ان کو کسی مورخ یا محدث نے تحریر نہیں کیا کس قدر حیرت انگیز اور مضحکہ خیز ہے لطف یہ ہے کہ فاضل مذکور نے اس کتاب سے نقل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کو تاریخ کی کتب معتبرہ میں شمار کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ فاضل دربندی فن تاریخ سے ناآشنائے محض ہیں اور قصہ کہانی اور واقعاتِ تاریخی میں بالکل امتیاز نہیں کر سکتے۔

قصۂ عروسی کے مؤید سید العلما سید میرن صاحب کی اس عبارت سے بھی استدلال کرتے ہیں جو جناب علیین مکان نے مجالس مفجعہ کے صفحہ ۲۱۵ پر تحریر کی ہے اس کی نقل یہ ہے

"و روایۃ تزویج القاسم لم تذکر فی اکثر الکتب المعتمدۃ ولهذا ترکها مولانا المجلسی ولکن ذکرها فخر الدین فی جامعه وکان ماخذه تاریخ

"شادی قاسم کی روایت اکثر معتبر کتابوں میں نہیں ہے اسی لئے اس کو مولانا مجلسی نے چھوڑ دیا ہے۔ البتہ فخر الدین طریحی نے اپنی جامع میں اس کا ذکر کیا ہے اور ان

الحسین الکاشفی وحیث انّ العمدۃ فی امثال المقام ھو نقل اھل السّیر فانّ شیخنا المفید کثیرا یذکرہ فی الارشاد حاکیا عن الکلینی والمدائنی وروایات مقتل ابی مخنف ایضا من ھذا القبیل فلا باس بذکر ھذہ القصّۃ ولذا ذکرہ صاحب الفضل المعاصر صاحب ریاض الشہادۃ لکن متضمن ھذہ الحکایۃ مع شذوذھا مِمّا یستغرب وقوعھا بھذا النمط فی مثل ھذہ المعرکۃ ان عظم ھذہ المصیبۃ والنطواءھا علیٰ ما ینطو علیہ غیرھا من غرائب الامور وفجائع الدھور مِمّا یجوز الوقوع ومجرد الاستبعاد لایدفع بہ الروایۃ والمسامحۃ فی ادلّۃ السّنن تقتضی عدم الاعراض عن مثلھا فلذا اجبنا ایراد القصّۃ اعانۃً علےٰ البکاء علیٰ عظیم البلاء وان کان اجود ھو الاقتصار علےٰ الروایۃ المذکورۃ فی البحار۔"

ماخذ ملّا حسین کاشفی کی تاریخ (روضۃ الشہدا ہے) بات یہ ہے کہ عموماً ایسے مقام پر اہل سیر و تاریخ کا نقل کرنا ہے جو اکثر روایت لکھی ہے۔ کلینی اور مدائنی سے حکایت کی ہے بلکہ روایات مقتل ابی مخنف بھی اسی قبیل سے ہیں اس لئے اِس قصہ کے ذکر میں کوئی مضائقہ نہیں اسی سبب سے اس قصّہ کو ہمارے ہم عصر صاحب علم و فضل مؤلف ریاض الشہادت نے ذکر کیا ہے لیکن یہ روایت شاذ ہے اور اس اصول پر مشتمل ہے جن کا وقوع غرابت کا درجہ رکھتا ہے کہ یہ واقعہ اس طرح پر ایسے معرکہ میں واقع ہوا ہو۔ لیکن مصائب امام مظلوم اعظم ترین مصائب ہیں ان مصائب کا ایسے امور پر جو اوروں کے مصائب میں نہیں پائے جاتے بلکہ ایسی باتیں جو غرابت رکھتی ہیں اور تمام جہان کے حوادث سے زیادہ دردناک ہیں شامل ہونا اسی قبیل سے ہے کہ اس واقعہ کے وقوع کا بھی جواز ظاہر ہوتا ہے۔ اور محض خلاف قیاس ہونا اس کا مقتضی نہیں

کہ اس روایت کو مرفوع کر دیا جائے اور ادلۃ السنن میں سہل انگاری کا جائز ہونا اس کا مقتضی ہے کہ ایسے قصّوں سے اعراض نہ کیا جائے اِس ہی وجہ سے اس قصہ کا بیان کرنا میں نے پسند کیا کہ کربلائے عظمیٰ پر معین گریہ و بکا ہو اگرچہ بہتر یہی ہے کہ اس روایت پر اکتفا نہ کیا جائے جو بحار میں مذکور ہے"۔

لیکن جناب علّیین مکان کے اس کلام سے قصّۂ مذکورہ کے ثبوت پر استدلال کرنا بھی بچند وجوہ صحیح نہیں ہو سکتا۔

(۱) انہوں نے اِس قصّہ کو بیانِ حال کے طور پر منتخب سے نقل کیا ہے جس کے بعد وہ اس کی صحت کے ذمّہ دار نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ حوالہ منقول عنہ اور بیان حال کے بعد ناقل بری الذمہ ہو جاتا ہے اور اس کے وقوع و صحت کی ذمّہ داری اصل راوی پر عائد ہوتی ہے ایسی صورت میں سید العلماء کا قصّۂ مذکور کو محض نقل کر دینا اور اس کو بعنوان مذکور اپنی کتاب میں جگہ دینا اس کے غیر موقوع الصدور بلکہ بے اصل و موضوع ہونے کے منافی نہیں ہو سکتا اور محض ان کی نظر میں قصۂ مذکورہ کے محتمل الوقوع ہونے سے اس کا وقوع لازم نہیں آتا۔

(۲) قصۂ مذکورہ کو خود جناب علّیین مکان کے کلام سے بھی غیر موقوع الصدور اور مظنون الکذب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ نہ تو کتب متعددہ میں کہیں اس کا تذکرہ ہے اور وہ بھی اس کو شاذ اور مستبعد الوقوع کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ملّا محمد تقی برغانی صاحب مجالس المتقین۔ حاجی ملّا محمد صالح برغانی صاحب مخزن البکا، ملّا محمد مہدی نراقی۔ محرق القلوب۔ محمد بن سلیمان تنکابنی صاحب اکلیل المصائب شیخ جعفر نجفی صاحب خصائص۔ تاج العلماء سید علی محمد صاحب رسالہ قاسمیہ کی تصریحات اور مفتی محمد عباس صاحب کی مثنوی بیت الحزن کے ایک شعر پر بھی استدلال کیا جاتا ہے مگر ان بزرگواروں میں سے آقائے دربندی کے

سوا کسی شخص نے بھی اس قصہ کا ثبوت وقوع کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ محض نقل پر اکتفا کی ہے اور حسبِ مقولہ "دروغ برگردنِ راوی" اس کے بارِ ثبوت کو راوی کے ذمہ رکھا ہے اس کے ماسوا یہ لوگ مذہبی عالم اور دینیات کے ماہر تھے، فنِ تاریخ نہ تو داخل دینیات ہے۔ نہ فلسفۂ تاریخ پر عبور علمائے دین کے لئے فرض نہ یہ لوگ معصوم تھے نہ ان کی کتابیں صحیفۂ آسمانی رطب ویابس ہر عالم کی کتاب میں موجود ہے۔ اس سے صاحب کتاب کی علمی جلالت پر حرف نہیں آتا۔ مگر یہ سمجھ لینا کہ جو کچھ اس نے لکھ دیا ہے وہ یقیناً صحیح ہے اور اس میں چون وچرا کرنا اُس عالم کی توہین وتذلیل ہے محض خیالِ باطل ہے معلومات وخیالات سب کے یکساں نہیں غلطی اور سہو میں سب انسان برابر ہیں۔ مدارجِ تالیفات ترقیِ معلومات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں آج کسی مؤلف نے اپنی کتاب میں کسی مسئلہ پر بحث کی چند روز کے بعد اس کی معلومات میں اضافہ ہو کر اس کی تصریحات خود اس ہی کی نظر میں غلط ثابت ہو گئیں۔ کوئی تالیف ابتدائے زمانۂ تعلیم کی ہے۔ کوئی انتہائے زمانۂ تکمیل کی جس قدر عمر اور کثرتِ مطالعہ کے لحاظ سے وسعتِ معلومات کو رفتہ رفتہ ترقی ہوتی جاتی ہے اسی قدر تالیفات کا رتبہ بھی رفتہ رفتہ اور بلند ورفیع ہوتا جاتا ہے۔ لہٰذا کسی دینی علم کے مؤلف کا اس کلیہ سے مستثنٰی ہونا قانونِ قدرت کے خلاف ہے اور نہ زہد وورع وتقدس تبحر فی العلوم اور کثرتِ تالیفات سے یہ لازم ہے کہ جو کچھ اُنہوں نے سمجھا اور لکھا وہ حتماً درست اور صحیح ہے۔

بہرحال اس قصۂ عروسی کا واقع ہونا۔ فاطمہ کبریٰ یا زبیدہ کے جناب سید الشہداء کی اولاد میں معدود اور واقعۂ کربلا میں موجود ہونے پر مبنی ہے لیکن علماءِ فریقین اور ائمہ تاریخ وسیرت کے بیانات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کی اولاد میں کوئی صاحبزادی فاطمہ کبرےٰ یا زبیدہ نہ تھیں بلکہ محققینِ فن کی تصریحات سے فقط ایک فاطمہ کا حضرت کی اولاد میں موجود ہونا ثابت ہوتا ہے جو فاطمہ صغرےٰ کے

نام سے مشہور اور واقعہ کربلا میں حضرت کے ساتھ موجود تھیں اور ان کا عقد ان کے ابن عم جناب حسن مثنیٰ سے ہوا تھا اور خود حسن مثنیٰ بھی معرکہ کربلا میں موجود تھے جو کربلا سے بچ کر مدینہ واپس آئے اور ایک مدت تک زندہ رہے ان کے صُلب اور فاطمہ بنت الحسین کے بطن سے کئی فرزند پیدا ہوئے ایسی صورت میں جنابِ قاسم کے ساتھ عقد کا واقع ہونا کیونکر معقول ہو سکتا ہے اِن مطالب کی تصریح ذیل میں کی جاتی ہے۔

امرِ اوّل

جناب سید الشہداء کی اولاد میں فقط ایک فاطمہ کا موجود اور کتب تواریخ وانساب کا فاطمہ کبریٰ اور زبیدہ کے ذکر سے خالی ہونا۔ اِس مطلب کی توضیح وتشریح کے لئے بعض علماء کرام اور مورخین عظام کی عبارات وافادات کی نقل ضروری ہے مگر ہم بخوفِ طوالت بعض فقرات پر اکتفا کرتے ہیں جو شخص چاہے اصل کتابوں کو دیکھ سکتا ہے۔ اِن میں علما و مورخین اہلِ تشیع۔

(۱) علامہ شیخ مفید ہیں جن کے کلام کا اس باب میں تمام علماء اور مورخین کے کلام پر مقدم ہونا محتاجِ بیان نہیں وہ جناب کتابِ ارشاد میں حضرت کے چار بیٹوں کا ذکر کر کے ارشاد فرماتے ہیں۔

وسکینة بنت الحسین وَامها الرّباب بنت امرء القیس بن عدی کلبیة معدیته وَھیَ امّ عبد اللہ بن الحسین وَفاطمة بنت الحسین وَامّھا امّ اسحٰق بنت طلحہ بن عبید اللہ تیمیة	اور سکینہ بنت حسین ان کی والدہ رباب بنت امراء القیس بن عدی کلبیہ معدیہ ہیں اور یہی عبد اللہ بن حسینؑ کی بھی والدہ گرامی ہیں (۲) فاطمہ بنت حسین ہیں انکی والدہ امّ اسحاق بنت طلحہ بن عبید اللہ تیمیہ تھیں۔

(۲) علامہ طبرسی ہیں ان کی کتاب اعلام الوریٰ کی عبارت یہ ہے۔

وَسکینة بنت الحسین اُمّھا	سکینہ بنت حسین کی والدہ رباب بنت

الرّباب بنت امراء القیس بن عدی بن اوس وھی ام عبد اللہ ایضًا وفاطمة بنت الحسین امھا اُم اسحاق بنت طلحہ بن عبد اللہ تمیمیہ

امراء القیس بن عدی ہیں اس ہیں وہی عبد اللہ کی بھی والدہ ہیں (۲) فاطمہ بنت حسین ہیں ان کی والدہ ام اسحٰق بنت طلحہ بن عبد اللہ تیمیہ ہیں۔

(۳) محمد بن علی اربلی ہیں جنہوں نے کشف الغمّہ میں عبارات ابن طلحہ ابن خشاب ابن اخضر اور شیخ مفید کو نقل کیا ہے۔ جن سے جناب سید الشہداء کی اولاد اُناث میں صرف ایک فاطمہ کا ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ عبارتِ شیخ مفید اوپر لکھی گئی۔ باقی عبارتیں آگے مذکور ہوں گی۔

(۴) محمد بن علی بن شہر آشوب ہیں چنانچہ اس کی کتاب مناقب مطبوعہ بمبئی کے صفحہ ۸۲ میں مرقوم ہے۔

وَبناته سکینة امھا الرّباب بنت امراء القیس لکندیه وفاطمة امّھا اُمّ اسحٰق بنت طلحہ بن عبد اللہ۔

آپ یعنے حضرت سید الشہداء کی بیٹیاں (۱) سکینہ ہیں جن کی والدہ رباب بنت امراء القیس کندیہ تھیں (۲) فاطمہ جن کی مادر گرامی ام اسحٰق بنت طلحہ ابن عبد اللہ ہیں۔

(۵) فخر الدین طریحی ہیں جنہوں نے باوجودیکہ منتخب میں قصۂ عقد قاسم کو نقل کیا ہے۔ مگر حضرت کی اولاد میں صرف دو ہی صاحبزادیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک سکینہ دوسری فاطمہ صغرٰے چنانچہ منتخب کے جزو ثانی کی مجلس اول میں لکھتے ہیں وکانَ للبین بنتان سکینة وفاطمة الصغریٰ +

(۶) علامہ مجلسی ہیں جنہوں نے بحار میں عبارت ارشاد شیخ مفید مناقب ابن شہر آشوب اور کشف الغمہ اربلی کو نقل کیا ہے ان میں صرف ایک فاطمہ کا ذکر ہے۔ فاطمہ کبریٰ اور زبیدہ کا بالکل تذکرہ نہیں اور جلاء العیون میں قول شیخ مفید کو جس میں حضرت کی

دو صاحبزادیاں فاطمہ وسکینہ مذکور ہیں اظہر واشہر درمیان علمائے شیعہ فرمایا ہے۔

(۷) علامہ عبد اللہ بن نور اللہ صاحب عوالم ہیں جنھوں نے مقتل عوالم میں وہی عبارتیں نقل کی ہیں جنھیں فاضل مجلسی نے بحار میں تحریر کیا ہے۔

(۸) سلطان العلماء سید محمد صاحب رضوان مآب ہیں جنھوں نے جدولِ چہاردہ معصومین میں جناب سید الشہداء کی اولاد کے متعلق لکھا ہے کہ:-

"اولاد آنحضرت چہار پسر و دو دختر۔ علی السجاد، علی الاکبر عبد اللہ شہور بہ علی اصغر وجعفر کہ درحیات آنحضرت وفات یافت وسکینہ وفاطمہ"

(۹) علامہ میرزا ابوالفضل طہرانی ہیں جنہوں نے کتاب شفاء الصدور فی شرح زیارت العاشور میں حضرت کی اولاد کے متعلق متعدد اقوال نقل کئے ہیں مگر کسی میں فاطمہ کبریٰ یا زبیدہ کا ذکر نہیں اور آخر میں علامہ ممدوح نے شیخ مفید کے قول کو تمام اقوال عالم پر ترجیح دی ہے۔

(۱۰) میرزا شہر کاشانی ہیں جنھوں نے ناسخ التواریخ میں صاف لکھا ہے کہ:-

"وآنحضرت را از دو دختران افزوں بود نخستیں فاطمہ وآں دیگر سکینہ"

علماء و مورخین اہل تسنّن

علما و مورخین اہل سنت میں جن بزرگواروں نے جناب سید الشہداء کی اولاد امجاد میں صرف دو بیٹیوں فاطمہ اور سکینہ کو شمار کیا ہے ان کی فہرست یہ ہے۔

(۱) ابو محمد عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ دینوری صاحب کتاب معارف

(۲) ابو جعفر محمد بن جریر طبری صاحب ذیل المذیل۔

(۳) ابوبکر المعروف بہ ابن ابی ثلج صاحب تاریخ اہل بیت۔

(۴) ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن خشاب صاحب موالید۔

(۵) علامہ ابن جوزی صاحب صفوۃ الصفوۃ۔

(۶) حافظ ابو محمد عبد العزیز بن اخضر جنابذی صاحب معالم العترہ

(۷) کمال الدین محمد ابن طلحہ شافعی صاحب مطالب السئول۔

(۸) سبط ابن جوزی صاحب تذکرہ خواص الامۃ۔

(۹) علامہ یحییٰ ابن شرف نووی صاحب تہذیب الاسماء واللغات۔

(۱۰) جمال الدین حسین حسنی صاحب عمدۃ الطالب۔

(۱۱) علامہ محب الطبری صاحب ذخائر العقبیٰ۔

(۱۲) خواجہ محمد پارسا بخاری صاحب فصل الخطاب۔

(۱۳) یحییٰ ابن ابی بکر کانی عامری صاحب ریاض مستطابہ۔

(۱۴) احمد بن عبد القادر عجیلی شافعی صاحب ذخیرۃ المآل۔

(۱۵) محمد بن علی صبان مصری شافعی صاحب اسعاف الراغبین۔

(۱۶) سلیمان بن ابراہیم بلخی قندوزی صاحب ینابیع المودۃ

(۱۷) ملا محمد مبین فرنگی محلی صاحب وسیلۃ النجات۔

(۱۸) سید مومن بن حسن شبلنجی مصری نور الابصار۔

البتہ ان میں سے ابن خشاب۔ ابن طلحہ۔ ابن ابی ثلج اور ابن عبد القادر نے تیسری بیٹی کا نام زینب لکھا ہے۔ باقی سب نے صرف دو بیٹیوں فاطمہ اور سکینہ سے زیادہ کسی کا نام تحریر نہیں کیا بہرحال حضرت کی اولاد دختری میں فقط ایک فاطمہ کو شمار کئے جانے اور کسی دوسری فاطمہ یا زبیدہ کے موجود نہ ہونے پر جملہ مورخین اور ارباب سیر نے اتفاق کیا ہے۔ مگر ان لوگوں کے نزدیک حضرت کی اولادِ دختری میں کوئی زبیدہ یا دوسری فاطمہ بھی موجود ہوتیں تو ان کو بھی ضرور شمار کرتے۔ شیخ مفید۔ علامہ طبری ابن قتیبہ دینوری۔ ابوجعفر طبری۔ ابن جوزی۔ ابن الاخضر جنابذی۔ سبط ابن جوزی

علامہ نووی محب طبری، خواجہ پارسا، جمال الدین حسنی شیرازی، مناوی۔ مرزا محمد بدخشی۔ صبان مصری۔ سلیمان بلخی وغیرہ وغیرہ جلیل القدر محققین فریقین نے حضرت کی اولاد دختری میں صرف فاطمہ اور سکینہ ہی کو ذکر فرمایا ہے، اگر ان کے علاوہ تیسری صاحبزادی اور ہوتیں تو ان کا نام قلم انداز کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی ایسی حالت میں محض قصۂ شادی کی اصلاح و درستی کے لئے حضرت کی اولاد میں فاطمہ کبریٰ یا زبیدہ کا فرض کر لینا کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

امر دوم میں وہ عبارتیں قابل غور ہیں جن کی وجہ سے فاطمہ کبرٰے کے حضرت کی اولاد میں ہونے کا توہم ہو سکتا ہے ان میں:۔

(۱) عبارت مناقب ابن شہر آشوب ہے۔ چنانچہ کتاب مذکور کے صفحہ ۲۰۱ احوال سید الساجدین میں کہتے ہیں۔

ان الحسین لما حضرہ الذی حضرہ دعا ابنۃ فاطمۃ الکبریٰ فدفع الیہا کتاباً ملفوفاً و وصیۃ ظاہرۃ الخبر	حسین علیہ السلام نے جس وقت وہ واقعہ پیش آیا جو پیش آیا۔ یعنی شہادت تو آپ نے اپنی بیٹی فاطمہ کبریٰ کو سامنے طلب

فرمایا اور ان کو ایک لکھا ہوا کاغذ لفافہ بند جو وصیت نامہ تھا سپرد کیا۔

(۲) عبارت بحار الانوار۔ (۳) عبارت ناسخ التواریخ کہ ان میں بھی "دعا ابنۃ فاطمۃ الکبریٰ" لکھا ہے وجہ توہم یہ ہے کہ ان عبارتوں میں لفظِ فاطمہ موصوف اور کبریٰ اس کی صفت ہے۔ حاصلِ مراد یہ کہ حضرت سید الشہداء نے اپنی شہادت کے قریب اپنی صاحبزادی فاطمہ کبریٰ کو طلب کیا اور صحیفۂ ملفوفہ اور وصیت کو اُن کے سپرد فرمایا اور جب سید الساجدین کو صحت حاصل ہوئی تو فاطمہ کبریٰ نے اس امانت کو حضرت کے حوالے کر دیا۔ اس سے جناب سید الشہداء کی اولاد میں فاطمہ کبریٰ کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت لفظِ کبریٰ جو ان عبارتوں میں

صفت فاطمہ کی نہیں بلکہ لفظِ ابنتہ کی صفت ہے معنے یہ ہیں کہ حضرت نے اپنی بڑی صاحبزادی فاطمہ کو طلب کیا اور یہ امر بالکل درست اور صحیح ہے اس لئے کہ فاطمہ کا سکینہ سے بڑا ہونا قابلِ انکار نہیں۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ ان عبارات میں لفظِ کبریٰ بعد لفظِ فاطمہ اشتباہاً بہ سببِ غلطی کاتب واقع ہوگیا ہے ورنہ دراصل اس کو بعد لفظِ ابنتہ اور قبل لفظِ فاطمہ ہونا چاہیئے کیونکہ ان عبارات میں یہ حدیث مذکور ہے اس کو اکابر علماء محدثین نے اسی طرح روایت کیا ہے کہ اس میں لفظِ کبرے بعد لفظِ ابنتہ واقع ہے۔ چنانچہ شیخ اجل ابوجعفر محمد بن حسن القمی جو امام حسن عسکریؑ کے اصحاب میں شمار کئے جاتے ہیں اپنی کتاب "بصائر الدرجات" میں کہتے ہیں۔

"حدثنا محمد بن احمد عن محمد ابن الحسین عن ابن سنان عن ابی الجارود عن ابی جعفر قال ان الحسین لما حضرہ دعا ابنتہ الکبریٰ فاطمۃ فدفع الیہا کتاباً ملفوفاً ووصیۃ ظاہرۃً ووصیۃ باطنۃ وکان علی ابن الحسین مبطوناً لا یرون الا انہ لما بہ فدفعت فاطمۃ الکتاب الی علی ابن الحسین"۔

ثقۃ الاسلام ابوجعفر محمد ابن یعقوب الکلینی بھی کتاب کافی میں دوسرے راویوں کی اسناد سے اسی حدیث کو نقل کرتے ہوئے "دعا ابنتہ الکبریٰ فاطمۃ بنت الحسین فدفع الیہا کتاباً ملفوفاً" تحریر فرماتے ہیں اور شیخ جلیل علی بن الحسین المسعودی نے کتاب اثبات الوصیت میں اس حدیث کو اسی طرح روایت کیا ہے۔ علیٰ ہذالقیاس ملائے مجلسی بحار میں اور آقائے دربندی اکسیر العبادات میں اسی طرح ناقل ہوئی ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ باعتبار عمر فاطمہ بڑی تھیں یا سکینہ تو گو اس امر کا تصفیہ عبارات

کتب مندرجہ صدر ہی سے ہو جاتا ہے تاہم مورخین نے صاف الفاظ میں اس کی صراحت کر دی ہے چنانچہ تاریخِ رسل وملوک ابوجعفر محمد ابنِ جریر طبری کی جلد آٹھ صفحہ ۳۸۱ میں مرقوم ہے "فقالت فاطمۃ بنت الحسین وکانت اکبر من سکینۃ" یہی عبارت تاریخ کامل ابن اثیر جزری مطبوعہ مصر جلد ۴ صفحہ ۳۵ میں اور فصول المہمہ ابن صباغ مالکی مطبوعہ ایران صفحہ ۲۰۵ اور نور الابصار سید مومن شبلنجی مطبوعہ مصر صفحہ ۱۲۶ میں موجود ہے لہذا یہ سمجھنا کہ ان کو فاطمہ کبریٰ کہتے تھے صحیح نہیں ہو سکتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی جدّہ ماجدہ جناب فاطمہ کبریٰ کے ہم نام ہونے کی وجہ سے بنام فاطمہ صغریٰ مشہور تھیں چنانچہ علامہ طبرسی نے احتجاج میں سید ابن طاؤس نے لہوف میں فخر الدین طریحی نے منتخب میں علاّمہ مجلسی نے بحار میں اور علامہ عبداللہ نے مقتل عوالم میں علی بن عیسیٰ نے کشف الغمۃ میں نورالدین سمہودی نے جواہر العقد میں علامہ مزی نے تہذیب الکمال میں ولی الدین خطیب نے رجال مشکوٰۃ میں فاطمۃ الصغریٰ بنت الحسین ہی تحریر کیا ہے۔ جب حضرت کی اولاد دختری میں صرف ایک ہی فاطمہ ہیں تو وہی فاطمہ کبریٰ اور وہی فاطمہ صغریٰ کیسے ہو سکتی ہیں بلکہ ان کا حسبِ صراحت علمائے مذکور الصدر فاطمہ صغریٰ ہونا ہر طرح ثابت ہوتا ہے۔ فاطمہ بنت الحسینؑ کے مقابلہ میں سیدہ عالم کو فاطمہ کبریٰ جن لوگوں نے اپنی کتب میں لکھا ہے ان میں بحار الانوار جلد عاشر صفحہ ۳۵۔ کشف الغمۃ صفحہ ۱۷۳۔ صحیح ترمذی مطبوعہ دہلی صفحہ ۶۔ مشکوٰۃ المصابیح مطبوعہ دہلی کہ ان سب میں جناب سیدۃ النساء سے حدیث نبوی کو فاطمہ بنت الحسینؑ کی زبانی بیان کرتے ہوئے "عن فاطمۃ بنت الحسین عن فاطمۃ الکبریٰ" تحریر کیا ہے۔ اسی طرح کتاب الدلائل محمد بن جریر طبری امامی کی عبارت میں لفظ "عن شیبہ بن نعامہ عن فاطمۃ الصغریٰ عن فاطمۃ" اور جواہر العقد میں نورالدین

سمہودی کی عبارت میں "در دایۃ فاطمۃ الصغرٰی ابن الکبریٰ وان کانت مرسلتہ ابوالحجاج نسیانی مانقوی بہ" اور تہذیب الکمال مزی کی عبارت میں جملہ "روی معنبا انس بن مالک الیٰ ان قال وفاطمۃ الصغریٰ بنت الحسین بن علی بن ابی طالب مرسلاً" اور اسماء الرجال مشکوٰۃ کی عبارت میں عنوان "فاطمۃ الصغریٰ ھیَ فاطمۃ الصغریٰ بنت الحسین کا مطلب اس پر دلالت کرنا بالکل صاف اور واضح ہے۔

امر سوم:۔ فاطمہ بنت الحسین کا عقد حسن مثنیٰؑ کے ساتھ قبل واقع کربلا مدینہ میں ہو چکا تھا یہ واقعہ ایسا ظاہر اور آشکار ہے کہ ناظرین کتب سیر و اخبار کو اس پر آگاہ کرنے کی حاجت نہیں چنانچہ شیخ مفید کتاب ارشاد میں کہتے ہیں "ان الحسن بن الحسن خطب الیٰ عمہ الحسین احدی ابنتیہ فقال لہ الحسین اختر یا بنی احبھا الیک فاستحییٰ الحسن وھالم یجر جوابا فقال لہ الحسین فانی قد اخترت لک ابنتی فاطمہ ھی اکثرھما" یہی عبارت کسی قدر تغیر الفاظ کے ساتھ علامہ طبرسی کی کتاب اعلام الوریٰ علامہ علی بن عیسیٰ اربلی کی کشف الغمہ علامہ مجلسی کی بحار الانوار علامہ ابوالفرج اصفہانی کی مقاتل الطالبین علامہ جمال الدین کی عمدۃ الطالب علامہ ابن صباغ مالکی کی فصول المہمہ علامہ عبدالحق دہلوی کی اسماء الرجال مشکوٰۃ علامہ میرزا محمد بن معتمد خاں بدخشی کی مفتاح النجا علامہ عجیلی کی ذخیرۃ المآل محمد صبان مصری کی اسعاف الراغبین سید مومن شبلنجی کی کتاب نور الابصار اور شیخ حسن عدوی کی مشارق الانوار میں درج ہے۔ میرزا سپہر کاشانی ناسخ التواریخ کی پانچویں جلد صفحہ ۲۸۹ میں کہتے ہیں:۔

حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب کہ او را حسن مثنیٰؑ گویند در خبر است
حسن بن حسن خواست دختر امام حسین را از بہر خود تزویج کند چوں ایں

خبر بسید الشہدا رسید او را طلب فرمود و گفت اینک فاطمہ و سکینہ دختران من اند ہر یک را خواہی با تو کابین بندم حسن بن حسن سلام اللہ علیہما را شرم مانع آمد تا چیزی گوید سر فرو داشت و سخن نکرد امام حسین فرمود دختر خود فاطمہ را کہ با مادرم شبیہ تر است با تو کابین بستم"۔

امر چہارم:۔ جناب حسن مثنیٰؑ کا واقعہ کربلا میں حضرت سید الشہدا کے ہمرکاب حاضر رہنا اور باوجود جدال و قتال زندہ بچنا اس واقعہ کے متعلق بھی تمام علمائے تاریخ و سیر کا اتفاق ہوا اور کسی شخص نے حسن مثنیٰؑ کے واقعہ طف میں موجود ہونے اور ان کے زندہ بچ رہنے میں اختلاف نہیں کیا چنانچہ شیخ مفید کتاب ارشاد میں لکھتے ہیں۔

"وکان الحسن بن الحسن حضر مع عمہ یوم الطف فلما قتل واسر الباقون من اھلہ جاء اسماء بن خارجۃ فانتزعہ من بین الاسارٰی وقال واللہ لا یوصل الیٰ ابن خولہ ابداً فقال عمر بن سعد دعوا لابی حسان ابن اختہ ویقال انہ اسر وکان بہ جراح قد اشفی منہا،

"حسن مثنیٰؑ فرزند امام حسن علیہ السلام روز عاشورہ اپنے چچا کے ساتھ تھے جب اقربا و اصحاب امام قتل ہو چکے اور اہل بیت کے باقیماندہ لوگ قید کر لئے گئے تو اسماء بن خارجہ حسن مثنیٰؑ کے پاس آیا۔ ان کو قیدیوں سے جدا کیا اور کہا خدا کی قسم خولہ کے بیٹے کو کبھی کوئی گزند نہیں پہونچے گا ابن سعد نے لشکریوں سے کہا ابی حسان کی روایت سے اس کی بہن کے فرزند کو چھوڑ دو بعض کہتے ہیں کہ حسن مثنیٰؑ قید کر لئے گئے تھے اور زخمی تھے مگر شفایاب ہو گئے تھے۔

یہی عبارت علی بن عیسیٰ اربلی نے کشف الغمہ میں اور علامہ مجلسی نے بحار میں ارشاد سے نقل کی ہے سید ابن طاؤس لہوف میں کہتے ہیں۔

والحسن بن الحسن وکان قد واسی
عمہ واما م فی الصبر علی ضرب
السیوف وطعن الرماح واکا ونث
وقد اثخن بالجراح وروی مصنف
کتاب المصابیح ان الحسن بن الحسن
المثنیٰ قتل بین یدیہ عم الحسین
فی ذالک الیوم سبعة عشر لفظ
واصابہ ثمانیة عشر جراحة فوقع
ناخذہ خالہ اسماء بن خارجہ
فحملہ الی امکرفتہ وداواہ حتیٰ
برو حملہ الی المدینة +

حسن بن حسن نے اپنے چچا اور امام کا ساتھ
دیا۔ نیزہ و شمشیر کھانے میں صبر اختیار
کیا سخت زخمی ہو جانے کے بعد جاں
بلب میدانِ جنگ سے اٹھالائے گئے
درحالیکہ زخموں سے چور تھے۔ اور
کتاب المصابیح کے مصنف نے روایت
کی ہے کہ حسن مثنیٰؑ بن حسن نے اپنے چچا
امام حسینؑ کے سامنے سترہ آدمیوں کو
قتل کیا ان کے بھی اٹھارہ زخم لگے۔
یہانتک کہ گر گئے لیکن ان کے ماموں اسماء
بن خارجہ نے ان کو چھڑالیا اور کوفہ لے
گیا۔ علاج کرایا جب شفایاب ہو گئے تو مدینہ بھجوا دیا۔

اسی عبارت کو فاضل دربندی نے اسرار الشہادت میں اور نیز صاحب خوارج
حسینیہ نے لہوف سے نقل کیا ہے اور ابو حاتم بن صبان نے کتاب الثقات میں لکھا
ہے:۔ "وجرح فی ذالک الیوم الحسن بن علی بن ابی طالب جراحة شدید
حتیٰ جلوہ ثم عاس بعد ذلک"۔

ناسخ التواریخ کی جلد پنجم صفحہ ۲۹۰ میں مرقوم ہے۔
"وحسنِ مثنیٰؑ در یوم طف ملازمت رکاب عم خود حسین را داشت، و در
روز عاشورہ زخم فراواں یافت و درمیانِ کشتگان در افتادگاہ
کہ سر شہدا را از تن دور بکردند خواستند تا سر او را نیز برگیرند دا ورا
ہنوز رمقے در تن بود اسماء بن خارجہ بن عتبہ بن حصین بن حذیفہ بن

بدر الفزاری گفت او را بجائے گزارید و این سخن از بہر آں گفت کہ مادر
حسن مثنیٰؑ خولہ دختر قبیلہ را زقبیلہ فزارہ بود با جملہ اسماء کہ یکبنی با بوحسان
بود حسن مثنیٰؑ را بکوفہ آوردہ مداوا کرد تا صحت یافت و از آں جا روانۂ
مدینہ شد۔

اسی مضمون کو علامہ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں جمال الدین حسینی نے
عمدة الطالب میں ابن صباغ مالکی نے فصول المہمہ میں میرزا محمد بن معتمد خاں نے
مفتاح النجا میں شیخ محمد حبان مصری نے اسعاف الراغبین میں سید مومن شبلنجی نے
نور الابصار میں علامہ اشرف علی نے ریاض الجنان میں اور مفتی اکرام الدین دہلوی
نے سعادة الکونین میں بہ تغیر الفاظ بیان کیا ہے۔

امر پنجم[5] فاطمہ بنت الحسین کے بطن سے حسن مثنیٰؑ کے تین صاحبزادے
عبداللہ المحض ابراہیم اور حسن مثلث کا پیدا ہونا یہ مضمون ناظرین تاریخ و سیر پر
آفتابِ عالمتاب سے زیادہ روشن ہے اور اس کی شہادتیں اس قدر کثرت سے موجود
ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا دشوار ہے جو ما نحن فیہ پر مطابقتاً یا التزاماً دلالت کرتی ہیں۔
علمائے انساب کے علاوہ جو اس پر متفق ہیں شیخ مفید نے ارشاد میں علی بن عیسیٰ نے
کشف الغمہ میں علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں محمد بن محمد الحسینی الشبانی نے کتاب
اثنا عشریہ میں میرزا سپہر کاشانی نے ناسخ التواریخ میں محمد بن سعد کاتب الواقدی
نے طبقات میں ابو حاتم بستی نے کتاب الثقات میں ابو الفرج اصفہانی نے مقاتل
الطالبین اور اغانی میں ابو الحجاج مزی نے تہذیب الکمال میں خواجہ محمد
پارسا نے فصل الخطاب میں ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں سید
مومن شبلنجی نے نور الابصار میں مرزا محمد بدخشی نے مفتاح النجا میں ملا محمد مبین فرنگی
محلی نے وسیلة النجات میں اس کی صراحت کی ہے۔

امرِ ششم :- حضرت حسن مثنیٰ کا بعد واقعہ کربلا ایک مدت تک زندہ رہنا اور عہدِ ولید بن عبدالملک یا سلیمان بن عبدالملک میں رحلت فرمانا۔ اِس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ حسن مثنیٰ بعد واقعہ کربلا عرصۂ دراز تک زندہ رہے۔ البتہ اِس میں اختلاف ہے کہ ان کا انتقال کس عمر اور کس عہد میں ہوا شیخ مفید ارشاد میں علامہ طبرسی اعلام الوریٰ میں علی بن عیسیٰ کشف الغمہ میں علامہ مجلسی بحار میں میرزا سپہر ناسخ التواریخ میں ابن اثیر جزری جامع الاصول میں جمال الدین حسینی عمدۃ الطالب میں شیخ عبدالحق دہلوی رجال مشکوٰۃ میں حضرت حسن مثنیٰ کا ۳۵ سال کی عمر پاکر ولید بن عبدالملک کے عہد میں اور علامہ ذہبی کاشف میں ابن حجر عسقلانی تہذیب التہذیب وتقریب التہذیب میں صفی الدین خزرجی تذہیب میں مرزا محمد بدخشی مفتاح النجا میں اور مفتی اکرام الدین، سعادت الکونین میں آپ کا ۶۵ سال کی عمر میں بعہد سلیمان بن عبدالملک اور ابن صباغ نے فصول المہمہ میں حسن مثنیٰ کا بچاسی سال کی عمر پاکر رحلت فرمانا تحریر کیا ہے البتہ ان میں قول اوّل صحیح ہے۔

امرِ ہفتم :- حضرت فاطمہ بنت الحسین کا اپنے شوہر حسن مثنیٰ کی وفات تک موجود ہونا اور اُن کی قبر پر ایک سال تک مقیم رہنا اس کے متعلق شیخ مفید نے ارشاد میں ابن شہر آشوب نے مناقب میں علی بن عیسیٰ نے کشف الغمہ میں علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں ابن اثیر جزری نے جامع الاصول میں ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں ابوالحجاج مزی نے تہذیب الکمال میں ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ابن صباغ نے فصول المہمہ میں ولی الدین خطیب نے اسماء رجالِ مشکوٰۃ میں صفی الدین خزرجی نے تذہیب میں عجیلی نے ذخیرۃ المآل میں مومن شبلنجی نے نورالابصار میں اشرف علی نے ریاض الجنان میں امام بخاری نے کتاب الجنائز میں ابن حجر نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں قسطلانی نے ارشاد

الساری شرح صحیح بخاری میں ملا یعقوب بنباری نے خیر جاری شرح صحیح بخاری میں مرزا سپہر نے ناسخ التواریخ میں اور مفتی اکرام الدین خاں نے سعادت الکونین میں صاف صراحت کی ہے کہ جب حسن مثنیٰ کا انتقال ہوا فاطمہ بنت الحسین نے ان کی قبر پر بمقام بقیع خیمہ استادہ کرایا اور ایک سال تک وہیں مقیم رہیں یہ تمام زمانہ شب و روز عبادت میں بسر کیا دن کو روزہ رکھتیں اور رات بھر نماز پڑھتیں۔

المختصر اس تمام تحقیق و تنقید سے علماء فریقین اور ائمہ تاریخ و سیر کے نزدیک حضرت سید الشہداء علیہ السلام کی اولاد دختری میں صرف ایک فاطمہ کا جو فاطمہ صغریٰ کے نام سے مشہور ہیں موجود ہونا ان کا عقد قبلِ حادثۂ کربلا حسن مثنیٰ کے ساتھ کیا جانا ان دونوں بزرگواروں کا واقعہ کربلا میں جنابِ سید الشہداء کے ہمرکاب حاضر و موجود ہونا بعد معرکہ کربلا دونوں کی جانب مدینہ مراجعت ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہونا حسن مثنیٰ کا ایک عرصہ کے بعد رحلت فرمانا فاطمہ بنت الحسین کا اپنے شوہر کی وفات کے وقت موجود ہونا اور ان کی قبر شریف پر سال بھر تک مقیم رہنا روزِ روشن کی طرح واضح اور آشکار ہوگیا۔ تو اب عقدِ قاسم بن حسن کے قصہ کا بے سروپا ازقبیل خرافات و اباطیل اور اربابِ تحقیق و تنقید کی نصوص صریحہ کے مخالف ہونے میں کیا شک و شبہ باقی رہا۔ جب قدماء کی کتابیں اس سے خالی ہیں تو اس کے سوا اور کیا سمجھا جاسکتا ہے کہ متاخرین میں سے کسی کذاب مفتری نے اس داستان کو وضع کیا اور عوام کالانعام جن کو نیک و بد کی تمیز نہیں اس کو رواج دینے میں ساعی ہوئے بعض خواص نے بھی حقیقت حال کی تفتیش کئے بغیر اس قصہ کو اپنی تالیفات میں جگہ دیدی جو کسی طرح سند نہیں اور بلاشبہ یہ قصہ بے اصل و واہی اور سراسر باطل و موضوع بلکہ بہتان و افترا ہے فافہم وتدبر۔

اگرچہ تاریخی واقعات کو خواہ وہ سیاسی ہوں یا مذہبی بحیثیتِ فن علماء او

مجتہدین کے فتوؤں سے کچھ تعلق نہیں۔ ہم مجتہدین کے محتاج ہیں بھی تو حدیث و تفسیر و فقہ میں جن کا تعلق مذہب سے ہے۔ تاریخی واقعات اور ان کے متعلقات کو دینیات اور اجتہاد فی الدینیات سے کچھ سروکار ہے۔ نہ علاقہ۔ ہمارے لئے کسی تاریخی واقعہ وقوع اور عدمِ وقوع اور اس کے صحت و عدمِ صحت کا معیار صرف تاریخی شہادت اور اصولِ مقررہ ہیں۔ نہ یہ کہ فلاں قبلہ یہ فرماتے ہیں اور فلاں مولانا کا یہ ارشاد ہے۔ قصۂ مذکور کے جواز و عدمِ جواز کی بحث اُس وقت کارآمد ہوسکتی ہے۔ جب اس کی کچھ اصلیت بھی ہو۔ پہلے تو یہ دیکھنا مقدم ہے کہ یہ واقعہ ہوا بھی ہے یا نہیں اور ہوا تو اس کا ثبوت کیا ہے یہ تو بعد کی بات ہے کہ اس کا ذکر جائز ہے یا نہیں۔ اور علمائے مذہب نے اس کے پڑھنے اور سننے کی مخالفت کی ہے یا نہیں تاہم جہاں تک مجتہدینِ عراق و لکھنؤ کے فتوے ہماری نگاہوں سے گذرے کسی نے بھی اِس بے اصل روایت کی تصدیق و تائید نہیں کی۔

آقا سید محمد طباطبائی یزدی فرماتے ہیں :-

"وقوعِ ایں قضیہ معلوم نیست ہرچند در بعض کتب بدون سند معتبر مذکور باشد"

آقا شیخ عبداللہ مازندرانی کا ارشاد ہے۔

"الی الآن مستندے کہ بتواں اعتماد نمود در باب وقوع ایں قضیہ بدست نیامد"

آقا شیخ حسین مازندرانی کا فتوے ہے۔

"اما اصل ایں قضیہ پس ہنوز بدرجۂ تحقیق و ثبوت و یقین نرسیدہ بلکہ عدمش محقق است"

آقا سید اسمٰعیل صدر تحریر فرماتے ہیں۔

"ذکر عروسیٔ قاسم در کتبِ معتبرہ دیدہ نشدہ۔ کتابِ منتخب نیز منقولات غیر معتبرہ را ذکر می فرماید"

آقا سید ابوتراب موسوی النجفی لکھتے ہیں :-

"ایں حکایت صادق نیست بلکہ معلوم الکذب است"

آقا سید ریحان اللہ موسوی الطہرانی ارقام فرماتے ہیں :-

"ظاہر ایں ست کہ عقد قاسم با فاطمہ واقع نہ شدہ بلکہ بتواں ادعائے قطع بعدم وقوع او نمود"

آقا سید ناصر حسین مجتہد لکھنؤ فرماتے ہیں۔

"قصۂ عقدِ قاسم بن حسنؑ بے اصل محض ہے"

ان کے ماسوا اور بہت سے فتوے علماء عراق کے موجود ہیں اسی طرح اس بے اصل قصہ کے پڑھنے کو بوجہ اس کے کہ کذبِ صریح ہے یہ حضرات جائز نہیں سمجھتے۔

آقا سید محمد کاظم طباطبائی کا ارشاد ہے۔

"خواندنِ آں با ظہار جزم و عدم جزم بوقوع مشکل است"

آقا شیخ حسین مازندرانی فرماتے ہیں :-

"بنحو احتمال و جزم و قطع خواندنش مشکل بلکہ حرام است"

آقا غلام حسین اصفہانی تحریر کرتے ہیں :-

"خواندنِ آں مقداری کہ در منتخب مذکور است بانسبتِ ہماں کتاب ہم غیر جائز است بدون شبہ و ریب"

بڑے تعجب کی بات ہے کہ حضرت امام حسنؑ نے زید اور حسن مثنیٰ اور عبداللہ یا کسی دوسرے بیٹے کے لئے تو عقد کی وصیت نہ کی اور قاسم کے عقد کے واسطے جو اپنے والد کی وفات کے وقت بہت ہی صغیر سن تھے۔ وصیت فرمائی اس سے زیادہ حیرت انگیز یہ کہ جن عقدوں کی بابت وصیت نہ تھی ان کو حضرت نے مدینہ میں کر دیا اور جس عقد کے واسطے وصیت تھی اس کو تعویق میں ڈالے رکھا۔ سب سے زیادہ قابلِ غور یہ بات ہے کہ اگر فاطمہ کے عقد کی قاسم کے ساتھ وصیت

ہوتی تو حضرت ان کا عقد حسن مثنیٰؑ کے ساتھ کیسے کر دیتے۔ پھر ایک شوہر کی موجودگی میں دوسرا عقد کیسا کس قدر حیرت افزا اور افسوسناک بات ہے کہ پڑھنے والے اور اس کی تائید کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ اس توہین آمیز افترا کا ذکر (نظماً یا نثراً) گستاخی اور بے ادبی کی کس حد تک پہنچا ہوا ہے، اس کے علاوہ یہ امر بھی کس قدر قابلِ افسوس ہے کہ اس واجب الاحترام طبقہ نے جس کو مداحئ اہل بیت کا فخر حاصل تھا اس کے تلخ اور زہر آلود نتائج پر غور کئے۔ بغیر اپنی پُر زور اور مؤثر اور دلآویز نظم کے جادو سے عالم اور جاہل بوڑھے اور بچے مرد اور عورت سب کو ایسا مسحور کیا کہ اِس بے بنیاد اور بے اصل قصہ کو سُنتے سنتے ان کے دل و دماغ میں حق الیقین سے بھی بڑھ کر درجہ حاصل ہو گیا، لطف یہ کہ جب اس کی ابطال و تردید کی جاتی ہے تو براہ کج بحثی یہ جواب دیا جاتا ہے کہ کیا میر انیسؔ جاہل تھے یا میرزا دبیرؔ کو اتنی بھی خبر نہیں تھی وغیر ذالک بلکہ بعض اوقات اِس حد سے بھی تجاوز ہوتا ہے جس کی تائید ذیل کے واقعے سے جو میں نے ایک ثقہ شیعہ بزرگوار کی زبان سے سُنا ہے ہوتی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن عرف آبو صاحب اعلی اللہ مقامہ کے مکان پر لکھنؤ میں مجلس عزا تھی نواب محمد حسین خاں لکھنؤ کے ایک سربرآوردہ امیر جو میر مونس کے شاگرد تھے وہ بھی شریکِ مجلس تھے۔ سید آبو صاحب نے سید محمد جواد سے جو ایک محتاط بزرگوار تھے ہدایت کر دی تھی کہ آج آپ ممبر پر جا کر پڑھیں اور اثناء ذکر میں قصہؑ عروسی کا ابطال نرم اور مناسب الفاظ میں کر دیں۔ سید محمد جواد نے سید آبو صاحب کے حکم کی تعمیل کی اور ممبر پر جا کر اس روایت کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ اِس توہین آمیز روایت کا ذکر کرنا قبالۂ جہنم ہے ان کا اتنا کہنا تھا کہ نواب محمد حسین خاں نے ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی ان کو ممبر سے گھسیٹ لیا، اور بھرے مجمع میں سخت و سست الفاظ کہے۔ یہ کیوں! صرف اس وجہ سے کہ نواب محمد حسین خاں کے استاد نے اپنے

متعدد مرثیوں میں اس موضوع روایت کو بڑے آب و تاب سے نظم کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ساتویں محرم کو مہندی کے متعلق خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہے بفرضِ محال اگر وصیت کا اظہار اور اس پر عمل ہوا بھی تو دسویں کو قریب دوپہر ہوا، ساتویں کو مہندی چہ معنی دارد اس کے علاوہ یہ رسمیں مہندی سانچی وغیرہ وغیرہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی ہمسایہ قوموں سے لی ہیں۔ عرب میں جہاں اب بھی یہ باتیں نہیں آج سے تیرہ سو برس پہلے ہونا کس قدر بعید از عقل بالتخصیص ہندوؤں کی ایک رسم کو خاندانِ رسالت کی طرف منسوب کرنا مسلمانوں کے لئے کس قدر شرمناک اور لایعنی حرکت ہے۔

حضرت قاسمؑ کے واقعات میں قصۂ عروسی کی طرح ارزق شامی اور اس کے چار بیٹوں کی معرکہ آرائی نہایت مشہور اور دلچسپ ہے جس کو شعرائے ہند نے بڑے آب و تاب اور دلکش پیرائے سے نظم کیا ہے لیکن تاریخ کی تمام قدیم اور مستند کتابیں اس واقعہ کے بیان سے بھی قطعاً خالی ہیں۔ داستانِ عروسی کی طرح ارزق کی جنگ بھی روضۃ الشہدا جیسی کتابوں میں ہی پائی جاتی ہے۔ ملائے کاشفی نے اپنی عادت کے موافق اِس لڑائی کو کسی سند یا حوالے سے نہیں لکھا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کو بھی قصۂ عروسی کی طرح بے اصل و موضوع نہ مانا جائے۔ روایتاً کوئی سند نہ ہونے کے علاوہ درایتاً بھی اس کی صحت مشکوک و ناقابلِ اعتبار ہے، کیونکہ اس معرکہ میں سوائے عراقیوں کے ایک بھی شامی یا حجازی شریک نہ تھا۔

ابومخنف لوط ابن یحییٰ ازدی جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اِس زمانہ میں بمقام کوفہ موجود تھے اپنے مقتل میں صاف لکھ رہے ہیں " فتکمر العسکر ثمانون الف فارس من اھل الکوفۃ لیس منھم شامی ولا حجازی۔

(۱۰) یہ امر بھی تنقیح طلب ہے کہ علی اکبر کون تھے سید سجاد یا علی الشہید حضرت زینبؑ

کا شہادتِ علی اکبر کے وقت خیمہ سے نکل آنا قصۂ دخترِ بادشاہِ حلب علی اکبر کی بابت عام طور پر یہ مشہور ہے کہ وہ حضرت سید الشہدا کے منجھلے صاحبزادے ہیں اور شہادت کے وقت ان کی عمر اٹھارہ برس سے زائد نہ تھی۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس تحقیق کی بابت علماء اور مورخین مختلف الخیال اور مختلف البیان ہیں بعض کہتے ہیں کہ علی الشہید ہی علی اکبر ہیں بعض کا خیال ہے کہ سید سجاد علی اکبر اور علی الشہید علی اوسط ہیں۔ مگر ہمارے اجتہاد اور تحقیق میں پہلی رائے صحیح اور درست ہے اس کے متعلق ہم اس کتاب کے دوسرے حصہ میں کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے انشاء اللہ۔ البتہ مختصراً اتنا عرض کیا جا سکتا ہے کہ گو کتاب ارشاد اور شرح الاخبار وغیرہ میں سید الساجدین کو علی اکبر اور علی الشہید کو علی اوسط بیان کیا گیا ہے لیکن دوسرے تمام مشہور و معتبر مورخ اور نساب برخلاف ازیں اسی قول کی تائید کرتے ہیں کہ علی الشہید ہی جناب سید الشہدا کے خلفِ اکبر تھے۔ نہ کہ سید الساجدین چنانچہ ابن قتیبہ دینوری معارف میں محمد بن جریر طبری ذیل المذیل میں ابو بکر بن ثلج تاریخ اہل بیت میں ابن الاخضر جنابذی معالم العترہ میں۔ محمد ابن طلحہ شافعی مطالب السؤل میں سبط ابن جوزی تذکرہ خواص الامۃ میں محب طبری ذخائر عقبیٰ میں خواجہ محمد پارسا فصل الخطاب میں جمال الدین حسینی عمدۃ المطالب میں یحییٰ بن ابی بکر ریاض مستطابہ میں احمد بن عبد القادر عجیلی ذخیرۃ المآل میں محمد بن صبان مصری اسعاف الراغبین میں سلیمان بن ابراہیم قندوزی ینابیع المودۃ میں سید مومن شبلنجی نور الابصار میں ملا محمد مبین لکھنوی وسیلۃ النجات میں اور ابن شہر آشوب مناقب میں ایسا ہی کہتے ہیں۔ جب یہ صورت ہے تو علی اکبر کی عمر شہادت کے وقت اٹھارہ سال کی کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سید الساجدین کا سن شریف اس وقت ۲۲ سال آٹھ مہینہ کا تھا علی اکبر آپ سے بڑے ہیں تو جیسا کہ بعض نے ۲۸ سال یا ابن شہر آشوب نے پچیس سال کی

عمر لکھی ہے اس کو تسلیم کرنا پڑیگا۔

مرثیہ گو حضرات کی بدولت عموماً لوگوں کے یہ بھی ذہن نشین ہو گیا ہے کہ حضرت علی اکبر کی شہادت کے وقت جناب زینب بیتاب ہو کر خیمہ سے نکل آئی تھیں لیکن حرم سرا سے اِس طرح باہر نکل آنا کہ نامحرموں کی نظر پڑ سکے۔ دخترِ سیدۃ النساء کی شانِ رفیع سے بہت بعید بلکہ ایسا خیال اور ایسا ذکر اُن معظمہ کی توہین ہے ہم آئندہ ایک موقعہ پر اس کے متعلق کسی قدر تفصیل سے بحث کرینگے۔

جناب علی اکبر کے واقعات میں بادشاہ حلب کی بیٹی کا قصہ بھی نہایت مشہور ہے جس کو روضہ خواں بڑی شد و مد سے بیان کیا کرتے ہیں کہ آپ کے حسن و جمال کا شہرہ سُن کر بادشاہ حلب نے اپنی بیٹی کا عقد کرنا چاہا تھا لیکن وہ اور اس کی بیٹی اس وقت کربلا میں پہنچے کہ جب آپ شہید ہو چکے تھے مگر اس داستانِ بے اصل کی لغویت محتاج تشریح نہیں اور اس پر وہی یقین کر سکتا ہے جو علم تاریخ سے ناآشنائے محض ہے۔ حلب نہ کسی مستقل حکومت و سلطنت کا پایۂ تخت تھا نہ وہاں کوئی خاندان برسرِ حکومت تھا حلب کی چھوٹی سی سلطنت ولادت مسیح سے ۴۲ برس مارک انیٹونی کے ہاتھوں جو رومۃ الکبریٰ کا مشہور سپہ سالار اور رُکن اعظم تھا برباد ہو چکی تھی اس زمانہ سے یہ علاقہ بھی روم کی وسیع شاہنشاہی کا ایک حصّہ تھا جب اِس عظیم الشان سلطنت کے ۲ دو حصّے ہو کر شہر قسطنطنیہ ایسٹرن رومن امپائر کا دار الخلافہ ہوا تو تمام مشرقی صوبے قیصر قسطنطنیہ کے حصہ میں آئے یہاں تک کہ ۱۶ سنہ ہجری مطابق ۶۳۷ء میں تمام شاہی علاقے مع حلب کے مسلمانوں نے فتح کر لئے اور اب یہ سب ملک امیر معاویہ کے بعد یزید کے زیر حکومت تھے جب وہاں کوئی سلطنت ہی نہ تھی بلکہ اس پر خاندان بنی امیّہ کا ایک عامل حکومت کر رہا تھا تو حلب کا کوئی بادشاہ ہوتا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے اِس لئے یہ قصّہ محض بے وجود

اور کسی وضاع جاہل کا گھڑا ہوا ہے۔ مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ مجتہد لکھنؤ بھی ایک استفسار کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

"قصۂ مذکورہ غلط محض اور دروغ بے فروغ ہے اور از روئے تتبع کتب معتبرہ تاریخ و سیر پر ظاہر ہے کہ حلب عہد خلافت ثانیہ میں فتح ہوا۔ اور وہ ملک شام میں واقع ہے شام کی حکومت عہد خلافتِ ثانیہ سے امیر معاویہ بن ابی سفیان کو حاصل رہی ہے۔ حلب بھی دوسرے بلادِ شام کی طرح اسی کے تصرف میں تھا۔ اور اس کی طرف سے حسبِ دستور وہاں بعض حکام و عمّال رہا کرتے تھے یہی کیفیت حلب کی آخر زندگی امیر معاویہ تک رہی تا اینکہ یزید برسر حکومت ہوا۔ پس وہ بادشاہِ حلب کون تھا جس کی دختر کے ساتھ عقد حضرت علی اکبر کا قرار پائے بالجملہ یہ قصہ افترا محض ہے۔ ہدایاتِ ناصریہ صفحہ

حضرت زینب کا بھائی کو گھوڑے پر سوار کرنا

(۱) حضرت سید الشہدا کی رخصت آخری کے وقت حضرت زینبؑ کا بھائی کو گھوڑے پر سوار کرانا اس واقعہ کو بھی نظماً و نثراً نہایت کثرت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اس وقت کی مجبوری و بیکسی پر خیال کرتے ہوئے یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے اور اپنے دردناک اور جگر خراش منظر کے لحاظ سے نہایت مؤثر اور گریہ آور ہے لیکن اول تو اس واقعہ کے اسباب کے لئے کوئی تاریخی شہادت نہیں دوسرے ہم اس کو درایتاً یوں تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت سید الشہدا جیسے غیور کی حمیت کبھی اس کی اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ آپ کی خواہر گرامی کسی ایسے موقعہ پر جہاں نامحرموں کی نظر پڑے خیمے سے باہر تشریف لے آئیں۔ اس میں

شک نہیں کہ خیمے ہلال نما حلقہ میں ایک دوسرے سے پیوستہ نصب کئے گئے تھے مگر سپاہ مخالف کی صف بندی اس حلقہ کے عین سامنے ہی تھی اور سراپردۂ حرم کے باہر ذرا سی نقل و حرکت بھی ان سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی یہ یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ زنانے خیموں کے سامنے قناتیں ضرور تھیں ممکن ہے کہ آپ ایسے موقعہ پر سوار ہوئی ہوں جہاں قنات کی آڑ ہو لیکن اول تو بیان کرنے والے اس واقعہ کو اس صورت سے بیان نہیں کرتے دوسرے یہ ان لوگوں کے لئے جو گھوڑے کی سواری کے مشاق اور شہسوار ہیں سوار ہوتے وقت دوسرے کی امداد کی حاجت ہے تو ہم ایسی روایت کو جو حضرت زینب کی شان میں منقصت پیدا کرنے والی ہو باور ہی کیوں کریں اور کیوں نہ دوسرے موضوعات کی طرح اس کو بھی غلط سمجھیں۔

(۲) زعفر بن راحیل بادشاہِ جنات کا مع فوج حضرت کی مدد کو آنا

روز عاشورہ کے واقعات میں جب کہ حضرت کے تمام انصار و اقربا درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے تھے، زعفر جن کا حضرت کی کمک کو حاضر ہونا ذاکرین بڑے آب و تاب سے بیان کرتے ہیں لیکن یہ واقعہ متقدمین و متاخرین کی کسی مستند تاریخ میں نہیں پایا جاتا گو ملائے کاشفی نے اس واقعہ کو نور الائمہ سے بحوالہ علامہ جار اللہ زمخشری نقل کیا ہے۔ تاہم اس کی اصلیت بھی یقیناً اسی طرح بے بنیاد اور بے وجود ہے جس طرح قصۂ عروسی قاسم کی۔ منتخب طریحی وغیرہ میں جو یہ قصہ نقل کیا گیا ہے۔ غالباً ان کا ماخذ روضہ کاشفی ہی ہے۔ صاحب ناسخ التواریخ نے منتخب سے اس کو نقل کیا ہے۔ چونکہ متقدمین کی تمام کتابیں اس ذکر سے خالی ہیں اور متاخرین میں جن لوگوں نے لکھا ہے انہوں نے کوئی قابل اطمینان سند نہیں بیان کی اس لئے یہ واقعہ بے وجود اور غلط ہے اور اس کی صحت کا کوئی ثبوت نہیں

(۱۳) حضرت اور آپ کے رفقا کے ہاتھ سے مقتولین کی تعداد

فوج مخالف کی تعداد میں بعض علماء شیعہ نے حیرت انگیز مبالغہ کیا ہے بعض نے پانچ لاکھ بعض نے نو لاکھ مگر سب سے بڑھ چڑھ کر آقائے دربندی نے چھ لاکھ سوار اور دو کرور پیادے تحریر فرمائے ہیں اور مطلق اس کے لوازم پر خیال نہ کیا۔ آقائے موصوف جو ایسے مبالغوں میں سب سے آگے ہیں۔ اسرار الشہادت میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت کے ہاتھ سے تین لاکھ، حضرت عباس کے ہاتھ سے ۲۵ ہزار اور دوسروں کے ہاتھ سے ۲۵ ہزار اس طرح کل ساڑھے تین لاکھ کوفی قتل ہوئے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان فضول اور لغو مبالغوں سے آقائے موصوف نے کیا نتیجہ خیال کیا تھا۔ کیا حضرت کی شجاعت کا اظہار بغیر ان لغویات کے نہیں ہو سکتا اگر آپ نے ان حوصلہ شکن صدمات اور ناقابل برداشت بھوک پیاس میں سو دو سو آدمی بھی قتل کئے تب بھی آپ اشجع الناس قرار پاتے ہیں۔ دیکھو جس کارکرن نے حضرت اور انصار حضرت کی شجاعت کو تمام دنیا کے شجاعوں پر کس خوبی کس متانت اور کس حجتِ قاطع کے ساتھ فائق ہونا ثابت کیا ہے اور ایسی محکم اور استوار دلیل پیش کر دی ہے جس کے سامنے اس یاوہ سرائی اور تارِ عنکبوت کی ضرورت ہی نہیں۔ شجاعت ثابت قدمی اور قوتِ قلب کا نام ہے، نہ ایسی بیہودہ روایتوں کے اسناد کا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت نے متواتر کئی حملے کئے اور ہر حملہ میں دس دس ہزار لاشیں بچھا دیں۔ بھلا اس مبالغہ کا کچھ ٹھکانا ہے۔ اسی طرح علامہ ابو اسحٰق اسفرائنی نور العین میں مقتولین کوفہ کی تعداد تیس ہزار بیان کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی مبالغہ سے خالی نہیں کیونکہ کل سپاہ مخالف ۳۰ ہزار سے زائد نہیں تھی اس میں شک نہیں کہ کئی ہزار آدمی کھیت رہے مگر اُن کا شمار چار پانچ ہزار سے زیادہ نہ تھا۔ ابن

شہر آشوب اور محمد ابن ابی طالب اپنی تحقیق میں ان مقتولین کی تعداد جو صرف حضرت کے ہاتھ سے مارے گئے ایک ہزار نو بچاس لکھتے ہیں جو بالکل قرین قیاس ہے۔ اتنے آہن پوش لوگوں کا ایک ہی شخص کے ہاتھ سے درحالیکہ وہ بھوک اور پیاس سے جاں بلب ہو۔ تمام انصار و اقربا اس کی آنکھوں کے سامنے قتل ہو چکے ہوں انبوہِ مصائب اور روحانی و جسمانی صدمات نے اُس کے تمام قوائے کو مضمحل و بیکار کر دیا ہو، اس پر آلام و نوائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ آغشتہ خون و خاک ہو جانا ایسا حیرت انگیز کارنامہ ہے جو انسانی طاقت سے بالاتر ہے اور جنگی تاریخ میں ایک شاندار اور زرین واقعہ ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے اولین اور آخرین کے بہادرانہ افسانے قطعاً و حتماً معذور ہیں ع واللہ کہ اے حسینؑ کاری کردی۔

(۱۴) فاطمہ صغری کا آنا

(۱۴) ان ہی موضوع روایات میں فاطمہ صغرے بنت الحسین کے قاصد کا اس وقت کہ جب آپ بالکل تنہا رہ گئے تھے کربلا میں آنا بہت مشہور ہے جس کو محض بُکا و ابکا کے لئے وضع کیا گیا ہے اس مسئلہ پر ہمیں زیادہ بحث کرنے کی اس وجہ سے ضرورت نہیں کہ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ فاطمہ صغری حضرت کے ہمراہ کربلا میں موجود تھیں اور آپ نے اپنی کسی بیٹی کو مدینہ میں نہیں چھوڑا۔ اس کے علاوہ تاریخ و سیر کی تمام مستند کتابیں اس ذکر سے خاموش ہیں جب اس واقعہ کی کچھ اصلیت ہی نہیں تو قاصد صغری کا کربلا میں آنا محض بے اصل و بے بنیاد ہونے میں کیا شبہ باقی رہ سکتا ہے۔

(۱۵) حضرت جبریل کا میدان کربلا میں نزول

(۱۵) یہ امر مسلمہ ہے کہ حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے مرتبۂ عالی کا احصاء،

انسانی طاقت سے باہر ہے۔ زمانہ جناب ختمی مآب صلے اللہ علیہ وآلہ میں آپ کے دونوں نواسوں کی خدمتیں جو جبریل یا دوسرے ملائکہ نے کیں ان کے متعلق سعد دواقعات کتبِ فریقین میں موجود ہیں ملائکہ مقربین کا فرزندِ خاتم الانبیاء کی خدمت کو آنا یا مدد کو آنا کوئی تعجب خیز امر نہیں اور ہم کو اس میں چون وچرا نہ کرنا چاہیے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی جو روز عاشورہ کو روزِ عید قرار دیتے ہیں وہ بھی غنیۃ الطالبین (مطبوعہ مطبع اسلامیہ لاہور صفحہ ۵۸۵) میں لکھتے ہیں۔

اخبرنا ابونصر عن والدہ باسنادہ عن ابی اسامہ عن جعفر بن محمد قال ہبط علی قبر الحسین بن علی یوم اصیب سبعون الف ملک یبکون علیہ الی یوم القیامۃ +

ہم کو ابونصر نے اپنے باپ اور انہوں نے ابی اسامہ اور انہوں نے جعفر بن محمد کے استاد سے خبر دی ہے کہ روزِ قبر حسین بن علی پر ستر ہزار فرشتے نازل ہوتے اور وہ ان پر قیامت تک روتے رہیں گے۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ حضرتِ جبریل کے اسوقت نزول کی کوئی سند بھی ہے یا نہیں یہ سند ہم کو عام راویوں سے نہیں پہونچ سکتی۔ اگر ممکن ہے تو صرف آئمۂ اہلبیت سے۔ مگر ہم علمائے امامیہ کی تمام مستند کتابوں میں سے کسی ایک میں بھی اس واقعہ کو نہیں پاتے۔ متقدمین ومتاخرین میں سے کسی نے اس کا ذکر کیا اشارہ تک نہیں کیا۔ اگر ہے بھی تو صرف معمولی کتابوں میں یا مرثیوں میں ہے جو تاریخی نقطۂ خیال سے قابلِ تسلیم نہیں

(۱۶) عبداللہ بن حسن کی شہادت اور ان کی عمر

(۱۶) مورخوں نے عموماً اس واقعہ کو لکھا ہے کہ جب حضرت گھوڑے سے گرے اس وقت ایک خوبصورت لڑکا آپکی طرف دوڑا۔ ہر چند بیبیوں نے

روکنا چاہا۔ مگر نہ رکا۔ ابجر بن کعب تمیمی حضرت پر تلوار کا وار کرنا چاہتا تھا کہ وہ بچہ چلایا۔ او جہنم نصیب اکیا میرے چچا کو قتل کریگا اور اپنے دونوں ہاتھ حسینؑ پر پھیلا دئے تلوار چلی۔ اور دونوں چھوٹی چھوٹی کلائیاں کٹ کر گر پڑیں۔ ابھی چچا نے اچھی طرح گود میں نہ لیا تھا کہ حرملہ بن کاہل کا تیر لگا۔ اور بچہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ اس بچہ کا نام عبداللہ الاصغر بن حسن بیان کیا گیا ہے چنانچہ صاحب ناسخ التواریخ لکھتے ہیں۔

"ایں وقت عبداللہ بن حسن علیہ السلام کہ درمیان زنان میزیست و ہنوز از علم خبری نداشت ومراہق نبود۔ چوں عم خویش را دریں حال نگریست تاب وتواں ازوے برفت وآہنگ ملازمتِ خدمت کرد واز خیمہ بیروں دوید"

ممکن ہے کہ ایسا ہوا ہو لیکن تعجب خیز یہ امر ہے کہ بعض ذاکر اس لڑکے کی عمر تین سال کی بیان کرتے اور اس کا خیال نہیں کرتے کہ حضرت امام حسنؑ کی شہادت کو جو ۲۸ صفر ۵۰ھ کو واقع ہوئی روز عاشورہ ۱۰ محرم ۶۱ھ تک دس سال دس ماہ دس یوم کا زمانہ گذر چکا تھا۔ پھر حضرت امام حسنؑ کے کسی بیٹے کی عمر تین سال بیان کرنا کسقدر ناواقفیت اور جہالت پر مبنی ہے اور کس حد تک گستاخی اور بے ادبی ہے۔ اگر ہم اس واقعہ کو صحیح مان لیں کہ حضرت امام حسن کا کوئی لڑکا اس طرح شہید ہوا تو اس کی عمر کسی طرح دس سال سے کم نہیں ہو سکتی۔

(۱۷) حضرت زینبؑ کا سر برہنہ مجمع عام میں نکل آنا

(۱۷) یہ امر یقینی ہے کہ حضرت کی شہادت خیمہ گاہ کے عین سامنے اور بہت ہی قریب واقع ہوئی تھی ممکن ہے کہ مخدراتِ حرم اس ہوش ربا اور مصیبت انگیز خونی منظر کو قنات سے دیکھ رہی ہوں۔ عورتیں فطرتاً دل کی کمزور اور جذبات رنج

الم سے بہت جلد متاثر ہونے والی ہوتی ہیں یہ ہولناک اور قیامت خیز نظارہ ایسا نہ تھا کہ ان کے ستم رسیدہ قلوب کو بیچین و بے قرار نہ کر دیتا۔ جناب زینب جو حضرت سید الشہدا کے بعد باعتبار عمر سب سے بزرگ اور اپنے بھائی سے بے حد محبت رکھنے والی تھیں ان کے صدمہ اور انتشار کا اندازہ کرنا زبان اور قلم کی طاقت سے باہر ہے یہ جو کچھ قلق و اضطراب تھا۔ انسانی فطرت کا تقاضا تھا۔ حضرت جس وقت خیمہ گاہ کے سامنے گھوڑے سے گرے اور دشمنوں نے بارادۂ قتل نرغہ کیا اُس وقت سپہ سالار فوج عمر سعد بھی موجود تھا۔ اور افسرانِ سپاہ کو حضرت کے قتل کی ترغیب دے رہا تھا خیام حرم اس قدر قریب تھے کہ وہاں کی آواز اس مجمع تک آ سکتی تھی ممکن ہے جناب زینب بے قرار ہو کر قنات کے پاس باہر تک آ گئی ہوں جہاں آپ نے آواز دی۔ واخاہ واسیداہ واھل بیتاہ الیت السماء طبقت علی الارض، ولیت الجبال تدکدکت علی السہل کاش آسمان زمین پر پھٹ پڑتے، کاش پہاڑ پاش پاش ہو جاتے اور عمر سعد کو جو قریشی اور رشتہ دار بھی تھا ملامت کی یا عمر بن سعد یقتل ابو عبد اللہ و انت تنظر الیہ" "عمر سعد! ابو عبد اللہ قتل کئے جا رہے ہیں اور تو کھڑا تماشا دیکھ رہا ہے۔

یہاں تک تو ہم کو اس واقعہ کے قبول کرنے میں تامل نہیں لیکن یہ بیان کہ آپ بے تابانہ یا سر و پا برہنہ مجمع عام میں آ گئیں یا حضرت کی عین شہادت کے وقت شمر کے پاس آ کر اس کی منت و سماجت کی ہرگز مان لینے کے قابل نہیں۔ بے شک عورت کا دل نازک ہوتا ہے خصوصاً جس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو جس کے عزیز بھائی کا حادثۂ قتل اعلیٰ درجہ کی سفاکی اور بے رحمی کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے واقع ہوا ہو اُس پر جو اضطراری کیفیت لاحق ہو وہ تھوڑی ہے مگر ہم کو دخترِ خاتونِ محشر کی حالت دنیا کی دوسری معمولی عورتوں کی حالت پر قیاس نہ کرنی چاہیئے۔ اس ثانی سیدۃ

النساء خاتون معظمہ کے وقار و تحمل اور قوتِ برداشتِ مصائب کو دنیا کی دوسری عورتوں سے کوئی نسبت نہیں انہوں نے تمام جانکاہ مصائب کو جو مشیتِ ایزدی سے اُن پر نازل ہوئے ایسے صبر و تحمل تسلیم و رضا سے برداشت کیا کہ عالم میں ہمیشہ یادگار رہے گا ان کے نفس مطمئنہ اور ان کی قوتِ ارادی کو اضطرار و انتشار کے جذبات مغلوب کر ہی نہیں سکتے تھے بلکہ فولاد اس کی سختی اور پہاڑ اس کے وزن کو نہیں پہنچ سکتا جس بھائی نے اس انبوہِ مصائب کا جو تاریخِ عالم میں عدیم المثال ہیں نہایت خوشی اور حیرت انگیز ثابت قدمی سے مقابلہ کیا اسی کی وہ بہن تھیں اگر مردوں میں محمدی وقار اور استقلال کا نمونہ ہونے کی حیثیت سے حسینؑ کا ثانی روئے زمین پر نہ تھا تو زینب بھی عورتوں میں اُن ہی اوصاف کا نمونہ ہونے سے دنیا میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھیں۔ اگر رسول خداؐ کا آغوش مبارک حسنؑ حسینؑ کا گہوارہ تربیت رہ چکا تھا تو اسی آغوش مقدس میں زینبؑ و ام کلثومؑ نے پرورش پائی تھی۔ سیدۂ عالم جیسی ماں کے دودھ سے اگر حسنؑ و حسینؑ کے گوشت و پوست کا نشو و نما ہوا تھا تو وہی شرف زینب و ام کلثوم کو حاصل تھا۔ ان میں رسولؐ اللہ کا وقار فاطمہؑ کا صبر علیؑ کی غیرت حسنؑ کی بردباری اور حسینؑ کا استقلال سب موجود تھے جس ماں کی غیرت اور حیا نے اپنا جنازہ دن کو اٹھایا جانا گوارا نہ کیا اسی کے قدم بقدم چلنے والی زینب و ام کلثوم تھیں ان مخدراتِ عظمےٰ نے ان جادۂ استقلال سے ڈگمگا دینے والی مصیبتوں کا ایسے وقار متانت ثابت قدمی اور تسلیم و رضا سے مقابلہ کیا جن میں سے بعض کو حسینؑ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے حسینؑ اُن کو وصیت کر چکے تھے کہ دیکھو تمہاری بے صبری منزلت کو نقصان نہ پہونچائے اور دشمنوں کو شماتت اور خوشی کا موقعہ نہ ملے حسینؑ اگر وصیت نہ بھی کرتے۔ تاہم زینب و امّ کلثوم یا دوسری مخدراتِ عصمت سے کوئی ایسی بات سرزد ہونا جو ان کے مرتبہ ان کی شان اور ان کے خاندانی وقار کے خلاف ہو۔ ہمارے خیال میں قطعی محال اور ناممکن ہے اور

کوئی ایسی حرکت جو صبر و رضا کے منافی ہو قولاً یا فعلاً تو درکنار اشارتاً کنایتہً بھی ان سے وقوع میں نہیں آسکتی تھی۔

جس طرح مردوں میں سب کے قوائے جسمانی و دماغی یکساں نہیں اسی طرح عورتوں میں بھی سب عورتیں یکساں نہیں ہوتیں بعض عورتوں کی قوتِ قلب قوتِ ارادہ قوتِ استقلال ایسی حیرت انگیز دیکھنے میں آتی ہے کہ بڑے بڑے اولوالعزم مرد متحیر و مبہوت رہ جاتے ہیں تو ہم کیسے مان لیں کہ وہ عالی مرتبت مخدرات جو نساء اولین و آخرین کی فخر ہوں جن کی قوتِ ارادی قوت صبر و تحمل اور جذباتِ وقار و حیا کی مثال طبقۂ نسواں تو درکنار، مردوں میں بھی ملنی دشوار ہو۔ وہ بے تابی اور بے صبری سے ایسی متاثر ہو جائیں کہ ان کو اپنے ذاتی وقار اور خاندانی عظمت کا بھی خیال نہ رہے مرزا دبیر حضرت کی شہادت کے وقت جناب زینب کے آنے کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

نامحرموں کا ہوش نہ پردہ کا ہوش ہے ٭ یہ سب لہو کا جوش ہے الفت کا جوش ہے

مگر نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ اور نہ ہو سکتا تھا کہ سیدۃ النساء العالمین کی بیٹی اور دنیا میں پردہ قائم کرنے والے کی نواسی اپنے اختیار سے نامحرموں کے مجمع میں آجاتیں۔ ایسا خیال اور ایسا بیان دنیائے اسلام کی اُن خوزادیوں کی سراسر توہین ہے۔ اور جو لوگ خاندانِ رسالت کے ان ممتاز اور ان عالی جاہ خواتینِ معظمات کے حرکات و سکنات خیالات و جذبات کو اپنے گھروں کی عورتوں کی طرح خیال کرتے ہیں وہ یقیناً سخت اور خطرناک غلط فہمی کے ارتکاب کے مجرم ہیں۔

(۱۸) حضرت شہر بانو کا ری کی طرف چلا جانا

ان ہی غلط موضوع اور بے بنیاد روایات میں یہ قصہ بھی نہایت مشہور

ہے کہ حضرت کی شہادت کے بعد جب آپ کا گھوڑا در خیمہ پر آیا تو جناب شہر بانو سوار ہو کر رَے کی طرف چلی گئیں راستہ میں ان کا بھائی شہریار جو کمک کے واسطے لشکر لئے ہوئے آرہا تھا بہن سے ملا۔ اور اس وجہ سے کہ واقعات شہادت ہو چکے تھے۔ بہن کو اپنے ساتھ لے کر واپس چلا گیا فاضل دربندی نے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اکسیر العبادات میں شہریار کا آنا تو نہیں لکھا مگر یہ ضرور بیان کیا ہے کہ جناب شہر بانو فاطمہ یا سکینہ یا زبیدہ زوجۂ قاسم بن حسنؑ کو اپنے ساتھ لے کر گھوڑے پر سوار۔ رَے کی طرف چلی گئیں اور وہاں کوہ شمران کے ایک غار میں پوشیدہ ہو گئیں لیکن یہ روایت سراسر لغو اور کذبِ محض ہے اور اس میں حسب ذیل امور تنقیح طلب ہیں۔

(ا) کیا شہر بانو اس وقت تک زندہ اور واقعہ کربلا میں موجود تھیں۔

(ب) کیا یہ ممکن تھا کہ شہر بانو تمام اہل بیت اور اپنی اولاد کو اس مصیبت میں چھوڑ کر محض اپنے تحفظ کے لئے اس طرح علیحدگی اختیار کر لیں۔

(ج) کیا ان کا کوئی بھائی مسمّی شہریار موجود تھا۔ اگر تھا تو کیا شہریار کو کسی ملک کی سلطنت حاصل تھی اگر تھی تو ملک کی۔

(د) کیا جناب سید الشہداء نے ان کو رَے کی طرف جانے کی اجازت دیدی تھی۔

(ھ) اگر یہ شہر بانو والدہ سید الساجدین نہ تھیں تو کیا کوئی دوسری بھی شہزادی تھیں اگر تھیں تو حضرت نے ان سے عقد کب کیا تھا امر اول کی نسبت عموماً محققین کا اتفاق ہے کہ شہر بانو واقعہ کربلا کے وقت زندہ ہی نہ تھیں بلکہ اس واقعہ سے ۲۲ سال پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا چنانچہ ملا محمد حسن قزوینی ریاض الشہادۃ میں لکھتے ہیں

"از احادیث ظاہر می شود کہ شہر بانو مادر امام زین العابدین در صحرائے کربلا حاضر نبود بلکہ آنچہ مستفاد می شود از اخبار اینست کہ در وقت وضع حمل از دنیا رفت و آں مصائب و وقائع را ندید"

ملائے مجلسی جلاء العیون میں ابن بابویہ سے بہ سند حضرت امام رضا علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت امام زین العابدین علیہ السلام از دیلم رسید وچوں آنحضرت ازو متولد شد او برحمت الٰہی واصل باشد۔"

محمد بن سلیمان تنکابینی اکلیل المصائب میں ارقام فرماتے ہیں:-

"وقول دیگر در شہربانو کہ در کربلا ہمراہ بود واسیر شد۔ ایں نیز ضعیف است ومحل اعتنا نیست واضح ایں کہ شہربانویہ وخواہرش کہ زوجۂ امام حسن بود۔ حاملہ شدند وہر دو متولد شدند وہر دو در ایام نفاس وفات یافتند وآں کودکے کہ از شہربانویہ متولد شد۔ حضرت سید سجاد بود۔ کہ او را بعضے از کنیزکان سید الشہدا کہ ام ولد بودند کفیل شدند وشیر دادند پس در کربلا ہمراہ نبود وبر وفق ہمیں قول کہ اختیار کردیم صدوق علیہ الرحمہ کہ المحدثین است حدیثے در کتاب عیون اخبار الرضا در مجلد ثانی ذکر فرمودہ واز ارباب مقاتل معتبرہ مانند صدوق در امالی ابن نما در مثیر الاحزان شیخ مفید در ارشاد سید رضی الدین ابن طاؤس در لہوف ومجلسی در بحار واخوند ملا حسن یزدی در مہیج الاحزان وابو مخنف وغیر آنہا از مقاتل معتبر ذکر نہ کردہ اند کہ شہربانویہ در کربلا۔ در میان اسیران بود۔"

میرزا محمد حسن خان اعتماد السلطنت خیرات حسان میں لکھتے ہیں۔

"بارے حضرت شہربانو چنانکہ در اخبار معتبرہ رسیدہ است بحال نفاس در گذشت"

اور پرنس فرہاد مرزا قمقام ذخار میں تحریر کرتے ہیں۔

"آنچہ از کتب معتبرہ وروایات محدثین شیعہ بہ نظر رسیدہ شہربانو در نفاس وفات یافت وکفالت وحضانت امام سجاد را یکے از امہات اولاد حضرت

سید الشہدا علیہ السلام ہمی نمود"

اور اس کی سند میں حدیث عیون اخبار الرضا ارقام کی ہے۔

سپہر کاشانی ناسخ التواریخ میں لکھتے ہیں:-

"چہ شہربانو در ہنگام ولادت علی ابن الحسین وداع جہاں گفت ودر سفر کربلا۔ ملازمت خدمت سید الشہدا را نداشت۔"

مولانا سید حبیب حیدر صاحب کا ارشاد ہے۔

"جن روایتوں سے جناب شہربانو کا واقعہ کربلا میں تشریف رکھنا معلوم ہوتا ہے وہ زیادہ اعتماد کے لائق نہیں ہیں اور مجہول الاسانید ہیں اور ان معظمہ کا حضرت امام زین العابدینؑ کی ولادت کے ساتھ وفات پانا اقوی اور اظہر ہے۔"

مولانا سید ناصر حسین صاحب ایک استفتی کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔

"کتاب العیون اخبار الرضا سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت شہربانو والدہ ماجدہ امام زین العابدین نے قریب ولادت سید سجاد انتقال فرمایا"

خود فاضل دربندی جنہوں نے شہربانو کے رے کی طرف جانے کا طومار باندھا ہے۔ اکسیر العبادات میں لکھتے ہیں۔

فلا بد ان یکون ھذہ المرأۃ غیر شاہ زنان التی ھی بنت الملک یزدجرد ام امام سید الساجدین فان ام الامام قد ماتت فی النفاس فی ولادۃ الامام +

ضرور ہے کہ یہ معظمہ حضرت شاہ زنان دختر بادشاہ یزدجرد والدۂ امام سید الساجدین کے علاوہ ہیں کیونکہ امام سجاد کی والدہ حضرت کی ولادت کے وقت وفات پاچکی تھیں۔

اسی طرح اور بہت سے علما اور مورخین کے اقوال ہیں جن کو بخیال طوالت چھوڑا جاتا ہے۔

امر دوم:- اگر اس روایت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے شہربانو کی نسبت کئی شبہات وارد ہوتے ہیں۔

(ا) انہوں نے ایسی قیامت خیز مصیبت کے وقت رسول اللہ کی نواسیوں اور خاتونِ محشر کی بیٹیوں اور بہوؤں کا ساتھ چھوڑ کر ایک بڑی اخلاقی کمزوری کا اظہار کیا۔

(ب) انہوں نے اپنی عزت کو دختران سیدۃ النساء العالمین کی عزت پر مقدم سمجھا۔

(ج) خاص اپنی ہی اولاد کے لئے کیونکہ ایسی دردناک مصیبت میں چھوڑ کر مادری شفقت اور فطری ہمدردی کو خیر باد کہہ دیا۔

آپ کی ذات گرامی سے کبھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ اپنے تحفظ کی خاطر ایسے فعل کو جو ہمدردی اور وفاداری اور مروت سے خلاف ہے۔ گوارا فرمایا ہو۔

امر سوم:- ہمارے پاس کوئی ایسی تاریخی شہادت نہیں ہے کہ یزدجرد پدر جناب شہربانو کا کوئی بیٹا بنام شہریار موجود تھا۔ بالفرض اگر ہو بھی تو یزدجرد کے کسی بیٹے کا مسلمان ہونا یا کسی حصۂ ملک کی سلطنت حاصل کرنا کسی مورخ نے نہیں لکھا۔ متقدمین اور متاخرین کی تمام معتبر و مستند کتابیں دیکھنے سے کہیں اشارتاً و کنایتاً بھی اس کا ذکر نہیں پایا جاتا کہ زوالِ سلطنت کے بعد شہریار پسر یزدجرد یا کسی دوسرے کسرائی شہزادے کو آج تک پھر سلطنت خواہ کسی چھوٹے سے ملک کی ہی حاصل ہوئی ہو۔

جب شہریار اور اس کی سلطنت یا ریاست کا وجود ہی نہیں تو اس کا لشکر لے کر حضرت کی کمک کو آنا کس قدر لغو اور بے سر و پا ہے۔

مولوی ناصر حسین صاحب بھی ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:- شہریار کا قصہ قطعاً کتب معتبرہ میں نہیں اور اس کا قصہ جس طرح روضہ خوان پڑھتے ہیں وہ بالکل غلط اور سراسر خلاف واقعات مسلمہ مورخین فریقین ہے۔ ایک یہ امر بھی قابل غور و لحاظ ہے کہ نبی یا امام کے مامور من اللہ ہونے کے وقت اس کے والدین

بقید حیات نہوں ورنہ ان پر بھی بیٹے کی اطاعت فرض ہو جائے گی۔ اس کلیہ یا عقیدہ کے موافق جس پر علماء امامیہ کا اتفاق ہے جناب سید الشہداء کی رحلت کے وقت جناب شہربانو کا زندہ ہونا تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ سید الساجدین اسی وقت امام مفترض الطاعت منجانب اللہ ہو گئے تھے۔

امر چہارم کی نسبت صاف ظاہر ہے کہ علماء و مورخین کی تمام مستند کتابیں اس سے خالی ہیں کہ حضرت نے شہربانو سے ایسا فرمایا ہو کہ تم گھوڑی پر سوار ہو کر چلی جانا گھوڑا تم کو وہاں پہنچا دیگا جہاں خدا کا حکم ہوگا۔ فاضل دربندی کا اکسیر العبادات میں یہ لکھنا کہ:-

وفی بعض کتب التواریخ المعتبرۃ ان شہربانویہ التی کانت فی کربلا ھی ام زوجۃ القاسم وقد اوصیٰ بہا سید الشہداء اروحی لہ الفدا بان ترکب جوادہ بعد الشہادۃ فھو یوصلہا الی الارض المقدرۃ لہا۔

بعض کتب تواریخ معتبرہ میں بیان ہوا ہے کہ شہربانو جو کربلا میں موجود تھیں وہ زوجۂ قاسم کی والدہ تھیں اور جناب سید الشہداء نے ان کو وصیت کی تھی کہ میری شہادت کے بعد گھوڑے پر سوار ہو جانا وہ تم کو اس زمین پر پہنچا دے گا جہاں کے لئے حکم خدا ہوگا۔

ہرگز قابل اعتنا نہیں فاضل موصوف نے فی کتاب التواریخ معتبرۃ تو لکھ دیا لیکن کسی کتاب یا سند کا حوالہ تحریر کرنے کی تکلیف گوارا نہ کی جب ان کے خیال میں روضۃ الشہداء اور بحر الانساب جیسی کتابیں تاریخ کی کتب معتبر میں شمار کرنے کے قابل ہیں تو وہ واقعات صحیح اور غیر صحیح میں کیا امتیاز کر سکتے ہیں۔ یہ واقعہ انہوں نے بحر الانساب سے نقل کیا ہے اور یہ کتاب مہملات و لغویات سے جیسی بھری ہوئی ہے محتاج تشریح نہیں۔ پھر ایسی حالت میں اس قصہ کے مہمل اور لغو ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

اِس کے علاوہ شہر بانو کے ساتھ اِس حکم کی کوئی خصوصیت بھی نہیں پائی جاتی حضرت نے اپنے دوسری ازواج لیلےٰ، رباب اور ام اسحٰق کو ایسا حکم کیوں نہیں دیا بالخصوص رباب کو جن سے آپ سب سے زیادہ مانوس تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شہر بانو نے اپنی دوسری اسیری کی ذلت کا خوف ظاہر کیا تھا مگر جب حضرت کو معلوم تھا کہ میرے بعد سب اہل بیت کا یہی حال ہونے والا ہے اور خود آپ کی بہنیں جو دین و دنیا کی شہزادیاں اور آپ کی ازواج سے عظمت و منزلت میں زیادہ ہیں اسی بلا میں گرفتار ہونے والی ہیں تو فقط شہر بانو کی اسیری کا ایسا خیال و پاس کوئی وجہ نہیں رکھتا تھا اس کے علاوہ حضرت ان کو گھوڑے پر سوار ہونے کی کیونکر اجازت دیتے، درحالیکہ شرع محمدی میں عورتوں کو گھوڑے کی سواری سے منع کیا گیا ہے۔

امر پنجم:۔ آقائے دربندی نے اپنی عادت کے موافق یہ بھی اک قیاسی تجویز کی ہے کہ زبیدہ کی والدہ اور سید سجّاد کی مادرِ گرامی قدر دونوں حقیقی بہنیں تھیں اور حضرت سید الشہدا نے بعد وفاتِ والدۂ سید سجّاد ان کی خواہر سے عقد کر لیا تھا اور یہی معظمہ حسبِ وصیتِ سید الشہداء گھوڑے پر سوار ہو کر گئیں تھیں۔ چنانچہ آپ کتاب جواہر الانقال میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"مخفی نماند کہ ایں مخدرۂ مظلومہ و سیدۂ طاہرہ طیّبہ یعنے شہر بانو دختر بادشاہ یزدجرد زوجہ سید الشہدا روحی لہ الفدا و مادرِ زبیدہ عروسِ قاسم غیر شاہ زناں دختر یزدجرد مادرِ سید الساجدین است زیرا کہ مادرِ آں خلیفۃ اللہ در ایام نفاس برحمتِ خدا پیوست و ایں شہر بانو بہ خالہ آنحضرت خلیفۃ اللہ بودہ است و ایں را جناب سیّد الشہداء در حبالۂ عقد درآورد۔ درحالیکہ بیوہ بود"

گویا فاضل دربندی اس کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ والدہ سید الساجدین آپ کی ولادت کے

وقت رحلت فرما چکی تھیں اور ان کا نام شاہزنان تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ شہر بانو جو کربلا سے رَے کی طرف گئیں وہ شاہزنان کی بہن اور حضرت سید الساجد کی خالہ تھیں اور ان کا نام شہر بانو تھا مگر یہ بھی فاضل مذکور کا ایک ذاتی اجتہاد اور قیاسی فیصلہ ہے، جو انہوں نے بحر الانساب کی نقل پر کر دیا ہے حالانکہ متقدمین اور متاخرین کی کتابیں اس ذکر سے خالی ہیں اگرچہ بعض روایات میں یزدجرد کی دو بیٹیوں اور بعض میں تین بیٹیوں کا واردِ مدینہ ہونا بیان کیا گیا ہے لیکن ایک سے زیادہ کا داخلِ زوجیتِ سید الشہداء ہونا کسی روایت میں نہیں پایا جاتا۔ تو محض قیاسی اور احتمالی بیان اثباتِ واقعہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتا اور یہ لغو اور بیہودہ خیال ہرگز قابل تسلیم نہیں۔ بلکہ جمہور کے خلاف ناموں کا الٹ پھیر بھی۔ فاضلِ موصوف کی جدت طرازی یا صاحب بحر الانساب کی قوتِ اختراعی کا نتیجہ ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر وہ روایت ہے جس کو علامہ ابن شہر آشوب نے تحریر کیا ہے آپ کتاب مناقب میں تحریر فرماتے ہیں:۔ وَجاءَ بالحرم اساری الا شہر بانویہ فانہا التفت نفسہا فی الفرات جس سے پایا جاتا ہے کہ جناب شہر بانو دریائے فرات میں ڈوب کر مر گئیں۔ ہم حیران ہیں کہ ابنِ شہر آشوب جیسے بزرگوار نے ایسی روایت کو اپنی کتاب میں کس طرح جگہ دی اور کیا ایسا ممکن تھا کہ زوجہ امام اور مادرِ امام خودکشی کے فعل کی جو شرعاً حرام ہے مرتکب ہوتیں۔ تعذیر خودکشی کی تصریح قانون الٰہی (قرآن) میں ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے۔

لاتقتلوا انفسکم اِنَّ اللّٰہ کَانَ بکم رحِیمًا وَمَنْ یَّفعَلْ ذٰلِکَ عدواناً وظلماً فسوف نصلیہ الخ	اپنے نفسوں کو خود قتل نہ کرو (یعنی خودکشی نہ کرو) کیونکہ خدا ضرور تمہارے حال پر مہربان ہے اور جو شخص ایسا جور

وظلم (خودکشی) کریگا۔ یاد رہے کہ ہم بہت جلد اس کو آگ میں جھونک دیں گے اور یہ بات اللہ کے لئے آسان ہے پارہ ۵ سورۂ النساء آیہ ۲۹۔

وہ گھر جو مہبط قرآن سرچشمۂ علم اور منبع ہدایت تھا اور اس کا ہر فرد۔ مرد و عورت بوڑھا بچہ احکامِ قرآنی سے باخبر اور یکساں عامل تھا ایسے گھر کی ایک ممتاز خاتون کو جو امام کی بہو۔ امام کی بھاوج، امام کی بی بی اور امام کی ماں تھی اس تہدید الٰہی کی خبر نہ تھی کہ خودکشی کرنے والے کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

اس کے علاوہ یہ روایت سوائے ابنِ شہر آشوب کے کسی نے نہیں لکھی صاحب مقام الذخار اس روایت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "منافی با جمیع روایات فریقین است"۔

(۱۹) تاراجیٔ خیام۔ تاراجیٔ لباس، پامالی نعش

(۱۹) خیام اہل بیت کا معہ چادر ہائے مخدراتِ عصمت تاراج کیا جانا۔ حضرت کے جسدِ مطہر سے لباس کا اُتارنا اور آپ کی نعشِ مقدس کا پامالِ سُم اسپاں ہونا ایسے مشہور واقعات ہیں کہ ان سے انکار کرنا مشکل ہے اور عموماً متقدمین اور متاخرین کی کتابیں ان اذکار سے بھری ہوئی ہیں۔ مخالفوں کی شقاوت اور قساوت اور بے غیرتی و بے حمیتی کو دیکھتے ہوئے اس قسم کی کمینہ اور شرمناک حرکات کچھ تعجب خیز نہیں، درحقیقت ان دشمنانِ شرافت و انسانیت نے جن کو شریف سمجھنا۔ شرافت کی توہین ہے اور انسان کہنا انبیاءِ نوع کی تحقیر ہے اپنی وحشیانہ سفاہت اور ابلیسانہ شرارت میں کوئی کمی نہیں کی ان کے دل پتھر سے زیادہ سخت اور ان کے بہیمانہ جذبات درندوں سے زیادہ خطرناک تھے انہوں نے ایک حاکم کی خوشامد میں اپنی ملکی خصوصیت اور قومی حمیت کو خیرباد

کہہ کر ان ہولناک مظالم کا ارتکاب کیا جن کی مثال پیش کرنے سے تمام قوم کی تاریخیں معذور ہیں۔ دنیا کے تمام ظالموں اور سفاکوں کی بے رحمیاں ان کے سامنے گرد ہیں ایسے شیطان سیرت اور ناپاک سرشت انسانوں سے اس طرح کی قابل نفرت حرکات کچھ بھی بعید نہیں نہ ان پر حیرت و استعجاب کی کوئی وجہ معلوم ہوتی ہے۔

اگرچہ یہ واقعات جن کی روایتیں حدِ تواتر تک پہونچی ہوئی ہیں درایتاً کسی تنقید کی گنجائش نہیں رکھتے لیکن شاید ہمارا یہ قیاس بے معنے نہ ہو کہ ایک ایسی سرکار کی لوٹ جہاں امیرانہ جاہ وجلال تو درکنار، فقیرانہ ساز و سامان کی بھی یقیناً کمی تھی۔ اور جو ضروریاتِ زندگی سے زیادہ ہونے کے علاوہ بالکل ہی سادہ اور محض معمولی تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے جمِ غفیر کو کیا لالچ دلا سکتی تھی اگر عوام کو چھوڑ کر خواص کی طرف خیال کیا جائے تو افسرانِ فوج خود رؤسائے قوم اور سردارانِ قبائل تھے۔ ان کو اس تاراجی سے کیا نفع حاصل ہو سکتا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت کے ساتھ وہ خزانہ یا اس کا معتدبہ حصہ معہ تحائف و نفائس موجود تھا جو آپ نے مکہ سے چل کر منزل تنعیم پر یمن سے آتا ہوا لے لیا تھا۔ اور جس کو ابن خلدون اور ابن طاؤس بحیر بن ریان عاملِ یمن کا یزید کی طرف بھیجا ہوا قیمتی زیور پارچہ جات اور سامان لکھتے ہیں چنانچہ آپ نے محمد بن بشیر حضرمی کو ان کے بیٹے کی گرفتاری کے فدیہ میں ہزار روپے کے کپڑے دئے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال ہو سکتا ہے کہ آپ کے ساتھ جس قدر جماعت تھی وہ بھی کئی سو سے کم نہ تھے اگر آپ بالکل خالی تھے۔ تو ان کے مصارف کیونکر پورے ہو سکتے تھے۔ ہم اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔ مگر گفتگو صرف اس میں ہے کہ ایک مذہبی پیشوا اور روحانی سردار جو محض ہدایتِ امت کا بیڑہ اٹھا کر گھر سے نکلا ہے جس کا نصب العین سلطنت و حکومت نہیں اُس کے گھر کو۔ درہم و دینار کے توڑوں۔ گراں بہا کپڑوں اور طلائی و نقرئی زیور و سے

کیا علاقہ۔ اور الفقر فخری فرمانے والے کے فرزند کو اس ساز و سامان سے کیا تعلق جس کا تمغائے امتیاز فقر و فاقہ اور ترک دنیا ہو۔ اسے دنیاوی شان سے کیا سروکار۔ مین کا آیا ہوا سامان خواہ وہ نقد روپیہ ہو یا اس کے ساتھ قیمتی تحائف آپ نے اسی وقت تقسیم کر دیا تھا اس میں سے کس قدر آپ کے تصرف میں رہا اس کے متعلق ہمارے پاس کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے۔ تاراجیِ خیام کے وقت جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان میں بعض روایتیں ایسی ہیں جن سے مخدرات عصمت کے پاس سونے چاندی کا زیور ہونا پایا جاتا ہے۔ بے شک عورتوں کو ایسے زیور رکھنے کی اسلام نے اجازت دی ہے مگر جب بانئ اسلام کی بیٹی نے اس قسم کے تکلفات کبھی نہیں کئے جس کی چادریں کپڑے کے بدلے لیفِ خرما کے پیوند ہوتے تھے۔ تو کیونکر قیاس میں آسکتا ہے کہ اُسے معظمہ کی بیٹیاں اور بہوئیں دنیوی آرائش کو پسند فرماتی ہوں جب دشمن جانتے تھے کہ حسینؑ کے پاس مالِ دنیا اور اسبابِ دنیا سے کوئی ایسی شے نہیں جو تاراج کے قابل ہو تو ان کا ایسا ارادہ ایک بے سود امر تھا اور ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس فقیرانہ سامان اور ان فقیرانہ کپڑوں کی لوٹ اور مخدرات عصمت کو بے پردہ کرنے سے ان کو کیا مالی فائدہ پہونچ تھا۔ کیا عجب ہے کہ یہ لوٹ صرف مردانے خیموں تک محدود رہی ہو۔ اسی لئے ہم ملائے کاشفی کی اس تحریر سے۔

"اما بعد از قتل آنحضرت شمر مردود با جمعے سطر و دروی بخیمہ امام انس و جان نہادند۔ دہر متاعی کہ دیدند بغارت و تاراج بردہ گرد عورات نگردیدند"

متفق ہیں جس کی تائید ملائے موصوف کے اِس عبارت سے بھی ہوتی ہے۔

"القصہ عمر سعد گفت تا منادی کردند کہ بخیمہ زنان در میائید و متعرض

ابن حبی اسید سجاد امشوید۔ و دست از غارت بدارید و آنچہ بردید باز دہید۔ این سخن را کسے اطاعت نکرد و ہیچ چیز باز ندادند تا دیگر غارت نکردند"

اس طرح جسدِ مطہر سے لباس اُتارے جانے کے بابت ہم کو اس وجہ سے تامل ہے کہ اول تو وہ کوئی قیمتی نہ تھا دوسرے جب ہتیاروں کے صدہا زخم جسم پر پہونچے تھے۔ تو وہ کپڑے بھی جسم کے ساتھ پارہ پارہ ہو چکے تھے۔ ان کو کوئی لیتا بھی تو کیا کرتا کیونکہ بعض مورخ آپ کے جسمِ مقدس پر بہتر بعض تیروں کے علاوہ ۳۳ زخم نیزوں کے اور ۳۴ زخم تلواروں کے بعض علاوہ تیروں کے ستر بعض تین سو بیس اور بعض ایک ہزار نوسو اور بعض ایک ہزار نوسو اکاون۔ زخم بیان کرتے ہیں جب کپڑے زخموں کے ساتھ اس قدر کٹ چکے تھے تو نہیں قابلِ پوشش کیونکر سمجھا جا سکتا ہے۔ ملائے مجلسی نے جلاء العیون میں نقلاً عن شیخ مفید مفید و سید ابن طاؤس اتنی تصریح کی ہے۔

"جامہ ہائے آنحضرت کہ قیمتی داشت مانند جبہ خز و عمامہ خز۔ غارت کردند"

دوسرے سب کپڑوں کو نہیں لکھا لیکن یہ بھی سلامت اور قابل استعمال کب رہے تھے البتہ ہتیاروں کے متعلق جن لوگوں کے نام لئے گئے وہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

پامالِ لاش حضرت سید الشہدا کی بابت علما مختلف البیان ہیں گو اس واقعہ کو عموماً تسلیم کیا جاتا ہے تاہم بعض کو اس میں تامل ہے جیسا کہ علامہ کلینی نے کافی میں اِس سے انکار کیا ہے اور علامہ مجلسی بھی بحار میں لکھتے ہیں وَالمعتمد عندی ماسیاتی فی روایة الکافی انه لم یتیسر لھم میرے نزدیک کتاب کافی کی روایت میں معتبر یہ ہے کہ پامالی نہیں ہوئی۔

---

(۲۰) اہل بیت کا سر برہنہ کیا جانا

(۲۰) مخدراتِ عصمت کا مکشوف الوجوہ شتران بے کجاوہ و عماری پر سوار کرنا۔ سید الساجدین کو خدمت ساربانی دیا جانا اور شہر بشہر تشہیر گوان واقعات کی نسبت بھی اکثر مورخوں نے یہی لکھا ہے لیکن بعض علما اس کے خلاف ہیں چنانچہ علامہ مجلسی جلاء العیون میں لکھتے ہیں۔

"پس ام کلثوم دختر دیگر حضرت سیدۃ النساء صدا بگریہ بلند کرد۔ و از ہودج محترم ندا کرد"۔

پھر آگے مسلم جصاص کی روایت لکھ کر اس کی زبانی تحریر کرتے ہیں۔

"ناگاہ دیدم کہ نزدیک بہ کجاوہ و محمل پیدا شد۔ گفتند حرم محترم سید الشہدا و فرزندان فاطمہ زہرا دریں محمل ہا یند"۔

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"زنان اہل کوفہ از مشاہدۂ احوال آں مقربان ذوالجلال می گریستند ام کلثوم چوں صدائے گریہ ایشاں را شنید از میان محمل صدا زد"۔

اس کے بعد لکھتے ہیں

"چوں زینب خاتون را نظر بر سر آں سرور افتاد سر خود را بر چوب محمل زد"۔

ان ہی واقعات کو اسی طرح ملا موصوف نے کتاب بحار میں بھی تحریر کیا ہے۔ مرزا سپہر کاشانی ناسخ التواریخ جلد ششم صفحہ ۳۱۶ میں اس واقعہ کو ایک دوسرے پیرایہ سے لکھتے ہیں۔

"دختران پیغمبر را مکشوفات الوجوہ بے مقنعہ و عمار بر شتران بے وطاء و ہودج سوار کردند و بعضے را در محمل ہا و ہودج ہا بے پردہ و پوشش

جائے دادند"۔

فاضل دربندی نے اسرار الشہادۃ میں ایک تیسری صورت بیان کی ہے کہ حضرت زینب و ام کلثوم مکشوفۃ الرؤس و الوجوہ نہ تھیں بلکہ کنیزیں خدمت گاریں اور اطفال اس حال میں تھے۔ صاحب طراز مذہب مظفری صفحہ ۳۱۰ اور ۳۵۸ میں میں لکھتے ہیں کہ۔

"اگر مکشفات الوجوہ تھیں تو بنات غیر بالغہ اور نسواں غیر معظمہ یعنی کنیزیں اور خدمت گاریں"۔

بہر حال ان مقامات سے اتنا ضرور پایا جاتا ہے کہ اہل حرم شتران بے کجاوہ و عماری پر سوار نہ تھے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ محملوں کے اندر پردوں میں تھے۔ چنانچہ ملا کاشفی بحوالہ ابو حنیفہ دینوری صاف لکھتے ہیں کہ:۔

"صباح روز سوم خواتین اہل بیت را فرمود۔ تا جامہ ہا پوشیدہ و روا ہا بر بستہ بر شتراں سوار شوند"۔

پھر آگے چل کر لکھا ہے کہ

"ابو الفوائد آوردہ کہ اہل کوفہ در حوالی محامل اہل بیت غلو کردہ می گریستند حضرت زینب علیہما السلام از درون ہودج خود آواز داد"۔

کوفہ جناب امیر کا دار السلطنت رہ چکا تھا باوجود کوفیوں کی اس قدر بے وفائی اور غداری کے اب بھی وہاں ہزاروں ہوا خواہانِ اہل بیت موجود تھے۔ جو خوف جان و مال و آبرو سے کسی قسم کی جنبش نہ کر سکے۔ مگر ایک ایسی کارروائی جو خاندان رسالت کی توہین اور تذلیل کو انتہائی حد تک پہنچانے والی تھی۔ ضرور ان کے لئے اشتعال انگیز اور ہنگامہ عظیم پیدا کرنے والی تھی اور کوئی مدبر اور سیاست داں ایسی فاش اور خطرناک غلطی کا جو عام جذبات کو ہیجان میں لانے والی ہو ارتکاب نہیں

کر سکتا اس لئے ملائے کاشفی کا یہ لکھنا کہ "نساء و جواری امام حسین علیہ السلام او مخلہا نشاندہ می بردند و آنچہ در بعض کتب نوشتہ اند کہ سر برہنہ بر شتران بے جہاز نشاندہ بردند قولِ ضعیف است و بصحت نرسیدہ بلکہ بہ ہمیں وجہ کہ بردند آں نیز نسبت بہ اہلبیت اہانت بود چہ ایشاں پردگیان حرم عصمت و ستر داران حریم عفت بودند آفتاب جہاں تاب بر فرقِ مبارک ایشاں سایہ نینداختہ بود و باد عالم گرد گرد حجرۂ پاکیزہ ایشاں نساختہ" راستی و صداقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور ہم بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں کیونکہ خاندان نبوت کی عورتوں اور خاتونِ محشر کی بیٹیوں کو جو دین و دنیا کی شہزادیاں تھیں قیدیوں کی طرح ماخوذ کر کے کوفہ اور دمشق تک لے جانا اور بھرے درباروں میں ان کی رو بکاری کیا تھوڑی ذلت اور اہانت ہے۔

اس واقعہ کی بابت دو امور بیان کئے جاتے ہیں اول یہ کہ اہل حرم کے ساتھ دشمنوں نے دُرّوں اور تازیانوں سے بے ادبی کی، دوسرے سید الساجدین کو باوجود علالت اس لٹے ہوئے قافلہ کے اونٹوں کا ساربان بنایا۔ اور آپ کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے دمشق تک پاپیادہ گئے لیکن یہ دونوں واقعات سراسر بے اصل و بے بنیاد ہیں جن کا تاریخی کتابوں میں کہیں تذکرہ نہیں پایا جاتا۔

رہی تشہیر بے شک اہل بیتِ اطہار کو قیدیوں کی طرح نامحرموں کی حراست میں کوفہ سے دمشق تک متعدد شہروں اور قریوں میں ہو کر جانا پڑا لیکن وہ اثنائے راہ کے مقامات تھے فاتحانہ تشہیر کوئی سہل کام نہ تھا۔ ملک کے حصّے اعظم میں شورش ہو جاتی جیسا کہ بعض مقامات کے باشندے بمقابلہ پیش آئے اور اس دستہ فوج کو جو ان اسیروں کے ساتھ تھا بھاگنا پڑا۔ بہر حال یہ باتیں مبالغہ آمیز اور ناقابل اعتبار ہیں۔

(۲۷) قصۂ اُمّ حبیبہ خادمہ جناب سیدہ علیہا السلام

اکثر روضہ خوانوں کی زبانی ام حبیبہ کی روایت بہ کثرت سنی جاتی ہے صورت اس کی یہ بیان کرتے ہیں کہ زنان قریش نے ایک موقعہ پر ام حبیبہ کو جناب سیدہ کی خدمت مبارک میں ہدیۃً بطور کنیز پیش کیا تھا۔ بعد ازاں اس کا عقد ایک شخص باشندہ کوفہ سے کر دیا گیا۔ بعدِ واقعۂ شہادت داخلۂ کوفہ کے وقت اہل حرم کے اونٹ اتفاق سے ام حبیبہ کے مکان کے نیچے ہو کر نکلے۔ وہ بھی دوسری تماشائی عورتوں کی طرح کوٹھے پر موجود تھیں اس وقت جناب سکینہ بہت پیاسی تھیں۔ ام حبیبہ کو رحم آیا۔ پانی حاضر کیا اور دعا کے لئے ملتجی ہوئی۔ آخر میں جنابِ زینبؑ نے اُمّ حبیبہ کو اور اس نے اپنی مخدومہ کو پہچان لیا، اور وہ غش کھا کر کوٹھے سے گری اور انتقال کر گئی۔ لیکن اس کے متعلق نہ کوئی تاریخی شہادت ہے نہ کوئی معتبر سند جن معمولی اور غیر مستند کتابوں میں اس کی موضوع اور بے سر و پا روایتیں بھری ہوئی ہیں مثلاً بحور الغمہ اور بحر المصائب وغیرہ اُن میں ہم اس روایت کو بھی بکثرت پاتے ہیں۔ جو تاریخی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ علامہ مجلسی نے جلاء العیون میں اتنا ضرور ذکر کیا ہے

"چوں اہل بیت رسالت نزدیک کوفہ رسیدند۔ بیشتر مردمانِ اہل کوفہ بنظارہ بیروں آمدند پس زنے از زنان اہل کوفہ پرسید کہ شما از کدام اسیرانید گفتند مائیم اسیرانِ آل محمد آں زن چوں ایشاں راشناخت بسرعت از بام خانہ بزیر آمد و آنچہ در خانہ داشت از چادر و مقنعہ برائے ایشاں آورد کہ خود را بایشاں پوشاندند"

لیکن نہ تو اس عورت کا نام ہے نہ اس قصہ کو اس قدر طوالت دی ہے۔ جیسا کہ

ذاکرین بیان کرتے ہیں یہ قافلہ جو بازار میں ہوتا ہوا دارالامارۃ کی طرف جارہا تھا۔ اور لے جانے والے اپنی کارگذاری اور خوشامد کے اظہار میں حتی الوسع جلد پہنچانے کی کوشش و فکر میں تھے۔ اس کا قدم قدم پر اس طرح ٹھہرایا جانا۔ قیاس میں نہیں آسکتا۔ اور یہ روایت یقیناً موضوع و بے اصل ہے۔

(۲۲) قصۂ جناب شیریں کنیز جناب شہربانو

روضۃ الشہدار نے شیریں کا واقعہ اِس طرح بیان کیا ہے کہ جب جناب شہربانو حضرت سیدالشہدار کے عقد میں آئیں تو ان کے ساتھ ایک سو عجمی کنیزیں تھیں عقد کے دوسرے روز انہوں نے پچاس کنیزوں کو آزاد کرا دیا۔ ۴۰ کو اس وقت حکم آزادی سنایا جب سیدالساجدین پیدا ہوئے۔ دس باقی رہیں۔ ایک روز حضرت کی زبان سے شیرین کے حسن کی تعریف سن کر اس کو ہدیتاً خدمت میں حاضر کیا آپ نے شہربانو کے خیال کو سمجھ کر اسی وقت راہ خدا میں آزاد فرمادیا۔ تاہم شیریں نے خاندانِ رسالت کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ بعد واقعۂ کربلا دمشق کے راستہ میں متصل حلب ایک پہاڑ کے نیچے فوج کے محافظ دستہ کا پڑاؤ ہوا اس پہاڑ پر ایک قافلہ تھا جس میں یہودی آباد تھے۔ اور عزیز بن ہارون اُن کا سردار تھا۔ وہاں کے بُنے ہوئے ریشمی کپڑے دور دور مشہور تھے۔ شیریں جناب شہربانو کے لئے کپڑا خریدنے گئیں۔ عزیز ایک خواب دیکھ کر منتظر تھا۔ وہ بڑے اخلاق سے پیش آیا۔ اور صبح سیدالساجدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور دینِ اسلام قبول کیا آپنے شیریں کا عقد اس کے ساتھ کر دیا بعض اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ حضرت نے مدینہ ہی میں شیریں کا عقد ایک شخص سے کر دیا تھا۔ اور وعدہ فرمایا تھا کہ ہم تیرے گھر آکر مہمان ہوں گے اب اثنائے راہ میں وہ قلعہ آیا

جس میں شیریں کا مکان تھا اس کو خبر لگی اور وہ حاضر ہوئی تو یہ ہولناک منظر دیکھا۔ لیکن اس روایت کے دونوں پہلو روایتاً اور درایتاً کمزور ہیں اور سراسر لغو اور باطل ہیں اول تو اس کی کوئی معتبر سند نہیں اور اسی وجہ سے مورخین علماء نے اس جعلی اور فرضی قصہ کو اپنی کتابوں میں جگہ دینے کے قابل نہ سمجھا۔ دوسرے حضرت شہربانو اس وقت زندہ ہی نہ تھیں۔ مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ کا ارشاد ہے کہ:۔

> شیریں کنیز جناب شہربانو کا حال مطلقاً کتب معتبرہ میں نہیں ہے اور اور یہ قصہ جس طرح مراثی ہند میں نظم ہے وہ بالکل غیر معتبر ہے۔ اور صاحب روضۃ الشہدا نے جس طرح اس کو لکھا ہے وہ بھی معتبر نہیں ہے (ہدایات ناصریہ صفحہ ۶)

(۲۳) زندان شام سکینہ کا محبس میں وفات پانا۔

واقعۂ کربلا کے وقت آپ کی عمر

اہل بیت رسالت کون سی تاریخ کو دمشق پہنچے۔ کب تک وہاں رہے اور کس تاریخ کو دارالسلطنت سے روانہ مدینہ ہوئے۔ افسوس ہے کہ تمام تاریخیں ان تاریخوں کے تعین میں خاموش ہیں اور ہمکو کوئی روایت قابل اطمینان ایسی نہیں ملی جس پر حتمی فیصلہ کیا جاسکے۔ صاحبِ روضۃ الشہدا اور صاحبِ تہیج الاحزان کا قول ہے کہ جب اہلِ بیت کی روبکاری یزید کے سامنے ہوئی اور اس کو تمام واقعات معلوم ہوئے تو وہ ایسا متاثر ہوا کہ اسی وقت رہائی کا حکم دے کر باعزاز واکرام پیش آیا۔

ملائے مجلسی سید ابن طاؤس اور ابن بابویہ وغیرہ کا ارشاد ہے کہ اہل حرم ایک ایسے مکان میں ایک ماہ تک قید رہے جہاں سردی اور گرمی سے کوئی بچا!

تھا۔ محمد بن جریر طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ یزید نے ان کو دس روز تک اپنے مکان میں ٹھہرایا بعد ازاں ان کو مدینہ جانے کی اجازت دیدی۔

بعض کہتے ہیں کہ ۶ مہینہ اور بعض کا خیال ہے کہ سال بھر تک اہل بیت قید خانہ میں رہے (عام طور پر جیسا کہ ذاکرین اور مرثیہ خوان بیان کرتے ہیں) یہ مشہور ہے کہ یزید نے اہل بیت رسالت کو ایسے محلس میں قید کیا تھا۔ جہاں نہ سایہ تھا۔ اور نہ روشنی اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ مکان نہایت تنگ و تیرہ و تاریک شکستہ اور قریب بہ انہدام تھا گو ہم کوئی نص قطعی موجود نہ ہونے سے حتمی رائے نہیں دیتے تاہم جہاں تک قرائن سے کام لیا جاتا ہے ان سے یہی ظاہر ہے کہ اہل بیت کا قیام زیادہ عرصہ تک دمشق میں نہیں رہا۔ ممکن ہے کہ اہل بیت اطہار چند روز کسی معمولی مکان میں نظر بند رہے ہوں بعد ازاں یزید کے خیالات میں تغیر پیدا ہو کر بالارادہ یا مصلحتاً شاہی محل کے کسی حصہ میں ٹھہرایا گیا ہو۔ لیکن جس طرح ہم اس روایت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کہ یزید روزِ اول سے ہی بہ اعزاز و مدارات پیش آیا ویسی ہی اس روایت کو بھی قبول نہیں کرتے کہ اہل بیت کو ایک شکستہ خرابہ میں مہینوں تک مقید رہنا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ دربارِ یزید میں اہل بیت کے ورود کی کیفیات کو اربابِ مقاتل نے بے ترتیبی سے بیان کیا ہے اس لئے وہ لوگ جن کو کتب اخبار میں تتبع تام نہیں ہے ان تمام واقعات کا وقوع ایک ہی موقعہ پر خیال کرتے ہیں بلکہ یہاں تک گمان کیا جاتا ہے کہ یزید نے روزِ اول ہی اہل بیت کو رہائی دے کر مجلس عزا برپا کرنے کی اجازت دے دی حالانکہ عقل سلیم ہرگز اس امر کی تصدیق نہیں کرتی۔ کیونکہ پہلے دن یزید سے سوائے خشم و ستیز اور کچھ ظاہر نہیں ہوا۔ اور اس وقت تک وہ لوگوں کے جوش و خروش سے مطمئن تھا۔ مگر جب سب طرف سے لے دے ہوئی تو وہ گھبرایا اور اس کا خیال پلٹا اور تلافیِ مافات میں کوشاں ہوا لیکن یہ مختلف اوقات

مختلف اوقات میں رونما ہوئی۔ چھ مہینہ یا سال بھر تک مقید رہنا۔ ضرور داخل مبالغہ ہے اور ہم علامہ مجلسی ابن بابویہ۔ شیخ بہائی اور ان کے ہم خیال حضرات کے اس بیان کو کہ اہل بیت نبوت ایک ماہ تک نظر بند رہے اور اس کے بعد سات روز اور قیام فرما کر راہیِ مدینہ ہوئے اور سب اقوال پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور ہمارے خیال میں اہل بیت اطہار کا چھ مہینہ یا سال بھر تک قید رہنا غیر معتبر اور غلط ہے کیونکہ ہم کو اس کی تائید میں کوئی مستند تاریخی شہادت نہیں ملتی۔

اِس سے بھی زیادہ مشہور مگر سراسر کذب و افتراء وہ روایت ہے جس میں درد انگیز پیرایہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ جناب سکینہ نے زندان شام میں رحلت کی حالانکہ تمام مورخین و علمائے انساب کا اتفاق ہے کہ آپ عرصہ دراز تک زندہ رہیں اور واقعہ کربلا سے ۵۷ برس کے بعد ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔ آپ کا عقد واقعہ کربلا سے پہلے عبداللہ بن حسن کے ساتھ ہو چکا تھا جیسا کہ ناسخ التواریخ نفس الابرار۔ ارشاد شیخ مفید۔ بحار الانوار اغانی کشف الغمہ سیر الائمہ عمدۃ المطالب۔ اعلام الوریٰ۔ قمقام زخار، مراۃ الجنان۔ اسعاف الراغبین وجنات الاعیان۔ تاریخ کامل وغیرہم میں صاف درج ہے۔ ہنوز زفاف واقع نہ ہوا تھا کہ عبداللہ معرکہ کربلا میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے اور ان کا دوسرا عقد مصعب ابن زبیر کے ساتھ ہوا۔ بہرحال جناب سکینہ کا دمشق میں وفات پانا ایک ایسا لغو بے بنیاد اور کذب محض افترا ہے جس کی تردید کو فریقین کی تمام معتبر و مستند کتابیں موجود ہیں اس لئے اس پر زیادہ بحث کی ضرورت بھی نہیں البتہ مولانا سید ناصر حسین صاحب مجتہد العصر کا وہ ارشاد جو ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا گیا ہے اور لکھ دینا مناسب ہے۔

"جناب سکینہ کا زندان شام میں انتقال کرنا بالکل غلط ہے۔ اور طریق معتبرہ سے ثابت ہے کہ آپ بعد جناب سیدالشہداء علیہ السلام ایک مدت

تک زندہ رہیں۔ البتہ کتاب منتخب فخرالدین بن طعزیلی میں ایک روایت ایسی موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ امام حسین علیہ السلام کی ایک صاحبزادی نے جن کا سن تین سال کا تھا۔ زندانِ شام میں انتقال فرمایا اور چونکہ اس روایت میں صاحبزادی کا کوئی نام درج نہیں ہے۔ لہذا بالیقین نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا نام کیا تھا۔ لیکن ممکن ہے کہ نام ان کا زینب ہو واسطے بنابر ایک قول کے جناب سید الشہدا کی تین صاحبزادیاں تھیں ایک فاطمہ دوسری سکینہ تیسری زینب اور چونکہ فاطمہ اور سکینہ کا بعد جناب سید الشہدا ایک مدت تک موجود رہنا ثابت ہے اور انکے بعض حالات بطرق موثق [illegible] وارد ہیں۔ اور زینب بنت الحسین کا کوئی حال ثابت نہیں لہذا اقرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ جن صاحبزادی نے زندان شام میں انتقال کیا وہ زینب بنت الحسین ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ شام میں جو روضہ حضرت زینب کا مشہور ہے۔ وہ یہی زینب بنت الحسینؑ ہوں۔ نہ حضرت زینب بنت علی علیہ السلام۔ کیونکہ زینب بنت علی کا بعد اسیری شام سے مدینہ کی طرف مراجعت کرنا ثابت ہے اور بار دیگر حسب الطلب یزید شام کی طرف جانا اور وہاں انتقال کرنا جیسا کہ بعض روضہ خوانوں نے بہ عنوانات مختلف افترا کیا ہے۔ محض غلط ہے اور بعض علمائے معاصرین اہل عراق نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ کتاب منتخب میں روایت رقیہ بنت الحسین مذکور ہے۔ اور روضہ ان کا شام میں موجود ہے۔ عندالتحقیق اشتباہ در اشتباہ ہے (ہدایات ناصریہ صفحہ ۵ و ۶)

مرثیہ خوانوں اور ذاکرین مصائب جناب سید الشہدا نے عموماً لوگوں کے یہ ذہن نشین کر دیا ہے کہ واقعہ کربلا کے وقت جناب سکینہ تین برس کی ناسمجھ بچہ تھیں۔ لیکن

اگر ذرا بھی غور و تحقیق سے کام لیا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ محض غلط اور افترا ہے اس میں شک نہیں کہ حضرت سید الشہدا نے اپنی بیٹی سکینہ کا عقد حضرت عبداللہ بن حسن سے کر دیا تھا اور ان کا سن اس وقت آٹھ نو برس سے کسی طرح کم نہ تھا کیونکہ ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں کہ فاطمہ بنت الحسین حضرت سکینہ سے بڑی تھیں۔ فاطمہ کی والدہ ام اسحاق سے جو پہلے حضرت امام حسن کے عقد میں تھیں۔ جناب سید الشہدا نے اپنے بھائی کی وصیت کے موافق عقد کر لیا تھا۔ حضرت امام حسن کا انتقال ۲۸ صفر ۵۰ھ کو ہوا۔ بعد ایام عدت غالباً آپ نے ماہ شعبان میں عقد کیا ہوگا۔ اگر فاطمہ کی ولادت جلد از جلد ہوئی ہو۔ تو رجب ۵۱ھ میں ہوئی اور محرم ۶۱ھ میں فاطمہ کی عمر ۹ برس چھ ماہ کی تھی۔ اگر سکینہ جن کی مادر گرامی قدر رباب تھیں۔ چند مہینہ ہی فاطمہ سے چھوٹی ہوں تو ان کی عمر اس وقت ۹ برس کی ہونی چاہیئے نہ کہ تین برس کی۔ یہ عمر ایسی تھی کہ حضرت نے اپنے بھتیجے سے ان کا عقد کر دیا۔ البتہ اب اپنے شوہر کے گھر نہ جانے پائیں تھیں کہ عنداللہ درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ بہر حال یہ خیال کہ جناب سکینہ نے دمشق میں وفات پائی اور ان کی عمر تین سال کی تھی غلط اور سراسر بہتان ہے

(۲۴) ہندہ زوجہ یزید کا سر دربار نکل آنا

یا

زنداں میں ملاقات اہلبیت کیلئے جانا

(۲۴) اہل بیت رسالت کے قیام دمشق کے زمانہ میں ہندہ زوجہ یزید کے متعلق دو روایتیں بہت مشہور اور قابل لحاظ ہیں۔ ایک یہ کہ اہل حرم جس خرابے میں تھے وہ شاہی محل سے اس قدر قریب تھا کہ عورتوں اور بچوں کے رونے کی

آوازِ ہندہ کے کان تک جاتی تھی۔ آخر وہ ایک روز خود مجلس میں آئی۔ دوسرے یہ کہ یزید کے سامنے جب اُسرائے اہل بیت پیش کئے گئے اور ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہندہ یہ کیفیت دیکھ کر بے تحاشا محل سے نکل آئی اور بے پردہ دربار عام میں آگئی۔ ان دونوں روایتوں کو مرثیہ گو شعراء نے مختلف عنوانات سے بڑے آب وتاب کے ساتھ نظم کیا ہے۔ اور روضہ خواں بھی اس کو گوناگوں رنگ آمیزی سے بیان کیا کرتے ہیں۔ صاحب ناسخ التواریخ نے ایک تیسری صورت بیان کی ہے۔ کہ ایک روز یزید نے حضرت کے سر مبارک کو اپنے محل کے دروازہ پر آویزاں کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ مخدرات عصمت کو شاہی محل سرا میں بلایا جائے۔ جب رسولخدا کی نواسیاں اور دوسری معظمات محل میں داخل ہوئیں۔ یزید کی بی بیوں اور آل ابوسفیان کی دوسری عورتوں نے ان کی ایسی افسوسناک حالت دیکھ کر اپنے مکلف لباس اور زیور اُتار کر پھینک دئے اور بآواز بلند گریہ وزاری میں مشغول ہوئیں اور تین روز تک اہل بیت کے ساتھ عزاداری کا سلسلہ جاری کیا۔ ہندہ دختر عبداللہ بن عامر جو یزید کی منکوحہ تھی اور اس سے پہلے سید الشہداء کے شرف زوجیت سے مشرف رہ چکی تھی۔ اہل بیت کا یہ حال تباہ دیکھ کر

"ازخود بیگانہ شد، وبے ہوشانہ از سرائے خویش بیرون دوید۔ وبے پردہ بمجلس یزید کہ خاص بمعارف وصنادید بود رفت وگفت۔ آیا ایں سر پسر فاطمہ دختر رسول خدا است کہ در آستانۂ سرائے من آویختہ۔ یزید چوں ایں بدید ناپرداسوئے اُو دوید وا ورا بزیر پوش جامہ خود محفوظ داشت وگفت اے ہندہ چند کہ خواہی بر پسر دختر پیغمبر کہ خاص وخالص قریش است بنال وبانگِ نالہ وعویل برآر۔ ابن زیاد ملعون عجلت کرد اورا کشت خدا اُش بکشد"

ملائے مجلسی بھی جلاء العیون میں اسی مطلب کو تحریر کرتے ہیں۔

"ہند دختر عبداللہ بن عامر کہ دراں وقت زنِ یزید بود و پیشتر درحبالۂ حضرت امام حسین علیہ السلام بود۔ پردہ را دریدہ از خانہ بیروں دوید۔ وبمجلسِ آں ملعون آمد در وقتیکہ مجمع حاضر بود۔ گفت اے یزید سر مبارک فرزند حضرت فاطمہ زہرا دختر رسولخدا بر در خانہ من نصب کردہ۔ یزید برجست وجامہ بر سرِ او افگند وا ورا بازگردانید وگفت اے ہند زاری ونوحہ کن بر فرزند رسولخدا وبزرگ ترین قریش۔ پسر زیاد۔ در امرِ او تعجیل کرد ومن راضی بر بحشتن او نبودم۔ پس اہل بیت را در خانہ خود جاداد وبر چاشت وشام حضرت امام زین العابدین علیہ السلام را بر سرخوان خود می طلبید"

یہی امر اخوند موصوف نے بحار میں ادا کیا ہے۔

ابن اثیر کا بیان ہے کہ ہندہ نے سر دربار یزید کو لعنت وملامت کی۔ اور پھر روتی ہوئی باہر نکل گئی لیکن ہم تینوں روایتوں کو اس وجہ سے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کہ ہندہ کا مجلس میں آنا تو کسی معتبر کتاب میں مذکور ہی نہیں۔ رہی یہ روایت کہ ہندہ سر دربار بے پردہ نکل آئی۔ درایت کے اصول سے صحیح نہیں ہے۔ عقل سلیم اس کو ہرگز قبول نہیں کر سکتی۔ کہ ایک شہنشاہ کی بی بی اس طرح بے حجابانہ مجمع عام میں نکل آئے۔ یزید اس وقت دنیا کا سب سے بڑا تاجدار اور سب سے وسیع سلطنت کا بادشاہ تھا۔ اسی طرح ہندہ بھی دنیا کی اُن شاہی بیگمات سے جن کو ملکہ آفاق کہلائے جانے کا شرف حاصل تھا۔ سب سے بڑی شہنشاہ بیگم تھی۔ یزید کے محلات بھی غالباً شاہی قاعدے سے بنے ہوئے تھے۔ متعدد ڈیوڑیات اور ہر ڈیوڑی پر خواجہ سراؤں اور محافظوں کا انتظام تھا۔ نہ اس طرح جیسے کہ ماہو وشما کے مردانہ وزنانہ مکانات بالکل متصل یا

قریب قریب ہوتے ہیں۔ یزید کی تخت نشینی سے پہلے ہی وہ تمام شاہانہ اہتمام جو کسریٰ اور فغفور کے محلات اور ان کے انتظامات کے متعلق تھے۔ قائم ہو چکے تھے۔ پھر کیونکر قیاس میں آسکتا ہے کہ ہندہ باوجود شاہی انتظامات اور پہرہ چوکی کے اس طرح بے تحاشا اور بے پردہ بھرے دربار میں نکل آتی۔ ایسی حرکت جس کو کسی معمولی امیر کی بی بی نہیں کر سکتی۔ دنیا کے شہنشاہِ اعظم کی بی بی کیونکر کر سکتی تھی جن لوگوں نے اس روایت کو لکھا ہے انہوں نے غالباً ان شاہانہ اصولوں پر غور نہیں کیا۔ جس کا ہر ذی عقل بادنیٰ تامل خود تصفیہ کر سکتا ہے۔ ہماری خیال میں ایسا ہونا قطعًا ناممکن۔ خلافِ قیاس۔ شاہانہ مراتب کے منافی اور یقیناً دروغ بے فروغ ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ہندہ کو جب اس واقعہ کی اصلیت معلوم ہوئی ہو تو بوجہ اس کے کہ اس کو خاندان رسالت سے ایک خاص تعلق رہ چکا تھا اس نے یزید کو لعن وطعن کی ہو اہل بیت کو محبت سے شاہی محل میں بلوالیا ہو اور اس کے کہنے سننے سے یزید نے اہل بیت کی رہائی کا حکم دیا ہو۔ بہرحال جس طرح ہندہ کے متعلق واقعات مشہور کئے گئے ہیں وہ بوجہ اس کے کہ درایتاً ان کی صحت مشکوک ومشتبہ ہے۔ غلط اور وضعی معلوم ہوتے ہیں اور ناقابل تسلیم اور ناقابل اعتنا ہیں۔

(۲۵) واپسیٔ روز اربعین۔ دفن نعش ہائے شہداء

دفن سرِ مبارک

(۲۵) اہل حرم دمشق سے کربلا کو واپس آئے یا براہِ راست مدینہ کو روانہ ہوئے ان کا یوم الاربعین کو کربلا میں آنا ہوا یا نہیں۔ چالیسویں روز دمشق سے ان کی واپسی ممکن تھی یا نہیں۔ ان سب امور کی نسبت ہم اپنے موقعہ پر مفصل بحث کر چکے ہیں اسی طرح لاش ہائے شہدا کی تدفین کا حال بھی لکھا جا چکا ہے۔ اور ہم اس غلط شہرت کا کہ سید الساجدین نے چالیسویں روز دمشق سے واپس آکر نعشہائے شہداء کو جو اس وقت تک بے گور وکفن پڑی ہوئی تھیں۔ سپرد زمین کیا بخوبی ابطال کر چکے ہیں اس لئے اُن کا مکرر اعادہ تحصیل حاصل ہے اب ہم صرف دفن سر مبارک کے لئے جو اختلافات ہیں اُن کو دکھلا کر اپنی تحقیق واجتہاد کا خلاصہ معرض تحریر میں لانا کافی سمجھتے ہیں۔

حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے سر مبارک کے متعلق علمائے تاریخ میں بڑا اختلاف ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ دمشق پہنچنے کے بعد کہاں گیا اور کس جگہ مدفون ہوا۔ ایک روایت میں ہے کہ یزید نے اس کی تشہیر کا حکم دیا۔ جب لوگ اس کو پھراتے عسقلان میں لے گئے تو وہاں کے امیر نے اسے وہیں دفن کر دیا۔ چنانچہ خوانِ خلیلی کے قریب مشہدِ حسینی اب تک موجود ہے۔ فتاوائے قرطبی میں لکھا ہے کہ یزید نے سر مبارک مدینہ میں عمر بن سعید بن عاص کے پاس بھجوا دیا۔ اور اس نے بمقام جنت البقیع حضرت سیدہ عالم کے پہلو میں سپرد زمین کر دیا۔ سید علی بن عبداللہ مدنی خلاصۃ الوفا میں تحریر کرتے ہیں کہ حضرت امام حسن کے مزار کے پاس دفن کیا۔ ابن شہر آشوب ابن نما ابن بکار اور ہمدانی وغیرہم کا بھی یہی قول ہے اور کتاب کافی علامہ محمد ابن یعقوب کلینی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت کا فرقِ مقدس مدینۂ طیبہ میں ہے۔ کتاب کامل الزیارۃ میں بہ سند یزید بن عمر بن طلحہ حضرت امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ آپ کا سر مبارک نجف میں ہم پہلوئے جناب امیر علیہ السلام دفن کیا گیا ہے۔ سید ابن طاؤس نے لہوف میں اور علامہ مجلسی نے تحفۃ الزائرین اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ تہذیب التہذیب اور صواعق محرقہ وغیرہ میں ہے کہ حضرت کا سر مبارک خزانہ یزید میں بھی رہا۔ جب سلیمان بن عبد الملک

بن مروان تخت پر بیٹھا اور لوگوں نے اس کو سر مبارک کے خزانہ میں ہونے کی خبر دی تو اس نے جستجو کر کے منگایا، دیکھا کہ استخوانِ سر منورّ مجلاّ چاندی کی طرح چمک رہے ہیں۔ تھوڑی دیر اپنے پاس رکھا، پھر کفن دیگر نہایت عزت و احترام کے ساتھ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرا دیا۔ مگر جب عباسیوں کا دور دورہ ہوا تو انہوں نے سر مبارک کو وہاں سے نکال کر نجانے کہاں پوشیدہ کر دیا۔ بعض کا قول ہے کہ جس جگہ سلیمان نے دفن کرایا تھا وہاں سے عمر بن عبد العزیز بن مروان نے نکلوا کر کربلا میں بھجوا دیا۔ تہذیب میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب عباسیوں کی فوج نے خزانۂ دمشق کو لوٹا۔ تو کسی سپاہی کو ایک تھیلی نظر پڑی اس نے کوئی گراں بہا چیز سمجھ کر اٹھا لیا۔ جب میدان میں لا کر کھولا تو سر مبارک ایک پارچہ حریر میں لپٹا ہوا نظر آیا۔ اور اس حریر پر لکھا ہوا تھا۔ یہ سر حسین ابن علی ہے ابذا راس الحسین ابن علی اس سپاہی نے وہیں تلوار کی نوک سے زمین کو کھود کر دفن کر دیا۔ ابن جوزی اور بعض مورخ اس پر متفق ہیں کہ جب منصور بن جمہور نے خزانہ بنی امیہ پر قبضہ کیا تو اسے آپ کا سر مطہر ایک مقفل صندوق میں ملا اور یہ معلوم ہو جانے پر کہ فرزند رسول اللہ کا سر مقدس ہے اس نے متصل باب الفرادیس دمشق تیسرے برج سے جانب شرق دفن کرا دیا۔

عبوس منصوری نے زبدۃ الفکر میں تحریر کیا ہے کہ زمانہ بنی عباس میں سر مبارک کو دمشق سے عسقلان لے گئے عرصۂ دراز تک عسقلان میں دفن رہا۔ جب صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں اس شہر پر نصاریٰ کا غلبہ ہوا تو لوگوں نے وہاں سے اٹھا کر قاہرہ دار السلطنت مصر میں پہنچا دیا۔ علامہ مقریزی خطط میں لکھتے ہیں کہ ۸ جمادی الاول ۵۴۸ھ ہجری ہوئی روز یکشنبہ کو سر مطہر قاہرہ میں لائے۔ اس وقت اس سے تازہ خون ٹپک رہا تھا اور مشک جیسی خوشبو آتی تھی۔ وہاں اب تک ایک

مسجد اسی نام سے مشہور رہی جو نہایت پرتکلف سامانوں سے آراستہ رہتی ہے۔ اور لوگ بکثرت زیارت کو آتے رہتے ہیں۔ صوفیائے کرام اپنے مکاشفہ سے اس کی تائید کرتے ہیں۔

دمشق سے عسقلان لے جانے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ دمشق دشمنانِ خاندان رسالت کا مرکز تھا اور اندیشہ تھا کہ کسی وقت یہ لوگ بے ادبی نہ کریں اس لئے اس کو عسقلان منتقل کر دیا تھا۔ ۵۴۸ھ ۱۱۵۳ء میں جب کہ عاضد لدین اللہ آخری فاطمی خلیفہ مصر کا زمانہ تھا اس کے وزیر اعظم ملک صالح طلائع بن زریک نے جبکہ اس کو یہ پرچہ گذرا کہ صلیبی فوجیں عسقلان کی طرف بڑھی چلی جا رہی ہیں اس اندیشہ سے کہ مبادی انصاری سر مطہر کو قبہ تعمیر کردہ امیر الجیوش بدر الجمالی واقع عسقلان سے نکال لیں یا مرتکب بے ادبی ہوں مصر میں منتقل کرنا چاہا اور ایک مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ جو بعد ازاں جامع صالح کے نام سے مشہور ہوئی مقصد یہ تھا کہ اس مسجد کے ایک خاص حصہ میں سر مقدس کو عسقلان سے لا کر دفن کر دیا جائے ۸ جمادی الاول ۵۴۸ھ کو سر مقدس قاہرہ میں لایا گیا اور ۲۰ روز بھی نہ گذرے تھے کہ ۲۷ جمادی الثانی کو عسقلان پر فرنگیوں کا قبضہ ہو گیا۔ بوستانِ کافوری میں جہاں مسجد صالح تھی سر مطہر کو دفن کیا گیا اس پر عالی شان عمارت بنوا کر خوب تزئین و آرائش کی گئی۔ لیکن یہ مسجد باب زیلہ سے کسی قدر فاصلہ پر تھی۔ زائروں کو آمد و رفت میں تکلیف ہوتی تھی۔ اس لئے خلیفہ عاضد لدین اللہ نے سر مقدس کو مسجد صالح سے نکال کر قصر زمرد کے پاس جو خاص اس کے رہنے کا محل تھا۔ دفن کرا دیا اور اس پر عمارت بنوا کر نہایت آراستہ و پیراستہ کیا۔ ۶۴۰ھ ہجری میں اس مشہد مقدس کو آگ سے بہت نقصان پہنچا لیکن جلد ہی درستی کر دی گئی۔

ابن جبیر نے ۵۷۸ھ ہجری میں مصر کی سیاحت کی وہ لکھتا ہے کہ قاہرہ میں مشہد

حسینی کی عمارت نہایت عجیب و غریب اور عمدہ بنی ہوئی ہے۔ سر مبارک ایک منقش تابوت میں مدفون ہے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ جس نے ۷۲۶ھ ہجری میں مصر کا سفر کیا تھا۔ لکھتا ہے کہ قاہرہ میں ایک مقدس مزار مشہد حسینؑ کی عظیم الشان عمارت ہے یہ عمارت نہایت مضبوط اور کواڑوں پر چاندی کے پتر جڑے ہوئے ہیں۔ اس مشہدِ مقدس کا جس قدر احترام کیا جائے کم ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد خالد بن عیسیٰ مغربی نے مصر کا ۷۳۷ھ ہجری میں سفر کیا۔ اس نے اس مشہد کی بہت تعریف لکھی ہے وہ کہتا ہے کہ اس مقصورہ کے چاروں طرف اکثر جھاڑ آویزاں دیکھے جن پر نہایت صنعت سے میناکاری کا کام تھا۔

امیر حسن کتخدا المتوفی نے ۱۱۴۳ھ میں مشہدِ مقدس میں توسیع کرائی آبنوس کی لکڑی کا تابوت بنوایا جس پر سیپ اور چاندی کا نہایت نفیس کام کیا گیا تھا اور اس پر حریر کا غلاف پڑا رہتا تھا۔ ۱۱۷۵ھ ہجری میں امیر عبدالرحمٰن کتخدا کے حکم سے پھر تجدید ہوئی۔ پھر ۱۲۰۴ھ ہجری میں مزید توسیع سید علی الوالوا نے کرائی۔ مصر کے موجودہ خاندان حکمران میں جب عباس پاشا پسر طوسون پاشا نبیرہ محمد علی پاشا حاکم مصر ہوا۔ تو اس نے توسیع کے لئے عمارات بنوانی شروع کیں لیکن وہ ۱۲۷۹ھ ہجری میں مرگیا اس کے بعد خدیو اسمٰعیل پاشا تجدید و تعمیر کی طرف متوجہ ہوا۔ اس ترمیم میں اسمٰعیل پاشا نے گنبد کو تو بحال رکھا مگر بقیہ عمارت کے لئے قسطنطنیہ میں ستون تیار کرائے اور اپنے صرفِ خاص سے عمارات مشہد کی تکمیل کی اور ۱۲۹۰ھ ہجری میں یہ عمارت پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ تابوت پر زرتار غلاف چڑھایا گیا مشہور ہے کہ اس قبّہ کے نیچے تہ خانہ ہے اس میں ایک صندوق کے اندر جو نہایت مزین و منقش ہے۔ سر مبارک رکھا ہوا ہے۔ سید محمود بلہاری سابق شیخ مشہد نے ۱۳۲۱ھ میں اس کا معائنہ کیا تھا۔ پہلے تہ خانہ میں

صندوق تابوت تک جا سکتے تھے لیکن نصاریٰ مصر نے ایک مرتبہ فرق مبارک کو نکال لے جانے کی کوشش کی تھی اس لئے حکومتِ مصر نے تہ خانہ کا دروازہ بند کرا دیا۔

اب یہ مشہد مابین خان خلیلی و جامع ازہر واقع ہے۔ عمارت نہایت شاندار اور خوشنما ہے اس کے وسیع گنبد کے نیچے سنہری کٹہرہ ہے اور اس کے نیچے تہ خانہ میں تابوت کا صندوق ہے، گنبد کے اندر نہایت نفیس سنہری نقش و نگار ہیں اور دیواروں کو کئی قسم کا رنگ دیا گیا ہے مسجد اور تمام عمارات میں اعلیٰ درجہ کا فرش ہے بیش قیمت شیشہ آلات اور جھاڑوں سے بھی آراستہ کیا گیا ہے۔ ہر وقت زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ صدہا مصری حفاظ اور قاری وغیرہ خوش الحانی سے تلاوتِ قرآن مجید میں اور دوسرے نمازی اوراد اور وظائف میں مصروف رہتے ہیں خصوصاً جمعہ کے روز بہت ہجوم رہتا ہے اور تبرکاتِ نبوی کی زیارت کرائی جاتی ہے۔

اسی عمارت کے سلسلہ میں ایک کمرہ کے اندر محملِ مصری جس کے اندر خانہ کعبہ کا غلاف ہوتا ہے۔ شہر میں گشت کرائے جانے کے بعد رکھا جاتا ہے۔ دستور یہ ہے کہ محملِ مصری کا جلوس حجاز کو روانگی سے قبل تمام شہر میں بڑی دھوم دھام سے نکالا جاتا ہے فوج بھی ساتھ ہوتی ہے۔ راستے بھی سجائے جاتے ہیں اس کے بعد دو روز تک اس کو جامع حسینؑ کے ایک مخصوص کمرہ کے اندر رکھا جاتا ہے۔ یہاں سے وہ سویز اور سویز سے بذریعہ جہاز جدہ کو روانہ ہوتا ہے۔ اس مشہدِ مطہر کی دیواروں میں دائروں کی شکل میں آیاتِ قرآنی اور مختلف اشعار سنہری حروف میں لکھے ہوئے ہیں۔

۱۳۱۶ھ ہجری میں بزمانہ خدیو عباس حلمی ان حروف پر پھر سنہرا رنگ چڑھایا گیا۔ قبّہ کے چار دروازہ ہیں ایک بحری جو باب الاخضر تک جاتا ہے اس کے کواڑ دل برتا ہے کے باقی تین دروازوں پر چاندی کے پتر چڑھے ہوئے ہیں قبلہ کی طرف

جو دروازہ ہے اس سے متصل ایک مخصوص کمرہ میں چند تبرکاتِ نبوی رکھے ہوئے ہیں (۱) آنحضرتؐ کی قمیصِ مبارک کا ٹکڑا۔ (۲) آنحضرت کی سرمہ دانی (۳) اس کی سلائی (۴) آنحضرتؐ کے ریشِ اقدس کے دو موئے مبارک (۵) عصائے مبارک کا ٹکڑا۔

صاحبِ عوالم کا قول ہے کہ علمائے امامیہ کا اتفاق ہے کہ سرِ منوّر جسدِ اطہر کے ساتھ ملحق ہے آنحضرت سید الساجدین نے اس کو دمشق سے لاکر نعشِ مقدس سے ملا دیا تھا۔

ان تمام واقعات کی پوری تفصیل قمقام ذخار تحفۃ الزائر کافی اور تہذیب میں ہے۔ ہم بخیالِ طوالت چھوڑتے ہیں اور ان سب مختلف روایتوں کو دیکھتے ہوئے جہاں تک اپنے قیاس اور اجتہاد سے کام لیتے ہیں ہمیں اقرب الی الصورت یہی معلوم ہوتا ہے کہ فرقِ منوّر جسد کے ساتھ ایک ہی مقام پر دفن ہے۔ نجف اشرف میں دفن کئے جانے کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ محبانِ اہل بیت میں سے ایک شخص نے اثنائے راہِ دمشق میں اس سر کو کسی تدبیر سے حاصل کر لیا۔ اور بمقام نجف اشرف جنابِ امیر کے پہلو میں سپردِ زمین کیا۔ مگر یہ روایت اس وجہ کر مستند نہیں سمجھی جاتی کہ اوّل تو حضرت کے سرِ مبارک کا دمشق میں یزید کے پاس جانا مسلّمۂ مورخینِ فریقین ہے دوسرے اس زمانہ میں جنابِ امیر کے مزارِ پُرانوار کا حال سوائے آئمۂ اہل بیت کے اور کسی شخص کو معلوم نہ تھا۔ رہی وہ روایت جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ فرقِ مطہر مدینہ میں دفن ہے یہ اسوجہ سے قرینِ قیاس نہیں کہ یزید کو مدینہ عمر بن سعید کے پاس بھجوانے کی کیا ضرورت تھی اگر اسے یہی منظور تھا تو سید الساجدین کو دیتا۔ یا کربلا میں بھجواتا عسقلان اور قاہرہ میں دفن ہونے کے واقعات بھی یقینی اور متفقہ نہیں جن بزرگواروں نے حضرت سید الساجدین کا کربلا میں آکر سرِ مبارک کو جسدِ مطہر سے ملانا درج کیا ہے۔ وہ یوں نہیں ہو سکتا کہ

سید الساجدین دوسری بار کربلا میں تشریف ہی نہیں لائے اس لئے ہم کو اس روایت کے کہ عمر بن عبد العزیز نے آپ کے سرِ مبارک کو دمشق سے کربلا میں بھجوایا۔ مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اسلام نے سات موقعوں پر قبر کھولنے کی اجازت دی ہے ان میں سے ایک موقعہ یہ بھی ہے کہ جسم کا کوئی ٹکڑا جس میں ہڈی ہو۔ اگر باہر رہ جائے تو قبر کو کھول کر اس کو جسم سے ملا سکتے ہیں کیا عجب ہے کہ عمر بن عبد العزیز کے حکم سے ایسا کیا گیا ہو اور سرِ مبارک جسدِ اطہر سے ملحق ایک ہی سرداب میں دفن ہو۔ دوسرے شہدائے کربلا کے سروں کے متعلق تمام تاریخیں خاموش ہیں اس لئے ہم کو بھی بجز خاموش رہنے کے چارہ نہیں۔

زیارت ناحیّہ کی تنقید

علمائے مورخینِ امامیہ کی اکثر کتبِ مقاتل میں زیارتِ ناحیہ مقدسہ کی یا تو تمامہا نقل موجود ہے یا اسکے مختلف جملوں سے مواقعِ ضروری پر استناد کیا گیا ہے لیکن اس مشہور زیارت کے متعلق جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں وہ بھی قابلِ لحاظ اور غور طلب ہیں اس زیارت کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت صاحب الامرؑ کے سردابِ مبارک سے ایک بزرگوار کو دستیاب ہوئی ہے۔ گویا اس کو حضرت کا کلام اور آپ کا عطیہ سمجھ کر ایک خاص وقعت و اہمیت دی جاتی ہے۔ اور تمام علماء و مشاہیر اس کو بلا چون و چرا تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ سب سے اول اس زیارت کا اظہار علامہ سید علی بن طاؤس کے قلم سے ہوا۔ چنانچہ آپ اپنی کتاب اقبال میں تحریر فرماتے ہیں۔

فصل فیما نذکرہ من زیارۃ الشہداء فی یوم عاشوراء رویناہا

اس فصل میں ہم اس زیارت شہداء روز عاشورہ کا ذکر کریں گے جسے ہم نے

اسنادنا الی جدی ابی جعفر بن
حسن الطوسی رحمۃ اللہ قال
حدثنا الشیخ ابو عبد اللہ محمد
ابن احمد بن عیاش قال حدثنی
الشیخ الصالح ابو منصور بن عبد
المنعم بن النعمان البغدادی رحمۃ
اللہ قال خرج من الناحیۃ سنۃ
اثنین وخمسین ومائتین علی
ید الشیخ محمد بن غالب الاصفہانی
حسین وفات ابی رحمۃ اللہ و
کنت حدیث السن وکتبت
استاذن فی زیارۃ مولای ابی
عبد اللہ و زیارۃ الشہداء رضوان
اللہ علیہم فخرج الی منہ +

اپنی ہی روایتوں سمیت لیا ہے اور جس کی سند ہمارے دادا ابو جعفر کہتے ہیں، کہ ہم سے شیخ ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن عیاش نے اور ان سے شیخ صالح ابو منصور بن عبد المنعم بن النعمان بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ ۲۵۲ھ میں شیخ محمد بن غالب اصفہانی کے ہاتھ پر میرے باپ کے مرنے کے وقت یہ زیارت ناحیہ مقدسہ سے برآمد ہوئی میں اس وقت نوعمر تھا میں نے ایک درخواست لکھی تھی جس میں حضرت امام حسین علیہ السلام اور دوسرے شہداء رضوان اللہ علیہم کی زیارت کی اجازت چاہتا تھا پس یہ زیارت میرے لئے سرداب میں سے نکلی۔

اسی کے لفظ بلفظ علامہ مجلسی نے بحار میں نقل کیا ہے اس کے علاوہ دوسری معتبر و موثق کتابوں میں بھی یہ عبارت اسی طرح بے کم وکاست پائی جاتی ہے۔ ان تمام کتابوں کی متفق علیہ عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ زیارت ناحیہ ۲۵۲ھ میں سرداب سرمن رائے سے دستیاب ہوئی۔ حالانکہ علمائے حضرت صاحب العصر علیہ السلام کی تاریخ ولادت ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ تاریخ امامت ۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ تاریخ غیبت صغریٰ ۱۰ شوال ۲۶۲ھ اور تاریخ غیبت کبریٰ ۲ شعبان

۳۲۶ھ لکھی ہے اس سے صاف اور کھلا ہوا شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت صاحب الامر کی ولادت مبارک ۲۵۵ھ ہجری میں ہوئی اور ۲۶۰ھ میں آپ منصب امامت پر فائز ہوئے تو ۲۵۲ھ میں آپ کی ولادت سے تین سال اور امامت سے دس سال پہلے ناحیہ مقدسہ سے اس کی دستیابی کیونکر ممکن ہے اور ایسی حالت میں اس کو قائم آل محمد کی طرف منسوب کرنا اور اسے خاص آپ کا کلام معجز نظام سمجھ لینا کہاں تک جائز ہو سکتا ہے۔

یہ اشکال دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو ۲۵۲ھ میں دستیابی غلط۔ یا ۲۵۵ھ میں سال ولادت صحیح نہیں لیکن جب تمام مورخین و نسابین کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ کی ولادت مبارک ۲۵۵ھ ہجری میں ہوئی ہے تو ہم اس سال کو غلط قرار نہیں دے سکتے۔ اگر غلط ہے تو سال دستیابی ممکن ہے کہ سال دستیابی ۲۶۲ھ یا ۳۵۲ھ ہو۔ اور سہو کتابت سے ۲۵۲ھ لکھ دیا گیا ہو۔ مگر جب ان تمام کتابوں میں جن کے جلیل القدر مؤلفوں نے اس زیارت کی سند کو نقل کیا ہے بلا تغیر و تبدل یہی عبارت موجود ہے تو اس کو سہو کتابت کیونکر سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ ایسی فاش غلطی پر ان بزرگواروں میں سے کسی نے بھی خیال نہ کیا اور کیا علامہ ابو جعفر طوسی نے محض راوی کے بیان پر اعتبار کر کے اختلاف سنین پر توجہ نہیں کی۔

اس سے قطع نظر کر کے زیارت ناحیہ میں دو باتیں اور بھی قابل غور ہیں ایک یہ کہ اس میں صرف ان شہداء کے نام ہیں جو بروز عاشورہ شہید ہوئے۔ ان ہی میں قیس بن مسہر صیداوی کا بھی نام ہے۔ حالانکہ مورخین فریقین میں کسی نے ان کو شہدائے طف میں شامل نہیں کیا۔ بلکہ اکثر تاریخوں سے یہی پایا جاتا ہے کہ جناب سید الشہداء علیہ السلام نے منزل ثعلبیہ سے ان کو خط دے کر کوفہ روانہ کر دیا تھا۔ اور وہ اثناء راہ میں بمقام قادسیہ گرفتار ہو کر عبید اللہ ابن زیاد کے

پاس بھیج دئے گئے اور اسی کے حکم سے شہید ہوئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ بھی نصرت امام میں ہی مارے گئے تو اس میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عبداللہ بن یقطر کو بھی حضرت نے اسی طرح راستہ میں سے خط دیکر کوفہ بھیجا تھا اور وہ بھی گرفتار ہو کر اسی طرح قتل ہوئے جس طرح قیس بن مہر۔ تو عبداللہ بن یقطر کا نام زیارتِ ناحیہ میں کیوں نہیں نہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کے نام اس زیارت کی فہرست میں ہیں حالانکہ ان دونوں بزرگواروں کی شہادتیں بھی واقعہ کربلا کی پیش خیمہ تھیں۔

دوسرے یہ کہ اس زیارت میں جہاں شہدائے اہل بیت کے اسمائے پاک ہیں وہاں ان کے قاتلوں کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ عبداللہ ابن مسلم بن عقیل کی نسبت لکھا ہے کہ

السلام علی القتیل بن القتیل عبداللہ بن مسلم بن عقیل ولعن اللہ قاتلہ عمر بن صبیح وقیل عامر بن صعصعہ وقیل اسد بن مالک۔

سلام ہو قتیل فرزندِ قتیل عبداللہ بن مسلم بن عقیل پر اور خدا کی لعنت ہو ان کے قاتل عمر بن صبیح پر اور کہا گیا ہے کہ وہ عامر بن صعصعہ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسد بن مالک تھا۔

کلامِ امام میں شک و شبہ کا کیا کام وہاں تو ہر چیز ہر بات اور ہر واقعہ کا یقینی علم ہے اور حضرت سے ہرگز پوشیدہ نہیں کہ عبداللہ ابن مسلم کا قاتل عمر ہے یا عامر یا اسد۔ یہ قیل اور قال جو شک اور تذبذب کو ظاہر کر رہا ہے کہ یہ قولِ امام اور کلامِ حجت خدا ہو سکتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ایسی حالت میں اس زیارت کو کیونکر کلامِ امام اور عطیہ حضرت صاحب العصر علیہ السلام سمجھا جائے۔ ہم نے لکھنؤ کے ایک مجتہد صاحب کی خدمت میں عرضداشت بھیج کر ان شکوک کو

رفع کرنا چاہا تھا لیکن افسوس ہے کہ وہاں سے کوئی شافی اور کافی جواب نہیں ملا۔

ہم ناظرین کرام کے اس خاص طبقہ سے جو زیارت کو عقیدتمندانہ وقعت سے دیکھتا ہے اپنی اس جسارت کی بادب معافی چاہتے ہیں اور مذکورۂ بالا حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم اپنے اس خیال کے اظہار میں معذور ہیں کہ اس زیارت کو حجتِ خدا کی طرف منسوب کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے اور ایک جویائے تحقیق کے اطمینانِ قلب اور ایک معترض کے جواب مسکت کی کیا صورت ہے۔ اور کیا ان تین اختلافات شبہات ونقائص کے ہوتے ہوئے بھی جن کا سوائے تاویلات کے کوئی جواب نہیں ہے، براہِ خوش اعتقادی محض ایک شخص کے اتنا کہہ دینے سے کہ میں نے اس زیارت کو سرداب شریف کے ایک کونہ میں رکھا ہوا پایا۔ بلا کسی حجت وبرہان اور بغیر کسی ثبوت واطمینان کے اس کو خاص حضرتِ صاحب الامر علیہ السلام کا کلام معجز نظام سمجھا جا سکتا ہے۔ فافہم وتدبر۔

چند شبہات اور اعتراضات کے جواب

شبہ اول:- یزید دوسرے سلاطینِ عالم کی طرح ایک دنیادار بادشاہ تھا۔ اس نے وہی تدبیریں اختیار کیں جو تحفظِ سلطنت کے لئے دنیا کے تمام تاجدار کرتے آئے ہیں حسین علیہ السلام کی مسلمانوں کی نظروں میں ایک خاص عظمت و وقعت اور آپ کا اس کی بیعت واطاعت سے انکار خصوصاً ایسی حالت میں کہ آپ پیغمبر اسلام کے نواسہ اور اسلامی خلافت کے اصلی وحقیقی وارث تھے ایک کھٹکتی ہوئی بات اور خوفناک مرحلہ تھا۔ ماہرانِ علم سیاست اور مدبرانِ امور سلطنت کسی ایسے وجود کی بقا کو جو سلطنت کے لئے خطرہ کا باعث ہو کبھی گوارا نہیں کرتے۔ یہ سیاست مدن کا مسلّمہ مسئلہ ہے جس سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں۔ ایسے واقعات سے تمام قوموں کی

تاریخیں پڑھیں اور رات دن ایسے قضیئے پیش آتے رہتے ہیں۔ حکومت وسلطنت تو بڑی چیز ہے۔ حقیت اور ملکیت کے خفیف اور معمولی تنازعات میں۔ بھائی بھائی سے۔ بیٹا باپ سے۔ عزیز عزیز سے دوست دوست سے کیا نہیں کر گزرتا یزید ہی پر کیا موقوف ہے اس کی جگہ جو کوئی ہوتا ایسا ہی کرتا۔ پھر یزید نے کیا برا کیا۔ بلکہ اصولِ ملک داری اسے ایسا ہی کرنے پر مجبور کر رہے تھے اور وہ اس کے سوا کر ہی کیا۔ دنیا کی تاریخ کو دیکھتے ہوئے یہ حادثہ کوئی نئی بات نہیں۔ پولیٹیکل اور سیاسی جھگڑوں میں ایسا ہی ہوتا ہے بلکہ ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے۔ اب ہو رہا ہے۔ اور آئندہ ہوتا رہے گا۔

جواب:۔ بے شک علم سیاست وریاست کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے۔ اور ہم کو اس کی معقولیت سے انکار نہیں۔ تحفظِ سلطنت وحکومت کے لئے کسی تشدد کو تشدد اور کسی خوں ریزی کو خوں ریزی نہیں سمجھا جاتا۔ خود غرضی اور ہوا و ہوس انسانی فطرت میں داخل ہی، دنیا میں جب تک نسلِ انسانی قائم ہے۔ اس قسم کے واقعات ہمیشہ رونما ہوتے رہیں گے۔ مگر جو شخص اس اعتراض کو پیش کرے یا جس کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو۔ اس کو تمام واقعات پر جو امیر معاویہ کے انتقال کے بعد یزید اور حضرت امام حسینؑ کے درمیان روزِ ازل سے وقوع پذیر ہوئے ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ یزید کی ولی عہدی کو تسلیم کرنے سے فرزندِ رسول اللہ کو روزِ ازل سے کراہ و انکار تھا۔ مگر اس انکار میں تین سردارانِ حجاز اور دنیائے اسلام کے سربرآوردہ ارکین اور بھی شامل تھے ان میں سے عبد الرحمٰن بن ابی بکر کا انتقال امیر معاویہ کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا۔ مگر یزید نے تخت نشین ہوتے ہی جو حکم نامہ گورنر مدینہ کے نام بھیجا اس میں گو عبد اللہ ابن عمر اور عبد اللہ ابن زبیر کے نام بھی تھے۔ تاہم حسین ابن علی کے نامِ نامی کو خصوصیت

سے جگہ دی گئی تھی اور کھلے الفاظ میں درج تھا۔ کہ یا تو ان سے فوراً بیعت لے لی جائے۔ ورنہ ان کا قلم سر کر کے ہمارے پاس روانہ کر دیا جائے۔ اس تخصیص کی وجہ قابلِ لحاظ اور لائق غور ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ابن عمر اور ابن زبیر صرف صحابی زادے تھے۔ اور حسین فرزندِ رسول اللہ۔ ایسے وہ دونوں بزرگوار نہ تو مسلمانوں کی نظروں میں حسینؑ کے ہم پلہ ہو سکتے تھے۔ نہ ہم رتبہ۔ اگر وہ دونوں بیعتِ یزید کر بھی لیتے اور صرف حسین کو انکار رہتا۔ تو بھی یزید کے سیاسی خطرہ میں کمی نہ ہوتی اور اگر صرف حسینؑ ہی اس کی بیعت کر لیتے تو اس کو نہ پھر ابن عمر کی بیعت کی ضرورت رہتی اور نہ ابن زبیر کی بیعت کی پروا لیکن یہ شکوک جو خیالِ باطل اور وہم لاحاصل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ ان کی تردید کو خود واقعات کا سلسلہ موجود ہے سب سے اول ان تینوں بزرگوں کے انکارِ بیعتِ یزید کی نوعیت پر غور کرنا لازم ہے۔ عبد اللہ ابن عمر کا انکار محض عارضی یا دکھاوے کا انکار تھا۔ کیونکہ انہوں نے واقعہ کربلا کے بعد ہی بہت جلد بیعتِ یزید کا شرف حاصل کر کے اس کی خلافت کو تسلیم کر لیا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے پُر جوش اور سرگرم حامی بن گئے تھے۔ اور اہتمام کے ساتھ مخالفینِ یزید کو اس کی اطاعت پر ترغیب دیتے تھے چنانچہ صحیح بخاری۔ صحیح مسلم اور جامع الاصول ابن اثیر جزری میں ہے۔

عن نافع قال لما خلع اهل المدینة یزید ابن معاویه جمع ابن عمر حشمه وولده فقال انی سمعت النبی صلی اللہ علیه وآله وسلم یقول ینصب لکل غادر لواء یوم القیامة وانا قد بایعنا هذا

نافع سے مروی ہے کہ جب اہلِ مدینہ نے یزید ابن معاویہ سے خلعِ بیعت کیا تو حضرت عبد اللہ ابن عمر نے اپنی اولاد اور متعلقین کو جمع کیا اور ان کو ہدایت کی کہ سنو میں نے رسول اللہ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر غدر کرنے والے کے لئے قیامت

لرجل علیٰ بیعۃ اللہ ورسولہ وانی لا اعلم عذرا اعظم من ان یبائع رجل علیٰ بیعۃ اللہ ورسولہ ثم ینصب الیہ القتال وانی لا اعلم احدا منکم خلعہ ولا تابع فی ھذا الامر الا کانت الفیصل بینی وبینہ

کے روز ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا۔ تم جانتے ہو کہ میں نے یزید کی بیعت حسبِ اطاعت واتباع خدا ورسول کی ہے اور میں نہیں جانتا کہ اس سے زیادہ کوئی عذر ہے کہ جس شخص کی اس طرح بیعت کی جائے پھر اس کے خلاف ہتھیار اٹھائے جائیں پس جو شخص یزید کی بیعت شکنی کریگا، اور میرا کہنا نہ مانے گا۔ میں اس سے بیزاری اختیار کروں گا۔

ان کے ارادہ اور خیالات میں ایسا تغیر عظیم کیوں ہوا۔ اس کی وجہ بظاہر یہی ہوسکتی ہے کہ وہ جنگ وجدال اور شور وشر سے برکنار اور ایک تارک الدنیا اور امن پسند بزرگوار تھے۔ ان کے کانشنس نے گوارا کر لیا کہ یزید کی بدافعالیوں سے قطع نظر کر کے اس کی خلافت کو تسلیم کرنے میں عام مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ رہے عبداللہ ابن زبیر۔ وہاں مطلب سعدی دیگر بود۔ وہ خود خلافت کے خواہاں اور امیدوار تھے بلکہ یہ بھی سمجھے ہوئے تھے کہ یزید کی بدچلنی اور بداطواری سے تمام دنیائے اسلام آگاہ ہے اس لئے تقدس کی آڑ میں اپنا کام نکالنا چاہیئے۔ چنانچہ ان کو ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ البتہ حسینؑ ہی ایک ایسے بزرگوار تھے جن کا انکار سچا انکار۔ اور اسلامی حمایت پر مبنی تھا۔ اور باوجود قدم کو ڈگمگا دینے والی سختیوں کے جوں جوں تشدد بڑھتا گیا ان کے ارادہ عزم اور ثابت قدمی کو استحکام اور ثقل حاصل ہوتا گیا لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ حسینؑ کا انکار خطرہ کا پہلو لئے ہوئے تھا حسین طالب دنیا نہ تھے۔ اگر ان کو مجبور نہ کیا جاتا تو مدینہ یا مکہ میں اپنی زندگی خاموشی سے نیوٹرل طریقے سے بسر کر دیتے حسین کی زندگی مذہبی زندگی تھی نہ کہ سیاسی جس سے یزید

یا اس کی سلطنت کو خطرہ ہوتا۔ بقول مسٹر جان لونگ وہ یزید سے صرف اس لئے بیزار تھے کہ اس کا چال چلن شرع اسلام کے خلاف تھا ورنہ ان کو اس کی سلطنت وحکومت سے کچھ تعرض نہ تھا۔ اگر یزید حسین سے پرخاش نہ کرتا۔ تو حسینؑ کی زندگی ایک خاموش اور بے ضرر زندگی تھی لیکن افسوس ہے کہ اس نے ایسا نہ کیا اور محض خیالی اور قیاسی شکوک پر خود چھیڑ چھاڑ کی ابتدا کی۔

تمام واقعات خود پکار کر کہہ رہے ہیں کہ حسین نے کسی وقت بھی قولاً اور فعلاً کوئی بات ایسی نہیں کی جس سے یہ پایا جائے کہ وہ متمنی خلافت تھے۔ یا یزید کی حکومت کو الٹ دینا چاہتے تھے۔ وہ کیا چیز حسین کے پاس تھی جس سے یزید کو خوف ہوتا۔ فوج، حکومت۔ روپیہ کچھ بھی نہ تھا۔ البتہ حکومتِ قلوب باقی تھی لیکن حسینؑ کی بیخ کنی کی کوشش کچھ اس بنا پر نہ تھی کہ وہ خلافت کے مدعی ہوں گے۔ یا ان سے کسی قسم کی مخالفت کا اندیشہ تھا بلکہ تجربہ اس کا شاہد تھا کہ وہ ہرگز مخالفت نہ کریں گے۔ اور خاموش رہیں گے۔ خوف ان کی کسی عملی مخالفت سے نہ تھا۔ بلکہ ان کا دنیا میں لوگوں کے سامنے رہنا ہی افرادِ حکومت کے نزدیک خطرہ کی چیز تھی حسینؑ کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ کہ وہ کیوں ایسے ہیں اس کے لئے وہ اپنی روش سے تو اطمینان دلا سکتے تھے۔ مگر حکومت کا اندیشہ دور کرنے کے لئے قومی اور دینی خودکشی نہ کر سکتے تھے حسینؑ کے لئے یہ بات امکان سے باہر تھی کہ وہ ایک فاسق وفاجر کی علانیہ بیعت کر کے اس کو خلیفہ رسول تسلیم کر لیتے۔

اگر تمام واقعات پر نظر غائر ڈالی جائے تو خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ انکارِ بیعت کا بہانہ محض دھوکے کی ٹٹی اور اپنے موروثی عناد کا انتقام لینے کے لئے دنیا دکھاوے کی آڑ تھی۔ تمام حالات پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یزید کو حضرت سے دلی کاوش اور خاندانی بغض تھا۔ اسے بغیر آپ کے قتل کئے چین ہی نہ تھا آپ کا وجود باجود

اس کی مردانہ اور فاسقانہ کارروائیوں میں سخت حارج تھا۔ اگر اس کو صرف ملکی مصلحتوں سے قتل جناب سید الشہداء ہی منظور تھا۔ تو آپ کے اہلِ حرم کے ساتھ جو لوگ کے نبی کی ذریت اور آل تھی۔ ایسے گستاخانہ برتاؤ کا مرتکب نہ ہوتا ان کو سر دربار رُوبکاری میں نہ بلاتا۔ رسول اللہ کی بہو بیٹیوں کو شہر بہ شہر نہ پھراتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مصالح ملکی کا محض ایک بہانہ یا حیلہ تھا۔ ورنہ درحقیقت اس کو خاندانِ نبی کا استیصال اور اہانت و تذلیل مدنظر تھی۔ اور جو کچھ اس سے ہو سکا کمی نہ کی۔ اس کے عندیہ اور مافی الضمیر کا اظہار خود اسی کے اشعار سے ظاہر اور آشکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب حضرت کا سرِ مبارک اسکے سامنے لایا گیا تو اس وقت اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی اس کو بار بار لبِ دندانِ مطہر پر لگا کر یہ اشعار پڑھتا جاتا تھا۔

لیت اشیاخی ببدر شہدوا ... وقعۃ الخزرج مع وقع الاسل
لعبت ہاشم بالملک فلا ... خبر جاء ولا وحی نزل
لست من خندف ان لم انتقم ... من بنی احمد ما کان فعل
قد اخذنا من علی ثارنا ... وقتلنا الفارس اللیث البطل
وقتلنا القرن من ساداتہم ... وعدلناہ ببدر فانعدل
فجزیناہم ببدر مثلہا ... وباحد یوم احد فاعتدل
لو راوہ لاستہلوا فرحا ... ثمّ قالوا یا یزید لاتشل
وکذاک الشیخ اوصانی بہ ... فاتبعت الشیخ فیما قد سئل

ترجمہ:- کاش میرے وہ بزرگ آج موجود ہوتے جو جنگِ بدر میں تھے! اور جنہوں نے خزرج واسل کے قتل و واقعات کو دیکھا تھا۔

"آل ہاشم (یعنے آلِ رسول اللہ) نے ملک کے ساتھ کھیل کھیلا نہ کوئی خبر آئی تھی۔ نہ وحی نازل ہوئی"

ہیں خندف سے ہوں۔ اگر بدلہ نہ لوں بنی احمد سے جو کچھ انہوں نے کیا تھا۔ کو

ہم نے علی سے اپنا انتقام لے لیا اور بہادر و جوانمرد سوار کو قتل کر ڈالا (یعنے حسینؑ)

ہم نے ان کے بڑوں میں سے جوان مرد کو قتل کیا اور اپنے مقتولین بدر کے ساتھ برابری کر دی۔

ہم نے ان سے جنگِ بدر کے مقتولین کا بدلہ لیا اسی طرح اور جنگِ اُحد کا اُحد کے دن کی طرح پس ہم اور وہ برابر ہو گئے۔

اگر آج وہ ہوتے تو ماری خوشی کے ان کی باچھیں کھل جائیں۔ اور کہتے کہ یزید تیرے ہاتھ شل نہ ہوں۔

مجھ کو اسی طرح میرے شیخ باپ نے وصیت کی تھی پس قتلِ فرزند رسول میں میں نے اپنے باپ کی خواہش کی پیروی کی۔

(دیکھو روضۃ الاحباب۔ شرح نہج البلاغۃ۔ تاریخ مسعودی۔ تاریخ اعثم کوفی تاریخ طبری۔ تاریخ واقدی۔ مراۃ الجنان یافعی۔ فصول المہمہ بن صباغ مالکی صواعق محرقہ ابن حجر مکی۔ تذکرہ خواص الامۃ ابن جوزی وغیرہم)

علم السیاست نے صرف ان لوگوں کے استیصال کو اصولِ جہانبانی کا جزو اہم قرار دیا ہے جن سے تحریراً یا تقریراً۔ قولاً یا فعلاً سلطنت کو کوئی خطرہ ہو۔ جو بادشاہ یا گورنمنٹ کے خلاف ہتیار اٹھائیں ان کی بڑھتی ہوئی طاقت ذاتی رسوخ اور عام اثر سے شورش و انقلاب کا احتمال ہو یا ایسے قرائن و اسباب موجود ہوں جن سے نقصِ امن کا اندیشہ کیا جا سکے۔ صرف قیاسات و احتمالات کسی کے تخریب و تفریب کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔ بلا کسی وجہ موجہ کے کسی سفاکانہ تشدد کو تدبیر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ مردم آزاری کا نام جہانداری نہیں ہے۔ وحشیانہ خونخواری اور بہیمانہ درندگی کو اصولِ سیاستِ مدن سے کیا علاقہ۔

جیسا کہ ہم اوپر تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔ حضرت کی روش محض دفاعی تھی۔ نزاعی نہ تھی۔ نہ آپ کی ذات سے یزید کو کسی قسم کا خدشہ ہونے کی کوئی وجہ پائی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اس ظالمانہ سفاکانہ وحشیانہ اور انتقامانہ برتاؤ کو جو آپ کے ساتھ برتا گیا، سیاسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا ایک فاش غلطی اور تمام سلسلہ واقعات سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی نہیں تو اور کیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت نے ان لوگوں کی جو سلطنت کے خلاف شورش پر آمادہ تھے۔ سربراہی منظور فرما کر اول مسلم ابن عقیل کو نمایندہ بھیجا۔ پھر خود کوفہ کو روانہ ہوئے اسی طرح آپ کی جانب سے پیشقدمی کا آغاز ہوا۔ تو ارباب سلطنت سوائے ان کارروائیوں کے جو اس نے کیں اور کیا کرتی۔

لیکن صورت معاملات ان توہمات کے برعکس ہے جن وجوہ سے حضرت کوفہ کی طرف نقل و حرکت پر مجبور ہوئے وہ بہت صاف ہیں اور ہم ان کو اس وقت تحریر کرنے کی ضرورت نہیں۔ حضرت کی طرف سے ابتدا ہرگز نہیں ہوئی بلکہ شروع ہی سے ان معاملات کی ذمہ داری کا بار یزید پر ہے یہ شبہ اس وقت صحیح ہو سکتا تھا کہ جب حضرت کے کسی قول و فعل سے عملاً ایسے رویہ کا کوئی ثبوت ملتا۔ چھیڑ چھاڑ کی ابتدا یزید کی طرف سے ہوئی اور وہ بھی (جیسا کہ خود اسی کے اشعار سے ثابت ہے) محض خاندانی عداوت اور موروثی عناد کی بناء پر نہ کہ کسی سیاسی ضرورت کی وجہ سے البتہ حضرت نے جو کچھ کیا بحالت مجبوری کیا کیونکہ آپ کو یقین کامل ہو چکا تھا۔ کہ میں قتل سے کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ یہی سبب تھا کہ بقول اعثم کوفی آپ نے ابن عباس، ابن عمر، اور محمد حنفیہ سے صاف فرما دیا تھا کہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ لوگ مجھ کو گھر میں بیٹھنے نہ دیں گے۔ مجھ سے الجھیں گے اور اگر میں ان سے نکل کر کسی نامعلوم مقام پر بھی چلا جاؤں گا۔ تو بھی ڈھونڈھ نکالیں گے۔ اور بیعت یزید کے لئے مجبور کریں گے۔ اور اگر انکار کروں گا۔ تو قتل کر ڈالیں گے۔ المختصر یزید

یزید نے جو کچھ کیا۔ سیاسی حیثیت سے نہیں کیا بلکہ محض خاندانی عناد کی وجہ سے خاندان رسالت کا استیصال منظور اور ان حضرات کی توہین و تذلیل مدنظر تھی لہذا ہم اس واقعہ کو قانون سیاست کی کسی دفعہ کے تحت میں نہیں پاتے، اور نہ دوسرے سلاطین عالم کی نظیر اس پر منطبق ہو سکتی ہے۔

شبہ دوم:۔ عبیداللہ ابن زیاد یا دوسرے کوئی سردار جن مظالم یا بے ادبیوں کے مرتکب ہوئے وہ محض یزید کو راضی کرنے یا خوشامد کی وجہ سے تھا۔ عبیداللہ حاکم صوبہ اور یزید کی طرف سے اس مہم کی سرانجام دہی پر مامور تھا۔ ظاہر ہے کہ المامور معذور ورنہ ان لوگوں کو حضرت سے کوئی ذاتی کاوش نہ تھی۔ تمام گورنمنٹوں کے ملازم اور ہوا خواہ ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔

جواب:۔ مانا کہ عبیداللہ اور دوسرے کوفیوں نے حق نمک یا خوشامد سے طوعاً و کرہاً ایسا کیا لیکن کوئی شخص ایسی تاویلی حجت پر مظلمۂ دنیا و آخرت سے بری نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک تمام واقعات پر نظر ڈالی جاتی ہے اور تاریخی شہادتیں ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان لوگوں نے خود وہ زیادتیاں کیں کہ شاید یزید ان کی اجازت نہیں دیتا، وہ اپنے افعال کی پاداش میں عنداللہ اور عندالناس بے شک قابل گرفت ہیں۔ خصوصاً ابن زیاد اور شمر جیسوں نے جس طرح کی قساوت اور شقاوت کا اظہار کیا۔ شاید یزید کے خیال میں بھی یہ باتیں نہ آئیں۔ تو کیا اس خوشامد یا ادائے حق نمک اور تعمیل حکم حاکم کے حیلے سے وہ لوگ بری الذمہ قرار پا سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ؎

شبہ سوم:۔ بے شک ان لوگوں نے براہ تملق یا اپنی کارگذاری کا اظہار کرنے کو عدیم المثال مظالم کا ارتکاب کیا لیکن جو سختیاں اور بے ادبیاں ان کی طرف سے ظہور میں آئیں ان کا یزید کو کس حد تک ذمہ دار سمجھا جائے ذرا خیالیکہ

یزید کی جانب سے اس کے عامل کوفہ کے نام تفصیلی ہدایات کا آنا۔ پایا نہیں جاتا۔ اس زمانہ میں گورنرانِ صوبہ جات کو ہر قسم کے ملکی و جنگی اختیارات تھے۔ وہ جس طرح مناسب سمجھتے صوبوں کا انتظام کرتے۔ یزید نے عبیداللہ کو گورنری کوفہ پر مامور کرتے وقت کوئی ایسا تفصیلی حکم نہ بھیجا تھا کہ حسینؑ کے ساتھ ایسا اور ایسا کرنا بلکہ اس کو صرف یہی حکم تھا کہ کوفہ میں جو انقلاب انگیز کوششیں کی جاری ہیں۔ اور جو لوگ سلطنت کے خلاف ہتیار اٹھانے والے ہیں انہوں نے مسلم کے ہاتھ پر حسینؑ کی بیعت کر لی ہے۔ اور حسینؑ خود کوفہ کو آنے والے ہیں۔ اس شورش کا جس طرح ممکن ہو انسداد اور دفعیہ کرے۔ چنانچہ عبیداللہ نے ایسا ہی کیا۔ بلکہ اپنی ذاتی خباثت اور شقاوت سے حکم کی تعمیل اس طریقہ سے کی جو اپنی درندگی کے لحاظ سے تاریخ عالم میں نظیر نہیں رکھتا۔ ایسی حالت میں ان تمام مظالم کا بار یزید کے سر پر کیوں ڈالا جاتا ہے۔

جواب:۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ یزید نے ایسے سفاکانہ احکام بالتفصیل نہیں بھیجے مگر وہ اس جرم سے یوں بری نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ ہوا۔ اس کے حکم اور اس کی مرضی سے ہوا۔ میدانِ جنگ میں جو مواقع پیش آتے ہیں۔ اور ذمہ دار افسر جو جا و بے جا کارروائیاں کر گزرتے ہیں ان کے متعلق تفصیلی ہدایات مرکزی گورنمنٹ سے نہیں دی جاتیں لیکن ان کا بار ہمیشہ مرکزی گورنمنٹ پر ہوتا ہے۔ اگر یزید ایسا حکم خواہ وہ اجمالی ہی سہی نہ دیتا تو ان مظالم کی نوبت ہی کیوں آتی۔ مامور کی کارروائیوں کی جوابدہی آمر ہی کو کرنی پڑتی ہے بلکہ ان تمام مظالم اس کی رضامندی صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے ماتحت افسروں کی کارگذاری سے بہت خوش ہوا۔ شاہانہ دربار آراستہ کیا۔ رسول اللہؐ کی ذریت اور ان کی نواسیوں کو دربار عام میں بلایا۔ رعونت اور خشونت سے پیش آیا۔ اور

اگر دنیا کے دکھاوے کے لئے اپنی بریت کی کوشش بھی کی تو صرف اتنا کہہ کر ٹال دیا کہ خدا ابن مرجانہ پر لعنت کرے کہ اس نے ایسے امر شنیع کا ارتکاب کیا۔ حبیب السیر میں لکھا ہے کہ:۔

"چوں یزید ملعون شنید کہ مردمان بر قتل امام حسین علیہ السلام تنفر میں ہمی کردند شمر و ہمراہانش برحسب ظاہر خشونت در زید و گفت سوگند با خدائے در اطاعت شما بدونِ قتل حسینؑ خوشنود بودم لعنت بر پسر مرجانہ باد کہ با حسینؑ امری اقدام نمود۔"

لیکن یہ سب باتیں محض مکاری اور حیلہ جوئی کی تھیں۔ ابن اثیر تاریخ کامل میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جب سر مبارک یزید کے پاس لایا گیا تو اس نے ابن زیاد کا مرتبہ بڑھایا اس کو انعام دیا اور اس کام سے بہت خوش ہوا۔"

اسعاف الراغبین اور صواعق محرقہ میں تحریر ہے کہ یزید نے صرف دنیا کے دکھانے حضرت امام حسینؑ کے حال پر اظہار ترحم کیا تھا۔ کیونکہ در پردہ اس کے خلاف اس سے باتیں ظہور میں آئیں کہ اس نے ابن زیاد کی تعظیم و ترفیع میں مبالغہ تام کیا حتیٰ کہ اس کو محلسرائے شاہی کے اس زنانہ حصہ میں۔ جہاں کوئی شخص نہیں جا سکتا تھا۔ بلوایا۔ یزید کا یہ کہنا کہ اگر میں حاضر ہوتا۔ تو حسینؑ کو معاف کر دیتا۔ براہِ نفاق و فریب دہی عوام تھا اور نہ اس نے قاتلانِ حسینؑ سے کسی قسم باز پرس نہیں کی۔ صرف ایک شخص کو جس نے سر مبارک پیش کرتے ہوئے فخریہ اشعار پڑھے تھے قتل کرا دینا بیان کیا جاتا ہے مگر اس کی وجہ بھی یہ پائی جاتی ہے کہ اس نے حضرت کو خیر الناس کہا تھا۔ پھر ان مظالم کی ذمہ داری یزید پر عائد نہ ہوگی تو کس پر عائد ہوگی جیسا کہ شمر نے بھی سر دربار یزید کو ہی ملزم قرار دیا تھا۔

شبہ چہارم۔ جب بقول علماء امامیہ خوفِ جان وخوف مال خوف آبرو کے وقت تقیہ ضروری ہے اور تمام انبیا خصوصاً امیر المومنین اور دوسرے ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے ضرورت کے وقت ایسا کیا تو پھر کیا وجہ تھی کہ امام حسین علیہ السلام نے جان ومال وآبرو تینوں کی بربادی وتباہی منظور فرمائی اور تقیۃً بیعت یزید کرکے کیوں اس بلا کو سر سے نہ ٹالا۔ جیسے کہ علی مرتضیٰؑ اور حسنؑ مجتبیٰ نے کیا تھا۔

جواب:۔ یہ بات قابل غور ہے حسینؑ کی حالت کا موازنہ سابقہ حالتوں سے نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ دونوں بزرگوار بیعت پر مجبور نہ کئے گئے تھے نہ اس کا زمانہ ہتکِ اسلام کا زمانہ تھا حسینؑ اگر تقیۃً بھی ایک فاسق وفاجر کی بیعت کر لیتے تو بھی اس بیعت کا وہی اثر دنیائے اسلام پر پڑتا۔ جو حقیقی بیعت کا پڑتا اور وہ اسلام کے لئے سم قاتل ہوتا۔ اگر یزید بیعت پر مجبور نہ کرتا تو حسینؑ کی زندگی اسی طرح بسر ہوتی جس طرح علیؑ اور حسنؑ کی ہوئی تھی۔ لیکن نہیں اب سلطنت کی پالیسی دوسرے ڈھانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی۔ علی مرتضیٰؑ اور حسن مجتبیٰؑ کے ہمعصر حکومتوں نے ظاہری تشدد کو خلاف مصلحت سمجھا تھا۔ لیکن یزید نے اپنے سابقین کی مصلحت سے قدم آگے بڑھایا۔ اس لئے حضرت کا وہ موقعہ نہیں رہا تھا۔ جو آپ کے برادرِ عالیمقدار کو رہا تھا۔ تاہم حسینؑ اپنے ہر عمل سے ظاہر کر رہے تھے کہ ہم اپنے بزرگوں کی طرح خاموش رہیں گے۔ اگر ہمارے ساتھ بھی وہی مصلحت برتی جائے گی جو برتی جا چکی یعنی جس طرح انہوں نے بیعت کرکے خود کو حکومت کے افعال کا پیرو اور ذمہ دار بنانا قبول نہیں کیا اسی طرح ہم یزید کی بیعت کرکے اس کے افعال کو امت محمدیہ کی نگاہ میں مستند نہیں قرار دے سکتے گو اتنی آڑ کا ہونا اس وقت اسلامی روح کی ترقی کا باعث نہ بھی رہتا۔ ہم لوگ آپ کی عدم بیعت یا علیحدگی

سے اتنا ضرور خیال کر سکتے تھے کہ آخر کسی خاص وجہ سے اہل بیت رسول کا خلیفہ وقت کی نسبت ایسا خیال ہے۔ اسلام کی حقیقی روح کی اسی قدر بقا تھی۔ مگر حضرت کا بیعت کر لینا خواہ وہ تقیۃً ہی ہوتا اس روح کو فنا کر دینا تھا جیسے علی مرتضیٰؑ اور حسن مجتبیٰ نے استیجال خیز وقتوں میں قائم رکھا تھا اصلاب شامخہ اور ارحام طاہرہ کی توریث معروف ومنکر کی تعلیم اپنے جدِ بزرگوار پدرِ نامدار اور برادرِ عالیمقدار کی تربیت کے بعد یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ حسینؑ یزید کے سامنے جھک کر ان تمام اصول کو فنا کر دیتے اور اس بڑے اور کٹھن امتحان کے وقت خوف یا لالچ سے اصول وخاصہ کی قربانی منظور فرما لیتے حسین نے ایک روشن ضمیر مدبر کی طرح اپنے ارادہ کے نتائج کو تمام دنیا پر ظاہر کر دیا۔ اور باوجود جان ومال وآبرو کے نقصانِ کامل کے اپنے علوئے نفس حمایت اسلام اور احقاق حق کی وہ شاندار اور تابناک نظیر قائم کی جس کے سامنے اولین وآخرین کے استقلال اور عزم کے افسانے گرد ہیں۔

شبہ پنجم۔ جب جناب امیر نے امیر معاویہ سے مصالحت کر کے پنچائتی فیصلہ کو منظور کر لیا۔ اور حضرت امام حسنؑ نے خلافت سے بالکل ہی دست بردار ہو کر عرب وعراق اور فارس بھی بنی امیہ کے حوالے کر دئے تو حضرت امام حسینؑ کو پھر اسی دعوے کو سرسبز کرنے کی کیا ضرورت تھی اور جب نہ ان کے پاس لشکر ہی تھا نہ سامان تو پھر ایسے شخص کے خلاف جس کی حکومت سرحد کوہستان ہندوکش سے قسطنطنیہ کی دیواروں تک اور بحر ہند سے بحر ظلمات تک پھیلی ہوئی تھی۔ جارحانہ کارروائی میں سوائے تباہی وبربادی کے کیا نتیجہ نکلا۔

جواب ۱:۔ درحقیقت یہ خیال محض غلط ہے۔ حضرت نے ہرگز ایسی کوشش نہیں کی کہ یزید کی حکومت کو الٹ دیں۔ خلافت دراصل نیابت رسول اللہ کا نام ہے نہ کہ حکومت وسلطنت کا اور اگر یہی مانا جائے تو آپ جناب ختمی مآبؐ کے

نواسے اور بہ مقابلہ یزید ہر طرح خلافت و امارت کے اہل تھے۔ اور اس منصب جلیل کا وراثۃً آپ کے سوا کوئی مستحق نہ تھا۔ اور نہ ہو سکتا تھا۔ اگر حضرت اپنے طلب حق کے لئے کوشش بھی کرتے۔ وہ ہر طرح جائز تھی۔ یزید کے باپ نے جب حضرت امام حسنؑ سے معاہدہ کیا تو اس میں ایک شرط یہ تھی کہ امیر معاویہ اپنی زندگی تک خلیفہ رہیں۔ ان کے بعد امر خلافت پھر اپنے مرکز یعنے اہل بیت رسالت کی طرف عود کرے جیسا کہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں اور ابن عبدالبر نے استیعاب میں اس کی صراحت کی ہے۔ لیکن انہوں نے خلاف ورزی کر کے یزید کو اسلامی دنیا پر مسلط کر دیا۔ یزید کی حکومت غاصبانہ فاسقانہ بلکہ مرتدانہ تھی ایسی حالت میں کہ فرماں روائے وقت کی جو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کے لقب سے پکارا جاتا تھا رندانہ اور فاجرانہ حرکات و سکنات کا اثر بڑی تیزی کے ساتھ مسلمانوں میں اشاعت پذیر ہوتا جاتا تھا۔ ضرور تھا کہ ہادیِ عالم کا نواسہ اور وارثِ مستحق جس کے جدِّ امجد نے بڑی جانفشانی سے دین برحق کی اشاعت فرمائی تھی۔ حق کو اپنے مرکز پر قائم کرنے کے لئے ساعی ہو۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اپنے حق کے لئے کوشش کرنا کس طرح ناجوازی کا مرادف وہم معنے ہو سکتا ہے تاہم کبھی آپنے خلافت ظاہریہ کے واسطے کوشش نہیں فرمائی لیکن مخالفین نے چین سے بیٹھنے نہیں دیا اس کے بعد جو کچھ آپ نے کیا بحالتِ مجبوری کیا اور اس کے محرک وہ اسباب تھے جن کو ناظرین ہمارے متعدد بحثوں میں پڑھ چکے ہیں۔

شبہ ششم: جن لوگوں نے آپ کو براہِ خیر خواہی اور ہمدردی روکنا چاہا یا صرف مکہ میں قیام کی صلاح دی۔ یا سفر عراق سے مانع ہوئے ان کے مشورہ پر آپنے عمل نہ کیا۔ عبداللہ ابن عباس کی اس باوقعت رائے پر بھی کہ پہلے آپ اپنے دوستوں کو بذریعہ خطوط اطلاع دے کر اپنا ہمخیال بنائیں۔ یا کم سے کم یمن میں جہاں آپ کے ہوا خواہ بکثرت ہیں اول تشریف لے جا کر ان کی جمعیت کے ساتھ ارادہ عراق فرمادیں۔ آپ متوجہ نہوئے یہ تو دیدہ و دانستہ ہلاکت میں پڑنا تھا۔ اگر ایسا نہ تھا تو کیا تھا۔

جواب:۔ حرمین شریفین میں حضرت کا قیام ممکن نہ ہونے کے وجوہ پر ہم بحث کر چکے ہیں جب حرمین میں ایسے اسباب موجود تھے تو ابن عباس۔ ابن جعفر ابن عمر وغیرہم کا مدینہ واپس چلنے یا مکہ میں رہنے کی صلاحیں دینا سوائے محبت نیک نیتی اور ہوا خواہی کے اور کس امر پر محمول ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ مذکورۂ بالا بزرگوار یا تو واقعات سے ناواقف تھے یا ان سے چشم پوشی کر رہے تھے۔ کیا حسینؑ مدینہ سے جلا وطن ہو کر نہ آئے تھے۔ اور کیا مکہ میں ان کی گرفتاری کی تجویزیں نہیں ہو رہی تھیں حسینؑ بیعت ہرگز نہ کرتے۔ اور شہید ہوتے جہاں کہیں ہوتے البتہ یہ ان کے اختیار میں تھا کہ خانۂ کعبہ کی حرمت ضائع نہ کریں۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور اپنی مجبوریوں سے ایسی نازک اور خطرناک حالت اختیار کر لی کہ حج سے ایک ہی دن پہلے مکہ کو چھوڑ دینے کے سوائے کوئی چارہ نہ رہا موقع کی اس نزاکت کا احساس حسینؑ کو خوب تھا۔ مگر ابن عباس اور ابن عمر آپ کی حالت خوف اور یزید کی طرف سے تشدد ہونے کے قرائن سے واقف نہ تھے۔ بلکہ صاف کہہ رہے تھے کہ یزید سے بیعت کر کے اس بلا کو سر سے ٹالئے۔ ابن عمر کی بھی درخواست تھی کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ یزید سے بیعت نہ کریں تو اس کے لئے ضرور آپ کو مجبور کیا جائیگا۔ دشمن وطن میں آپ کو اطمینان سے بیٹھنے نہیں دیں گے۔ تاوقتیکہ آپ بیعت نہ کریں۔ اگر معترضین کے نزدیک عقلمندی اور دانائی کا معیار یہی ہے کہ اپنے تحفظِ جان کے لئے ہر ذلیل مغل کے آگے سر جھکا دینا چاہیئے۔ تو علوئے نفس ایثار حمیت اور کسی بڑی وجہ کے لئے قربانی یا شہادت کا شریف ترین مفہوم یا مثالیں۔ دنیا میں موجود نہوتیں حسینؑ نے اپنے علم و ارادہ سے عزت کی موت کو

ذلت کی زندگی پر ترجیح دی جن لوگوں نے آپ کو یہ صلاح دی تھی کہ یمن وغیرہ کو خطوط لکھ کر اپنے ہوا خواہوں کو اطلاع دیجئے ان کی یہ صلاح اس وقت قابل عمل ہوتی جب آپ کو یزید سے جنگ کرنا اور استحقاقِ خلافت کے لئے ہتھیار اٹھانا مقصود ہوتا کوفہ کا قصد آپ نے محض کوفیوں کے اصرار اور طلب ہدایت پر کیا تھا اور اس سے آپ کو صرف ہدایتِ خلق اور اصلاحِ اُمتِ جدّ منظور تھی۔ جو بحیثیتِ ہادیِ اسلام آپ کا اہم فرض تھا مسلم ابن عقیل کو کوفہ روانہ کرنے سے بھی یہی مدعا تھا اور یہی ان کو ہدایت کی گئی تھی کہ جمعہ وجماعت اور قضائے شرعی کا انصرام کریں حکومت کے عزل ونصب کے متعلق ان کو کوئی ہدایت نہیں کی گئی تھی جیسا کہ تمام واقعات سے آفتاب کی طرح روشن ہے۔

حسین نے مکہ سے عراق وشام کا رُخ کیا کیونکہ یہی سرزمین تھی جسے بنی امیہ کے پروپگنڈے نے زیادہ زہر آلود بنا دیا تھا اور حسین کی پہلی توجہ کی مستحق تھی حسین کے اہل وعیال اور مخصوص احباب کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی مکہ اور اثنائے راہ میں شریک ہوگئے تھے۔ مگر بار بار حسین کے اس اظہار خیال سے کہ میں اپنے مقتل کی طرف جا رہا ہوں راستہ سے ان کی تعداد کم ہوتی گئی حسین اپنا فرض سمجھتے تھے کہ میں اپنے ساتھیوں کے مغالطہ کو دور کریں، اور وہ یہ سمجھ لیں کہ دولت وحکومت حسین کا انتظار کر رہی ہے یہ ہی حسینؑ کا انتہائی تدبر اور دور اندیشی تھی کہ کوفہ والوں کی متواتر درخواستوں پر اپنے چچا زاد بھائی مسلم کو کوفہ بھیج کر یہ دکھا دیا کہ تمہارے ارادے کس قدر بلند اور تمہاری ہمتیں کس قدر مضبوط ہیں۔ لیکن کوفہ والوں نے حکومت کی ذرا سی آنکھ دکھانے پر مسلم کا ساتھ چھوڑ دیا اور حسین کا تن تنہا سفیر نہایت بے دردی اور مکر وفریب کے ساتھ شہید کر دیا گیا حسینؑ جانتے تھے کہ ان کو کوفہ تک پہونچنے کا موقعہ نہیں دیا جائے گا اور کوفہ والوں کا

مطالبہ باقی رہ جائے گا لہذا آپ نے اپنے جاں نثار بھائی کو بھیج کر کوفہ والوں کا حق اپنی گردن سے اُتار دیا، اور حجت تمام کر دی اب ان کو الزام دینے کی گنجائش نہ رہی لیکن ابھی دنیائے اسلام کا حق باقی تھا جس کو ادا کرنے کے لئے حسینؑ نے آگے قدم بڑھایا۔ اگر حسینؑ نے حکومت کی تمنا میں ترکِ وطن کیا ہوتا تو موقعہ تھا کہ شہادت مسلم کی خبر سے سبق حاصل کر کے اپنے ارادے سے باز رہتے اور مدینہ واپس ہو جاتے یا کسی اور طرف کا رُخ کرتے۔ یا مسلم کے قتل کی خبر اپنے ہمراہیوں سے پوشیدہ رکھتے ان کی ہمتیں بڑھاتے۔ سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں کا لالچ دیتے مگر ایسا نہیں ہوا حسینؑ کا مقصد تو درجہ شہادت حاصل کر کے احیائے اسلام تھا نہ کہ حصول حکومت وسلطنت۔

شبہ ہفتم:۔ جناب سید الشہداء کو جس وقت مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر ملی تو کیوں نہ پلٹے اور کوفہ ہی کیوں روانہ ہوئے جہاں سے ایسی متوحش خبر ملی تھی۔

جواب:۔ بے شک حضرت کو شہادتِ مسلم کی خبر راہ میں ملی جس کو آپ نے صحیح باور فرمایا۔ لیکن "کیوں نہ پلٹے" کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ کہاں پلٹتے۔ اگر اس سے مراد مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ ہوں تو وہاں کے حالات اوپر بیان کئے جا چکے ہیں کیا یہاں سے دشمن سے مفر کی صورت تھی کسی ایسے شخص کے لئے جس کو آپ کی طرح مشکلات کا موقعہ پیش آتا۔ اِن دونوں مقامات پر قیام ناممکن تھا اگر اِن مقامات سے نکلنے میں ذرا بھی بے احتیاطی ہوتی تو گرفتاری یا قتل سے کوئی شے مانع نہ تھی مکہ اور مدینہ آخر تھے تو یزید کے ہی علاقے۔ اب حضرت کے لئے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ کہیں ادھر چلے جائیں اس لئے آگے کے مقامات پر فوجیں پڑی ہوئی تھیں۔ تمام راستوں کی ناکہ بندی ہو رہی تھی۔ اور

یہ حلقہ بڑھتا ہوا مکہ کی طرف آرہا تھا۔ جابجا مخبر چھوٹے ہوئے تھے۔ عام راستوں اور سڑکوں کے علاوہ حصین بن نمیر کی طرف سے ریگستانی مقام پر فوجی چوکیاں قائم کر دی گئی تھیں۔ حضرت کسی طرف کو بھی رُخ کرتے۔ دشمن سایہ کی طرح ساتھ لگے رہتے۔ اگر آپ کی نقل و حرکت اخفا کے ساتھ ہوتی تو یہ بھی ممکن نہ تھا کیونکہ حضرت تن تنہا نہ تھے بلکہ سو۔ سوا سو کے قریب عزیز ترین رفقا ساتھ تھے۔ اِس لئے اتنے بڑے قافلہ کا مخفی رہنا بھی اس کے متلاشی جماعت سے ممکن نہ تھا اب رہا یہ سوال کہ جانب کوفہ ہی کیوں روانہ ہوئے۔ تو کوفہ کو روانہ ہونے کی وجہ بجز اس کے کچھ نہ تھی کہ ایک غیر محفوظ مقام پر دوسرے غیر محفوظ مقام کو آپ نے اس سبب سے ترجیح دی کہ آپ کو اپنے موقعہ کے احساس کے لحاظ سے اس اختیار تمیزی کے صرف کا ایک اہم اور نازک موقعہ تھا خصوصاً اس حالت میں کہ بقول ابن اثیر جب مسلم کی شہادت کی خبر ملی اور صلاح ہوئی کہ کہاں جائیں تو بعض اصحاب نے یہ بھی عرض کی کہ آپ مسلم نہیں لوگ آپکی ضرور مدد کریں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگرچہ نصرت کا موقعہ اب امید اور یقین کے درجہ پر نہ تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ تھا نہ یہ ممکن تھا کہ آپ دریائی مقامات میں سکونت اختیار فرماتے اس لئے کہ عرب کے جغرافیائی موقع کے ماور جس میں بے آبی کی وجہ سے ہر جگہ قیام ممکن نہیں۔ اور آبادیاں وہیں ہوتی ہیں جہاں کھانے پینے کی چیزیں دستیاب ہو سکتی ہوں اس کے ماسوا حفاظتی حیثیت سے بھی یہ امر احتیاط کے خلاف تھا کہ قیام کرنے سے آپ خود کو ایک خطرناک مقام پر رکھتے جس کے آگے اور پیچھے دشمنوں کی فوجوں یا فولادی حلقہ میں گھر جاتے قطع نظر اِن حالات کے حضرت کا بنو عقیل کے اِس فیصلہ پر کہ مسلم کا عوض لیں گے۔ یا شہید ہوں گے آگے بڑھنا۔ ایک وجدانی اور اخلاقی تصفیہ تھا۔ بہر حال سوائے اس تصفیہ کے جو کیا گیا اور کوئی صورت ممکن نہ تھی اور آپ اِس طرح گھر چکے

تھے کہ اب مامن و مفر کا کہیں ٹھکانہ نہ رہا تھا۔ کسی طرف جاتے نتیجہ وہی ہوتا۔ جو میدان کربلا میں ہوا۔

شبہ ہشتم:۔ بصورت متذکرہ صدر حُر سے ملاقات کے بعد کیوں مراجعت کا قصد کیا جب کوفہ کا عزم کر چکے تھے۔

جواب:۔ حُر بن یزید ریاحی اور حضرت سید الشہداء سے جو گفتگو ہوئی اس میں آپ کی تجویز ایک یہ بھی تھی کہ ہمیں جانے دو ہمارا جہاں جی چاہے۔ یا ہمیں مکہ واپس جانے دو۔ یا ہم جہاں سے آئے ہیں وہیں چلے جائیں مگر حُر اسے قبول نہ کر سکا۔ اور طے یہ ہوا کہ آپ ایسے راستہ سے چلئے جو نہ حجاز کی طرف جاتا ہو اور نہ کوفہ کی طرف مگر حضرت اس سوال سے صرف اس امر کی تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ حقیقتاً دشمن اس امر پر راضی ہیں یا نہیں کہ ہم ان کی نگرانی سے محفوظ رہ سکیں لیکن حر کے جواب اور انداز نے طے کر دیا کہ حضرت تک یا اور کہیں آزادی سے نہیں جا سکتے حر کو ابن زیاد کا اس کے سوا دوسرا حکم نہ تھا کہ حسینؑ کو نہ چھوڑنا۔ یہاں تک کہ میرے پاس لے آئے اس کے بعد پھر وہی سوال تھا کہ یا تو بیعت کرو۔ یا لڑائی کے لئے تیار رہو۔ حضرت نے حُر کی مذکورۂ صدر رائے کو منظور فرما کر اس امر کا ثبوت دیا کہ ہم اسوقت تک جنگ کے لئے آمادہ نہیں۔ جب تک کہ بالکل مجبور نہ کر دئے جائیں اور جب یہ یقین ہو چکا تھا کہ ہم گھرتے جاتے ہیں تو کوفہ کے سامنے ہی کیوں نہ گھرتے۔ جہاں برائے نام ہی سہی لیکن کچھ تو امید تھی اور شہید ہونے کی حالت میں اپنے صادق الوعدی اور کوفیوں کے وعدہ خلافی کے اظہار کے علاوہ احقاق حق اور ابطال باطل کی ایک زریں مثال اور لاثانی نظیر قائم کرنی تھی۔

شبہ نہم:۔ نویں یا دسویں محرم کو عمر سعد سے واپسی کی اجازت کیوں

مانگی۔ درحالیکہ ایسی استدعا ان کے عزم و استقلال کے منافی تھی۔

جواب:۔ اگرچہ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ حضرت نے عمر سعد سے دورانِ گفتگو میں یہ شرط بھی پیش کی تھی کہ واپس جانے دیئے جائیں لیکن دراصل اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ حضرت نے ہرگز ایسی کوئی درخواست نہیں کی۔ چنانچہ ابن اثیر اپنی تاریخ کامل مطبوعہ مصر جلد ۴ صفحہ ۲۲ میں لکھتے ہیں:۔

من عقبة بن سمعان انه قال صحبت الحسين من المدينة الى مكة ومن مكة الى العراق ولم افارقه حتى قتل وسمعت جميع مخاطباته الناس الى يوم مقتله فوالله ما اعطاهم ما يتذاكر الناس من انه يضع يده فی يد يزيد ولا ان يسيروه الى ثغر من ثغور المسلمين۔

"عقبہ بن سمعان کہتے ہیں کہ میں مدینہ سے مکہ اور مکہ سے عراق تک امام حسینؑ کے ساتھ رہا اور کبھی آپ سے جدا نہیں ہوا۔ آپ کی ہر بات سُنی مگر خدا کی قسم حضرتؑ نے کبھی وہ خواہشیں نہ کیں جو لوگ بیان کرتے ہیں کہ حضرت نے یزید کے پاس جانے کو کہا۔ یا مسلمانوں کی کسی سرحد پر نکل جانا چاہا" اور اگر بالفرض ایسا ہوا بھی تو واپسی کا یہ سوال بہ لحاظ نوعیت حُر اور عمر دونوں سے ایک حیثیت کا تھا۔ البتہ درجہ اور موقعہ میں فرق تھا۔ حُر صرف ایک دستہ کا افسر اور عمر تمام فوج کا سالارِ اعظم تھا اگرچہ ابتداء میں حُر کا منصب اس لحاظ سے کہ اس کی براہ راست ابن زیاد سے خط و کتابت تھی کسی کے ماتحت نہ تھا۔ تاہم حُر کا موقعہ ابن سعد جیسا نہ ہو سکتا تھا اس کے علاوہ یہ امر بھی تھا کہ عمر قبیلۂ قریش کے ایک ممتاز رکن۔ سادس الاسلام۔ فاتح عراق اور رسول اللہ کے ماموں زاد بھائی کا بیٹا تھا۔ موقعہ کا فرق یہ تھا کہ اگرچہ حر کو ابن زیاد نے حضرت کو روک لینے کا حکم دیا تھا مگر جنگ کی اجازت نہیں دی تھی۔ نہ حضرت کو اب تک

عملاً یقین تھا کہ بغیر جنگ اور کشت و خون کے ہمارے دشمن کسی اور امر پر راضی نہیں ہیں۔ مگر اب کربلا میں یہ موقعہ نہ رہا بلکہ متواتر فوجوں کی آمد اور ابن سعد کے نام سخت احکام نے کوئی شُبہ باقی نہ رکھا تھا کہ دشمن حضرت سے کیا چاہتے ہیں۔ حُر کے انداز سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسے اجازت نہ تھی کہ حضرت کی ایسی تجویز کو ابن زیاد تک پہونچا دے۔ برخلاف اس کے عمر سعد بحیثیت سپہ سالار اکثر امور کے متعلق سلسلۂ مراسلت جاری کر سکتا تھا۔ اب جب کہ بظاہر بیعت یا جنگ کے سوا اور کوئی صورت باقی نہ رہی تھی اور آپ بائیس ہزار دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے تو آپ کا یہ سوال بغرض رفع فساد صلح و امن کی ایک تحریک تھی۔ اس کے علاوہ اتمام حجت بھی مقصود تھا۔ بے شک اگر آپ بلا بیعت گئے جانے دیئے جاتے تو آپ کو نہ مخالفت تھی۔ نہ مزاحمت بلکہ آپ اسی نیوٹرل حالت پر عود کرتے جس میں سوال بیعت سے پہلے تھے اور جس پر آپ کے والد بزرگوار اور برادر عالی مقدار کاربند رہے تھے۔

شبہ دہم:۔ بنی امیہ پر ناحق الزام لگایا جاتا ہے۔ اہل بیت پر ظلم کرنے والے تو خود شیعیان علی تھے۔ جنہوں نے بنی امیہ سے بڑھ کر بے وفائیاں اور ظلم آرائیاں خاندانِ رسالت کے ساتھ کیں شیعوں نے ہی حضرت کو بُلایا۔ شیعوں نے ہی بیعت کر کے مسلم بن عقیل کو تنہا چھوڑ دیا۔ اور ان کے قتل کا تماشہ دیکھا۔ شیعہ ہی آپ کے مقابل صف آرائے جنگ ہوئے۔ انہوں نے ہی بے وفائی کی۔ انہوں نے ہی آپ پر پانی بند کیا۔ شیعوں نے ہی ان کو شہید کیا۔ پھر لطف یہ کہ شیعہ ہی روتے چلاتے ہیں۔

جواب:۔ اس کا جواب ہم سلسلۂ نظامیہ کے سرگروہ خواجہ حسن نظامی دہلوی کے ان الفاظ سے دینا کافی سمجھتے ہیں جو ممدوح نے محرم نامہ حصہ دوم کے صفحات ۳۱-۳۲ میں تحریر کئے ہیں (وہو ہذا)

"اس میں شک نہیں کہ شیعیان کوفہ و عراق پر یہ الزام بالکل صادق آتا ہے۔ مگر اس سے نفس شیعیت ملزم قرار نہیں پا سکتی۔ کیونکہ اگر کوئی مسلمان شراب پئے۔ یا چوری کرے تو ان گناہوں کے سبب سے اس کی ذات اور اس کا نفس مجرم ہوگا۔ مذہب اسلام پر دھبہ نہیں آئے گا اسی طرح حُبِ اہل بیت کی صداقت اہلِ کوفہ کے اعمال سیئہ سے قابلِ الزام نہیں ہو سکتی۔ رہا یہ امر کہ بنی امیہ نے ایسا ظلم نہیں کیا۔ جیسا شیعیانِ کوفہ و عراق کے ہاتھوں سے ظاہر ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کے تلوار مارے تو وہ تلوار کو اس زخم کا الزام دے گا یا مارنے والے کو ہم تو ایک کتے کو دیکھتے ہیں کہ جب اس کے پتھر مارا جائے تو وہ پتھر مارنے والے پر بھونکتا ہے۔ پتھر کو کچھ نہیں کہتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پتھر تو بے اختیار تھا۔ قصور اس کا ہے جس نے پتھر کو مجھ پر پھینکا۔ مانا کہ اہل کوفہ کے ہاتھوں یہ بے عنوانیاں اور سفاکیاں ہوئیں مگر ان کے کرانے والے تو بنی امیّہ تھے۔ حکم تو ان کی زبانیں دیتی تھیں۔ تجویزیں تو ان کے دماغ سے نکلتی تھیں لہٰذا وہی ہر گناہ کے ملزم ہیں ان ہی پر ہر ظلم کا بوجھ ہے۔ اہل کوفہ کا قصور اتنا تھا کہ ان کے کمزور دل بنی امیہ کی پر زور پالیسی اور چالاکی سے دب جاتے تھے۔ اُن کے خیالات بنی امیہ کی ساحرانہ تقریروں سے آن کی آن میں آسمان سے زمین پر گر پڑتے تھے اور پھر وہ ان کے ہاتھوں کی تلواریں بن کر خود اپنے ہی وجود پر مارتے تھے۔ اور اپنے مقتداؤں کی شان کو بھول کر گستاخیوں سے پیش آتے تھے یہ ان کی قومی ذاتی۔ اور میں کہوں گا کہ عراقی سرزمین کی پیدا کردہ خصلت تھی اور وہ ہرگز ایسے محبّ اہل بیت نہ تھے جن کے دلوں کو تاثرات محبت نے مستحکم کر دیا ہو اور ان کے ارادے حقیقی شیعیت سے اتنے بلند ہو گئے ہوں کہ کسی مرز رساں اغوار کی رسائی بھی وہاں تک نہ ہو سکے"۔ یہ آگے فرماتے ہیں "اگرچہ میں شیعہ مذہب کے اصول کو تسلیم نہیں کرتا"۔ "لیکن خاندانِ رسالت کی محبت ایک ایسی

چیز ہے جس میں میری اور ان کی شرکت ہے کوفہ کے اشرار سے مشابہت دینا ان صادقِ محبّانِ اہل بیت کی توہین ہے جس کے دل سراپا صداقت ہیں کوفیوں کو شیعہ کہنا شیعیت کی بے حرمتی کرنا ہے (انتہیٰ کلامہ)"۔

غمِ حسین علیہ السلام کا نشوونما

عزاداری اور تعزیہ داری کی ابتدا

جب سے دنیا میں نسل انسانی کا نشوونما ہوا۔ اس وقت تک بے شمار ہولناک واقعات اور درد انگیز حادثات رونما ہو چکے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ حریص اور سنگ دل انسانوں نے اپنی ہی ابنائے نوع کو ایسی جلّادانہ سفاکیوں کا تختۂ مشق بنایا ہے جس کو سن کر کلیجہ تھرا جاتا ہے جن کے خیال سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اس قسم کی جفاکاریوں اور ظلم آرائیوں کا ایک لگاتار سلسلہ ہے۔ جو نسلِ انسانی کے ساتھ شروع ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی جاری رہے گا۔ تاریخ میں ایسی مثالیں بے شمار موجود ہیں کہ انسانی حرص و آز کی بدولت خاندان کے خاندان نیست و نابود کر دئے گئے۔ نمودار قومیں غارت ہو گئیں۔ سرسبز و شاداب ملک تباہ ہو گئے۔ لاکھوں ہستیاں آغشتہ خون و خاک ہوئیں انسان تو انسان حیوان تک تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ عظیم الشان شہر کھود کر پھینک دئے گئے۔ وسیع علاقے آگ اور تلوار کی نذر ہو گئے۔ یہ سب کچھ پہلے ہو چکا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ لیکن کیا کسی مصیبت کا ایسا عالم گیر اثر پڑا۔ جیسا کہ واقعہ کربلا کا اور کیا کسی غم انگیز واقعہ کو اس طرح یاد کیا جاتا ہے جس طرح حادثہ عاشورہ کو۔ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ ہر شخص بہ آسانی اس کا جواب نفی میں دے سکتا ہے۔ آخر کیا وجہ

ہے کہ دنیا کے دوسرے الم انگیز واقعات تاریکی کے پردہ میں آگئے اور ان کا ذکر صرف تاریخی صفحوں میں محدود ہو کر رہ گیا مگر اس قاعدہ کلیہ کے برعکس حسینی واقعہ کا ذکر طرح طرح کی مزاحمتوں اور مخالفتوں کے ہوتے ہوئے بھی حیرت خیز سرعت کے ساتھ روز بروز بڑھتا رہا۔ یہ اس واقعہ کی حقانیت اور للّٰہیت ہے۔ جو مقناطیسی جذب کا اثر دکھا رہی ہے۔ یہ خدائی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ جو دلوں کو تسخیر کر رہا ہے جس روز سے شہادتِ حسینی کا واقعہ پیش آیا۔ تیرہ سو برس گزر جانے پر بھی آج تک اسی طرح تازہ ہے اور ایک نامعلوم زمانہ تک یوں ہی تازہ رہے گا جس کا روکنا نہ کسی طاقت کے امکان میں ہے نہ کسی قوت کے۔ یہ وہ زخم ہے جو آج تک مندمل نہیں ہوا اور ہمیشہ ہرا رہے گا۔ جس میں حسینؑ کی محبت اور اسلام کی صداقت کی کچھ بھی جھلک ہے اس سے اس غم کا اثر کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ غم ہے جس میں قبل از وقوعِ واقعہ حضرت خاتم الانبیا ہی نہیں بلکہ انبیائے سلف بھی روئے ہیں جس کی بشر ہی نہیں شجر و حجر بھی متاثر ہوئے ہیں۔ بعد واقعہ سب سے زیادہ سید الساجدین علی ابن الحسین جنھوں نے اس خونی منظر کو آنکھوں سے دیکھا تھا اس سے متاثر ہوئے اور اپنی بقیہ حیات تک جس کا زمانہ ۳۴ برس کا ہے ہمیشہ روتے رہے۔ حضرت رباب بنت امراء القیس جو جناب سید الشہدا کی عزیز ترین بی بی تھیں۔ ایک برس تک چھت کے نیچے نہ بیٹھیں اور جب تک زندہ رہیں محزون و مغموم رہیں۔ اہل بیت برابر سوگ میں رہے اور کبھی اسباب راحت و تزئین پر التفات نہ کیا جب تک عبد اللہ ابن زیاد کا سر مختار ابن ابو عبیدہ ثقفی نے مدینہ میں نہ بھیجدیا۔

شیخ صدوق امالی میں بہ سند ابو عمارہ شاعر لکھتے ہیں کہ جس وقت حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے ذکر حسین ہوتا تھا شام تک کوئی حضرت

کو ہنستے نہ دیکھتا تھا۔ آپ کے حضور میں جعفر ابن عفان، عبد اللہ بن غالب ابو ہارون مکفوف وغیرہ مرثیہ پڑھتے تھے۔ حضرت اس کا بھی اہتمام فرماتے تھے کہ حرم محترم بھی سنیں اور کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ پس پردہ سے یا اَبَتَاہُ کی آواز آ جاتی تھی۔ حضرت امام رضا علیہ السلام کے دربار میں دعبل خزاعی مرثیہ پڑھتا تھا۔ اور آپ بھی اپنے جدِ بزرگوار کی اہتمام فرماتے تھے۔

صاحب ناسخ التواریخ لکھتے ہیں کہ سلطنت علوئین مصر کے زمانہ میں امیر سیف الملک اور قاضی موتمن وغیرہ حضرت کے مرقدِ منور کی زیارت کو جایا کرتے تھے عاشورہ کے دن ملک افضل مجلس عزا برپا کرتا تھا دائیں بائیں علماء و قضات بیٹھتے تھے۔ روضہ خواں ایک دوسرے کے بعد پڑھتے تھے۔ لوگ روتے تھے۔ زوال کے وقت گریہ و بکا کی شدت ہوتی تھی۔ دوکاندار اپنی دوکانیں بند رکھتے تھے۔ ابو الفدا لکھتے ہیں کہ معز الدولہ دیلمی نے حکم دیا تھا کہ دسویں محرم کو لوگ غم حسین برپا کریں اور دوکانیں بند کر دیں۔ مرد و عورت بال پراگندہ کریں۔ اور کپڑے پھٹے ہوئے پہنیں۔

مجالس عزا کے قیام کی ابتدا کب اور کس طرح ہوئی اس کا جواب ہم کسی تاریخ میں نہیں پاتے۔ لیکن متفرق روایتوں کے دیکھنے سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ جب اہلِ بیتِ اطہار کو حکم رہائی سنایا گیا تو سید الساجدین یزید سے اجازت لیکر تین روز تک مشغول عزاداری رہے اس طرح یہ پہلی مجلس تھی۔ جو دار السلطنت دہلی میں منعقد ہوئی دوسری مجلس بعد واپسی دمشق مدینہ منورہ میں ہوئی جس میں تمام مردوں اور عورتوں نے شریک ہو کر حضرت کا ماتم کیا۔ اس کے بعد باضابطہ مجلس کے انعقاد کی ہمارے پاس کوئی تاریخی شہادت نہیں ہے البتہ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے آئمہ اطہار اور محبان اہل بیت ایک محدود پیمانہ پر مجالس عزا برپا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ

سلطنت بغداد کے ضعف پر دیلمی خاندان کو عروج ہوا۔ تو ۳۵۲ھ ہجری میں معزالدولہ دیلمی کے حکم سے بغداد میں حسینؑ مظلوم کا علانیہ ماتم منایا گیا۔ اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس طرح بہ تغیر نوعیت آزادانہ مجلس عزا قائم ہوئی۔ یہ رسم بغداد میں کئی برس جاری رہی دیلمیوں نے علم رکھنے کا طریقہ بھی جاری کیا جو اب تک ایران اور افغانستان میں قائم ہے۔ یہاں مجلسوں میں ممبر پر دو علم ہوتے ہیں اور بس جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ مجالس عزا کو فروغ ہوتا گیا۔ جیسا کہ اب ہم دیکھ رہے ہیں اسی معزالدولہ نے حکم جاری فرمایا تھا کہ یکم محرم سے دسویں تک سوائے غم حسینؑ کے کوئی کام نہ ہو۔ اور دسویں کو تمام کاروبار بند رہیں۔

اب رہی تعزیہ داری اور نقل ضریح مبارک کا بنایا جانا اس کا باوجود تلاش و تجسس آج تک صحیح پتہ نہ چلا کہ اس کی ابتدا، کب سے اور کیونکر ہوئی عام طور پر اس کی ابتدا، اور رواج کے متعلق امیر تیمور صاحبقران کا نام لیا جاتا ہے۔ اور زبان زد خاص و عام یہی ہے کہ جب صاحبقران اعظم نے دہلی پر قبضہ کیا تو بوجہ اس کے کہ اسی اثناء میں عشرۂ محرم آگیا تھا اور اس کو عزاداری جناب سید الشہدا سے کمال شغف تھا۔ نقل ضریح بنوا کر یہاں بھی عزاداری کی اسی سال سے ہندوستان میں اور لوگوں نے بھی نقل روضۂ مبارک بنوانی شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ نقل مطابق اصل کے بدلے نئی نئی طرز اور تراش کے تعزیہ بننے لگے۔ مگر یہ خیال اس وجہ سے صحیح نہیں ہو سکتا کہ امیر تیمور عشرہ محرم ختم ہو جانے کے بعد ۱۲ محرم ۸۰۱ھ کو ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوا تھا۔

۶ ربیع الاول کو میدان فیروز آباد میں سلطان ناصر الدین تغلق بادشاہ دہلی کو شکست ہوئی اور صاحب قرانِ اعظم ۸ ربیع الاول کو دہلی میں داخل ہوا دو ہفتہ شہر میں قیام کیا اور ۲۲ ربیع الاول کو یہاں سے کوچ کر دیا۔ ۲۹ جمادی الثانی

۸۰۱ھ ہجری کو سرحد ہندوستان سے باہر چلا گیا اس حساب سے اس نے عشرہ محرم ہندوستان کا نہیں کیا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عراق کو اس نے ۸۰۳ھ میں فتح کیا تھا۔ گویا فتح ہندوستان سے تین چار سال بعد اگر اس نے نقل ضریح بنوائی ہوگی تو بعد فتح عراق اس کی اولاد میں بابر نے پھر ہندوستان میں تیموری حکومت کو قائم کیا جس کا سلسلہ (باستثناء چند سال) بہادر شاہ تک رہا لیکن ہم کسی تاریخ میں نہیں پاتے۔ کہ امیر تیمور کی اولاد میں کسی نے ہندوستان میں اس رسم کی تجدید کی ہو۔ پھر کیونکر مانا جا سکتا ہے کہ امیر تیمور اس کا بانی اور مُروِج ہے اور اس کی وجہ سے ہندوستان میں تعزیوں کا رواج ہوا۔ ہندوستان کو فتح کر کے نہ وہ یہاں رہا۔ نہ اس نے اپنے تسلط کا باقاعدہ انتظام کیا۔ بلکہ بعد تسخیر یوں ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو جن ملکوں میں اس کی حکومت کو قیام ہوا۔ وہاں اس کے رواج سے کون سی شے مانع تھی۔ دنیا کے پانچوں بر اعظم اور تقریباً تمام بڑے بڑے جزیروں میں مسلمان پھیلے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ فرزند رسولؐ اللہ کا ماتم مختلف صورتوں سے کم و بیش سب جگہ بنایا جاتا ہو۔ مگر یہ تعزیہ جس طرح ہندوستان میں ہوتے ہیں کہیں بھی نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ ایران جو شیعوں کا خاص گھر ہے۔ وہاں بھی اس کا رواج نہیں۔ ہندوستان کے طول و عرض میں ہر جگہ تعزئے بنائے جاتے ہیں کچھ شیعوں ہی پر منحصر نہیں بلکہ سنی بھی۔ اور سنی ہی کیا۔ بلکہ ہندو بھی اس رسم میں شریک ہیں۔ آخر اس کی ابتدا کب سے ہوئی اور کس نے کی اور کیوں ہوئی افسوس ہے کہ اس سوال کے جواب میں تاریخ خاموش ہے، زبانی روایتیں غیر موثق ہونے کی وجہ سے قابل اطمینان و لائق اعتبار نہیں۔

امیر صاحبقران کے ایک پوتے مرزا حیدر شکوہ ابن مرزا کام بخش ولد میرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم بادشاہ دہلی نے رسالۂ علم حیدری میں اپنے جد امجد صاحبقران

اعظم کے تزک سے جو عبارت نقل کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"منجملہ تائیدات ربانی جس سے میں موئد ہوا۔ ایک یہ ہے کہ ۸۰۴ھ میں بادشاہ روم نے چار لاکھ فوج جمع کرکے مجھ پر حملہ کا ارادہ کیا۔ میں بھی صف آرائی میں مشغول ہوا۔ میں اپنے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا یکایک میں نے دیکھا کہ سادات کربلا و نجف کی فوج عراق و عرب کی طرف سے چلی آتی ہے۔ اس فوج کے سردار سید محمد فتاح تھے، وہ میری مدد کے لئے آئے تھے ان کے ساتھ ایک سفید علم تھا۔ میں نے ان کے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ سید محمد جو اس لشکر کے علم بردار تھے۔ انہوں نے مجھ سے عرض کیا کہ جناب اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو ہم نے خواب میں دیکھا حضرت نے فرمایا ہے کہ علم بیضا اُخ الترک کے پاس پہنچا دو۔ اصحاب نجف کی رائے ہوئی کہ اُخ الترک امیر تیمور ہے۔ میں نے خدا کا شکر کیا اور وہ علم لے کر لڑائی کی طرف گیا۔

ایک بشارت جس سے میں مستبشر ہوا یہ ہے کہ:۔

نواحی کوفہ میں مجھ کو خبر ملی کہ اس سرزمین میں فرزند رسول خدا ابو عبد اللہ الحسین کو سپاہ کوفہ و شام نے بحکم یزید شہید کیا ہے۔ ان شہیدوں میں حُر بن یزید ریاحی گنج شہیداں سے جدا مدفون ہیں ان کے بازو پر حضرت امام حسینؑ نے جناب سیدہ کا رومال باندھ دیا تھا بعض لوگوں نے عرض کی کہ قبر اکھاڑ کر بطریق تبرک اس رومال کو لے لیجئے۔ میں نے علمائے حاضر الوقت سے دریافت کیا۔ سب نے نبش قبر کے حرام ہونے کا فتویٰ دیدیا اور میں نے خلافِ ادب جان کر اس پر جسارت نہ کی۔ اس وقت سید مدنی نے جو ملا حسین کے نام سے مشہور ہیں مجھ سے کہا کہ مدینہ منورہ میں شیخ زید ہاشمی کے پاس ایک چادر ہے۔ وہ جناب سیدہ کے ہاتھ کے کاتے ہوئے سوت سے بنوائی گئی ہے۔ مجھے اس کا بے حد شوق پیدا ہوا ایک آدمی کو شیخ ہاشمی کی طلب کے لئے بھیجا وہ معہ چادر آئے اور مجھے وہدی میں نے اس کو سر پر لپیٹا۔ اس کے بعد میں نے سید الشہداء کی قبر مطہر کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ وہاں کے مُستکان نے خاکِ پاک کربلا کا علَم بطور ہدیہ مجھے دیا۔ میں نے سر اور آنکھوں پر رکھا۔ حضرت کی زیارت کے وقت ایسی رقت مجھ پر طاری ہوئی کہ تین روز تک مجھے امورِ سلطنت اور حالِ لشکر سے خبر نہ رہی۔ میرا دل کربلا سے مفارقت کو گوارا نہ کرتا تھا اور اس مزار فائض الانوار کی دوری اور جدائی پر راضی نہ تھا۔ میرے امرائے رکاب طرح طرح کے حیلوں اور حکایتوں سے اس بقعۂ مبارکہ کی جدائی کی تکلیف دیتے تھے۔ تب اہل کربلا نے میری تسکین اور ہر روز کی زیارت کے لئے ایک ضریح خاکِ شفا کی مجھے دی اُس کو دیکھ کر پھر مجھے بے حد رقت طاری ہوئی اور میں شدتِ گریہ سے بے ہوش ہوگیا۔ رات کو اس ضریح سے گریہ وزاری کی آواز آتی تھی جس نے وہ آواز سُنی غش کھا کر گر گیا۔ چونکہ اس ضریح سے یہ معجزہ ظاہر ہوا۔ میں نے اس کا نام ضریحِ معجزہ رکھا۔ سفر و حضر میں اس کو ساتھ رکھتا ہوں۔ اور عشرۂ اول محرم میں اس ضریح کو ایک مقام پر رکھ کر بمشورہ سید مدنی تعزیہ داری کرتا ہوں اور امام مظلوم کے مصائب کی روایات سن کر روتا ہوں۔

مگر تعجب ہے کہ تزک تیموری قلمی محررہ سنہ ۱۲۳۴ ہجری جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے ہم اس میں ان واقعات کا مطلق ذکر نہیں پاتے۔ تزک سے صرف اتنا پایا جاتا ہے کہ

امیر صاحب قرآن نے دوسرے مزاراتِ مقدسہ کی طرح مصارف روضۂ مبارک جناب سید الشہدا کے لئے کربلا اور بغداد کی اراضی وقف کردی تھی۔ اور بس۔ خیر ایسا ہوا بھی۔ تو فتح عراق کے بعد تو پھر اس کا رواج ہندوستان میں کس طرح ہوا۔ افسوس ہے کہ ہم اس کا ذکر کسی تاریخی کتاب میں نہیں پاتے۔ صرف خافی خان نے عہد عالمگیری میں برہان پور کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ وہاں کے شیعوں نے تابوت (تربت) عشرۂ محرم میں بنایا تھا اور اس کو گشت کرانا چاہتے تھے۔ اہلسنت نے روکنا چاہا۔ اس قضیہ کی خبر بادشاہ تک پہنچی۔ تو اس نے ایک فرمان جاری کیا۔ کہ تابوت بنانے اور رکھنے میں حرج نہیں البتہ گشت نہ کرانا چاہیئے۔ اس تربت کو قبرِ شریف کی نقل کہنا بیجا نہ ہوگا ممکن ہے کہ امیر تیمور کے وقت میں یا اس کے بعد صرف تربتوں کا رواج ہوگیا کیونکہ اس وقت عمارت روضۂ منورہ کی یہ شان نہ تھی۔ جو اب ہے۔ یہ عظمت وشان دیالمہ کے وقت سے ہوئی۔ گنبددار تعزیہ کا رواج غالباً لکھنؤ شروع ہوا ہے بعض سن رسیدہ لوگوں سے سنا گیا ہے کہ آغاز زمانہ نواب آصف الدولہ بہادر میں اول ایک سبزی فروش نے بانس اور کاغذ کا تعزیہ بنایا تھا۔ جب وہ سبزی فروش مرگیا تو وہاں میر باقر نے ایک امام باڑہ بنوا دیا اس کے بعد ویسے ہی تعزیوں کا رواج ہوا۔ رفتہ رفتہ ارکینِ خاندانِ سالار جنگ نے گنبددار تعزیوں کو رواج دیا۔ اور لطافت وزینت روز بروز بڑھتی گئی۔ شدہ شدہ تمام ہندوستان میں اس کا رواج ہوگیا اور شیعوں کے علاوہ سنی بلکہ ہندو بھی اس میں حصہ لینے لگے۔ کیا عجب ہے کہ یہ روایت صحیح ہو اور ہم کو اسکے ماننے کے سوا چارہ نہیں۔

یوں تو تعزیہ داری ہندوستان کے طول وعرض میں ہر جگہ ہوتی ہے لیکن فی زمانہ جیسا شغف اور اعتقاد ریاست گوالیار کے فرماں روائے سابق ہزہائی نس مہاراجہ مادھوراؤ سندھیا بہادر کو تھا اس کی نظیر ہم دوسری جگہ نہیں پاتے لیکن

روضۂ مبارک کی نقل صرف ہزہائی نس نواب حامد علی خاں بہادر فرماں روائے رامپور کے حکم سے بنائی جاتی ہے جو ہو بہو نقل مطابق اصل ہوتی ہے جس کو جناب مرحوم ہر سال بڑے اہتمام سے تیار کراتے تھے۔ اور اب بھی تیار ہوتی ہے۔

غم حسین میں گریہ و بُکا

جیسا کہ ہم پہلے بھی کئی بار بیان کر چکے ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کی تاریخ میں شہدا ایسے کسی عالی خیال پر اپنی جان ومال آبرو کے فدا کرنے والے نہ گزرے ہوں۔ انہوں نے انتہائی سختیاں نہ جھیلی ہوں۔ نہایت بیکسی کے ساتھ قتل نہ ہوئے ہوں اور نہایت استقلال وبہادری کے ساتھ مصائب وآلام کو برداشت نہ کیا ہو۔ صرف افراد ہی انتہائی امتحانات میں ثابت قدمی کے لئے مشہور نہیں بلکہ پورے خاندان اور قبائل مافوق التصور سختیاں اور مصائب بے رحم اور سفاک جابر کے ہاتھوں برداشت کر جاتے ہیں جن کے تصور سے ہی انسان سناٹے میں آجاتا ہے اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ تاریخ عالم ایسے دلسوز جگرخراش اور ہوش ربا واقعات سے پُر ہے جن کو پڑھ کر ہمیں اپنی اخلاقی ہستی ان کے مقابلہ میں ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ ہر قوم ان واقعات کی یاد کو تازہ رکھتی ہے اور اسی پر ان کی قومی حیات کا انحصار ہے۔ لیکن کیا تاریخ عالم میں کوئی ایسا ظلم کا واقعہ گذرا ہے جس پر باوجود ہر قسم کی سختیوں اور رکاوٹوں کے اقوام وافراد نے ماتم کیا ہو اور اس ماتم سے کبھی دل سیر نہ ہوتا ہو۔ جس قدر اشک کے قطرے اسوقت تک حسین کے غم میں گرائے جاچکے ہیں وہ اگر جمع ہوں تو بلا شبہ ایک دریا بہہ سکتا ہے محرم کا چاند افق پر نمودار ہوا۔ اور ایک عام ہیجان نے قلوب پر بجلی کا سا اثر پیدا کیا ہزار مخالفت کرتے ہیں۔ کفر کے فتوے دیتے

ہیں کوئی نہیں سنتا اک پکار ہے کہ مچی ہوئی ہے کہ اس خدائی پکار کو کون روک سکتا ہے اِس واقعہ کی اہمیّت سے اِس ہیجان کی تو کافی توجیہ ہو جاتی ہے۔ لیکن گریہ پھر بھی ایک معمّہ رہتا ہے۔

(۱) کیا یہ اِس وجہ سے ہے کہ واقعۂ کربلا ایسا ہی دردناک کہ دوسرے غم انگیز واقعات اِس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں اور اِس وجہ سے ہم اِس پر بےساختہ رُو دیتے ہیں بے شک تمام عالم کے مظالم کو بالتفصیل پڑھا جائے تو کوئی واقعہ ایسا سخت اور دردناک نہ ملے گا مگر یہ وجہ ہو نہیں سکتی۔ رونا تصوّر پر منحصر ہے۔ جن وجوہ سے یہ واقعہ دوسرے واقعات سے زیادہ ممتاز اور دردناک کہا جا سکتا ہے۔ ان کو ہم سُن تو لیتے ہیں لیکن تصوّر نہیں کر سکتے۔ ہم اسی قدر تصوّر کر سکتے ہیں جتنا ہم محسوس کر چکے ہیں ہم تصوّر ہی نہیں کر سکتے، کہ ایک شیر خوار بچّہ کی دو تین دن کی پیاس میں کیا حالت ہوگی۔ ہم تصور ہی نہیں کر سکتے کہ آنکھوں کے سامنے اولاد کے قتل ہو جانے سے ماں باپ پر کیا اثر ہوتا ہے ہم تصور ہی نہیں کر سکتے کہ تیروں سے چھدا ہوا جسم زمین پر کھینچا جائے تو اس پر کیا گزرتی ہوگی سچ تو یہ ہے کہ ہم معرکہ کربلا کے کسی جزو کا بھی کما حقّہ تصور نہیں کر سکتے جو ہیجان تصور کے شروع میں پیدا ہوتا ہے وہ خود خیال کے قائم رہنے سے مانع ہے تو پھر گریہ کیونکہ ممکن ہے۔

(ب) کیا گریہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ہمارا تعلق امام حسین علیہ السلام سے ایسا ہے جیسا کہ اپنے محبوب ترین عزیز سے ہوتا ہے۔

(۱) خدا کرے ایسا ہی تعلق ہو لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسا نہیں ہے اِس ناگوار امر کی تفصیل کی ضرورت نہیں ورنہ نہایت حیا سوز امور پیش ہو سکتے ہیں۔

(۲) اولاد سے بڑھ کر کوئی عزیز نہیں ہو سکتا۔ فطرت نے جو تعلق اولاد کے ساتھ

پیدا کیا ہے۔ وہ دوسرے کے ساتھ ممکن نہیں لیکن اولاد کے مرنے پر بھی گریہ دو چار دس دن سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ایک مدّت کے بعد کوشش سے بھی گریہ نہیں آتا جو کچھ گریہ ہوتا ہے وہ بھی زیادہ تر دوسرے اسباب سے جس میں اپنی ذات کو بہت کچھ دخل ہے۔

(۳) بالآخر آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے میں کچھ فرق ہونا چاہیئے عیسائی تو تاثر کی غرض سے عیسےٰ علیہ السلام کی شہادت کا تھیٹر تک بناتے ہیں لیکن کیا اثر ہوتا ہے، کچھ بھی نہیں۔

(۴) جن لوگوں کو ایسا تعلق نہیں ہے جیسے ہنود وغیرہ ان کے گریہ کی کیا وجہ ہو سکتی ہے وہ بھی ایک بار نہیں ہر بار۔ حالانکہ ان کو اپنے تاریخ کے دردناک واقعات پر یہ اثر نہیں ہوتا۔

(ج) کیا یہ گریہ اِس وجہ سے ہوتا ہے کہ مذہب میں اس کا حکم ہے۔ جو شخص علم النفس کی مبتدیات سے بھی واقف ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسا ہونا محال ہے۔ حکم اور گریہ ایسا ہی ہے کہ کسی کے حکم سے ہم کسی پر عاشق ہو جائیں حکم اور فرض کے خیال کے ساتھ نو آتا ہوا گریہ بھی بند ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سخت جذبے اور نرم جذبے کبھی ایک وقت میں مجتمع ہو نہیں سکتے۔

(د) کیا یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ واقعہ اِس قدر مذہبی اخلاقی۔ تاریخی اور تمدّنی اہمیت رکھتا ہے بے شک اس واقعہ کو ہر قسم کی انتہائی اہمیت حاصل ہے جو دنیا میں اور کسی واقعہ کو حاصل نہیں مگر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ یہ اہمیت گریہ کی کیونکر معین ہو سکتی ہے علاوہ ازیں عوام تو ان خاص امور کو جانتے بھی نہیں۔

(لا) کیا ان سب کے مجموعہ سے اِس قدر گریہ ہو جاتا ہے اگر ان میں سے ہر ایک جزو کسی حد تک ازدیاد گریہ میں مفید ہو سکتا ہے تو ضرور ان کا مجموعہ کچھ معقول اثر

رکھتا۔ لیکن ہم کو کسی طرح اِس واقعہ پر دوسرے واقعات سے زیادہ متاثر ہونیکی سابقہ وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ خلاف اِس کے جو امور اس گریہ کے بقا اور دوام کے خلاف ہیں اُن کو ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) علم النفس میں جذبات کے متعلق یہ اصول ہے کہ خوشی کے جذبات اپنے کو باقی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور تکلیف کے جذبات اپنے کو کم کرنے کے۔ اسی پر زندگی کا دار و مدار ہے۔ فرحت ممد حیات ہے۔ اِس وجہ سے اس کو باقی رہنا چاہیئے۔ الم بقائے حیات کے لئے مضر ہے اِس سبب سے ان کا فنا ہونا ضروری ہے لہٰذا یہ قطعی امر ہے کہ کوئی صدمہ دیرپا نہیں ہوسکتا یہ کیسا الم ہے کہ تیرہ سو برس ہو چکے پھر بھی کسی طرح کم نہیں ہوا۔ بلکہ ہر سال ترقی ہی کرتا جاتا ہے۔

(۲) علم النفس کا اصول ہے کہ کسی شے یا امر کے متعلق کوئی جذبہ دوبار یکساں نہیں ہوسکتا۔ بلکہ کم ہوتا رہتا ہے۔ ہاں اگر طویل مدت کا فصل ہو جائے۔ تو فرق کم محسوس ہوگا۔ لیکن اگر جلد جلد اور کئی بار وہی جذبہ پیدا کیا جائے تو نمایاں فرق محسوس ہوگا اور جلد بالکل ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محسوسات میں کوئی امر ایسا نہیں ہے جس کے احساس کے ساتھ نظام نرد ی میں جس کا مرکز دماغ ہے۔ کسی قسم کی تحریک نہ ہوتی ہو یہ نردیں جاندار ہیں۔ باربار متحرک ہو جانے سے تھک جاتی ہیں اور پھر تحریکات جو پیدا ہوتی ہیں وہ ضعیف ہوتی ہیں ہاں اگر دو تحریکوں کے درمیان میں فصل کافی دیدیا جائے تو پھر اپنی قوت کے ساتھ متحرک ہو سکتی ہیں لیکن پھر بھی اور اسباب سے کچھ فرق رہیگا۔ مثال کے طور پر کسی شاعر کی نئی غزل لیجئے۔ جو لطف پہلی بار آئے گا۔ وہ دوسری بار نہیں آسکتا۔ اب اس غزل کو ہر دوسرے تیسرے روز پڑھا کیجئے۔ تو

چندروز میں اثر بالکل جاتا رہیگا کسی عالی شان خوش نما عمارت کو دیکھئے۔ پہلی مرتبہ اس کو دیکھ کر آپ متحیر رہ جائیں گے۔ مگر بار بار دیکھنے سے فرحت اور استعجاب کا اثر قطعاً رخصت ہو جائیگا یہی حالت غم و الم کے جذبہ کی ہے کسی دردناک قصّہ کا واقعہ کسی تاریخ میں پڑھئے۔ جو اثر اس کا پہلی مرتبہ قلب پر ہوگا، وہ دوبارہ نہ ہوگا، اگر روز وہی قصّہ پڑھئے یا سنئے تو کچھ بھی اثر نہ ہوگا اب اِن مجالس کو ملاحظہ فرمائیے وہی قصہ ہے کہ پھر پھر کر دوہرایا جاتا ہے، ایامِ محرم میں روز بلکہ دن رات میں دس دس مرتبہ اور یوں بھی سال بھر میں بار بار ان ہی معلومہ واقعات کو سنتے ہیں اور روتے ہیں اسکی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ کہا جاسکتا ہے کہ ہم واقعات کو اول بدل کرسکتے ہیں بے شک یہ امر کسی قدر معیّن ہوسکتا ہے مگر پھر بھی واضح ہے کہ ہم اس قدر جلد ان ہی واقعات کو سنتے ہیں کہ کچھ بھی اثر نہ ہونا چاہیئے۔

نرم جذبات تو بہت بے حد نازک ہوتے ہیں اُن کا فنا ہو جانا کوئی بات ہی نہیں تکرار اور اکثار وہ بلا ہے کہ جسمانی تکلیف اور درد جس پر جان کا انحصار ہے۔ وہ بھی یہ تکرار ہونے سے کم محسوس ہوتا ہے اور مزمن ہو جانے سے بالکل زائل ہو جاتا ہے بہر حال ہم کو اس وقت تک علم النفس کے چار اصول ایسے ملے ہیں۔ جس کو یہ گریہ صاف باطل کر دیتا ہے۔

(۱) محض کافی تصور کا اس زمانہ میں محال ہونا جو اور واقعات سے زیادہ اس پر گریہ کے واسطے مفید ہوگا۔

(۲) بقا اور دوام کسی تکلیف کے جذبہ کا محال ہے

(۳) تکرار پر کوئی جذبہ خوشی کا ہو الم کا باقی نہ رہنا چاہیئے۔

(۴) اکثر حالات میں کسی نہ کسی سخت جذبہ کا تصادم لازمی ہے جس کو گریہ کا مانع ہونا چاہیئے۔

اگر قوانین فطرت میں کسی ایک کا بھی فرق ہو جائے تو اسے معجزہ کہیں گے۔ یہاں چار مختلف قوانین کا فرق اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اس کو معجزہ نہ کہیں تو کیا کہیں کیا اصولِ علم النفس۔ قوانین فطرت نہیں ہیں، عوام اگر اس میں اور دوسرے قوانینِ فطرت میں فرق کریں تو کریں مگر ایک شخص جو علم النفس سے واقف ہے اس کو اس گریہ اور احیائے اموات میں فرق کرنے کی مطلق گنجائش نہیں۔

اِس سے قبل کہ اس بحث کو ختم کیا جائے اِن امکانات پر بھی نظر کرنا چاہیئے جن پر ایک مخالف امید لگا سکتا ہے۔

(۱) اوولیوشن (ارتقا) کی بناء پر یہ گمان ہو سکتا ہے کہ شاید رَوتے رونے نوع میں ایک قسم کی استعداد گریہ پیدا ہو گئی ہے مگر یہ بالکل لغو ہے کیونکہ قبل اس کے کہ ایسی عادت نوع میں متوارث ہو سکے ایک طویل مدت تک رونے کا عادی ہونا لازمی ہے۔ مگر قوانینِ علم النفس اس قدر مخالف ہیں کہ ایک انسان کی زندگی میں بھی رُونے کی عادت ہو جانا محال ہے۔ جو لوگ علم الارتقا اور علم الحیات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کسی عادت کے متوارث ہونے کے لئے کس قدر طویل مدت کی ضرورت ہے۔ تیرہ سو برس اس کے لئے ایک لمحہ کے برابر ہیں اس کے علاوہ اگر کوئی استعداد پیدا ہوگی تو گریہ کی۔ نہ یہ کہ صرف حسینؑ پر گریہ کی ورنہ اسی کے ساتھ حسینؑ کا نام اور واقعہ شہادت کا علم بھی متوارث ہونا چاہیئے ایسا مخصوص اوولیوشن کبھی نہیں دیکھا گیا اِس سے معلوم ہوا کہ اوولیوشن کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے۔

(۲) ظاہری عنوانات عزاداری مجلس ماتم سوز خوانی۔ تعزیہ داری وغیرہ معین ہو سکتی ہیں لیکن اوپر ہم دکھا چکے ہیں کہ خود نفس میں ایسی قوی فطری اسباب موجود ہیں کہ اس کو باکم سے کم اس کی بقا اور دوام کو محال ہی کر دیتے ہیں اُن کی

موجودگی پر خارجی محرکات کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔

(۳) یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اس گریہ کی مذہب میں سفارش ہے۔ اِس وجہ سے جوشش گریہ کو روکنے اور خیالات کے منتشر کرنے کی عام صدمات میں پائی جاتی ہے وہ اس میں نہیں ہوتی لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ اگر کسی سبب سے رونا آہی نہ سکتا ہو تو یہ مذہبی سفارش کہاں سے پیدا کر دیگی۔ جب ہم اپنی قوم سے نکل کر دوسرے اقوام کو دیکھتے ہیں تو صرف لائے حیرت ہوتی ہے ان کے واسطے نہ تو کوئی مذہبی سفارش ہے نہ اور کوئی محرک بیشک وہ ہماری طرح گریہ کے مواقع تلاش نہیں کرتے۔ مگر جب کبھی وہ ہمدردی کے ساتھ ان واقعات کو سنتے ہیں روتے ضرور ہیں، گریہ کا ضبط کرنا ایک اخلاقی صفت ہے۔ جس طرح عزائے حسین کو ہم نے ایک مستثنیٰ قرار دے رکھا ہے انہوں نے نہیں کیا ہے۔ تعجب ہے کہ وہ ہماری تاریخ کے اِن مظالم پر تو روتے ہیں۔ حالانکہ اپنی تاریخ کے دردناک واقعات سے اس طرح متاثر نہیں ہوتے۔

ہندوؤں کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قدیم مذہبی اور تاریخی روایات نے ان کے جذبات کو اس طرح رنگ دیا ہے کہ فتح۔ شجاعت کامیابی وغیرہ کے جذبات سے تو خوب متاثر ہوتے ہیں لیکن مظلومیت اور شہادت وغیرہ کے واقعات کا کم اثر لیتے ہیں ایسی قوم بلاوجہ ایک دوسری (اور وہ بھی ایک کمزور اور پسپا) قوم کے ماتم میں شریک ہو جائے۔ کیا یہ معجزہ نہیں ہے کیا کوئی ایسی دوسری نظیر بھی تاریخ عالم میں مل سکتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو لوگ مقتول فی سبیل اللہ ہیں۔ وہ بموجب نقل قرآنی زندۂ جاوید ہیں ان کو مردہ خیال نہیں کیا جا سکتا اگرچہ ان کے اجساد خاکی۔ خاک ہی ہو گئے ہوں۔ کلام مجید میں صاف ارشاد ہے۔ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا

فی سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا بَلۡ اَحۡیَاءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ جب یہ حکم شہدا کے لئے ہے تو حسینؑ کو جو سید الشہدا اولین و آخرین اور ان کے رفقا مقتولین فی سبیل اللہ کے سرتاج ہیں ان کے زندہ جاوید ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے اور جب وہ زندہ ہیں تو ان پر رونا اور ماتم کرنا کیا معنے رکھتا ہے۔ کیا زندہ پر رُونے اور ماتم کرنے کو عقل سلیم تسلیم کرسکتی ہے چنانچہ ایک صاحب جو مولوی شبلی نعمانی کے عزیز ہیں فرماتے ہیں ؎

روتے ہیں جو قائل ہیں ممات شہدا کے ٭ ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

بظاہر یہ ایک پتہ کی بات ہے مگر اس کا جواب بھی صاف ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں ؎

قائل نہیں ہم بھی تو ممات شہدا کے ٭ ہم جان کے مردہ انہیں یہ غم نہیں کرتے
روتے ہیں مصائب پہ شہیدانِ جفا کے ٭ ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

جس سے جس کو ایک خاص تعلق اور تولائے صادق کا رابطہ ہوتا ہے خواہ وہ زندہ ہی کیوں نہ ہو اس کے مصائب و تکالیف کو سننے یا خیال کرنے سے ہمدردی کا جوش قلب و دماغ پر ایک خاص ہیجان پیدا کرتا ہے اور اس کے جذبات الفت برانگیختہ ہو کر رونے پر بھی مجبور کر دیتے ہیں البتہ جو لوگ رقت قلب اور احساس ہمدردی سے محروم ہیں ان پر اثر نہیں ہوسکتا حسینؑ کا غم وہ غم ہے جس پر ملائکہ انبیا جن و انس محزون و مغموم ہوئے ہیں خود سید الانبیا جبکہ حسینؑ زندہ اور آپکی آغوش میں تربیت پا رہے تھے بلکہ حسینؑ کی ولادت کے وقت بھی آئندہ زمانہ میں ہونے والی خبر شہادت سُن کر اشکبار ہوئے ہیں حسینؑ اور انصار حسینؑ بے شک زندۂ جاوید ہیں، یہ رونا اور ماتم کرنا ان کی شہادت پر نہیں۔ بلکہ ان مصائب اور شدائد پر ہے جو ایک مسلمان بادشاہ کے حکم سے مسلمانوں ہی کے ہاتھوں رسول اللہ کی ذریت اور اولاد پر عمل میں لائے گئے اور کوئی دقیقہ ایذادہی اور توہین کا باقی نہ رکھا گیا۔ گویا ان لوگوں

ہی نے جو نمازوں میں محمد اور آل محمد پر درود پڑھتے تھے۔ آل محمد پر انتہائی مظالم و شدائد کو ایک فریضہ سمجھ کر ان کا نام و نشان ہی دنیا سے مٹا دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ مظالم اور توہین کا یہ ارتکاب جو امیوں کی طرف سے عمل میں آیا۔ اگر نظر حقیقت سے دیکھا جائے تو خود آنحضرت کی ہی ایذادہی اور توہین تھی۔ یہ مصائب ہی ایسے پُر اثر اور درد انگیز ہیں جن کو سن کر اپنے تو اپنے غیروں کے قلوب بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ہاں متبعین یزید اور اس کے نام لیوا۔ لوگوں پر جن کے قلوب پتھر جیسے سخت ہیں حسینی ہمدردی کا اثر اس وقت نہ ہوا۔ نہ اب ہے۔ نہ آئندہ ہوگا۔

جو لوگ حسینی ہیں وہی کرتے ہیں ماتم ٭ لیکن جو یزیدی ہیں وہ کچھ غم نہیں کرتے

ہماری مراد ماتم سے سینہ کوبی نہیں۔ بلکہ مصائب حسینی پر گریاں اور اشکبار ہونا ہے۔ یا کم سے کم حُزن و ملال کا اثر لینا۔

اس سے قطع نظر کرکے ان عورتوں اور بچوں کو دیکھئے جنہیں نہ واقعات کی پوری خبر ہے اور نہ مصائب و آلام کے تصور کا احساس، نہ مذہبی سفارش کا علم لیکن زار و قطار روتے ہیں خلاصہ یہ ہے کہ عزائے حسین سے زیادہ کوئی اور حیرتناک حقیقت علم النفس اور انسان کی تاریخ میں نہیں ہے اور یہ وہ بھید ہے کہ جس کی تہ تک پہنچنا ناممکن اور ہم اس کو سوائے معجزہ اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

گریۂ حسینؑ کا اخلاقی اثر

کسی شریعت اور ملت کا مقصود اصلی کیا ہے؟ اس کا جواب ہر شخص بآسانی دے سکتا ہے کہ ملل اور شرائع کا مقصد اصلی اور علت غائی روحانی اور اخلاقی تعلیم ہے اس میں دنیا کے تمام مذاہب تقریباً یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ کذب، کبر، کینہ، بخل، زنا، چوری، خصائل ذمیمہ سے احتراز لازم ہے

سخاوت، تواضع، حلم، شجاعت، عفت، ہمدردی، خصائل حسنہ کا خوگر ہونا تکمیل انسانیت ہے ہر مذہب اِن باتوں کی تعلیم دیتا ہے لیکن یہ عقلی فیصلہ ہے کوئی ایسی بڑی بات نہیں جس کے واسطے ربّانی معلموں کی ضرورت ہو۔ نہ ان کی تعلیم سے یہ خصائل ذمیمہ انسانی افراد سے کلیتاً دور ہو سکتے ہیں کیونکہ انسانی فطرت نہیں بدل سکتی شریعت کا خاص کام یہ ہے کہ ایسے عبادات اور فرائض مقرر کرے جس سے خود بخود فطری اصول پر خصائل حسنہ پیدا ہوں اور خصائل ذمیمہ کا ازالہ ہو جائے خمس و زکوٰۃ دیتے دیتے فطری بُخل دور ہو جاتا ہے۔ نماز باجماعت خصوصاً ایام حج میں امیر الامراء کو غریب الغرباء کے ساتھ ایک ساتھ ایک حالت میں بلا امتیاز رہنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ نفس میں کبر و غرور باقی نہیں رہتا خشوع و خضوع یوں پیدا نہیں ہوتا، ارکان نماز اور تلاوتِ قرآن کسی نہ کسی حد تک اس کو پیدا کر ہی دیتے ہیں بہرحال تمام مذہبی احکام کی غرض صرف اعلےٰ اخلاق کا نشو ہے لیکن تمدنی اخلاق کی تعلیم سے زیادہ ضروری وہ تعلیم ہے جس کا تعلق روحانیات سے ہے فضائل حسنہ میں ایک صفت ایسی بھی ہے جو روحانی اور اخلاقی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ وہ صفت کیا ہے "رقتِ قلب" جس کو ایک حد تک کل خوبیوں کا سرچشمہ اور راس و رئیس کہنا چاہیئے۔

علم النفس کے اصول پر رقّتِ قلب کے پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ گریۂ حسینؑ ہی ہو سکتا ہے گویا اس صفتِ خاص کی نشو و نما کا مکمل انتظام حسینؑ پر گریہ کے عبادت ہونے میں قرار دیا گیا ہے ایک دردناک واقعہ پر روتے روتے قلب میں دوسرے دردناک واقعات کا پورا اثر لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہونا بھی چاہیئے کیونکہ گریہ بلا کیفیر تاثر کے ناممکن ہے جس قوت کو بار بار صرف کیجئے وہ ضرور ترقی کرے گی، اگر ہمدردی اور رقّت قلب کی صفت کسی ملت

میں محض مذہبی تعلیم سے ہو سکتی تو سب سے اول۔ عیسائیوں میں جو فخر کیا کرتے ہیں کہ ہمارا مذہب رحم اور محبت کا مذہب ہے۔ مگر افسوس اور تعجب ہے کہ اُن کی تمام تاریخ بے گناہوں کے خون سے رنگی ہوئی ہے، بے شمار آدمی سحر کے بہانے قتل کر دیئے گئے، بے شمار کو لامذہبی کے حیلہ سے مار ڈالا۔ یہودیوں وہ ظلم کئے کہ عیاذاً باللہ۔ امریکہ کے اصلی باشندوں کو انسان ہی نہ جانا اور درندوں کی طرح ہلاک کیا یہاں تک کہ ملک کے ملک صاف کر دیئے گئے۔ درحقیقت جتنا خون اِس محبت اور رحم کے مذہب نے بہایا ہے، تمام اقوام عالم نے مل کر بھی نہ بہایا ہوگا ہم نے مانا کہ موجودہ زمانہ میں یہ لوگ تہذیب و تمدن کے علمبردار ہیں اور یہ سب نعمتیں ان کو علوم مختلف بالخصوص سائنس کی تحصیل کی برکت سے حاصل ہوئی ہیں۔ تعلیم نے ان کو اقوام عالم سے ممتاز کیا۔ تعلیم نے ان کے دل و دماغ کو روشن بنایا۔ اور ان کے قوائے عملی کو ترقی عطا کی لیکن صرف تعلیم سے کام نہیں چل سکتا جب وقت تک کہ نفس کی تربیت بھی نہ کی جائے، اِس رقّتِ قلب کی تربیت کا بہترین ذریعہ گریۂ حسینؑ ہی ہے کیونکہ رقّت قلب ہی باعث گریہ ہو سکتی ہے، اور گریہ اس کی مصیبت پر آتا ہے جس سے محبت کا لگاؤ ہو محبت ایسا قوی جذبہ ہے کہ اگر خالص ہو تو پیروی اور تاسّی پر مجبور کرتا ہے حسینؑ اخلاق حسنہ کے بہترین نمونہ تھے جن کو ان سے محبت ہے وہ حسینی اخلاق کی تاسّی میں حتی الوسع کوشاں رہتے ہیں۔ بلاشبہ ذکر مصائب حسینؑ جس کے واقعہ میں اخلاق کا کوئی نہ کوئی پہلو نمایاں ہے اور وہ بھی اس اعلیٰ اور ارفع شان پر جس سے مافوق ممکن نہیں، ہر حیثیت سے عام اخلاق پر اثر ڈالنے والا بلکہ اس کا مکمل ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا مجالس عزا کا اصل مقصد صرف گریۂ و زاری اور سینہ کوبی ہی ہے جیسا کہ عام دماغوں میں یہی خیال مرکوز ہو گیا ہے۔ اور آلِ مجلس

فقط کثرتِ گریہ اور شدّتِ سینہ زنی کو سمجھا جاتا ہے اگر سامعین کو زیادہ رقت ہو تو مجلس مقبول اگر کم ہو یا نہ ہو، تو مجلس نامقبول۔ اگر دو چار کو غش آجائے۔ تو پھر سبحان اللہ کہنا ہی کیا ہے، اگر کوئی ذاکر گریہ خیز واقعات بیان کرکے خواہ وہ غلط اور موضوع ہی کیوں نہ ہوں حسب منشائے بانیٔ مجلس کافی طور سے حاضرین کو رُلا دے تو اپنی سعی میں کامیاب ورنہ ناکام اور ثواب "اُڈانکے" سے محروم۔ یہ قابلِ غور مسئلہ ہے۔ موجودہ زمانہ کی طرزِ مجالس عنوانِ ذاکری ان کے مقاصد واغراض سامعین کے جذبات وحسیات اور خیالات کو دیکھتے ہوئے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا فی نفس الامر ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ عام طور پر ذاکرین اور سامعین اپنے ذہن میں سمجھے ہوئے ہیں کیا اس شہادت عظمیٰ اور اس مقدس ذاکری کی علت غائی، رونے رلانے انواع واقسام سے ماتم کرنے۔ یہاں تک کہ زنجیروں اور تلواروں سے سر و پشت زخمی کرکے ایک وحشیانہ اور دہشت انگیز سانحہ دکھانے اور خود ساختہ رسوم کو فرائض مذہبی یا ایک اہم جزو قرار دینے تک ہی محدود خیال کرلینا درست ہے۔ اس کے جواب میں ہم نہایت ادب کے ساتھ اتنا عرض کریں گے کہ یہ خیال ایک حد تک ضرور اصلاح طلب ہے۔ حسینی شہادت اس لئے نہیں ہوئی کہ چند ایسے آدمیوں کا گروہ تیار ہو جائے جو عورتوں کی طرح گریہ و بکا کو اپنا دائمی مشغلہ اور فوجی اصول کی پریڈ پر سینہ زنی کو اپنا مستقل شیوہ قرار دیدے۔

حسینی مصائب جیسے اہم واقعہ کی اتنی ہلکی غرض سمجھ لینا اس شہادت کبریٰ کی لطافتوں کو بے اعتنائیوں کا آماجگاہ بنا دینا ہے، اچھی طرح سمجھ لو کہ گریہ وزاری سینہ زنی۔ علم۔ تعزیئے، روشنی، سبیلیں، نذر و نیاز کوئی ایسی چیز نہیں جو بالذات کسی اتنے عظیم الشان اور کثیر النتائج واقعہ کی غرض بن سکیں ممکن ہے کہ موقعہ کی

خصوصیت گریہ و بکا کو استحسان کے دائرہ میں لے آئے لیکن اگر ان عوارض سے قطع نظر کر لی جائے تو پھر رونا بہر حال افراد کی کمزوری اور جماعت کی بے دست و پائی کے اظہار کا ذریعہ ہے حسین جیسے اولوالعزم روحانی پیشوا کے متعلق یہ خیال قائم کر لینا کہ وہ ۱۰ محرم سنہ ۶۱ھ کو جلتی ریگ پر خون کے دریا میں اس لئے نہائے کہ ان کے غم میں صرف مجلس عزا منعقد کر لی جائے کچھ سطحی اور غیر مفید ذاکری کر لی جائے ضعیف اور موضوع اور بے سرو پا روایات پر خواہ وہ توہین کی حد تک کیوں نہ پہنچیں۔ آنسو بہا لئے جائیں اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ نہ ہم نے حسینؑ کی شان رفیع کو پہچانا۔ نہ ان کی شہادت کے رموز و مصالح کو سمجھا، بلکہ عام خیالات کی تقلید کرتے ہوئے سطحی اور نمائشی باتوں کو ذریعہ نجات قرار دے لیا ہے اگر شہادت کی غرض صرف گریہ و بکا کے نظام کا وسیع بنیاد پر قائم کرنا ہے تو خدارا یہ تو بتائیے کہ اس گریہ و بکا سے ہم کونسا اخلاقی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اس کے رواج نے ہم میں انسانیت کس حد تک پیدا کی۔ اگر شہادت کی صرف یہی غرض ہے تو ظاہر ہے کہ یہ پوری ہوئی اور خوب پوری ہوئی۔ ہر کامیاب مجلس میں آنسوؤں کی مقدار اچھی خاصی جمع کی جا سکتی ہے، لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کے باوجود ہم رونے والوں میں مجموعی حیثیت سے کوئی خاص اخلاقی کیفیت نہیں پاتے، کیا ان میں یہ قوت ہے کہ سچائی کی حمایت آخری سانس تک کر سکیں کیا ان میں ایثار و قربانی کا وہ جذبہ موجود ہے جس کے انتہائی نمونہ میدانِ کربلا میں دیکھے جا چکے ہیں مشہد مقدس اور جنت البقیع میں جو واقعات پیش آچکے ہیں ہم نے ان کے لئے کیا یہی نا کہ چند مجلسوں کا اور اضافہ کر لیا ان میں بیٹھ کر عورتوں کی طرح آنسو بہائے اور آگے بڑھے تو گاجے باجے کے ساتھ علم نکال لئے اس سے زیادہ ہمت کی تو چند رضا کاروں کے دستے مرتب کر کے ظاہری نمائش کر لی۔ اور اس بے جا اقدام اور بے نتیجہ سعی پر دوسری قوموں

کو ہنسی کا موقعہ دے دیا گیا ان قوموں کی جو اخلاقی منزلت کے کسی نہ کسی درجہ پر فائز ہوتی ہیں۔ یہی طریقے ہوتے ہیں ان سی اہم آزمائشی موقعوں پر ایسے ہی جلبن کا اظہار ہوا کرتا ہے اگر ہم نے شہید کربلا کے فلسفہ شہادت کو عارفانہ نگاہوں سے دیکھا ہوتا اور کوشش کی ہوتی کہ ان اصول کو اپنی سیرت کا جزو بنالیں جن کو قائم کرنے کے لئے حسین نے خونی کفن پہنا تو ایسے دلخراش مناظر دیکھنے میں نہ آتے۔ صرف رونا اور خود ساختہ رسموں کی اداکاری اس شہادتِ عظمےٰ کے اصلی مقصد ہرگز نہیں۔ یہ توضمنی باتیں ہیں جن کو ہم نے اپنی کوتاہ بینی اور ایمانی کمزوری سے اصلی اور حقیقی غرض سمجھ لیا ہے۔

یہ واقعات ہی اس نوعیت کے ہیں کہ ان کو سُن کر ہم تو ہم غیروں کے بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ خود کوفی وشامی ظلم کرتے جاتے تھے۔ اور روتے جاتے تھے جس وقت حضرت گھوڑے سے گرے اور وہ آپ کا کام تمام کرنے کے تاکیدی حکم دے رہا تھا اس کے بھی آنسو جاری تھے، بعض روایتوں کے موافق خود یزید بھی ان واقعات کو سُن کر آبدیدہ ہوا۔ اس صورت میں انصاف کیا جائے کہ اگر شہادت سے ہم بھی صرف اسی قدر متاثر ہوئے کہ آنکھوں سے آنسو بہائے۔ کچھ فیشن کے طور پر ماتم کی نمائش کر لی۔ تو ہم میں اور اغیار میں کیا فرق رہا۔ کیا وہ لوگ جو حسین علیہ السلام کی سچی محبت اور حقیقی معرفت کا دعوے کرتے ہیں اس سرسری غرض کو پورا کر کے اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کا اطمینان حاصل کر سکتے ہیں۔

ہم رونے کے مخالف نہیں بلکہ ہمارا خیال ہے کہ وہ لوگ جو ان واقعات کو سُن کر سنگدلانہ متانت و وقار کے ساتھ بیٹھے رہتے ہیں قابل ملامت ہیں یقیناً مصائبِ حسین پر رونا ہمارا ایمان ہے۔ مگر رونا صرف رونے کی حیثیت سے ہونا چاہیئے ہم اس کی جسارت نہیں کر سکتے۔ کہ حسینی شہادت جیسی عظیم المرتبت قربانی

و ایثار کا مقصودِ اصلی صرف رونے کو قرار دے لیں۔ مجالس کا اصلی منشا ہم رونے کا سامان مہیا کرنا کبھی نہیں سمجھ سکتے، ہمارا خیال ہے اور غالباً تمام فہمیدہ دنیا اس خیال میں ہماری ہمنوا ہوگی کہ مجلس ایک نہایت ہی مفید تبلیغی انسٹی ٹیوشن ہمارے سامنے ہے۔ اس کے ذریعے سے قوم میں اُن اصول کی عملی وقعت پیدا کرنی چاہیئے جن کے لئے حسین علیہ السلام نے اپنی بہتر ساتھیوں کی قربانی گوارا کی۔ اگر ہم نے اس شہادت سے یہ فائدے نہیں اُٹھائے تو اس کے دوسرے معنے یہ ہوئے کہ یہ شہادت افادی حیثیت سے ہمارے لئے کم سے کم بے کار رہی۔ روئیے اور خوب رولائیے لیکن یہ گریہ ان لوگوں کا گریہ ہو جن کو حسینؑ کی صحیح معرفت حاصل ہے۔ جو ان اصول کا عملی احترام کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں جن کی حفاظت کے لئے حسین نے خونی کفن پہنا تھا۔ ان حدیثوں کا احترام اور ان پر عمل ہمارا فرض ہے جنھیں ہمارے ائمہ معصومین نے مصائبِ حسینی پر رونے کو مختلف عنوانوں سے اہم قرار دیا ہے۔ لیکن احادیث سے یہ کسی طرح مستنبط نہیں ہوتا کہ مظلومِ کربلا کی شہادت کا اصل اور مقصود بالذات منشا صرف گریہ و بُکا تھا اور اس لئے مجالس میں صرف اسی منشا کو پیش نظر رکھنا چاہیئے، کہ خوب گریہ و بُکا ہو۔ خواہ جھوٹے موضوع اور لغو روایات کرنے سے بھی کیوں نہو، دوسرے مقاصد سے ذاکر کو اور کوئی خاص ربط نہ ہونا چاہیئے۔ بے شک حدیث "مَنْ بَكٰى اَوْ اَبْكٰى وَتَبَاكٰى وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّة" یا دوسری احادیث میں رونے پر زور دیا گیا اور یہ زور دینا اس وقت کے لحاظ سے قطعاً حق بجانب اور نہایت ضروری تھا، اموی اور عباسی مظالم نے دوستدارانِ اہل بیت کے لئے دُنیا تنگ کر دی تھی۔ خانوادۂ رسالت کے افراد کا عزت سے تذکرہ تک جرم تھا اس کی کوششیں جاری تھیں کہ دنیا کی نگاہیں اس ظالمانہ سیاست کے ذریعہ سے ان بزرگواروں کی طرف سے پھیر دی جائیں۔ ضرورت تھی کہ دانشمندی کے ساتھ اس عیارانہ سیاست کی جڑ

ہر کاری ضرب لگائی جائے اس کی بہتر تدبیر یہی تھی کہ ایسے اجتماعات پر زور دیا جائے جو ایسے مواقع پر فطری تعلقات کے اظہار کی فطری صورت ہوں اور اس لئے مخالفین کی نگاہوں میں ان سے کبھی مضرت کا اندیشہ نہ تھا۔ اس وقت اسی حق کا قائم کرلینا بڑی کامیابی تھی اُن واقعات کو زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا۔ ان کی ایک ہلکی یادگار سے بھی انسانی توجہ اُدھر مبذول ہو سکتی تھی، مگر اب اُسی ابتدائی اصول پر قائم رہنا اور اس شہادت اور ذکر شہادت کے حقیقی مقصد سے چشم پوشی اور بے اعتنائی عمل میں لانا، ان احادیث اور ان کی منشا سے روگردانی کرنا ہے وہ درحقیقت دوسری اہم فوائد حاصل کرنے کا اس وقت کے لحاظ سے ضروری ذریعہ تھا۔ اب آگے بڑھنے کی ضرورت ہے احادیث ہمیں اس بات سے نہیں روکتیں کہ ہم ان مجالس سے دوسرے فائدے نہ اٹھائیں، اُنکا والکا کو ضمنی اہمیت دیتے ہوئے ہم کو ان مجالس سے وہ اسباق حاصل کرنے چاہئیں جن کی ہمارے مصلح اعظم و محسن عالم نے خود عملی نمونہ بن کر تعلیم دی ہے۔ ہم ہر سال محرم کا پہلا عشرہ یا پورا مہینہ یا اس سے زیادہ عرصہ تک واقعات کربلا کو یاد کرکے روتے بھی ہیں اور رُلاتے بھی ہیں امام باڑوں کی آرائش، روشنی، شیرینی، چا، شربت، حقہ پان، نذر ذاکرین اور دوسرے رسوم میں روپیہ بھی صرف کرتے ہیں لیکن یہ تو بتائیے کہ محمدی مشن اور حسینی مشن کا کون سا کام کرتے ہیں۔ قطعاً کچھ نہیں۔ ہمارے سارے کام یزیدی، ہمارے سارے افعال یزیدی۔ کیا ایسی حالت میں ہم کو دربار محمدی یا سرکار حسینی سے کسی انعام کی امید رکھنا چاہئیے محض رونے پیٹنے اور رسوم ظاہری ادا کردینے سے رُوحِ محمدی و روحِ حسینی ہرگز ہرگز خوش نہیں ہوسکتی جب تک کہ حسینی مشن کی تکمیل نہ کریں، نہ یہ کہ فقط رسمی اور سطحی طور پر رُولئے اور بس۔

شیعوں کو عالم طفولیت سے اس امر کا عادی بنا دیا جاتا ہے کہ وہ رونے کو تاجِ دین و دنیا سمجھیں اسی تربیت کا اثر ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ گریہ کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ روسیوں نے حضرت علی بن موسیٰ علیہ السلام کے روضہ مطہر پر گولہ باری کی شیعوں نے اس مذہبی اور قومی ذلت کا دفعیہ آنسوؤں کی فوج سے کرنا چاہا۔ ابن سعود نے جنت البقیع کی مقدس قبروں کو زمین کے برابر کردیا شیعوں سے اور کچھ نہ ہوسکا تو ان ظالمانہ بدعتوں پر رونے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی کہ وہ شہر شہر میں مجلسیں قائم کرکے عورتوں کی طرح رُو پیٹ لئے۔

اس میں شک نہیں کہ ایسے حالات میں جہاں انسان کی تدبیر کاروز چل نہیں سکتا سوائے اس کے اور کوئی طریقہ اظہار عتاب و انتقام کا نہیں ہوسکتا۔ اور جب جب انسان انتقام وغضب کے جوش میں بےخود ہوجاتا اور کچھ نہیں کرسکتا وہ گریہ وزاری کرتا ہے۔ ہم بھی اسی طرح روتے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ ہماری گریہ وزاری معرفت پر مبنی ہوتی اور اس کا کوئی صحیح منشا معین کیا جاتا۔ ہماری آہ و بکا۔ خود نمائی اور ریاکاری اور ناآشنائے حقیقت ہونے کی اسپرٹ ہونے کا نتیجہ ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ شیعہ قوم گریہ وزاری کی بہت عادی ہونے کی وجہ سے رقیق القلب ہوگئی ہے اور اس کی طبیعت سے عنصر ہمت زائل ہوچکا ہے رضاکاران جنت البقیع کی بھرتی کا جب طوفان برپا تھا تو ہمیں حیرت تھی کہ اس شور وشغب کا منشا کیا ہے کیا یہ مجبور و معذور لوگ حجاز جاکر سلطان نجد کو وہاں سے نکال دیں گے۔ اگر ایسا نہیں ہوسکتا اور یقیناً نہیں ہوسکتا تو ان لایعنی حرکات سے سوائے جگ ہنسائی کے اور کیا نتیجہ نکلے گا، مگر شیعوں کے بعض قومی لیڈروں کا قومیت کی حرارت غریزی کو قائم رکھنے کے لئے تحریک رضاکاران جنت البقیع کو میدان عمل میں لانا ضرور تھا۔ سیکڑوں آدمیوں نے بڑے جوش وخروش سے رضاکاروں میں اپنے نام لکھوائے

اور اپنی جان و مال قربان کر دینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن یہ سب وقتی جوش تھی۔ ایک آندھی تھی جو آئی اور نکل گئی ملّتِ گریہ کن سے کوئی کام ہوا بھی ہے۔ اس حمّام میں لیڈر اور قوم دونوں ایک ہی رنگ میں ڈوبے نظر آتے ہیں ہماری باتیں ہی باتیں ہیں۔ کام کرنا کچھ نہیں آتا۔ جھوٹے آنسو بہانے کے مرد ہیں لیکن آزمایشی مقامات پر ہم سے بڑھ کر کوئی بُزدل نہیں۔ ان تحریکوں کے اٹھانے میں ایک فوری اور عارضی جوش تھا لیکن خلوص غائب تھا۔ کیسے بڑے بڑے دعوے تھے۔ ابن مسعود پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں، حج کے التواء کا اعلان بڑے زور و شور سے کیا گیا لیکن ہوا کیا۔ اس داستاں کو نہ پوچھئے، کچھ کہیں گے تو زبان کاٹ دی جائے گی کفر کے فتوے شایع ہوں گے، گوئی کتنا ہی جوش دلائے، اِن تلوں سے تیل نکلنے والا ہی نہیں ایسی رسوائی کبھی نہ ہوئی تھی، جو لوگ صرف رو لینے کو آلِ دین و دنیا سمجھتے ہوں جن میں مذہبی و قومی سود زیاں کے احساس کا فقدان ہو وہ اس کے سوا اور کس بات کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

مرثیہ گوئی

اور

مرثیہ خوانی

مرثیہ جس میں متوفی کے فضائل و محامد اور اس کے وفات پر اظہارِ رنج و غم کیا جاتا ہے۔ اس کا رواج عرب میں قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے کسی مصیبت و تعزیت کے وقت جو کوئی شاعر یا مردہ کا وارث یا رشتہ دار مرثیہ کہتا اس میں بعض نامناسب امور بھی نظم کر دیتا حضرت کا زمانۂ نبوت

جب وقت آیا تو آپ نے اُمورِ نامناسب کے نظم کی ممانعت فرما دی۔ مگر مُردہ کے حالات و مضامین تعزیت اور غم و الم کا نظم کرنا جائز رہا آپ کے اصحاب میں سے حسان بن ثابت اور کعب بن مالک نے شہدائے بدر و اُحد کے لئے مرثیئے لکھے۔ خاندانِ رسالت کے شہیدوں میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضؓ حضرت عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب رضؓ حضرت جعفر بن ابی طالب رضؓ بن عبدالمطلب رضؓ کے واسطے مرثیے لکھے گئے۔ یہ سب مرثیئے کتب تاریخ میں درج ہیں یہ تو حضرت کے روبرو کا حال تھا۔ جب آپ نے وفات پائی تو مدارج النبوۃ میں لکھا ہے۔

"ہر کدام از اہل بیت آنحضرتؐ و صحابۂ عظام مرثیہ در وفات آنحضرتؐ در سلکِ نظم کشید نداول الشاں فاطمہ زہرا بود کہ چوں بعد از دفن پدر بزیارت قبر شریف رفت۔ خاکے از آں جا بر داشت و بدیدہ غم دیدہ نہاد و گریہ کرد و اشعار انشا و نمود"

یہ اشعار مدارج النبوت میں لکھے ہیں۔ تاریخ طبری میں ہے کہ جناب سرور کائناتؐ کی وفات کے بعد آپ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضؓ نے بہت مرثیئے کہے۔ حضرت ابوبکر صدیق اور حسان بن ثابت نے بھی کہے ان مرثیوں کے اشعار طبری نے لکھے ہیں اصحاب کے بعد تابعین اور آئمۂ مذاہب وغیرہ کا بھی یہی عمل رہا کہ سب نے سید الشہداء کی مصیبت میں مرثیئے نظم کئے چنانچہ جواہر العقد میں سمہودی اور استیعاب ابن عبدالبر ینابیع المودۃ میں فاضل قندوزی میں سلیمان ابن قتیبہ کا مرثیہ اور جواہر العقدین میں۔ امام شافعی کا لکھا ہوا مرثیہ تحریر ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب سر الشہادتین میں لکھتے ہیں۔

ثمّ لما وقعت وشهر امرها بانقلاب — واقعہ شہادتِ مظلوم مٹی کے خون ہو
التربة وما وامطار الله من — جانے سے آسمان سے خون برسنے

السماء وهتف الهواتف بالمراثی و نوح الجن وبکائهم	اور عالم غیب اور جنات کے مرثیوں اور نوحوں کی آواز سننے سے مشہور رہا

اِس عبارت سے ثابت ہے کہ عالم غیب اور جنات سے بھی مرثیے سُنے گئے۔ اِس عبارت کا ماحصل شاہ صاحب کے شاگرد مولوی کرم احمد صاحب نے یہ لکھا ہے:۔

"فرشتگان آواز می دادند از عالم غیب بمرثیہ ہائے آنحضرت بلکہ شہرت بخشیدا و سبحانہ تعالےٰ واقعۂ شہادت را بدیں وجوہ و در قلوب مردم صغیر و کبیر بکا و حزن متمر انداخت کہ ہمیشہ محزول وگریاں می باشند وگاہے ایں اندوہ کہنہ نمی گردد وایں واقعۂ ہائلہ جانکاہ ہمیشہ در امت رسول مذکور می شود بخواندنِ کتابہا و مرثیہ ہا مشعر حالات و روایات صحیحہ واقعہ امام حسین وایں امر تا روز قیامت باقی خواہد ماند، و در اہل آسمان و زمین ہا و در حاضران و غائبان و در خلق ناطق کہ زبان دارند۔ و در خلق صامت کہ خاموش و بے زبانند"

بہرحال قریب قریب ان کل زبانوں میں جو مسلمانوں میں مستعمل ہیں حضرت شہید کربلا کے مرثیے پائے جاتے ہیں۔ ہر ایک نے اِس عبرت خیز واقعہ کو اپنی وسعتِ نظر اور درجۂ جذبات کے موافق نظم کیا ہے۔

مسلمانوں کی آبادی اب بھی دور دور پھیلی ہوئی ہے مختلف زبانوں کے استعمال پر ادعا کرنا اور مشرق میں چین سے لے کر مغرب میں امریکہ تک مسلمان کم و بیش آباد ہیں دنیا کی تمام زبانیں بولتے اور لکھتے ہیں لیکن اِن میں سب سے پہلے عربی مرثیے قابلِ لحاظ ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرت عرب تھے قائل عرب تھے زمین و آسمان عرب تھے اس کے لئے عرب کی ہی شاعری موزوں تھی کہ وہ واقعات اور

جذبات غم کی مصوری کرتے ہم ان عربی مرثیوں کو جو کتب تاریخ میں لکھے گئے ہیں مجبوراً بوجہ طوالت چھوڑتے ہیں فارسی زبان کے جس قدر مرثیے ہماری نظر سے گذرے ملا محتشم کے اُس مشہور مرثیے سے جس کے چند اشعار ہم آگے لکھیں گے کوئی رنگ نہیں کھاتا لیکن اس امر خاص میں سب سے زیادہ حصہ ہماری اردو زبان نے لیا کیونکہ جس قدر کثرت سے مرثیے اردو میں لکھے گئے ہیں کسی دوسری زبان میں تحریر نہیں ہوئے۔ ہمارے ملک کے مرثیہ گو طبقہ میں میر انیس[1] اور مرزا دبیر آسمان شاعری و سخن سنجی کے آفتاب و ماہتاب ہوئے

[1] میر ببر علی صاحب انیسؔ: میر حسن صاحب خلیق کے بڑے بیٹے میر غلام حسن صاحب حسن کے پوتے میر غلام حسین صاحب ضاحک کے پرپوتے موروثی اہل زبان اور خاندانی شاعر ہیں اس خاندانی کمال میں باپ کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی اور ضروریاتِ فن سے آگاہی حاصل کی، ابتدا میں غزل کہتے تھے پھر مرثیہ گوئی اختیار کی اور اس میں ایسا کمال پیدا کیا کہ زمین شعر کو آسمان سے اونچا کر دیا فصاحت و سلاست کے دریا بہائے جس رَوش کو اختیار کیا اس میں وہ گل بوٹے لگائے کہ دیکھنے والوں کو محو حیرت بنا دیا حق یہ ہے کہ میر صاحب کے مقابلہ میں کسی دوسرے کو اُردو کی شاعری کا دعوےٰ کرنا محض مُنہ چڑانا ہے، میر صاحب کا مرتبہ اردو زبان میں وہی نسبت رکھتا ہے جو ہومر کو یونانی بیاس کو سنسکرت اور فردوسی کو فارسی زبان میں حاصل ہے۔ صفائی کلام حُسنِ بیان لطفِ محاورہ سلاستِ الفاظ خوبیٔ بندش میر صاحب کا خاص حصہ ہے جس طرح آپ کا کلام لاجواب دیکھتے ہو۔ اسی طرح پڑھنا بھی بے مثال تھا ان کی آواز اُن کا قد و قامت ان کی صورت کا انداز ان کے پڑھنے کی متانت و سنجیدگی غرض ہر شئے زیبِ ممبر ہونے کے لئے ٹھیک اور موزوں واقع ہوئی تھی اس کے ساتھ ہی اعلےٰ درجہ کے پابندِ وضع و پرہیزگار تھے اور سپاہی منش بھی۔ میر صاحب نے

ان دونوں بزرگواروں نے مداحیٔ اہل بیت میں عمر بھر ریاضت کی اور قبولیت عامہ کا جو تمغائے امتیاز حاصل کیا وہ برائے دوام فخر و اعزاز کے لئے کافی ہے۔ تاہم اتنا ضرور کہا جائے گا کہ مرثیہ گوئی کی قدیم سادگی اور درد انگیز تحریک جو مرثیہ کی حقیقی روح ہے اور دلگیر، خلیق، ضمیر، افسردہ وغیرہ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ زائل اور فنا ہو گئی۔

گذشتہ سے پیوستہ:۔ ستر برس سے زائد عمر پا کر ذی قعدہ سنہ ۱۲۹۱ ہجری میں انتقال فرمایا۔ ان کے فیضِ تعلیم اور فیضانِ موروثی سے سارا گھر ایسا ہی ہوا ان کے دو بھائی میر نواب صاحب مونسؔ اور میر مہر علی صاحب انسؔ اور بڑے بیٹے میر خورشید علی صاحب نفیسؔ اور میر ہادی صاحب وحید خلف میر انسؔ سب اپنے اپنے رنگ اور اپنے اپنے طرز میں صاحبِ کمال ہوئے اور اس فن کی استادی کو ایسا نباہا کہ اس سے مافوق متصور نہیں۔ میرزا سلامت علی صاحب دبیرؔ خاندانی شاعر نہ تھے مگر مرثیہ گوئی کے شوق نے شاعری کے عرش الکمال تک پہونچا دیا۔ میر مظفر حسین ضمیرؔ کے شاگرد تھے اور جو کچھ استاد سے پایا اسے انتہا سے زیادہ بلند اور روشن کر دکھایا تمام عمر میں کسی اتفاقی سبب سے کوئی غزل یا شعر کہا ہو ورنہ مرثیہ گوئی کے فن کو لیا اور اس درجہ تک پہنچا دیا جس سے آگے ترقی کا راستہ بند ہو گیا ابتداء سے اسی شغل کو اجر آخرت کا سامان سمجھا اور نیک نیتی سے اس کا ثمرہ لیا طبیعت بھی ایسی گداز پائی تھی جو اسی فن کے لئے نہایت موزوں اور مناسب تھی ان کی سلامت روی پرہیزگاری مسافر نوازی زہد اور سخاوت نے صفت کمال کو اور بھی زیادہ چمکا دیا تھا جس طرح میر انیسؔ صاحب صفائی کلام لطفِ زبان چاشنی محاورہ خوبی بندش حسنِ اسلوب مناسبت مقام طرز ادا اور سلسلہ کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے ویسے ہی مرزا صاحب شوکتِ الفاظ کثرتِ مضامین اس میں جا بجا غم انگیز اشارے درد خیز کنائے دلگداز انداز جو مرثیہ کی جان ہے ان صنعوں میں بادشاہ ہیں۔

مجلسِ غم نے محفلِ مشاعرہ کا رنگ اختیار کر لیا۔ آہ آہ میں واہ واہ بھی شامل ہو گئی لہذا تراش خراش مبالغہ اور رنگ آمیزی نے موجودہ طرزِ مرثیہ گوئی کو اس کے قدیمی اور

گذشتہ سے پیوستہ:۔ حق یہ ہے کہ میر صاحب اور مرزا صاحب آسمانِ شاعری کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ ان دونوں باکمالوں نے ثابت کر دیا کہ:۔ حقیقی و تحقیقی شاعر ہم ہیں اور وہ ہم ہی ہیں کہ ہر رنگ کے مضمون ہر قسم کے خیال کا اپنے الفاظ کے جوڑ بند سے ایسا طلسم باندھ دیتے ہیں کہ چاہیں رُلا دیں چاہیں ہنسا دیں چاہیں تو حیرت کی مورت بنا کر بٹھا دیں۔ یہ دعوے بالکل درست تھے کیونکہ مشاہدہ کی تصدیق کو ہر وقت موجود تھا دلیل کی حاجت نہ تھی سکندر نامہ جس کی تعریف میں لوگوں کے لب خشک ہیں اس میں صرف چند میدان ہیں رزم زنگبار جنگِ دارا جنگِ روش جنگِ فور جنگِ فغفور اسی طرح بزم کی چند تمہیدیں اور جشن شاہنامہ کے ساٹھ ہزار شعر فردوسی کی عمر بھر کی کمائی ہیں ان دونوں صاحبوں نے تو ایجازِ مضامین کے دریا بہا دئے ایک مقررہ مضمون کو سیکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا ہر مرثیہ کا چہرہ نیا، آمد نئی رزم جدا بزم جدا اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا تلوار نئی نیزہ نیا گھوڑا نیا، انداز نیا مقابلہ نیا، اور اسی پر کیا منحصر ہے صبح کا عالم دیکھو تو سبحان اللہ نور کا ظہور آفتاب کا طلوع مرغزار کی بہار، شام ہوئی تو شامِ غریباں کی اُداسی کبھی اندھیری رات کا سناٹا کبھی تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیری کے ساتھ رنگ رنگ سے دکھایا ہے۔ مختصر یہ کہ جس حالت کو لیا ہے اس کا وجد انگیز سماں باندھ دیا ہے آمد مضامین کی بھی کوئی انتہا نہ رہی جن مرثیوں کے بند چالیس پچاس سے زیادہ نہ ہوتے تھے وہ ڈیڑھ سو سے گذر کر دو سو سے بھی نکل گئے تخمینہ ہے کہ مرزا صاحب نے کم سے کم دس ہزار مرثئے لکھے ہوں گے سلاموں کا شمار نہیں رباعیاں تو باتیں تھیں۔

اصلی دائرہ سے باہر کر دیا مضمون آفرینی کے ساتھ واقعات آفرینی بھی ہونے لگی گو یہ نیا طرز ایسا عام پسند ہوا کہ ان دونوں صاحبوں کے علاوہ ان کے خاندان والے اور شاگرد بلکہ لکھنؤ سے باہر دوسرے شہروں کے مرثیہ گو سب اسی کی تقلید کرتے رہے اور کر رہے ہیں حتّٰی کہ خیال آفرینی کے ساتھ رنگِ تغزل اور اس کے ساتھ ساقی نامے[۱] لوازمہ

۱؎ کچھ عرصے سے ہمارے مرثیہ گو شعرا مرثیہ میں ساقی ناموں کی آمیزش کو لازمی جزو خیال کرنے لگے ہیں اور اس بدعت پر نازاں ہیں میر صاحب اور میرزا صاحب کے مرثیہ گوئی میں رزم و بزم کو داخل کرنے سے وہ اصلی سادگی جو مرثیہ کی جان ہے رخصت ہو گئی تھی مگر ان دونوں بزرگواروں نے اس کو بہ اعتبارِ فنِ شعر معراج کمال پر پہنچایا تاہم دائرہ ادب و احترام سے قدم آگے نہ رکھا اور ان محدود واقعات مواقع اور مناظر کو سیکڑوں طریقوں سے بیان کیا اور حسنِ کلام اور ادائے مطالب میں وہ جدتیں پیدا کی ہیں کہ ان سے مافوق متصور نہیں جن کا صلہ قبولیتِ عام ہے اور آئندہ مرثیہ گویوں کے لئے ایسی شاہراہ تیار کر گئے کہ کسی کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کے سوا چارہ نہیں لیکن پچھلے شعرا نے جن کو مداحِ اہل بیت بننے کا شوق ہے اُن کی تقلید چھوڑ کر صرف واہ واہ کا شور مچوانے کے لئے ایک نئی روش اختیار کی جو ابجاد بندہ اگرچہ گندہ کی مصداق ہے ان کو اس کے سوا اور کوئی رستہ نظر آیا کہ مرثیوں میں فضائل و مصائب کے ساتھ ساقی ناموں کا اضافہ کریں اب عموماً مرثیہ گو شعرا اسی بلا میں مبتلا ہیں محافل میلاد ہوں یا مجالسِ عزا قصیدہ ہو یا مرثیہ شراب اور ساقی کے ذکر سے خالی نہیں کوئی ان حضرات سے پوچھے کہ ان کو مرثیہ یا قصائدِ نعت و منقبت سے کیا ربط اور کیا تعلق ہے نہ یہ داخلِ فضائل نہ شاملِ مصائب آخر اس غیر متعلق حشویات و زوائد کو کس مد میں شمار کیا جائے اور اس جدت و جودت کا مقصد اصلی کیا ہے۔ ذواتِ قدسی کے مراثی اور قصائد کے ساتھ اس کی آمیزش ہمارے خیال میں تو صرف مرثیہ گوئی ہی کی نہیں بلکہ ذواتِ قدسی کی بھی

مرثیہ گوئی میں داخل ہو گئے مگر اب یہ افراط و تفریط قابل اصلاح ہے اگر آئندہ مرثیہ گو اسی قدیم سادگی اور بجائے دادِ سخن لینے کے ثواب اور رونے رُلانے کو ملحوظ رکھ کر اب

گذشتہ سے پیوستہ ا۔ یہی توہین ہے بعض شعرا اور ذاکر جو شراب اور ساقی کا تذکرہ کرتے ہوئے میکدہ کی پوری تصویر کھینچ دیتے ہیں اور مستانہ انداز سے اس طرح جھوم جھوم کے پڑھتے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک رندِ میخوار سرِ ممبر نشہ میں جھوم رہا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ تو سامعین کے گرمانے کے لئے صرف استعارات سے کام لیا جاتا ہے۔ ورنہ تلخ اور بدبودار یا رقیق کا معاذ اللہ خیال بھی نہیں آسکتا حُبِّ اہل بیت یا ایسے ہی کسی دوسرے مفہوم کو استعارتاً لفظِ شراب سے بیان کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی متعدد مقامات پر لفظ شراب آیا ہے تو ہم کہیں گے کہ لغتِ عرب میں ہر پینے کی چیز کو شراب کہتے ہیں (شراب آشامیدن و خوردن مائیات کما فی الصراح) پانی کو بھی شراب کہا گیا ہے ملاحظہ ہوں قرآن مجید اور فرقانِ حمید کی آیات ذیل :-

لَنگئین فِیْھَا یَدْعُوْنَ فِیْھَا بِفَاکِھَۃٍ کَثِیْرَۃٍ وَّشَرَابٍ۔ پارۂ ۲۳۔ سورۂ ص۔	یہ لوگ (بہشتی) وہاں تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے وہاں (خدام بہشت سے) کثرت سے میوے اور پینے کی چیزیں منگوائیں گے۔
ارکض برجلک ھذا مغتسل باردٌ وَّشَرَابٌ پارہ ۲۳۔ سورۂ ص۔	(حضرت ایوب سے خطاب) اپنے پاؤں سے زمین کو ٹھکرا دو تمہارے نہانے اور پینے کے لئے ٹھنڈا پانی موجود ہے۔
یخرج من بطونھا شراب مختلف الوانہ فیہ شفاءٌ للناس۔ پارۂ ۱۴ سورہ النحل	مکھی کے پیٹ سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے (یعنی شہد) جس کے رنگ مختلف ہوتے

دوسرا قالب اختیار کریں واقعات کی صحت و تحقیق کا خیال رکھیں تلوار اور گھوڑے کی بقول مصوری اور نقاشی سے دست کش ہو کر ان اخلاقی جذبات کی ترجمانی کریں جو حسینی شہادت کے ہر واقعہ سے وابستہ ہیں تو نہایت مناسب ہو گا کیونکہ مجلس عزا اور

گذشتہ سے پیوستہ:۔ اس میں لوگوں کی بیماریوں کی شفا ہے۔

ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَکُم مِنْہُ شَرَابٌ وَمِنْہُ شَجَرٌ تُسِیْمُوْنَ پارہ ۱۴ سورۃ النحل	وہ خدا ہے جس نے تمہارے لئے پانی برسایا آسمان سے جس میں سے تم پیتے ہو اور اس سے درخت شاداب ہوتے ہیں۔
وَاَنْھَارٌ مِّنْ مَّاءٍ غَیْرِ آسِنٍ وَاَنْھَارٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُہٗ وَاَنْھَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّۃٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ وَاَنْھَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّی پارہ ۲۶ سورۂ محمد	اس میں (بہشت میں) پانی کی نہریں جن میں ذرا بو نہیں اور اس میں دودھ کی نہریں جن کا مزا نہیں بدلا اور شراب کی نہریں جو پینے والوں

کے لئے لذت ہیں اور صاف شفاف شہد کی نہریں ہیں۔

صرف پچھلی آیت میں لفظ خمر آیا لیکن اس کا مفہوم کیا ہے یہ ہم نہیں سمجھ سکتے اور ہمارے عقل و ادراک سے بالاتر ہے نہ آخری آسمانی کتاب میں کسی استعارہ کو ایسی ہیئت و صورت سے بیان کیا گیا ہے جیسا کہ شعرا شراب خانہ کا مستانہ نظارہ اور خمار کا نقشہ کھینچتے ہیں شراب اور ساقی تو غزلیات اور دوسری ہزلیات کے ہی لئے موزوں ہے فضائل و مصائب کے ساتھ وضع الشئے فی غیر محلہ۔ کا مصداق نہیں تو کیا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہاں ساقیا۔ یا۔ ساقی تو کدھر ہے کہ الفاظ سے اُن کا مخاطب صحیح کون ہوتا ہے اگرچہ وہ فرضی ہی سہی اِس خبط کو یہاں تک ترقی ہوئی ہے کہ بعض شعراء کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ جس میں ساقی نامہ نہ ہو وہ مرثیہ ہی نہیں۔

اور مرثیہ کی اصلی رُوح اور علتِ غائی بھی یہی ہے۔

اِس مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی بدولت (جیسی کہ ہندوستان میں رائج ہے) تین باتیں اصولی حیثیت سے قابل اعتراض بھی پیدا ہو گئی ہیں۔

گذشتہ سے پیوستہ:۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ:۔ کاش خدا ان لوگوں کو توفیق خیر عطا فرمائے کہ وہ اہل بیت طاہرین کے متبرک اذکار کے ساتھ ایسے غیر ضروری اور مکروہ اشعار کو اس کا لازمی جزو قرار نہ دیں اور چند منٹ کی واہ واہ اور سبحان اللہ کے لئے اِس وبال کو اپنے سر نہ لیں اس کے ساتھ ہی سامعین کی بدمزاقی بھی قابل ماتم ہے کہ وہ اس رمز کا خیال کئے بغیر اس نامناسب مضمون آفرینی کی داد دیتے ہوئے چھت کو سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ مرثیوں میں جو ساقی نامہ ہیں ان میں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ساقی کدھر ہے لا مئے اطہر کا جام لا ؎ گل کے ایاغ میں گل احمر کا جام
جس میں ہو خوں کا رنگ وہ احمر شراب دے ؎ آئی ہیں اب جمائیاں بھر کر شراب دے
ساقیا ساغر صہبائے خوش انجام پلا ؎ ساقیا دم ہے کبوں پر مئے گلفام پلا
ساقیا کب سے تڑپتا ہے یہ ناکام پلا ؎ ساقیا جام پلا جام پلا جام پلا

سر پہ احسان ترا دل میں تری یاد رہے
تو رہے اور ترا میکدہ آباد رہے

ساقیا خوب پلا آج مئے ناب مجھے ؎ جس سے باقی نہ رہے ہوش خور و خواب مجھے
جام پر جام عنایت ہو بس جام شراب ؎ خوب جھک جاؤں جو ہو دست میں جام شراب

یہ اشعار تو پھر بھی معمولی ہیں لیکن اس موضوع پر بڑی بڑی طبع آرائیاں کی گئی ہیں جن کو ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔

(۱) اول یہ کہ مجلس عزا کو جس کا مقصد اصلی صرف فضائل و مصائب کا بیان کرنا ہی محفل مشاعرہ بنا دیا ہے اتنا مصائب پر گریہ نہیں ہوتا۔ جتنا حُسن کلام اور رعایت لفظی اور جذبات مضامین کی شور وغل کے ساتھ داد دی جاتی ہے۔

(۲) غلط یا طبعزاد واقعات کی اشاعت جو بچّوں عورتوں اور جاہلوں سے گذر کر لکھے پڑھے لوگوں پر بھی اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتیں جن کو سنتے سنتے حق الیقین کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور یہی غلط فہمیاں رفتہ رفتہ عام قلوب پر نقش کالحجر ہو جاتی ہیں۔

(۳) سب سے بڑھ کر اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ معصومینؑ کے ارشادات اور بیانات جو ان کی زبان مبارک سے نہیں نکلے مختلف عنوانوں کے ساتھ شدّ و مد سے قلمبند کئے جاتے ہیں حالانکہ ان کا موجد شاعر کا دماغی سانچہ ہوتا ہے۔

مذہب امامیہ اثنا عشریہ میں قولِ معصوم جو کچھ بھی ارشاد ہوا ہو حدیث ہے اور یہ کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس میں ایک لفظ کی کمی یا اپنی طرف سے اضافہ کرے۔ محدثین کو ارشاداتِ معصومینؑ کا جو کچھ پہنچا ہے انہوں نے بڑی عرق ریزی سے اس کی تنقید و تحقیق کی ہے احادیث کے مدارج مقرر کئے ہیں اور راویوں کے ثقہ او غیر ثقہ ہونے کی جانچ کے واسطے علم الرّجال مدوّن کیا ہے۔ ایسی صورت میں شعرا اس جسارت کے کیونکر مجاز ہو سکتے ہیں کہ اپنی طبیعت کی جودت اور دماغ کی مشین سے جو کچھ چاہیں گھڑیں اور اس کو کسی معصوم کی طرف منسوب کر دیں کہ یہ فرمایا اور وہ فرمایا۔

اسی طرح ان افعال و اعمال کو جو ان ذواتِ قدسی آیات کی طرف سے ظہور پذیر نہیں ہوتے خود ضبطِ نظم میں لانا اور ان کی طرف منسوب کرنا کہاں تک جائز ہو سکتا ہے اور اس اہم اور نازک مسئلہ پر غور کرتے ہوئے جس میں سخت احتیاط

کی ضرورت ہے اور ذرا سی لغزش کذب و افترا کی حد تک پہونچا دیتی ہے مذہب اور عقل کیونکر آزادیٔ تخیل کی اجازت دے سکتے ہیں۔

ہم کو شاعری کی عام حیثیت سے اس جگہ بحث نہیں بلکہ ایک خاص حیثیت یعنے مرثیے سے اس میں معیارِ شاعری یہ نہ ہونا چاہیئے کہ شاعر کہاں تک زمین و آسمان کے قلابے ملا سکتا ہے یا ہمیں مضمون آفرینی میں کہاں تک ملکہ حاصل ہے یا رعایت لفظی کس حد تک ہے جس کی افراط سے اصل مرثیت ہی معدوم ہو جائے بلکہ صدق و واقعیت کا وہ نمونہ ہونا چاہیئے جسے سن کر دل خود اقرار کرے کہ یہ واقعہ ہے۔ صحیح جذبات کا اظہار زمین و آسمان کے قلابے ملانے سے نہیں ہو سکتا۔ مرثیہ میں سب سے ضروری چیز خصائل نگاری ہے ہم اپنے زمانہ کے شعرا سے امید کرتے ہیں کہ وہ آئندہ کے لئے ایک ترقی خیز نظام اور اصول قائم کریں۔ اور اسلام کے نفوسِ قدسیہ کی مدح اور مرثیہ میں مذکرہ صدر اصول کا لحاظ رکھیں۔ وقت جا چکا کہ عوج بن عنق کی جانب اور ہاتھی گھوڑے کی غیر ضروری مصوری میں دلچسپی کی امید کی جائے مجلسِ عزائے حسینؑ کے واقعاتِ عظیم کے تذکرے کی جگہ ہے حسینؑ کے واقعات میں قوم گری اور خصائل سازی کی بہترین صلاحیت موجود ہے اس لئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کوئی ترکیب یا نوعیت جو اس میں مدد دیتی ہو وہی مفید و کارآمد ہو سکتی ہے اور جو نوعیت اس معیار پر پوری نہ اُترے وہ بلاشبہ نظرِ ثانی کی چیز ہے یاد رکھو کہ ہم مجلس میں کسی شخص کو اس کی شخصی قابلیت کی داد نہیں دینے جاتے۔ جو مجلس حسینؑ کے مفہوم کے خلاف ہے بلکہ اس لئے کہ ہم دیکھیں کہ حسینؑ اور واقعات حسینؑ کو شاعر کہاں تک سمجھا ہے البتہ اس کی اس مخصوص کوشش کی کامیابی میں ضمنی داد یہی ہے کہ ہم ایک نفس عظیم کے خصائل سے سبق اور اثر لینے جاتے ہیں اور ہم ان صحیح اثرات پر داد دے سکتے ہیں نہ کہ اس کے خلاف اگر کوئی شخص اس کے برعکس حسینؑ کو کسی اور طرح صرف کرنا چاہیئے۔ تو وہ نہ صرف ایک شے کی نوعیت کو تبدیل کر رہا ہے بلکہ ہمارے قومی فوائد کو روک کر

اس میں ناقص یا غیر متعلق چیزیں شامل کرنا ہے۔

ہمارے مراثی کی صورت میں رخصت اور شادی بیاہ کی امید اور پھر یاس کو بہت کچھ دخل ہے اور پھر شہادت کے بعد میں ایک نتیجہ ہے یہ اس لئے ہے کہ:۔ رخصت میں عورتوں کی نرم دلی اور شادی بیاہ میں ماں کے حوصلوں کی بڑی گنجائش ہے ہم اسکے مخالف نہیں کہ جذبۂ غم میں ہیجان نہ پیدا کیا جائے مگر جذبۂ غم کی ایسی مصوری نہونی چاہیئے جو خصائل کے سمجھانے میں غلطی کرتی ہو ہم اس سے بہتر فقروں میں نہیں سمجھا سکتے کہ وہ مخدرات جو شہدائے کربلا کی مائیں اور بیبیاں تھیں خصائل نگاری میں انصاف کی خواہاں ہیں ہیجانِ جذبۂ غم کے یہی معنی نہیں کہ کوئی شخص بدحواسی سے چیخیں مار کر روئے بلکہ اظہار غم کے موقعہ پر ضبط اور بے چینی پر صبر ہی سب سے بڑا مرثیہ ہے واقعات کی غلط نگاری اور جذبات کی غلط مصوری نے سب سے زیادہ ضرر رساں نقصان یہ پہنچایا کہ واقعات و خصائل کے متعلق غلط فہمی پھیل گئی حتیٰ کہ اہل بیت او شہداء کے صحیح حالات اور صحیح جذبات کا علم بہت ہی محدود ہو گیا۔ غلط بیانی مبالغہ اور طبع زاد مضامین کے ساتھ طبع زاد واقعات طبع زاد بیانات اور طبعزاد جذبات پہلو بہ پہلو چلنے لگے اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ ہم مرثیہ گو حضرات کے کام کو سبک سمجھ رہے ہوں یا ان کی سعی ہمارے نزدیک قابلِ قدر نہیں لیکن امر حق کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے مجلس ایک ایسا انسٹی ٹیوشن ہونا چاہیئے جو قومی حیثیت سے مفید ہو ہمیں اپنے اس جلسہ کی صحیح حیثیت کا لحاظ لازمی ہے جو اثر مجلس کا ہماری قوم پر ہے اگر اس میں کسی کا غیر صحیح میلان یا قومی عنصر کا غلط اندازہ شامل ہے تو قوم کو باز پرس اور اصلاح کا حق حاصل ہے۔

یہ بحث تو مرثیہ گوئی کے متعلق تھی اب مرثیہ خوانوں کو لیجئے اکثر دیکھا جاتا ہے کہ رزم بزم اور بین کے موقعہ پر صورتِ حال دکھانے کے لئے مرثیہ خوان ایسا طرز بیان

اختیار کرتے ہیں کہ تہذیب متانت آداب مرثیہ خوانی اور آدابِ مجلس کے سراسر خلاف ہوتا ہے بعض تو ممبر کی چولیں تک ڈھیلی کر دیتے ہیں یہاں تو فضائل و مصائب اہلبیت کا حال بیان کرنا ہے سنجیدگی اور ادب سے سنانا چاہیئے نہ کہ فضول ہاتھ پاؤں ہلانے اور مُنہ بنانے سے۔

ہم اس موقعہ پر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ جب تک کہ ملا محتشم کے ان مشہور اور یادگار مرثیہ کے کچھ بند نہ یہاں لکھ لیں۔ حق یہ ہے کہ اس مرثیہ کے بے مثل اشعار ہیں۔ اور عام قبولیت ان کا تمغائے امتیاز بلاشبہ اس سے صحیح تر مصوری اس سے مناسب تر الفاظ اس سے لطیف تر سخن اور آمد محال ہے۔

باز ایں چہ شورش است کہ در خلق عالم است
باز ایں چہ نوحہ وچہ عزا وچہ ماتم است

گر خوانمش قیامت دنیا بعید نیست
ایں رستخیز عام کہ نامش محرم است

جن و ملک برآدمیاں نوحہ می کنند
گویا عزائے اشرف اولاد آدم است

خورشید آسمان و زمیں نور مشرقین
پروردہ کنار رسول خدا حسینؑ

اے چرخ غافلی کہ چہ بیداد کردہ
وز کیں چہا دریں ستم آباد کردہ

کام یزید دادہ از کشتن حسینؑ
بنگر کرا بہ قتل کہ دلشاد کردہ

بہر خسے کہ خارِ درخت شقاوت است
در باغ دیں چہ باگل و شمشاد کردہ

حلقے کہ سود لعلِ لب خود نبی براں
آزردہ اش بہ خنجر بیداد کردہ

با دشمنان دیں نتواں کرد انچہ تو
با مصطفےٰ و حیدر و اولاد کردہ

ترسم ترا دمے کہ بہ محشر درآورند
از آتشِ تو دود بہ محشر برآورند

کشتی شکست خوردہ طوفان کربلا
در خاک و خوں فتادہ بمیدانِ کربلا

از آب ہم مضائقہ کردند کوفیاں / خوش داشتند حرمتِ مہمانِ کربلا
بودند دیو و دد ہمہ سیراب و می مکید / خاتم ز قحطِ آب سلیمانِ کربلا
آہ از دمیکہ لشکرِ اعدا نہ کردہ شرم / کردند رو بہ خیمۂ سلطانِ کربلا

آندم فلک بہ آتشِ غیرت سپند شد
کز خوفِ خصم در حرم افغاں بلند شد

کاش آں زماں سرادقِ گردوں نگوں شدے / ویں خرگہِ بلند ستوں بے ستوں شدی
کاش آں زماں کہ پیکرِ او شد درونِ خاک / جانِ جہانیاں ہمہ از تن بروں شدی
کاش آں زماں کہ کشتیٔ آلِ نبی شکست / عالم تمام غرقۂ دریائے خوں شدی
ایں انتقام گر نہ فتادی بروزِ حشر / با ایں عمل معاملۂ دہر چوں شدی

آلِ نبی چو دستِ تظلم بر آورند
ارکانِ عرش را بہ تزلزل در آورند

برخوانِ غم چو عالمیان را صلا زدند / اول صلا بہ سلسلۂ انبیا زدند
نوبت بہ اولیا چو رسید آسماں طپید / زاں ضربتے کہ بر سرِ شیرِ خدا زدند
وانگہ سرادقے کہ ملک محرمش نبود / کندند از مدینہ و در کربلا زدند
اہلِ حرم دریدہ گریباں کشادہ مو / فریاد بر درِ حرمِ کبریا زدند

روح الامیں نہادہ بزانو سرِ حجاب
تاریک شد ز دیدنِ او چشمِ آفتاب

چوں خوں ز حلقِ تشنۂ او بر زمیں رسید / جوش از زمیں بذروۂ عرشِ بریں رسید
نزدیک شد کہ خانۂ ایماں شود خراب / از بس شکستہا کہ بارکانِ دیں رسید
باد آں غبار چوں بمزارِ نبی رساند / گرد از مدینہ بر فلکِ ہفتمیں رسید
پر شد فلک ز غلغلہ چوں نوبتِ خروش / از انبیا بحضرتِ روح الامیں رسید

کرد ایں خیال وہمِ غلط کار کاں غبار / تا دامنِ جلالِ جہاں آفریں رسید

ہست از ملال اگرچہ بری ذاتِ ذوالجلال
او در دل است و ہیچ دلے نیست بے ملال

روزی کہ شد بہ نیزہ سرِ آں بزرگوار / خورشید سر برہنہ بر آمد ز کوہسار
جمعے کہ پاسِ محملِ شاں داشت جبرئیل / کردند بے عماری و محمل شتر سوار
با آں کہ سر زد ایں عمل از امتِ رسول / روح الامیں ز روحِ نبی گشت شرمسار
بر حربگاہ چوں رہِ آں کارواں فتاد / شورِ نشور در ہمہ کون و مکاں فتاد
ہر جا کہ بود آہوئے از دشت پا کشید / ہر جا کہ بود طائرے از آشیاں فتاد
شد وحشتے کہ شورِ قیامت بگرد رفت / چوں چشمِ اہلِ بیت بر آں کشتگاں فتاد
ناگاہ چشمِ دخترِ زہرا دراں میاں / بر پیکرِ شریفِ امامِ زماں فتاد
بے اختیار نعرۂ ہذا حسین ازو / سر زد چناں کہ آتش ازاں در جہاں فتاد

پس با زبانِ پر گلہ آں بضعۃ الرسول
رو کرد در مدینہ کہ یا ایہا الرسول

ایں کشتۂ فتادہ بہ ہاموں حسینِ تست / ویں صیدِ دست و پا زدہ در خوں حسینِ تست
ایں خشک لب فتادۂ ممنوع از فرات / کز خونِ او زمیں شدہ جیحوں حسینِ تست
ایں قالبِ طپاں کہ چنیں ماندہ بر زمیں / شاہِ شہید ناشدہ مدفوں حسینِ تست
ایں غرقۂ محیطِ شہادت کہ روئے دشت / از موجِ خونِ او شدہ گلگوں حسینِ تست

پس رو بسوئے بقیع و بہ زہرا خطاب کرد
وحشِ زمین و مرغِ ہوا را کباب کرد

کاے مونسِ شکستہ دلاں حالِ ما بہ بیں / ما را غریب و بیکس و بے آشنا بہ بیں
در خلد بر حجابِ دو کون آستیں فشاں / واندر جہاں مصیبتِ ما بر بلا بہ بیں

نے نے درآ چو ابرِ خروشانِ بکربلا — طغیانِ سیلِ فتنہ و موجِ بلا ببیں
تنہائے کشتگاں ہمہ در خاک و خوں نگر — سرہائے سروراں ہمہ بر نیزہا ببیں
آں سر کہ بود بر سرِ دوشِ نبی مدام — یک نیزہ اش ز دوشِ مخالف جدا ببیں
واں تن کہ بود پرورشش در کنارِ تو — غلطاں بخاکِ معرکہ کربلا ببیں

یا بضعۃ الرسول زابنِ زیاد داد
او خاکِ اہلِ بیتِ رسالت بباد داد

واقعہ خوانی

ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ اس میں شک وشبہ کی گنجائش ہے کہ مصائبِ مظلوم کربلا پر گریہ وبکا باعث اجرِ جمیل وثوابِ عظیم ہے اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی متعدد حدیثیں جو حدِ تواتر کو پہونچی ہوئی ہیں اس پر شاہد ہیں چنانچہ آئمہ طاہرین اور ان کے بعد دوسرے بزرگانِ دین کے وقت میں یہ طریقہ جاری تھا کہ مصائبِ کربلا نظماً ونثراً بیان کئے جاتے تھے اور سامعین گریہ کرتے تھے یہاں تک کہ مُلّا حسین واعظ کاشفی نے ۹۰۸ھ ہجری میں کتاب روضۃ الشہدا تالیف کی اور اس کتاب کو بوجہ قبولیتِ عام الیسار واج ہوا کہ تمام مجالسِ عزا میں پڑھی جانے لگی جو لوگ خصوصیت کے ساتھ اس کو پڑھنے کے مشتاق تھے وہ روضہ خوان کے لقب سے مشہور ہوگئے یعنی خوانندۂ کتاب روضۃ الشہدا بعد ازاں رفتہ رفتہ اس کے مضامین دوسری کتابوں میں نقل ہونے لگے بعض لوگوں نے اس کو محض حافظہ کی یادداشت پر پڑھنا شروع کیا اور بتدریج اس طریقہ میں ترقی ہوتی گئی اور چونکہ اصلی مقصود رونا اور رولانا تھا اِس لئے اب ذکرِ مصائب کے ساتھ

جدت پسند طبائع کو راغب کرنے کے لئے تمہیدیں قصّے حکایتیں اشعارِ فضائل اور مسائل فرعیہ وغیرہ بیان ہونے لگے یہاں تک کہ ایک مستقل فن ہوگیا اور اس فن میں علما اور دوسرے معمولی لیاقت کے آدمیوں نے بے شمار کتابیں اور رسالے لکھ ڈالے۔ خواہ نثر ہوں یا نظم عربی ہوں یا فارسی عام شیعوں نے (جو مجالس عزا میں بے دریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں یہاں تک کہ انفاق وصدقات زکات وخیرات میں بھی لاپرواہ ہیں اور اگر دیتے ہیں تو شوق سے نہیں بلکہ بے دلی سے لیکن مجالس عزا میں بڑے انہماک سے اور شوق سے جان ومال کے ساتھ خدمت کرتے ہیں) روضہ خوانوں کی خدمت اور تواضع کو جو ان مجلسوں کے رُکن اعظم ہیں دوسری تمام خدمتوں سے اعلےٰ اور اشرف سمجھا جاتا ہے چونکہ ذاکرین ان مخصوص لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں جن کے لئے وعدۂ مغفرت اور جنت یقینی ہے بلکہ دوسروں کو رولانے کا باعث ہونے کی وجہ سے ان کا مرتبہ اور اعزاز اور بھی برتر اور اعلےٰ سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ خود بھی مثاب ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی مثاب کرتے ہیں لہٰذا ان کو سرکارِ حسینی کے خادمانِ خاص ہونے کا شرف حاصل ہے اور یہ لوگ خود بھی دوسرے مومنین پر ایک خاص فخر شرف وامتیاز کے مدعی ہیں۔

لیکن ان کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس منصبِ جلیل اور پایۂ رفیع تک سربلندی پانا کچھ آسان کام نہیں ہے یہ ترقی وارتقا چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ جب تک ان پر عمل نہ کیا جائے یہ جدّ وجہد بے سود زحمت اور بے ثمر ریاضت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور ان کی تمام مشقتیں بے نتیجہ ہیں یہ لوگ نہ تو گروہِ مخلصین میں شمار کئے جائیں گے اور نہ طبقۂ ذاکرین میں بلکہ ان کا نام اس زمرہ سے محو اور ان کا یہ فعلِ حسنہ حبط ہو جائیگا اور وہ مذہبی تاجر یا کاذب وغادر سمجھے جائیں گے نہ اس کا اجر خدا کی بارگاہ سے پائیں گے نہ حضراتِ معصومین کی سرکار سے صلہ ملے گا اِس لئے ضرور ہے کہ جو شخص گروہِ ذاکرین میں داخل ہو کر ثوابِ عظیم کا خواہاں اور اس منصبِ جلیل کا امیدوار ہو وہ ان دو شرطوں

کو ملحوظ خاطر رکھے ورنہ خود کو اندھوں کی طرح اس مہلکہ اور مواخذہ میں نہ ڈالے۔ وہ دو شرطیں اخلاص اور صدق ہیں یہ دونوں اِس بام رفیع پر ترقی کی سیڑھیاں ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی صحیح و بے عیب نہ ہوگی اوندھے منہ نیچے گریگا اور یہ ایسا صاف اور واضح مسئلہ ہے جس پر زیادہ دلیل و حجت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر عمل میں عامل کی نیت اور ارادے کو دیکھا جاتا ہے۔ دینی ہو یا دنیاوی بالخصوص دینیات میں اگر اس کی نیت خالص اور قربتاً الی اللہ ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ فضائل و مصائب اہل بیت بہ نیت خالص اور محض رضائے الہی کے واسطے بیان کئے جائیں تو بے شک اجرِ عظیم اس کا صلہ ہے اور اگر اس سے مدعا کسبِ مال جلب منفعت اظہار فضل و کمال اور اعلان نام و نمود ہے یا یہ مقصد ہو کہ اگر نثر ہے تو لفاظی و فصاحت و بلاغت کی اور نظم ہے تو مضامین و استعارات و تشبیہات کی داد ملے تو یقیناً یہ ذکر اس کے لئے عبث اور بے نتیجہ ہے کیونکہ اس نے ایک فاسد غرض سے ان بے شمار حسنات کو چھوڑ دیا۔۔ جو بارگاہ ربّ العزت سے عطا فرمائے جاتے ہیں اور دنیا کے تھوڑے سے فائدہ کے لئے (خواہ وہ مال کا ہو خواہ نام و نمود کا) آخرت کی لازوال نعمت سے روگردانی کی بے شک کوئی نیکی بغیر اخلاص کے نیکی نہیں اور کوئی عبادت بغیر اخلاص کے عبادت نہیں سمجھی جاتی بلکہ یہ ایک شرکِ خفی ہے جس کا ان سے ضرور مواخذہ کیا جائیگا چنانچہ علامہ محمد ابن یعقوب کلینی کتاب کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:-

مَنْ اَرَادَ الحدیث المنفعة الدنیا لم یَکُنْ لہ فی الآخرة نصیب وَمَنْ اَرَادَ بہ الآخرة اعطاہ اللہ خیر الدنیا والآخرہ۔

جو کوئی حدیث سے یہ ارادہ کرے کہ اس کی وجہ سے مال دنیا حاصل ہوگا اس کے واسطے آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور اگر اس کے تعلیم و تعلم سے آخرت کی

نیت کرے خدا اس کو دنیا و آخرت میں نیکی عطا فرمائے گا۔

اسی طرح شیخ ابن ابی جمہور کتاب غوالی اللآلی میں جناب امیر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

من اخذ العلم مِنْ اَھْلِہٖ وَعَمِلَ بہٖ نجیٰ وَمَنْ اَرَادَ بہ الدنیا فھوَ حَظُّہٗ۔

جس نے کسی علم کو اس کے اہل سے حاصل کیا اور اس پر عامل ہوا تو اس نے نجات پائی اور محض دنیا کا ارادہ کیا تو اس کو اس علم سے وہی ملے گا جو قصد کیا ہے۔

اِسی قسم کی اور بہت حدیثیں کتب فریقین میں موجود ہیں افسوس ہے کہ اکثر اہل علم کے دامن فضل و کمال پر یہ بدنما دھبّہ نظر آتا ہے خصوصاً ذاکرین کہ ان میں سے اکثر کی غرض اس فن کے حاصل کرنے سے محض کسبِ مال ہوتی ہے نہ حصولِ ثواب گویا وہ ایک قسم کے تجارت پیشہ ہیں جو اپنے متاعِ کمال کو کوڑیوں کے مول بیچ ڈالتے ہیں۔ اور خریداروں سے اسی طرح معاملہ کرتے ہیں جس طرح سوداگر اپنی جنس کی بابت کمی بیشی پر ردّ و بدل کرتا ہے۔ اجرت ٹھہرا کر پڑھتے ہیں اگر کم ملے تو ناخوش ہوتے اور عدم توجہی سے کام کرتے ہیں اور اگر زیادہ دام ملیں تو محنت اور توجہ سے اس خدمت کو انجام دیتے ہیں اس پر لطف یہ ہے کہ اِس بیہودہ کسب و تجارت اور دنیوی معاوضہ کے باوجود مجالس و محافل میں برسر ممبر فخر کرتے ہیں خود کو جناب سید الشہدا علیہ السلام کے چاکران خاص میں سمجھتے اور دوسروں کے مقابلہ میں صاحبِ حقوقِ عظیمہ واجب الاحترام اور لائقِ توقیر و اکرام جانتے ہیں۔ درآنحالیکہ ان کا یہ فعل نہایت زبوں اور قابلِ نفرین ہے اور کسی طرح داخلِ عبادت اور ذریعہ ثوابِ آخرت نہیں ہوسکتا۔ ہم ایسے اُجرت کے کام کو کیونکر کارِ خیر سمجھ سکتے ہیں اور ایسے ذاکرین کو اجرِ عظیم کا مستحق کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ ان کے عمل کی ماہیت ہی ڈانواں ڈول ہو اور ان کی نیت کچھ ہے بھی تو

اول روپیہ پیدا کرنے کی اگر کوئی مسلمان اُجرت کی نماز پڑھے یا روزہ رکھے یا حج کرے تو کیا عقلاً و نقلاً وہ ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے۔ کیا اس اُجرتی عمل کا جس کے معاوضہ میں وہ روپیہ لے چکا ہے اس کو اجر بھی ملے گا ہرگز نہیں مالک جزا و سزا کا حکم محکم ایسے لوگوں کو نہایت صاف الفاظ میں تنبیہ فرماتا ہے۔

من کان یرید حرث الاخرۃ نزد لہ فی حرثہ ومن کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منہا وما لہ فی الاخرۃ من نصیب (پارہ ۲۵ سورہ حم عسق رکوع ۳)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کے لئے اس کی کھیتی میں افزائش کریں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو تو ہم اس کو اسی میں دیں گے۔ مگر پھر آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہ ہوگا۔

شیخ جلیل جعفر بن احمد قمی کتاب غایات میں کہتے ہیں کہ رسول خدا نے فرمایا ہے۔

شر الناس من باع آخرتہ بدنیاہ وشر من ذالک من باع آخرتہ بدنیا غیرہ

بدترین انسان وہ ہے جس نے آخرت کو دنیا کے عوض میں بیچا اور اس سے بھی بدتر وہ ہے جس نے اپنے آخرت دوسرے کی دنیا کے لئے فروخت کی۔

شیخ صدوق محمد بن بابویہ القمی کتاب اعقاب الاعمال میں تحریر کرتے ہیں کہ جناب ختمی مآب صلعم کا ارشاد ہے:-

ومن عرضت لہ دنیا وآخرۃ فاختار الدنیا وترک الاخرۃ لقی اللہ و لیست وحسنۃ یتقی بہ النار

جس شخص پر دنیا اور آخرت دونوں پیش کی جائیں اور وہ دنیا کو اختیار کر کے آخرت کو ترک کردے وہ ملاقات کریگا خدائے تعالے سے اس حال میں کہ اس کے واسطے ایسی نیکی ہو گی جو اس کو آتش جہنم سے بچالے۔

اخلاص کے بعد ذاکر کے لئے دوسرا درجہ صدق اور راست گفتاری کا ہے کہ صرف

وہی واقعات بیان کرے جن کو علما و مورخین صحیح تسلیم کر چکے ہیں۔ ذاکر کا کام یہ نہیں ہے کہ صرف رونے رُلانے کو مدنظر رکھ کر روایات ضعیفہ موضوعہ خود ساختہ کو بیان کرے ورنہ وہ دروغ بیانی او افترا پردازی دو جرموں کا مجرم ہوگا اور اس دوہری مصیبت کا پلہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ گراں ہو جائیگا کہ وہ ایک مجمع پر اپنے کذب و بہتان کا اثر ڈال رہا ہے جو واقعات اگر صحیح نہیں تو ان کے دروغ اور غلط ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے جو واقعہ نہیں ہوا یا جو فعل حضرت نے نہیں کیا یا جو قول حضرت نے نہیں فرمایا اس کو حضرت کی طرف منسوب کر دینا بہتان و افترا نہیں تو کیا ہے اور اس کے بہتان و افترا ہونے میں کون شک کر سکتا ہے اس کو تو بجائے مدح کے سراسر توہین و تذلیل ہے۔ پھر توہین بھی کس کی اہل بیت رسالت کی جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں قرآن مجید میں بہت سی آیتیں جھوٹوں کی مذمت میں وارد ہیں ان آیات کے علاوہ رسول خدا اور ائمہ خدا کی احادیث بھی بہ کثرت موجود ہیں جن میں کذب و افترا کی سخت مذمت کی گئی ہے اگر ان مذہبی احکام سے قطع نظر کیجئے تو عقلاً اور اخلاقاً بھی کذب و افترا جس قدر مذموم ہیں وہ محتاج بیان نہیں یہی وجہ ہے کہ شیخ صدوق کتاب امالی میں جناب سرور کائنات سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا

"عظیم ترین خطاکاران خدا کے نزدیک وہ ہے جو لسان اور کذاب ہو"

یہ نقلی اور عقلی برائیاں معمولی کذب کی ہیں چہ جائے کہ خدا رسول خدا اور اہل بیت رسول خدا پر بہتان و افترا کیا جائے نعوذ باللہ من ذالک۔

اس میں شک نہیں کہ شیعہ طبقہ میں ذاکرین حسین کو نہایت عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس مخصوص قدر و منزلت کا انحصار محض ان کی ذاتی قابلیت یا شخصی محاسن پر نہیں بلکہ ان خدمات پر ہے جن کو گروہ ذاکرین انجام دیتا ہے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ شیعوں کو حسین اور جاں نثاران حسین سے دلی انس اور جبلی محبت ہے۔

لہٰذا ان کے نزدیک ہر وہ شخص جو حسینؑ کا ذکر کرے عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے کا مستحق ہے شیعہ طبقہ میں ذاکرِ حسینؑ کی معمولی منزلت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ دنیا میں کسی پبلک پلیٹ فارم پر کسی جلسہ میں کسی مقرر کو اپنے خیالات کے اظہار میں اتنی آزادی حاصل نہیں جتنی ذاکرین کو ہے شیعوں کے خیال میں ذاکرِ حسینؑ کی ذات بالعموم دائرۂ تنقید سے بالاتر سمجھی جاتی ہے اس سے کسی قسم کی باز پرس کرنا سنگین سے سنگین موقعوں پر بھی اُسے ٹوکنا محض خلافِ ہی نہیں بلکہ سخت مذموم سمجھا جاتا ہے دنیا کے اور جلسوں میں جہاں کسی مقرر کی زبان سے غیر ذمہ دارانہ بات نکلی فوراً سامعین نے کسی نہ کسی طریقہ پر اظہارِ ناراضمندی کر دیا مگر شیعہ طبقہ کا یہ طرزِ عمل ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر ضبط و سکون سے کام لیتے ہیں اور ذاکر سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کرتے بلا لحاظ اس کے کہ ان کا پایۂ علم کتنا بلند یا پست ہے اور اس کی نظر کس قدر وسیع یا محدود ہے اور اس کے بیانات کو واقعات سے کیا نسبت ہے۔ علاوہ ایسے موقعوں کے جن کو اصطلاح میں مجلس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے عام اوقات میں بھی ذاکرین کے بیانات پر تنقیدی نظر ڈالنے سے احتراز کیا جاتا ہے۔ ان کی لغزشوں سے اغماض اور کوتاہیوں سے پردہ پوشی کی جاتی ہے یہاں تک کہ کبھی کوئی آدمی ذاکرین کے ارشادات کا جائزہ لینے اور ان کے بیانات کی ان سے باز پرس کرنے کی جرأت کر بیٹھتا ہے تو عوام الناس کے نزدیک وہ مذہب کی توہین اور عزاداری کی مخالفت کا مرتکب سمجھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ذاکرین کو اس کا یقین ہو گیا ہے کہ بر سرِ منبر ہم کچھ بھی بیان کر دیں گے اسے صحیح سمجھ لیا جائے گا تو انہوں نے ذاکرِ حسینؑ کے حقیقی صفات پیدا کرنے صحیح واقعات کا علم حاصل کرنے اور روایات کی چھان بین میں عرق ریزی کی ضرورت نہیں سمجھی اور جب ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ جو مخصوص وقعت و عزت ذاکرِ حسینؑ کے نام سے وابستہ ہے وہ بہت سستے داموں میں حاصل ہو سکتی ہے تو انہوں نے اکتساب علمی کی زحمتوں کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے بلا تامل نہایت ضعیف ناقابلِ وثوق بلکہ

بے وجود روایات کو آزادی سے بیان کرنا شروع کر دیا صرف یہی نہیں بلکہ سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ان کے دلوں پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کے خاطر ایسی روایات کے بیان کرنے کی جسارت اختیار کر لی جن کے ماخذ کا پتہ ان کے دماغوں کے سوا کسی کتاب میں نہیں چل سکتا ذاکری نے ایک خاص فن یا پیشہ کی صورت اختیار کر لی ہر ایک ذاکر کو اپنے ہم اثروں پر فوقیت لے جانے اور نئی سے نئی بات بیان کر کے امتیازی حیثیت قائم کرنے کا شوق دامنگیر ہوا جہاں واقعات اور محض واقعات کی ضرورت تھی وہاں تحریف اور اختراع دخیل کار ہو گئے نام و نمود کی ہوس روایات کی جانچ پڑتال کی ضرورت پر غالب آئی۔ سامعین کی رواداری اور عدمِ واقفیت نے ہمت افزائی کی کم مائگی اور عدمِ استعداد نے خود ذاکرین کو اپنی بے راہ روی کے احساس سے بیگانہ نہ رکھا آخر یہاں تک نوبت پہونچی کہ اصل مقاصد کی صورت ہی دگرگوں ہو گئی جس کا جی چاہا ذاکر بن بیٹھا اور جو اس کے جی میں آیا بیان کرنا شروع کر دیا میدانِ کربلا کے واقعات اس کے محتاج ہی نہیں ہیں کہ سامعین کو مائل بہ گریہ بنانے کے لئے ان میں خلافِ واقعہ اضافہ کئے جائیں نہ وہ متبرک ہستیاں ایسی ہیں جن کے متعلق روایات میں نصرت یا اضافہ کا حق ہم کسی فرد یا جماعت کے ہاتھ میں دیدینے پر رضامند ہو سکیں۔ ہم نے مانا کہ ذاکرین کی نیت سامعین کو رولانا ہی رہتی ہے اور امامِ مظلوم کے مصائب پر اشکبار ہونا باعثِ اجرِ عظیم ہے لیکن اس کے باوجود ہم یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتے کہ ائمۂ معصومین اہلبیت اطہار یا ان کے رفقا کی نسبت بے بنیاد افسانہ نگاری اور روایت آفرینی کو دخل دیا جائے بہرا اس کا اعتراف ہے کہ فنِ مرثیہ گوئی ادبِ اردو میں ایک قابلِ قدر اضافہ کا باعث ہوا ہے ادبی نقطۂ نظر سے ہمارے دل میں اس کی پوری وقعت ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم اس کے اظہار پر بھی مجبور ہیں کہ کسی ضعیف بے بنیاد خلافِ عقل روایت کو محض اس وجہ سے صحیح ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اس کو کسی ذاکر نے تقریر یا تحریر

نظم یا نثر میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے ہم کو اس کا پورا احساس ہے کہ جن وجوہ کا سطورِ بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے، ان کی بدولت اور جس مخصوص ماحول میں ذاکرین حسین اپنے فرائض کو ادا کرتے ہیں اس کے زیر اثر یہ لوگ ایک زبردست قوت کے مالک ہیں۔ شیعہ طبقہ میں بیشتر ایسے لوگ ملیں گے جن کے مذہبی معلومات اور عقائد دینی کا بہت کچھ انحصار ان باتوں پر ہے جن کو وہ وقتاً فوقتاً ذاکرین سے سنتے رہتے ہیں۔ شیعہ اطفال اوائل سن سے مجالس حسینی میں شریک ہونے لگتے ہیں اور جو کچھ ذاکرین بیان کرتے ہیں ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ ذاکرین کے ملفوظات کا اثر بالخصوص بچوں عورتوں اور کم لکھے پڑھے لوگوں پر بہت گہرا۔ اور رفتہ رفتہ کالنقش فی الحجر کی طرح راسخ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شیعہ قوم کے مذہبی سطح نظر اور مرحلہ حیات میں عام رجحان طبع کا انحصار ذاکرین حسین کے بیانات پر ہے۔ صحیح عقائد اور بہترین پایہ کی تعلیم کے مواقع ذاکرین کو حاصل ہیں ان سے فائدہ اٹھانا اُن کی استعداد علمی اور فرض شناسی پر منحصر ہے۔ لیکن اگر ذاکرین کی جماعت خود اپنے فرائض سے غافل رہے یا اپنی کم استعدادی اور عدم واقفیت کی بدولت غلط نظریہ غلط اصول غلط عقائد غلط واقعات قوم کے سامنے پیش کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ قوم کے لئے ان کا وجود کس درجہ مضرت رساں ثابت ہوگا ایسی حالت میں کسی صاحب فہم کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ذاکرین کو بالکل آزاد چھوڑ دینا قومی مفاد کے لئے کس قدر خطرناک ہے۔ سابق میں اس کا تجربہ ہو چکا ہے اور جو مضر نتائج اس سے پیدا ہو سکتے ہیں وہ بھی مشاہدہ میں آچکے ہیں اس کا دعویٰ ہے اور یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت ہماری بخشش اور نجات کا ذریعہ ہے لیکن ہم اس پر بھی فخر کرتے ہیں کہ حسینی شہادت کے متعلق ہمارا نظریہ وہ نہیں جو عیسائیوں کا عقیدہ حضرت عیسےٰ کے صلیب پانے کی نسبت ہے یعنے ہم یہ نہیں سمجھتے کہ حسینؑ کی شہادت اُمت محمدیہ کے گناہوں کا کفارہ ہو گئی اور اب ہمیں اپنے اعمال پر

نظر رکھنے اور ان کے متعلق جواب دہی کی ضرورت باقی نہیں رہی بلکہ ہمارا اعتقاد ہے کہ حسینؑ نے حق اور باطل کو علیحدہ کر کے دکھا دیا اسلام کو اغیار کی دست برد سے بچا لیا۔ اور اس اعتبار سے ہماری ہدایت کا سامان مہیا کر دیا اب راہ راست پر رہنا ہمارا کام ہے لیکن کم استعداد اور نااہل ذاکرین کے گولمول بیانات اور تاویلات کی بدولت عام شیعوں کی ایک بڑی تعداد کا یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ ان کی بخشش کے لئے حسینؑ کی شہادت کافی ہے اب ان کے اعمال کی نسبت کوئی بازپرس نہ ہوگی کیونکہ حسینؑ پر بارہا رو لینے سے جنت ان پر واجب ہو چکی ہے اس لئے وہ جو چاہیں کریں وقتی جذبات سے متاثر ہو کر چند آنسوؤں کا ان کی آنکھ سے نکل آنا ہی تمام گناہوں کی معافی کا ضامن ہے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ سب ذاکر ایسے ہی نظریوں کی ترویج کرتے ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی تعلیم کا ماحصل راست گوئی اور حق پرستی کی بجائے باطل پرستی مرداروار ہمت استقلال اور ایثار کے بدلے کم ہمتی ضعیف الاعتقادی تنگ دلی تنگ نظری نکلتا ہے۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ ذاکرین کی طرف سے کامل چشم پوشی کا اصول برتا جائے ان کی باگ بالکل ڈھیلی چھوڑ دی جائے اور ان سے کسی قسم کا محاسبہ نہ کیا جائے مروجہ ذاکری کا پایہ اس قدر پستی تک کبھی نہ پہنچتا اگر سابق میں شیعہ پبلک اپنے فرائض تنقید و تعریض سے غافل نہ رہی ہوتی مگر واقعہ تو یہ ہوا کہ سامعین کو کسی نہ کسی طرح رلا دینے میں کامیاب ہو جانا ہی ذاکری کا طرۂ امتیاز بن گیا مستند روایات صحت بیان اور سبق آموز معلومات کے اعتبار سے کسی ذاکر کا بیان کتنا ہی قابل قدر کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ سامعین کو بہ آواز بلند رونے پر مائل نہ کر سکا تو اس کا شمار کامیاب ذاکرین میں نہیں عام لوگوں کے نزدیک ایسے ذاکر کی محنت سعی لاحاصل کا مصداق بنی اور مجلس تاثر کار سے محروم رہی اس لئے ذاکرین کی انتہائی کوششیں اسی نصب العین کی طرف مبذول ہو گئیں اور اس کے زیر اثر صحیح روایات میں تحریف تصرف اور اضافہ ہونے لگا اور ذاکری کا مقصد

یہ رہ گیا کہ کسی نہ کسی طرح کی مجلس کو گریہ و بکا کے ایک مخصوص ماحول میں خاتمہ تک بہو بچا دیں اس طرح ان تمام معائب پر نظر رکھتے ہوئے جو ذاکری کے دامن پر بدنما داغ ہیں۔ اصلاح کی ضرورت ہے اور اشد ضرورت ہے ذاکرین کو لازم ہے کہ جس منصب جلیل کی خدمات وہ بلا معاوضہ یا بالمعاوضہ انجام دیتے ہیں اس کا تعلق اُن معصوم اور مقدس ہستیوں سے ہے جن کی طرف خود ساختہ یا بے بنیاد روایات اور خلافِ واقعہ بیانات کا منسوب کر دینا بلا لحاظ اس کے کہ وہ سامعین کی نظر میں کتنی ہی خوشگوار اور گریہ آور ہوں ہر پہلو سے قابلِ مواخذہ و محاسبہ جسارت ہے بلکہ معصیت کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

سامعین کو بھی یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ہر مرتبہ جب وہ شہدائے کربلا یا امام مظلوم کے سر مبارک یا رسول اللہؐ کے گھرانے کی بہو بیٹیوں یا ایسے ہی دوسرے واقعات کے متعلق طرح طرح کی غلط اور بے بنیاد روایات اور انواع و اقسام کے اتہامات کو خموشی سے بیٹھ کر سنتے ہیں اور کچھ باز پرس نہیں کرتے تو وہ خود بھی موردِ الزام ٹھہرتے ہیں ہمارا یہ مطلب نہیں اور نہ یہ مناسب ہے کہ بھری مجلسوں اور مجمعوں میں ذاکروں کو ٹوکا جائے یا ان کے بیانات کی تردید کی جائے۔ مگر ہر سننے والے پر اس کی ذمہ داری یقیناً عائد ہوتی ہے کہ موقعہ اور محل کا لحاظ کر کے ذاکروں کو ان کی لغزشوں اور غلط بیانیوں سے آگاہ کرنے کی کوشش کرے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہر کتاب لائق اعتماد نہیں بلکہ جو مشہور اور مستند کتابیں ہیں ان میں بھی علمائے مشاہیر سے تسامح ہوا ہے یا ان کو کوئی روایت غلط ملی ہے یا انہوں نے اس پر غور نہیں کیا جیسا کہ تمام مشہور کتابوں کے دیکھنے سے یہ حال ظاہر ہو جاتا ہے۔ کتاب الارشاد شیخ مفید ہو یا لہوف سید ابن طاؤس مقتل ابو مخنف ہو یا مثیر الاحزان ابن نما بحار الانوار ملائے مجلسی یا احتجاج طبرسی اول واقعات کی صحت و غیر صحت کی جانچ ان ہی اصول مقررہ پر کرنے چاہئیں جو اسی فن کے معیار

قرار دئے گئے اور جن کو ہم اوپر بیان بھی کر چکے ہیں۔

ہمدردانِ حسینؑ نے بے شمار دولت تقسیم شیرینی سامان اور اُجرتِ ذاکرین میں صرف کی جس کی غرض اول یہ تھی کہ غم حسینؑ کو ترقی دی جائے لوگ مصائب شہدائے کربلا سُن کر روئیں اور مثاب ہوں اگرچہ اکثر اشخاص اس سے مستثنےٰ نہیں ہو سکتے۔ کہ ان کی اس غرض میں نام و نمود کا جزو بھی شامل تھا خیر جو کچھ ہوا زمانہ کے موافق ہوا۔ شاعری کی ترقی کے زمانہ میں تحت اللفظ موسیقیت کے زمانہ میں سوز نثر خوانی کے زمانہ میں مقفےٰ و مسجع عبارت آرائی روضہ خوانی کے زمانہ میں روضہ خوانی و حدیث خوانی ہوتی رہی اور بڑی قیمت سے ہوتی رہی یہی ترکیب ہر جگہ کم و بیش اب بھی جاری ہے۔ مگر غور طلب یہ مسئلہ ہے کہ آیا صرف یہی طریقہ ہے جو حسینؑ کے نام اور واقعات کی ترقی کے لئے پسندیدہ ہے یا اس کے علاوہ اور بھی کچھ ممکن ہے پہلے ہم کو مذکورۂ بالا امور کے فوائد و نقصانات پر غور کرنا چاہیئے۔

فائدہ یہ کہا جائے گا کہ کچھ لوگوں نے سُنا کیا سُنا۔ سوز خوانی تحت لفظ خوانی، روضہ خوانی حدیث خوانی ان میں سے ہر ایک کی غرضِ مشترک یہ تھی کہ کس طرح اچھی طرح رلایا جائے تاکہ مالِ مجلس حاصل ہو صرف یہی نہ تھا بلکہ سوز خوان اپنی موسیقی کی تان اور تحت لفظ خواں اشعار کی طرز ادا کے لئے جان دے رہا تھا۔ نثر خوان مقفیٰ مسجع فقروں کی نمائش اور اپنے تبحر علمی کا اظہار کر رہا تھا بہر حال فائدہ تو یہ ہوا کہ ہم نے موسیقی شاعری لفاظی ولسّانی کو زندہ رکھا۔ کچھ لوگوں نے واقعات سُنے گریہ و بکا ہوا۔ چند ذاکر دیتوں کی فکر سے مستغنی ہو گئے تقسیم شیرینی بھی اسی ریمارک کے ماتحت میں ہے اور تقسیم کی بڑی غرض یہی ہو سکتی ہے کہ جو لوگ بغیر لالچ آتے ہیں وہ تو آئیں گے ہی جو لالچی ہیں ان کو شیرینی کھینچ لائے گی اور پھر گوش زدہ اثر سے دار د۔ نقصان یہ ہے ہم نے بھی اسی طرح کچھ لوگ تیار اور مقرر کئے جس طرح یہودیوں نے اپنے ربی مسیحیوں نے اُسقف ہندوؤں نے کتھا خوان برہمن اور بودھوں نے بھکشو

بنائے تھے ایسے لوگوں نے اگر مذہب کی حفاظت کی بھی تو اجرت پا کر جس طرح آج مسیحی پادریوں پر اعتراض ہوتا ہے کہ اگر تم بڑی تنخواہیں نہ پاتے اور بڑے بڑے اوقاف پر تسلط کے علاوہ ذاتی فوائد مدنظر نہ ہوتے تو شاید آج مسیحیت کتب خانوں کی الماریوں میں بند ہوتی۔ ایسی کوششیں بے غرضانہ اور خالصۃً للہ نہیں کہی جا سکتیں۔

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ اس کی وجہ سے ضرورت اور اشد ضرورت ہے کہ جو لوگ اپنے کو اس کار خیر کے لئے وقف کر دیتے ہیں ان کی خدمات کے صلہ میں اُن کے نقصانات کی تلافی کی جائے جو انہیں وقتی مصروفیتوں کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ ان کا ایثار اُنہیں تمدنی ضروریات سے فارغ اور مستغنی نہیں کر سکتا اس لئے مناسب بھی ہے کہ وہ قومی امداد سے اسی حالت میں رکھے جائیں اگرچہ یہ خیال ایک حد تک درست ہے مگر افسوس ہے کہ اس مزدوری کی اجرت سے دوسری دنیا کا اجر باطل و ساقط ہوا جاتا ہے کیونکہ اگر ان کو رونے رلانے میں ثواب ہے بھی تو اجرت اسکے لئے وجہ اولٰے ہے اور اخلاص وجہ ثانوی اس کے ساتھ ہی اس کی ذمہ داری کون کر سکتا ہے کہ یہ اجرت "وکسی خوان" کو حدودِ اعتدال کے اندر رکھے گی۔ اور اس کی شاعرانہ اُمنگ اور قوت طلاقت کو بے لگام نہ ہونے دیگی کوئی نہیں۔

یہ لوگ نظم ہو یا نثر طبعزاد یا بس محض رونے رلانے کی غرض سے بے دھڑک بیان کر جاتے ہیں اور مطلق صدق و کذب اور حق و باطل میں امتیاز نہیں کرتے نہ سامعین کو اس کا احساس اور خیال ہوتا ہے کیا ہماری قوم تعلیمی اور تربیتی حیثیت سے ایسی ہے کہ اس طرح کا ادعا کر سکے اگر ایسے لوگ ہیں بھی تو شاذ الشاذ کالمعدوم بلکہ زیادہ تر تو ایسی ہی ہیں جو "خوانوں" کے جدت انداز اور جدت واقعات کی خواہ وہ کیسے ہی بے ہنگام اور غیر متعلق کیوں نہوں مطلق پروا نہیں کرتے اور ساری عمر سے اُن ہی موضوع روایات اور غلط واقعات کو سنتے سنتے انہیں کے واقعات اور حقانیت پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔

اُنہیں صرف جدت چاہیئے اور بس اس سے بحث نہیں کہ اس جدت طرازی اور اختراع پردازی کے اثرات کس قدر تلخ ناگوار اور ضرر رساں ہیں کہا جائے گا کہ ایسے ذاکرین بھی ہیں جن کو اجرت کی احتیاج نہیں اور وہ محض خلوصِ نیت سے اس عمل خیر پر عامل ہیں بلاشبہ ہیں مگر فیصدی ایک کے تناسب سے بھی کم بشرطیکہ انہیں اجرت کے قریب مکروہ نمائش کی آمیزش نہو۔

اس میں شک نہیں کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام نے عطایا ذاکرین کو مرحمت فرمائے ہیں بنا بریں ایسے لوگوں کو علے قدر مراتب بطور ہدیہ اور بہ نیت نذر اگر کچھ پیش کش کیا جائے زیادہ ہو یا کم تو اس پر کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش نہیں اعتراض ہے تو ذکر حسینؑ کی تجارت پر اس کے مول بھاؤ پر عطایا و ہدایا کی صورت بالکل دوسری ہے۔ اور ذاکری کی باقاعدہ تجارت کرنا الگ شے ہے ذاکری کے سلسلہ میں جس قسم کی تجارت کا رواج ہو گیا ہے کیا وہ ائمہ معصومین کی تاسی ہے کیا وہ سید الشہداء کی خوشنودی کا باعث ہو گا کیا ایسی حدیثیں موجود نہیں جن سے صاف مستنبط ہوتا ہے کہ ذاکری کی موجودہ تجارت نہایت ہی مذموم اور قابل اعتراض ہے بعض شکی مزاج حضرات کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس قسم کی اصلاحی صدائیں بلند نہیں کرنی چاہئیں اس سے نفسِ عزاداری کو صدمہ پہنچے گا ذاکرین بددل ہوں گے اور پھر وہ اس پیشہ کو ہی چھوڑ بیٹھیں گے عزاداری بند ہو جائے گی حسینؑ کا ذکر دنیا سے مٹ جائے گا۔ یہ اعتراض جن حضرات کے دماغوں میں آئے ہیں ان سے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے شہادت حسینؑ کی قوت کا غلط اندازہ کیا ہے۔

حسینی شہادت کی روحانیت ان باتوں کی محتاج نہیں جب اس تذکرہ کو اُموی اور عباسی حکومتیں نہ مٹا سکیں تو چند پیشہ ور ذاکرین کے قطع تعلق کرنے سے کیا نقصان ہو سکتا ہے درحقیقت اس شہادت عظمےٰ کی روحانیت کا ہی یہ تقاضہ ہے کہ اس کے

ضمن میں جو غیر مذہبی اور غلط چیزیں داخل ہو گئی ہیں ان کا استیصال کیا جائے نفس واقعات کی حیثیت ہی اس نوعیت کی ہے کہ اس کا باقی رکھنا لازمی ہے ہم کو ایسے نظروں سے ڈرنے کی حاجت نہیں اس لئے اس ضمن میں ہم جن باتوں کو اس تذکرہ کی اعلےٰ حیثیت کا مخالف سمجھتے ہیں ان کی مخالفت میں ہم صاف طور سے کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ذکر حسین کی روحانیت کا یہ تقاضا ہرگز نہیں کہ اس میں غلط طور سے پروپگنڈے کی آمیزش کی جائے اگر ہم اس مقدس ذکر کو ایسی حالت میں ہی باقی رکھ سکتے ہیں کہ اس میں بہت سی جھوٹی باتیں شامل کر دیں اس کے اصلی رموز سے واقف ہونے کی کوشش نہ کریں. صحیح اور غلط میں امتیاز نہ کریں تو بہتر یہی ہے کہ اس پاک و محترم ذکر کو چھونے کی زحمت ہی گوارا نہ کریں.

ذاکری کی موجودہ تجارتی حیثیت کے مذموم ہونے کے علاوہ ایک بڑا رونا یہ بھی ہے کہ ہماری موجودہ ذاکری کا رجحان جس قسم کے خیالات و مضامین بیان کرنے کی طرف جا رہا ہے اس سے ہماری قوم کی دماغی تربیت استدلالی حیثیت سے بہت خراب ہو رہی ہے ان کے قوائے فکریہ کو مذہب کی آڑ سے برابر مغالطوں کا شکار بنایا جا رہا ہے اور صحیح غور و فکر کا مادہ سلب ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے جبہ و دستار والے ذاکر ممبر پر جا کر وہ لطیف نکتے ارشاد فرماتے ہیں جن کی کسی لکھے پڑھے سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ گویا حد ہے کہ ایک مشہور ذاکر ممبر پر جاتے ہیں اور اس کی وجہ بتاتے ہوئے کہ حضرت امام حسینؑ کی اولاد میں امامت کیوں رہی اور حضرت امام حسنؑ کی اولاد میں یہ سلسلہ کیوں نہ چلا فرماتے ہیں کہ سبز پھل کا بیج نہیں لیا جاتا جب خوب سرخ ہوتا ہے اور پک جاتا ہے تو لیا جاتا ہے حضرت حسنؑ زہر سے شہید ہوئے زہر کا رنگ سبز تھا اس لئے امامت کیونکر چلتی حسینؑ تلوار سے شہید ہوئے خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے اس لئے امامت چلی ہم نے نکتہ کا ماحصل بیان کیا ہے ورنہ اس مضمون کو بڑے آب و تاب سے فخریہ لہجہ میں بیان کیا گیا تھا انصاف کیجئے کہ ان مہملات کو ذکر

حسینؑ سے کیا تعلق اور جو مجمع ان مزخرفات پر تحسین و ستائش کی صدائیں بلند کرے اس کی دماغی حالت کس قدر واجب الرحم ہے۔

ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ اہل بیت نے نذر کا روزہ رکھ کر تین دن اپنی روٹیاں فقیر و یتیم و اسیر کو دیدیں وہ روٹیاں آسمان پر کیونکر رہ سکتی تھیں۔ مادی چیزوں کا آسمان پر کیونکر گذر ہو سکتا ہے، فقیر و یتیم و اسیر تو بہرحال ملائکہ تھے وہ لے کر آسمان پر پہونچے روٹیاں وہاں ٹھہر نہیں سکتی ہیں اس لئے سورۂ ہل اتیٰ کی صورت میں آسمان سے اتر آئیں۔ اسی طرح اور صدہا باتیں ان لوگوں سے سننے میں آتی رہتی ہیں۔ سامعین کے دماغوں کو جو گروہ اس طرح خراب کرتا ہے وہ ضرور قابلِ تنبیہ ہے۔ اغیار کی موجودگی میں ہمارے فاضل ذاکر جب اس قسم کے ہفوات پر اتر آتے ہیں تو ہم کو نہایت ہی شرمندہ ہونا پڑتا ہے ذاکرین کا معزز گروہ یا تو خالص شاعری کی نمائش کرتا ہے یا اپنے کو فلسفی ذاکر مشہور کرنے کے لئے فلسفہ اور شاعری کو مخلوط کر کے ایک عجیب طرح کا ملغوبہ پیش کر دیتا ہے ہم اس ذاکری کو قوم کے لئے مفید سمجھنے سے قطعی قاصر ہیں ذاکرِ حسینؑ کا باقی رکھنا ضروری ہے اور یقیناً وہ کسی نہ کسی عنوان سے ہمیشہ باقی رہے گا اسے کوئی روک نہیں سکتا لیکن موجودہ ذاکری پر تنقید کی ضرورت ہے اور سخت ضرورت ہے۔

ذاکرینِ حسینؑ کو پہلے خود اسوۂ حسینی کا نمونہ بننا چاہیے جس میں راست گوئی راستبازی اور خلوص ان کا شعار اول ہو ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ عارضی سرخروئی چند روزہ شہرت یا ذاتی منفعت کے لئے حق و باطل کے امتیاز کو پس پشت ڈال دیں اور باطل کی ترویج کے باعث بن جائیں مجلس عزا کو مناظرہ و مکابرہ کا دنگل بنا دیں۔ صرف اپنے گروہ کو خوش کرنے کے لئے دوسروں کے بزرگوں پر چوٹیں کریں ان کو ایثار کی صفت سے متصف ہونا چاہیئے ان کے نزدیک خدا اور خدا کے دین کی خدمت کا پایہ ذاتی اغراض سے بالاتر ہو ان کی نگاہ میں قومی و ملّی حقوق کی اہمیت خود غرضانہ نفس پرستی سے کہیں زیادہ ہو تھوڑے سے مالی فائدہ

باعارضی سامانِ عیش و آرام کی خاطر قومی مفاد سے چشم پوشی نہ کریں بلکہ ذاکری کی گرانقدر خدمات کا نیک نیتی سے بجالانا ہی ان کے نزدیک ایک ایسی قابلِ فخر چیز ہو جس کے بعد ان کو دوسری قسم کے معاوضوں کی قطعاً پرواہی نہ رہے گو بشری حیثیت سے وہ ایسے تحائف یا ہدیوں یا نذرانوں کو جو ان کی خدمات کے صلہ میں ان کے سامنے پیش کئے جائیں بخوشی قبول کرلیں مگر ان معاملات میں تمام مدارج بیع و شریٰ کو سختی سے طے کرنا اور ذکرِ حسینؑ کو ذریعۂ معاش و سرمایۂ حیات بنالینا ان کا شعار نہ ہو یہ لوگ سفر و حضر میں ان تمام لوازم عیش پسندی کے بہر نوع مہیا کئے جانے کو اپنی خدمات کی شرطِ اول نہ قرار دیں جن کے وہ آج کل عادی ہو گئے ہیں اور ان کا ذکر نہیں البتہ مہمانِ کربلا کے نوحہ خوانوں سے ہرگز اس کی توقع نہ ہونی چاہیئے کہ میزبانوں کے لئے ان کی مہمانداری طرح طرح کے افکار کا پیش خیمہ ان کی فرمائشات کا پورا کرنا جوئے شیر کا لانا آبگینۂ طبع کو ٹھیس لگنے سے بچانا انواع واقسام کی پریشانیوں کا موجب اور ان کی تنک مزاجیوں اور زود رنجیوں سے مقابلہ کرنا حد و صبر کی آزمائش بن جائیں بسا تعجب ہے کہ سیرتِ حسینی کا مطالعہ کرنے والے اور شب و روز اس کا ورد رکھنے والے سیرتِ حسینی کی خصوصیات سے بالکل ہی محروم ہوں یہاں تک کہ معمولی تکلیفوں کا برداشت کرنا بھی ان کے بس سے باہر ہو اگر کسی جگہ ایک سے زیادہ جمع ہوں تو ایک دوسرے کے حریف و رقیب بن کر عزادارانِ حسینؑ کی صف میں تفرقہ اندازی اور معرکہ آرائی کا باعث بن جائیں۔ ایک دوسرے پر چوٹیں کریں مجالسِ عزا کو تنازعات کی رزم گاہ بنادیں۔

برسوں سیرتِ حسینی کا تذکرہ کرنے اور مدتوں واقعاتِ کربلا کو شرح و بسط سے بیان فرمانے کے بعد بھی اگر ذاکر کی سیرت ان صفات سے محروم و بیگانہ ہے تو ہم کو یہ کہنا پڑے گا کہ ایسے ذاکر نے نہ سیرتِ حسینی کو پہچانا ہے اور نہ واقعاتِ کربلا ہی کو سمجھا ہے

اِس سے زائد اس نے کچھ نہیں کیا کہ چند مقدس الفاظ کو طوطے کی طرح رٹ لیا ہے اور ان کے بلا تکان دہرانے کو ذریعہ معاش بنالیا ہے۔ ورنہ اس کے دل میں ان چیزوں کی وقعت اور اہمیت کا احساس بمنزلۂ صفر ہے آفتابِ ہدایت کی نورانی کرنیں اس تک پہنچیں تو ضرور مگر اس کی آنکھ مادیت سے لڑی رہی اور وہ نورانیت کے جلووں سے محروم ہی رہا ایسا ناقدرشناس ذاکر ہمارے خیال میں اس قدر عزت و منزلت کا ہرگز مستحق نہیں جو اس منصب جلیل سے وابستہ ہے مانا کہ وہ مصائبِ حسین پر رویا بھی اور دوسروں کو رلایا بھی لیکن چونکہ اس کی طبیعت و اخلاق اور اعمال و افعال نے سیرتِ حسینی کا کچھ بھی اثر قبول نہیں کیا اسلئے اس کا رونا اور رلانا عارضی اور سطحی جذبات کی نمائش سے آگے نہیں بڑھتا اس کی آنکھیں روتی ہیں مگر دل نہیں روتا ایسی اشک فشانی جو شہید کربلا کی حقیقی عظمت کے احساس پر ہونے کے بجائے محض کامیاب پیشہ وری کے جذبات پر ہو کوئی قابل قدر چیز نہیں۔

قوم میں ایک مرض یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ مقامی ذاکرین کو گھر کی مرغی دال برابر سمجھے ہوئے ہیں اور اپنے گھر کے چاہے کتنے ہی اچھے پڑھنے والے ہوں لیکن باہر سے ذاکر کو بلوانا ایک طرح کا فیشن اور ذریعہ ناموری سمجھا جانے لگا ہے کون نہیں جانتا کہ واقعات محرم سے شیعوں کا بچہ بچہ واقف ہے۔ پردیسی ذاکر نفسِ واقعات میں ایک شمہ بھی اضافہ نہیں کرسکتے سوائے ان بناوٹوں کے جو موجب اعتراض ہوتی ہیں۔

اِس طولانی بحث سے ہماری غرض صرف یہ ہے کہ واقعہ خوانی میں واقعہ کی صورت مسخ نہ ہونی چاہیئے مجلسِ عزا محفل موسیقی یا مشاعرہ نہیں جس میں راگ راگنی کے زیر و بم سے اثر لیا جائے یا اشعار کے حُسن بندش جدتِ مضامین تشبیہات و استعارات تلازم لفظی اور حیرت انگیز مبالغہ کی داد دینے سے چھت کو سر پر اٹھالیا جائے اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اُجرت پر رونے والے یا داد دینے والے یا مجلس کو رونق دینے کے لئے خاص ایجنٹ مقرر

کئے جاتے ہیں جو نہایت ہی شرمناک اور قابلِ نفرین حرکت ہے مجلس عزا کے بیان نے وقتاً فوقتاً مختلف شکلیں بدلیں کسی زمانہ میں فارسی دہ مجلس پڑہی جاتی تھی اسی کے بعد تحت لفظ خوانی کا رواج ہوا پھر نثر خوانوں کی مقفیٰ و مسجع عبارتوں کا رنگ جما۔ پھر حدیث خوانی کا دور دورہ ہوا۔ اب نئی طرز کے حدیث خوان پیدا ہوئی ہیں جنہوں نے مجالس عزا میں فضائل اہل بیت کے ساتھ مناظرہ کی چاشنی سے کام لینا شروع کیا ہی لیکن افسوس ہی کہ اس چاشنی کے نتائج نہایت ہی تلخ اور زہریلے ہیں۔

مجالسِ عزا

مجلسِ عزا یعنے متعدد آدمیوں کا بہ غرض گریہ ایک جگہ فراہم ہونا اور ایک شخص کا ممبر یا کرسی پر بیٹھ کر فضائل و مصائب جناب سید الشہدا بیان کرنا ایک مستحسن اور عمدہ طریقہ ہے عزائے حسین کی سب سے پہلی مجلس وہ تھی جو عاشورہ محرم سے کئی ہزار برس پہلے اول الانبیا حضرت آدم اور حضرت جبریلؑ نے کی جیسا کہ تفسیر درثمین علامہ سیوطی میں اس کا ذکر ہے دوسری مجلس وہ تھی کہ حضرت عیسے ایک دفعہ مع حوارئین زمین کربلا پر گزرے آپ نے اپنے اصحاب سے واقعہ شہادت حسین مفصل بیان کیا پھر آپ اور آپ کے حواری بہت روئے جیسا کہ اعثم کوفی نے اپنی تاریخ میں اور ابن حجر عسقلانی نے کتاب تہذیب التہذیب میں لکھا ہے آخری بڑی مجلس وہ ہوئی جس کے بیان کرنے والے خاتم الانبیا، اور سننے والے مہاجرین و انصار تھے یہ مجلس خاص مسجد نبوی میں ہوئی تھی۔

اعثم کوفی لکھتے ہیں کہ ایک سفر سے واپس تشریف لاکر ایک صاحبزادے کا زہر سے اور دوسرے کا تلوار سے شہید ہونا بیان فرمایا تمام اصحاب رونے لگے اگرچہ ہم تنہا کتاب دیکھ کر بھی متاثر ہو سکتے ہیں لیکن مجمع کر کے مصائب بیان کرنا اور مجمع کثیر کا رونا رلانا زیادہ باعث ثواب ہے ایسا سمجھنا چاہئیے جیسا تنہا اور جماعت کے ساتھ نماز پڑہنے میں فرق ہے جیسا کہ ہم بیان کرچکے ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے نہ صرف حضرت سید الشہدا،

کے ذکر کا اہتمام فرمایا بلکہ شاعروں کی قدردانی سے وہ زبان خریدلی جو اشاعت مدح میں کام دے سکے ائمہ اطہار کے بعد ملوکِ دیالمہ عجم و عراق اور خلفائے بنی فاطمہ مصر و شام نے اس کا اہتمام کیا اور اس وقت سے برابر اب تک مجالس عزا کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا یہاں تک کہ اب یہ صورت ہے جس کو ہم دیکھ رہے ہیں۔

بادی النظر میں مجالس کا مفہوم یہ قرار دیا گیا ہی کہ حضرت شہید کربلا پر رونا ہی اس کی غایت ہے اور دلیل کے لئے آئمہ معصومین کی حدیثیں پیش کی جاتی ہیں کہ جو شخص حسین پر روئے اس پر بہشت واجب ہے یا اس نے خمسۂ نجبا پر احسان کیا یا جو شخص روئے یا رولائے یا رونے والوں کی سی صورت ہی بنائے وہ داخل بہشت ہوگا۔ گریۂ و بکا کا یہ مسئلہ قابل غور ہے رونا کیا ہی اور کوئی کیوں روئے گا کیا کوئی شخص بلا اثر لئے رو سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں کسی اندوہناک حالت سے اثر لئے بغیر ہیجان غم پیدا نہیں ہو سکتا جو گریہ کی حالت پیدا کردے رونے کے معنے لازماً آنسو بہانا نہیں ہیں۔ بلکہ یہ رونے کی ایک بے اختیارانہ صورت ہے جس کو احتیاط کی کمزوری کہا جاسکتا ہے۔ صاحب ارادہ صاحب استقلال اور صاحبِ احتیاط لوگوں کے نزدیک واقعہ غم کی موجودگی میں ضبط درحتی الوسع کم اظہار غم اور اثر کی کوشش ہی سب سے بڑا رونا سمجھا جاتا ہی۔ یہاں تک ایک شخص رو سکتا ہے بغیر اس کے کہ آنکھوں میں نمی یا چہرہ پر کوئی ظاہری تغیر کہا جاسکے۔ یہ ضابطہ اور صابر لوگوں کا رونا ہی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ صدائے گریہ یا محض گریہ صابر کو درجۂ صبر سے گرادیتا ہی بلکہ جب غم و الم کا جذبہ اس قدر تیز ہو جائے کہ ضبط نہ ہو سکے تو ایسا ہونا کچھ بعید نہیں۔ بہرحال جماعتِ انسانی میں رونا ہی اظہارِ محبت و ہمدردی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہی اور اس کی وجہ صرف قلبی دلبستگی ہی ہو سکتی ہی کسی کو حالت اندوہ میں دیکھ کر ہنسو تو صاحب غم اور دوسرے دیکھنے والوں کے نزدیک اس فعل کو خلاف انسانیت بے رحمانہ تہذیب سے معرّا عدم موقع شناسی اور بے حسی سمجھا جائے گا اور دفعتہً اس ہنسنے والے

کی طرف سے ہر دیکھنے والے کا خیال بدل جائے گا۔

اب ذرا ان احادیث ائمہ کے فلسفہ پر غور کرو تم جانتے ہو کہ وہ موقعہ تھا جب کہ حکومت اور لازماً ملک کے تمام افراد (بہ استثنائے معدودے چند) اہل بیت رسالت کے ساتھ دشمنی کے درجہ میں اس قدر ترقی کر گئے تھے جس کا نتیجہ کربلا کا سانحۂ عظیم تھا اور اس دشمنی کا سلسلہ زمانۂ دراز تک قائم رہا ایسی حالت میں یہ امید کرنا کہ کوئی شخص حضرت سید الشہداؑ سے ہمدردی کرے۔ اور اس سانحہ کی عظمت کو اپنے درجہ پر قائم رکھنے اور رکھنے کے لئے کوشاں ہو محال تھا لیکن مشیتِ ایزدی یہ تھی کہ یہ سانحہ اپنی پوری عظمت و شان کے ساتھ دنیا کو معلوم ہو جائے اور فطرت ہیجانِ غم کو حسین کے نام سے ایسی نسبت دیدے جو کسی انسان کے لئے نہ ہو گی یہ ہیجانِ غم اس طرح نہ پیدا کیا گیا تھا جو کسی حکومت اور اس کے متعلقات کے سایہ میں نشو و نما پائے یہ کام نہایت کٹھن اور دشوار تھا اور اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ لوگوں کو خاص طور پر اس طرف رغبت دلائی جائے اس سے یہ مقصود نہیں کہ ان اقوال میں تصنع ہے تصنع سے کوئی بڑا نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی بنیاد اصلیت اور حقیقت پر قائم نہ ہو ان احادیث کا اصول یعنی جوش ہمدردی پیدا کرنا یقیناً حسینؑ کے عظیم الشان موقعہ اور ان کی شہادت کی نوعیت سے تھا ان فقرات سے اصول ہمدردی کے نشو و نما کی کوشش کی گئی ہے ان اصولوں سے غرض یہ ہے کہ حسینؑ سے محبت و ہمدردی پیدا ہو جائے اس وسیع مفہوم پر غور کرو جو حسینؑ اور ان کی محبت کی عظمت میں مضمر ہے حسینؑ کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی شہادت ہے شہادت اِس لئے واقع ہوئی تھی کہ حسینؑ کا ضمیر ناصحانہ اسے گوارا ہی نہ کر سکتا تھا کہ مسلمانوں کے دینی و اخلاقی رسمی قانونی تمدنی اصول کا رہنما اور سردار یزید جیسا شخص ہو اور وہ بھی اس طرح کہ ہمیں اپنی وسیع موافقت پر مجبور کرے۔ ہماری ہستی کو جو اسلام کی مثالیہ سمجھی جاتی ہے نیست و نابود کر دے اب ائمہ کی مصلحت کے یہ معنے تھے کہ ایسے حسین سے محبت و ہمدردی پیدا کی جائے

کہ لوگوں کے خیال اور ارادہ کو ان اصول کی محبت سے رنگ دے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کوئی آسان کام نہ تھا ایک جڑ پکڑی ہوئی عداوت کو اکھاڑنا اور طبائع انسانی کا خاصہ بدل دینے کے لئے نسبتاً زیادہ وقت اور زیادہ سامان درکار تھا۔ سامان کی یہ حالت تھی کہ اور چیزوں کا تو کیا ذکر صدیوں تک ممالک اسلامی میں سلطنت کا اس سے بڑا کوئی جرم نہ تھا کہ کوئی شخص اہل بیت رسالت سے اظہار محبت و ہمدردی کرے اس سے یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ کہ حسینؑ سے محبت و ہمدردی کے ان اصول کی نشو و نما میں ائمہ اطہار کو یہ بھی موقعہ حاصل نہ تھا کہ وہ اس طرح مجلس منعقد کرتے جیسے مجمع ہم فراہم کر دیا کرتے ہیں ان اصول کو اختیار کیا جو سب سے سہل تھا۔ اسلام کے نام سے نہیں بلکہ اس صحیح مثالیہ یعنے حسینؑ کے نام سے حسین کے نام کی مرکزیت سے حسینؑ کا اسم مقدس وہ کنجی تھا جس سے انسان کے تخیل انسان کی معاشرت انسان کے اخلاق میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنے کا ارادہ کیا تھا یہ ارادہ ایک قوم بنانے کا ایک سانچہ تھا جس کے افراد سے حسین یاد آئیں اور ابد الآباد تک اپنی جسمانی حیات سے قوی تر حیات میں زندہ رہیں چنانچہ قوم گر اپنے اصول میں کامیاب ہوئے اور مجالس عزا اس اصول کی کامیابی کی بہترین دلیل ہیں

مجالس عزا کے متعلق ائمہ اطہارؑ نے جو ترغیب و تاکید اور رُلانے والوں کے اجر و ثواب کی توضیح و تشریح فرمائی ہے اس کا مقصدِ اصلی اور علتِ غائی رونے رولانے سینہ کوبی اور ظاہری مراسم کی ترویج ہی نہیں ہے بلکہ ان حکمائے الٰہی نے یہ ایک ایسے مشن کی بنیاد رکھی ہے جس سے بہتر مسلمانوں کے قلوب پر اثر ڈالنے والی کوئی تدبیر ممکن ہی نہ تھی سلاطینِ بنی امیہ و بنی عباس کے زمانہ میں محبان اہل بیت پر مغالطہ آمیز سیاسی حیلہ کی آڑ میں جو ہولناک مظالم ہوتے رہے ہیں ان سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ ان کی تعزیراتِ سیاست میں کوئی جرم علیؑ کی محبت سے زیادہ سنگین اور نہ قابلِ معافی تھا یہودی نصرانی مجوسی بت پرست بلکہ ملحد بھی امن و امان سے آزادانہ زندگی بسر کر سکتے تھے مگر علیؑ کے نام لیوا۔ اور ان کی اولاد کو کہیں پناہ

نہ تھی۔ سادات شیعیان علیؑ کا استیصال حکومت کی زرّیں پولیسی تھی تمام دنیائے اسلام میں ان کی مخالفت کے جذبات پائے جاتے تھے اہلِ بیت کی منقصت میں بے شمار حدیثیں وضع کرائی گئی تھیں اس لئے ایک ایسی تبلیغی مشن کی ضرورت تھی جو ایک دردانگیز و رقت خیز اور مظلومانہ شہادت کے تذکرے سے عام مسلمانوں سے جنہیں خاندانِ رسالت سے بے تعلق ہی نہیں بلکہ بغض و عناد تھا۔ اور ان کے فضائل و مناقب سے ناآشنائے محض تھے ہمدردی کے جذبات پیدا کرکے مخالفتِ اہل بیت پر جو نسلاً بعد نسلٍ ارث میں پہنچ کر قلوب میں راسخ ہو چکی تھی ازالہ کر سکے اس کے ساتھ ہی فضائلِ اہل بیت کی اشاعت ہو اور لوگ غلط فہمی کے دلدل سے نکل کر صراطِ مستقیم کے حقیقی جادہ پر آجائیں۔ یہ ایک ایسی مدبرانہ حکمت عملی تھی کہ اس سے بہتر کوئی مشن کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ جو آجتک علیٰ حالہٖ قائم ہے اور نامعلوم زمانہ تک رہے گا۔ جس نے تبلیغی تاریخ میں ایسا پائدار و مستحکم پوزیشن حاصل کر لیا ہے جس کی نظیر دنیا کے دوسرے مذاہب پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسی مشن کا فلسفہ بھی محض ظاہری رسمیات کے نذر ہو کر رہ گیا ہے بلکہ بعض ذاکرین و واعظین مصائب و فضائل کے ذکر میں مباحثہ کی تلخ چاشنی داخل کر دینے کے عادی ہو گئے ہیں جس سے دوسرے مسلمانوں کے گروہ بجائے شرکت احتراز کرتے ہیں ذکر شہادت کا مقصد عام مسلمانوں کے قلوب میں جذبات ہمدردی پیدا کرکے اپنے گروہ میں جذب کرنا ہے نہ کہ ان کو برانگیختہ و متنفر کرنا۔

اب ہم پوچھتے ہیں کہ مجلسیں ہونے لگیں ہمدرد لوگ دکھائی دینے لگے حسینؑ کے مصائب کا ذکر ہونے لگا تو کیا اصول کی غرض پوری ہو گئی نہیں ہرگز نہیں۔ یہ تو اصول کے ظاہری آسان نتائج ہیں یا ابتدائی شکلیں آنسو کے چند قطرے یا غم کی صورت تمہارا پہلا عہد اور پہلا پیش کش تھا جس کے بغیر تم اصول کے دروازہ تک نہیں پہونچ سکتے تھے۔ کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ بانیانِ قوم رہنمایانِ ملت اور روسائے روحانی کے اقوال یا اس بڑے اصول کی علت غائی صرف یہ ہے کہ عورتوں کی طرح رونا تمہارا جزوِ خصائل ہو جائے اور بس یہ ہماری

غلط فہمی اور بے مغزی ہوگی کہ باغبان کا فرض بیج بونے تک پورا ہو گیا۔ پودا اُگے یا نہ اُگے۔ اور اگر اُگے تو اُسے پانی دیا جائے یا نہیں دیا جائے نہ آبیاری کی ضرورت رہی۔ نہ بدنما اور غیر ضروری کے چھانٹنے کی یہ ہمارا ضعفِ تخیل پیش بینی کی کمی اور مفید باتوں سے فائدہ اُٹھانے کی عدم صلاحیت ہے جس نے ہمیں انحطاط و زوال کا ہدف بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان احادیث کا فلسفہ اور مجلس عزا کا مفہوم تو سوخت ہو گیا اور اب ایک محاسب کے نزدیک اس اعتراض کی گنجائش پیدا ہو گئی کہ اقتصادی فشار کی حالت میں یہ ایک اور اُدبار ہے اور ہمارے مزید غور کی راہ میں اپنی رسمی صورت سے ایک آڑ پیدا ہو گئی ہے کیا حسینؑ کی شہادت سے صرف یہ غرض تھی کہ کچھ رونے والے پیدا ہو جائیں اور بس۔ کیا حسینؑ نے انسانی طاقت برداشت سے بالاتر مصیبتیں فقط اس لئے اٹھائی تھیں کہ ان کے نام پر سبیلیں لگائی جائیں شیرینی تقسیم ہو علم اور تابوت اُٹھیں تعزیے بنائے جائیں تاشے نقارے بجیں یا سینہ کوبی ہوا کرے نہیں ایسا ہرگز نہیں حسینؑ نے اسلام کی حمایت میں جان دی۔ احیائے ملت کے واسطے اپنے دوستوں عزیزوں اور بیٹوں کی قربانی منظور فرمائی۔ اصول کے تحفظ کو اپنے خون سے خریدا اور ہم کو تعلیم دی کہ اصول کی پابندی و پیروی آخر دم تک کرنی چاہیئے۔ خواہ کچھ ہی افتاد پڑے یہ جو کچھ ہوا ہمارے مذہبی روحانی اور اخلاقی معاشرتی تمدنی اصلاح و حمایت اور ہماری تعلیم و ہدایت کے لئے نہ کہ صرف عورتوں کی طرح رونے پیٹنے اور چھاتی کوٹنے کے لئے۔

مگر کس قدر افسوس ہے کہ ہماری دنیا ایک مرکزِ اخلاق اور پیشوائے ملت کی بنائی ہوئی نہیں معلوم ہوتی جہاں اس قدر جہالت اور اس قدر نخوت اس قدر خود غرضی اس قدر ایذا رسانی اس قدر غصبِ حقوق اس قدر ظلم اس قدر کذب و افترا، اس قدر برائیاں بداخلاقیاں اور احکام شریعت سے اس قدر لاپروائی موجود ہے حسینؑ کے اس قدر ایثار اور قربانی کا ماحصل صرف یہ ہونا چاہیئے کہ ہم ایک جگہ جمع ہو کر حقہ پئیں کچھ شیرنی

بانٹ دیں اشعار رزم و بزم کا لطف اٹھائیں کچھ ذاکرین کے مخصوص انداز دیکھ لیں۔ ذاکر فاتحانہ انداز سے دائیں بائیں دیکھے اور لوگ اپنے ایثار پر ناز کریں کہ ہم نے کچھ وقت اس مشغلہ میں صرف کر دیا ایسا خیال حسینؑ پر اس سے بھی بڑھ کر ظلم ہے جو کربلا میں واقع ہوا حسین کی شہادت احقاق حق اور ابطال باطل کے واسطے نہیں حسین نے ملت اسلام کے جہاز کی اس وقت ناخدائی کی جب وہ فسق وارتداد کے طوفانی جھونکوں سے ڈگمگا رہا تھا حسین نے اسلام کا مکمل مثالیہ بن کر ہم کو ایثار اور علوئے نفس، استقلال تسلیم و رضا صبر، حمایتِ حق، صیانتِ شریعت خلق و کرم ہمدردی رحم اور ادائے فرض کی تعلیم دی مگر یہ تو بتایئے ہم میں کتنے ایسے ہیں جو مذکورۂ بالا صفات و احکام پر عمل کرتے ہوں صرف فرائض ہی کو لیجئے نماز روزہ حج زکوٰۃ خمس جمعہ جماعت تلاوت قرآن ہم میں کس قدر ہے کس قدر شرم کی بات ہے کہ حافظِ قرآن ہونا تو درکنار قاری قرآن بھی بہت کم ملیں گے، نماز باجماعت اور نماز جمعہ سے تو غرض ہی کیا ہے عتبات عالیات کی زیارات کو اگر سو جائیں گے تو حج کو پانچ بھی نہیں۔ امام باڑوں کی عمارتیں عالیشان ہیں ہزاروں روپیہ کا شیشہ آلات وغیرہ موجود ہیں مگر مساجد ویران پڑی ہیں۔ اول تو مسجد میں نماز کی پابندی ہی نہیں اگر ہے بھی تو کوئی کسی وقت آیا نماز پڑھ گیا کوئی کسی وقت آیا نماز پڑھ گیا کبھی وقت دو آ گئے کبھی وقت چار مجالس کی ترتیب روشنی اور تکلفات کی افراط ذاکرین کی خدمت اور شیرینی کی تقسیم پر دل و جان سے روپیہ صرف کرنے کو تیار ہیں مگر زکوٰۃ و صدقات سے سروکار ہی نہیں ایسی حالت میں ان کا ادعائے پیروی حسینؑ اس شخص سے بلند درجہ پر نہیں جو مسلمان ہی نہ ہو۔

کوئی شخص صرف آنسوؤں کے چند قطروں یا منہ بسور دینے سے وہ بڑا انعام حاصل نہیں کر سکتا جسے جنت کہتے ہیں نہ بہشت اور دائمی نجات کے پٹے ایسے ارزاں پڑے بکتے ہیں جو اس طرح رائگاں اور مفت ہاتھ آ جائیں ہمارا مسئلہ شفاعت مسیحیوں کی طرح عجیب

غریب نہیں ہے کہ گناہوں کی گٹھری خدا کے بیٹے کے حوالے کر دینا کافی ہے اور پھر خلیع العذار ہو کر جو چاہیں کریں کوئی بازپرس کرنے والا ہی نہیں قرآن مجید صاف لفظوں میں فرماتا ہے۔

مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ

ہم پر طاعات اسی طرح فرض ہیں جس طرح خدا اور اس کے رسولؐ کا حکم۔ اگر ہم ان سے جاہل غافل اور لاپروا ہیں۔ تو ہمارا دعویٰ محبّت حسین علیہ السّلام محض دروغ اور سراسر کذب ہے حسینؑ کے مصائب تو نہیں طاعات کے قائم کرنے کے لئے تھے اگر طاعات و فرائض کی بجاآوری میں تساہل و لاپروائی خدا اور اس کے رسول سے عدول حکمی اور سرکشی کی جائے تو یہ رونا کیا فائدہ رساں ہو سکتا ہے اور جب حسینؑ اور ان کے نانا کا تتبع نہیں کرتے اور حسین اور ان کے اوامر کی ہمارے دلوں میں کچھ وقعت نہیں تو ہم مسلمان مومن اور محبِّ حسین کہلائے جانے کے کیونکر مستحق ہو سکتے ہیں صرف حالات و مصائب سُن کر رو دینا کچھ بڑی بات نہیں ہے یہ تو انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ کسی انسان کی مصیبت سن کر متاثر ہو جائے اس لئے ایک غیر مسلم بھی ہماری طرح رو دیتا ہے حسینؑ پر ہی کیا موقوف ہے کسی کے مصائب کیوں نہ ہوں یا ایک گھڑا ہوا قصہ ہی کیوں نہ ہو محض رُو دینا کافی نہیں ہے جب تک حسینؑ کی شرافتِ اعمال اور غرض شہادت کے سمجھنے کے قابل نہ ہوں ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ کے آنسوؤں کے پیچھے آپ کا درجہ ہمدردی وایثار کیا ہے آپ کتنے عامل فرائض مستقل مزاج کریم النفس رحیم ہمدرد سخی شجاع اور پابندِ صوم و صلوات ہیں مصیبتوں کا کس طرح مقابلہ کرتے ہیں۔ اور آپ میں غیرت کتنی ہے۔

یہ بھی خوب یاد رکھنا چاہئے کہ مسائل اخلاق مذہب اور قومیت کو ایک تعلیم یافتہ

اور صاحبِ خصائل انسان بہ نسبت جاہل کے بہتر سمجھ سکتا ہے زندہ قومیں اس کی زندہ مثال موجود ہیں اگر ایسا ہے کہ علم و فضل کا اقتضا جنس شناسی ہے جیسا کہ بلاشبہ ہے تو ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ سب سے بڑی نیکی وہ ہے جو افراد جماعت کو پہونچانی چاہیئے۔ ہم نے فرض کیا کہ کچھ لوگوں کا منہ میٹھا کر دینا بھی نیکی ہے کیونکہ یہ معاشرتی یکجہتی کا ذریعہ ہے لیکن مقتضیات زمانہ اور عقل چاہتے ہیں کہ یہ معاشرتی یکجہتی اور زیادہ مضبوط بنیاد پر قائم کی جائے کیونکہ زمانہ اب نظریہ کا فریفتہ نہیں ہے۔ بلکہ عمل کا دلدادہ ہے مضبوط بنیاد سے ہمارا کیا مطلب ہے یہ کہ اگر آپ سے کوئی غیر قوم کا شخص پوچھے کہ آپ روئے تو خوب مگر حسین کے اسم مقدس اور ان کے بلند خصائل کے قیام و نفاذ کے لئے کیا کیا تو یقیناً تم سوائے سکوت کے کچھ جواب نہیں دے سکتے۔ وہ مضبوط بنیاد یہ ہے کہ حسینؑ کے نام پر تعلیم یا تعلیمی وظائف مقرر کرو حسینؑ کے نام پر یتیموں کی دستگیری کرو حسینؑ کے نام پر بیواؤں کی امداد میں حصہ لو حسینؑ کے نام پر فقراء اور مساکین کو کھانا کھلاؤ۔ کپڑا پہناؤ ہر سال کے محرم ختم ہونے پر اس سے خوش نہ ہو جاؤ کہ اس سال خوب گریہ و بکا ہوا خوب شیرینی یا چاء تقسیم ہوئی ذاکر نے اپنا کمال کما حقہ دکھلایا بلکہ یہ بھی دیکھو کہ حسینؑ کے نام پر کتنے لوگوں کی روٹیوں کا سہارا کیا کتنی بیواؤں کا عقد کر کے انہیں غلط خیالوں سے روکا کتنے یتیموں کے باپ بن کر انہیں دنیا میں عزت سے زندہ رہنے کا طریقہ بتایا اور اس طرح بیواؤں اور یتیموں کو اس سے بھی محفوظ کیا کہ وہ تمہارے ہو کر مجبوریوں سے عاجز آتے ہوئے غیر قوموں کے مالی فریب میں جذب نہ ہو جائیں اور تمہاری تعداد کو قائم رکھیں اور ترقی دیں۔

خوب سمجھ لو کہ فراوانیِ معیشت پر رسوم مذہبی کی حیات موقوف ہے چونکہ جہل نے بجائے اصول کے رسومات ہی کو مذہب سمجھ لیا۔ ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ افلاس مذہب کی فنا نہیں تو بے اثری اور بے وقعتی کا ذریعہ ضرور ہے۔ قوم کی تعلیمی امداد

سے قومی روپیہ ضائع نہ ہوگا۔ بلکہ جو حسینؑ کے نام کے صدقہ میں علم اور معاش حاصل کریگا۔ وہ حسینؑ ہی کا حامی ہوگا ہم کسی مجلس میں نہیں گئے۔ مگر یہ کہ جہل افلاس اور اس کے لازمی آثار دیکھ کر قلب پر ایک خاص اثر ہوا کہ حضرت کی مجلس کا مفہوم اور اسم گرامی ہل من ناصر ینصرنا کا استغاثہ بلند کر رہا ہے اور یا لیتنی کنت معہم فافوز فوزاً عظیما کہنے والو نہیں ہے کوئی اس [illegible] استغاثہ پر لبیک نہیں کہہ سکتا۔

یوم عاشورہ سے عیسوی تاریخ کی مطابقت

واقعہ ہائلہ کربلا کے متعلق اور بھی دو باتیں غور طلب ہیں اول یہ کہ سنہ ۶۰ھ تھا یا سنہ ۶۱ھ دوسرے سنہ عیسوی کون سا تھا اور مہینہ اور تاریخ کیا تھی۔ عموماً تاریخوں میں اس روز گرمی کی بڑی شدت بیان کیجاتی ہے جس سے مئی یا جون کا مہینہ ہونا پایا جاتا ہے حالانکہ بقاعدہ ریاضی یورپین مورخ اکتوبر کا مہینہ لکھتے ہیں جس میں سردی شروع ہو جاتی ہے اور حدت و تمازتِ آفتاب و لُو کا زمانہ گزر جاتا ہے۔ اِن دونوں مسئلوں پر جہاں تک غور کیا جاتا ہے ہم نتائج ذیل پر پہنچے ہیں۔

(ا) (سنہ ہجری) بعض مورخینِ اسلام مثلاً علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں ۱۰ محرم سنہ ۶۰ ہجری کو اس واقعہ کا ہونا لکھا ہے اسی طرح اور بھی متعدد مورخ بھی سنہ ۶۰ ہجری کو ہی تسلیم کرتے ہیں بعض نے مادہ ہائے تاریخ بھی اسی سنہ کے لکھے ہیں

"سر جدا شد از حسین و گشت تاریخ آشکار ہم ز حرفِ بے نقط ہم از حروف
نقطہ دار سر دیں را بریدے دیں"

لیکن مورخین یورپ نے بعدِ تحقیقات یہ فیصلہ کیا ہے کہ واقعہ کربلا سنہ ۶۱ ہجری میں ہوا فریقین کے اکثر مورخین بھی اسی سنہ کو مانتے چلے آئے ہیں۔ صاحبِ ناسخ التواریخ نے اس امر کے متعلق مدلل بحث کی ہے اور بروئے تقویم یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سنہ ۶۱ ہجری میں یہ واقعہ ہوا ہمارے خیال میں بھی ۱۰ محرم سنہ ۶۱ ہجری ہی صحیح ہے۔

(ب) (سنہ عیسوی) اب یہ دیکھنا ہے کہ اس تاریخ کا سنہ عیسوی کے کس سال کس مہینہ

اور کس تاریخ سے تطابق ہوتا ہے اس مطابقت کے لئے ماہرینِ علمِ ریاضی نے دو قاعدے مقرر کئے ہیں جن سے سنہ ہجری سے استخراج سنہ عیسوی کا کیا جا سکتا ہے۔

(قاعدہ اول) اعداد سنہ ہجری کو ۹۷۰۲۲۴ ضرب دیکر حاصل ضرب کے ساتھ ۶۲۱۵۷۷۴ جمع کر لیا جائے اور حاصل جمع سے شروع کے چھ عدد گن کر اعشاریہ لگا دیا جائے صحیح عدد سنہ عیسوی کا ہوگا باقی کسر کو ۳۶۵ میں ضرب دینے سے جو حاصل ضرب ہو اس کے بھی شروع سے چھ عدد گن کر اعشاریہ لگا دیا جائے۔ وہ صحیح تعداد ایام ہوگی۔ اس سال کے شروع سے یعنی اس قدر ایام گذرنے پر سنہ ہجری شروع ہوا تھا یہ قاعدہ درج ذیل ہے۔

۹۷۰۲۲۴
(ضرب) ۶۱
۹۷۰۲۲۴
۵۸۲۱۳۴۴
۵۹۱۸۳۶۶۴
(جمع) ۶۲۱۵۷۷۴
۶۸۰٫۷۶۱۰۶۴
(ضرب) ۳۶۵
۳۸۰۵۳۲۰
۴۵۶۶۳۸۴
۲۲۸۳۱۹۲
۲۷۷٫۷۸۸۳۶۰

اس سے معلوم ہوا کہ ۶۱ سنہ ہجری میں ۶۸۰ سنہ تھا اور ۶۸۰ سنہ کے ۲۷۷ دن گزرنے پر سنہ ہجری شروع ہوا تھا اب ۲۷۷ کا حال حسب ذیل ہے۔

جنوری	۳۱	اپریل	۳۰	جولائی	۳۱
فروری	۲۹	مئی	۳۱	اگست	۳۱
مارچ	۳۱	جون	۳۰	ستمبر	۳۰

اکتوبر ۳۱
۲۷۷

گویا یکم محرم ۶۱ سنہ ہجری کی تطبیق ۴ر اکتوبر ۶۸۰ سنہ سے اور ۱۰ محرم کی ۱۲ر اکتوبر ۶۸۰ سنہ سے ہوتی ہے۔

(قاعدہ دوم) اگر سنہ عیسوی سے سنہ ہجری نکالنا ہو تو سنہ عیسوی میں سے ۶۲۱½ تفریق کر کے ۱۰۰/۹۷ میں ضرب دیدیا جائے اس طرح اگر سنہ ہجری سے سنہ عیسوی نکالنا ہو تو ۹۷/۱۰۰ میں ضرب دیکر ۶۲۱½ جمع کر دیا جائے۔

۶۱/۱ × ۹۷/۱۰۰ = ۵۹۱۷/۱۰۰

۵۹۱۷/۱۰۰ + ۱۲۴۳/۲ = (۱۲۴۳۰۰ + ۱۱۸۳۴)/۲۰۰ = ۱۳۶۱۳۴/۲۰۰ = ۱۳۴/۲۰۰ ۶۸۰

اس طرح ظاہر ہوا کہ ۶۱ سنہ ہجری میں ۶۸۰ سنہ تھا۔

یہ تو سنہ عیسوی کے برآمد ہونے کا قاعدہ ہے اب مہینہ اور تاریخ کی مطابقت حسب ذیل طریقے سے ہوتی ہے۔ اور بروئے استخراج پایا جاتا ہے کہ یکم محرم ۶۱ سنہ ۲ر اکتوبر ۶۸۰ سنہ سے مطابق تھی۔

(مزید تشریح) ماہرینِ علمِ ہیئت کو یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہر ۳۲½ سال عیسوی کے بعد سنہ ہجری اسی موسم میں پلٹ کر آ جاتا ہے جس میں پہلے تھا۔ مثلاً ۶۲۲ سنہ کے جس عیسوی مہینہ میں سنہ ہجری کا جو مہینہ تھا وہ ۳۲½ سال گزرنے کے بعد پھر اسی ماہ عیسوی سے تقریباً مطابق ہو جائے گا بروئے استخراج قاعدہ اول اور تحقیقاتِ مورخین یورپ یکم محرم ۱ سنہ ہجری ۸ جولائی ۶۲۲ سنہ سے شروع ہوا ہے اس سے ۳۲½ برس کے بعد یکم محرم ۳۴ سنہ ۲۵ جولائی ۶۵۴ سنہ سے مطابق ہوتا ہے اسی طرح اس سے ۳۲½ برس کے بعد یکم محرم ۶۸ سنہ کی تطبیق ۲۱ جولائی ۶۸۷ سنہ سے ہوتی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہر ۶۵ سال میں سنہ ہجری کے شروع ہونے پر عیسوی مہینہ

کی تاریخ ۲ دن آگے بڑھ جاتی ہے بروئے استخراج جو حساب قائم کیا گیا ہے وہ مشاہدہ سے بھی درست معلوم ہوتا ہے اور پرانی جنتریوں سے بھی اس کی صحت ہوتی ہے مثلاً ۲۹ جون سنہ ۱۸۶۲ء مطابق یکم محرم سنہ ۱۲۷۹ ہجری تھی۔ اور ۶۵ سال کے بعد یکم جولائی سنہ ۱۹۲۷ء مطابق یکم محرم سنہ ۱۳۴۶ ہجری ہوگئی۔

گویا ہر ۶۵ سال میں بروئے مشاہدہ وحساب تین دن کا فرق پڑ جاتا ہے یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ سنہ ہجری ہر سال میں عیسوی سے (۱/۴ ۱۱ دن) سوا گیارہ دن پیچھے ہٹ جاتا ہے چونکہ شمسی سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ ۴۹ سکنڈ اور ۶۲ (۱/۱۰۰ سکنڈ) ہوگا اور قمری سال ۳۵۴ دن کا ہوتا ہے یعنی بہ لحاظ کثرت ۱/۴ ۱۱ دن کی کمی ہوتی ہے شمسی وقمری سال کی مطابقت جولیس قیصر نے اس طرح کی کہ تین سال معمولی ۳۶۵ دن کے اور چوتھا سال فروری میں ایک دن بڑھا کر ۳۶۶ دن کا کر دیا۔ ترتیب یہ رکھی تھی کہ فروری معمولی برسوں میں ۲۹ دن کا اور چوتھے برس ۳۰ دن کا ہو جایا کرتا تھا فروری میں ایک دن کا اضافہ آخر میں نہیں ہوتا تھا بلکہ ۲۴ یا ۲۵ کی تاریخ مکرر بڑھا کر دو روز تک ایک ہی مانی جاتی تھی اس طرح گو ایک دن کا اضافہ ہو جاتا تھا مگر مہینہ کا خاتمہ ہمیشہ ۲۹ تاریخ کو ہوتا تھا۔ اس حساب کو جولین کلینڈر کہا جاتا ہے جو سنہ ۴۶ ق م سے ایک خفیف ترمیم کے ساتھ آج تک جاری ہے۔ پھر اس کلینڈر کی تصحیح پوپ گریگوری سیزدہم نے سنہ ۱۵۸۲ء میں کی اس کو جو جولین کلینڈر میں جو ۳۶۵ دن کا سال تھا غلطی معلوم ہوئی نقطۂ اعتدال ربیعی جو ۲۵ مارچ سے مطابقت دیکر قائم کیا گیا تھا اس وقت دریافت ہوا کہ وہ اپنی جگہ کے کھسک کر ۱۱ مارچ کو آگیا لہذا پوپ نے حکم دیا کہ ۱۱ مارچ کو ۲۱ مارچ قرار دیدیا جائے۔ اور سال کی دوسری ترتیب یعنے حساب ماہ وسال کی ترتیب کا پھر آغاز ہوا اس کا عملدرآمد ہونا بحساب ذیل قرار پایا۔ اول ہر سال ماہ فروری ۲۸ یوم کا ہوگا مگر چوتھے برس ۲۹

یوم کا بشرطیکہ اُس سال کے عدد چار سے تقسیم ہو سکیں دوسرے ہر صدی کے اختتام پر ماہ فروری ۲۸ یوم کا ہوگا مگر چوتھی صدی تک ۲۹ یوم کا بشرطیکہ وہ صدی چار سے بہ اعتبار پوری صدی کے تقسیم ہو سکے۔ تیسرے ہر ہزار سال پر ماہ فروری ۲۹ یوم کا ہوگا مگر چوتھے ہزار پر ۲۸ یوم کا بشرطیکہ وہ ہزار چار سے بہ اعتبار پورے ہزار کے تقسیم ہو سکے۔ یہاں تک ہر کسر کہیں ایک روز گھٹا کر اور کہیں ایک روز بڑھا کر مٹائی گئی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہمیشہ چار کے عدد کو لئے رہے مگر ہزار صدیاں یعنی ایک لاکھ برس گزرنے کے بعد بھی از روئے قاعدۂ حسابی معلوم ہوا ہے کہ اب بھی ایک روز کا فرق باقی رہ گیا ہے۔ اسے گریگورین رُول کہتے ہیں اور ان کسرات کے دنوں کو ایام کبیسہ۔ بہرحال یہ عیسوی اور ہجری سنین شہور و ایام کی مطابقت شمسی وقمری حساب کی کمی بیشی اور ایام کبیسہ کے استخراج پر موقوف ہے۔

یہ تو تقریباً مسلمہ ہے کہ سن ہجری یعنی یکم محرم سنہ ۱ ہجری کا آغاز ۱۸ جولائی سنہ ۶۲۲ سے ہوا۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ سنہ ۶۱ ہجری کے یکم محرم کی تطبیق کس مہینہ اور کس تاریخ عیسوی سے ہوتی ہے اس کے لئے تاریخہائے ذیل پر نظر کرو۔

۲۱ جولائی سنہ ۶۸۷ء	یکم محرم سنہ ۶۸ھ
یکم اگست سنہ ۶۸۶	یکم محرم سنہ ۶۷ھ
۱۲ اگست سنہ ۶۸۵	یکم محرم سنہ ۶۶ھ
۲۳ اگست سنہ ۶۸۴	یکم محرم سنہ ۶۵ھ
۳ ستمبر سنہ ۶۸۳	یکم محرم سنہ ۶۴ھ
۱۴ ستمبر سنہ ۶۸۲ء	یکم محرم سنہ ۶۳ھ
۲۵ ستمبر سنہ ۶۸۱	یکم محرم سنہ ۶۲ھ
۶ اکتوبر سنہ ۶۸۰ء	یکم محرم سنہ ۶۱ھ

لیکن گریگورین قاعدی کے مطابق ۵ دن کم کرنے سے یکم اکتوبر ۶۸۰ء یکم محرم ۶۱ھ سے مطابق ہوتی ہے اور چونکہ اسی قاعدے کے موافق اس کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے اس لئے ۱۰ محرم ۶۱ھ ہجری سے ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء سے مطابق ماننا پڑتا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۳ طبع یازدہم میں بھی اسی تاریخ کو تسلیم کیا گیا ہے رہا اس روز کی حدت اور گرمی کا سوال تو اکتوبر میں بھی گرمی ہوتی ہے ریگستانی میدان دن بھر دھوپ میں کھڑا رہنا۔ ہتیاروں کا جسم پر تپنا۔ دو دن کی بھوک پیاس کیا تھوڑے اذیت رساں اسباب تھے۔ پھر زخمی کو پیاس زیادہ لگتی ہے یہ سبب ان سب کے علاوہ۔

البتہ ایک یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ علماء ہیئت نے اپنی تحقیقات سے ثابت کیا ہے کہ تمام کائنات کے ہمہ گیر قانونِ کون وفساد کے مطابق اجرام سماوی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ان میں بھی دائمی تغیر و تبدل (اوولیوشن و ڈسولیوشن) کا سلسلہ برابر جاری ہے اور رہے گا آفتاب کی حرارت رفتہ رفتہ کم ہوتی جارہی ہے۔ اگر یہ مسئلہ صحیح ہے جیسا کہ مشاہدات و تجربات سے تائید ہوتی ہے تو ممکن ہے کہ آج سے تیرہ سو برس پہلے آفتاب کی حدت وحرارت موجودہ زمانہ سے زیادہ ہو اور اکتوبر میں بھی گرمی کی اسی قدر شدت ہو جیسی کہ محرم ۶۱ھ میں تھی۔

توریت مُقدّس میں حکمِ غمِ عاشورہ

حسینی غم وہ غم ہے جس کا حکم بارگاہ ایزدی سے اُس آسمانی کتاب میں بھی پایا جاتا ہے جو یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کے نزدیک یکساں محترم اور مقدس ہے اور جسکے احکام کا تمام انبیاء بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ تک اتباع کرتے آئے توریت مقدس کی کتاب احبار باب ۲۳ میں سے ۳۲ درس تک یہ لکھا ہے۔

"پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ بنی اسرائیل کو کہہ کہ ساتویں مہینے کے پہلے دن تمہارے لئے عید اور یادگاری قرناؤں کے پھونکنے کا دن ہے اور جماعتِ مقدس ہوگی تم کوئی دنیاوی کام مت کیجیو اور خداوند کے لئے آگ سے قربانی گزرانیو۔ پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا ساتویں مہینے میں بھی اور اس کے دس روز بعد کفارہ دینے کا حکم ہوگا۔ تمہاری مقدس جماعت ہوگی تم اس دن آپ کو غمزدہ بناؤ اور خداوند کے لئے آگ سے قربانی گذرانو تم اس دن کوئی نہ کام نہ کرنا کیونکہ وہ کفارہ کا دن ہے کہ تم خداوند اپنے خدا کو اپنے لئے کفارہ دو جو کوئی انسان عین اس دن غمگین نہ ہوگا وہ اپنی قوم سے کٹ جائے گا۔ اور جو انسان عین اس دن کوئی کام کریگا میں اس انسان کو اس قوم میں سے فنا کردوں گا تم کسی طرح کا کام نہ کرنا۔ یہ تمہارے گھروں اور تمہارے لئے قرنوں کے لئے قانون ابدی ہوگا یہ تمہارے لئے سبت آرام کرنے کے لئے ہوگا تم آپ کو غمگین بنائیو تم اس مہینے کی نویں تاریخ کی شام سے دوسری شام تک اپنے آرام کا وقت مان لیجیو۔ (صفحہ ۱۶۰)

اس سے پہلے اسی کی کتاب کے باب ۱۶ میں اس حکم کے متعلق درس ۲۹ سے یہ عبارت درج ہے اور یہ تمہارے لئے قانون دائمی ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دس تاریخ تم سے ہر ایک خواہ دیس کا ہو یا پردیسی جو تم میں ہے اپنی جان کو دکھ دے اور کسی کا کام نہ کرے چونکہ اس روز تمہارے لئے پاکیزگی کا کفارہ دیا جائے گا تاکہ تم اپنے سارے گناہوں سے خداوند کے آگے پاک ہوجاؤ۔ یہ سبت تمہارے آرام کرنے کے لئے ہوگا تم اُس دن اپنی جان کو دکھ دیجیو۔ یہ سبت تمہارے لئے آرام کرنے کے لئے ہوگا۔ تم اس دن اپنی جان کو دکھ دیجیو۔

یہ تمہارے لئے ہمیشہ کو قانون ہوگا۔ (صفحہ ۱۵۰)
دیکھو بائیبل مقدس کتاب احبار صفحات ۱۵۰ اور ۱۶۰ مطبوعہ امریکن بائیبل سوسائٹی ترجمہ از عبرانی و یونانی امریکن مشن پریس لدھیانہ بہ اہتمام پادری ویری سنہ ۱۸۹۳ء۔

توریت مقدس کی ان عبارات سے پایا جاتا ہے کہ امت موسی کے لئے بارہ مہینہ کے اندر ایک دن ایسا مقرر کیا گیا ہے کہ اس روز کاروبار کو معطل کر کے غم منایا جائے قربانی وغیرہ کی رسمیں ادا کی جائیں دوسرے احکام تو بجائے خود کچھ توضیح بھی رکھتے ہیں لیکن غم کرنا اور خود کو دکھ دینا ایک معمہ ہے جس کی کوئی وجہ توریت میں نہیں پائی جاتی کہ یہ حکم اس خصوصیت کے ساتھ کہ جو ایسا نہ کریگا اس کو فنا کر دیا جائے گا چن لیا گیا ہے وہ بھی دسویں تاریخ کے لئے اور [illegible] یں کی شام سے دسویں کی شام تک اگر یہ کہا جائے کہ اس تاریخ کو بارہ مہینوں کی لغزشوں اور خطاؤں کا کفارہ ادا کرنے کا دن مقرر کیا گیا ہے کہ لوگ گناہوں کو یاد کر کے اظہار پشیمانی و توبہ کے طریق پر کاروبار بند کر کے دنیا کا کوئی کام نہ کریں بلکہ قرنا پھونکیں۔ اور جانوروں کی قربانیاں آگ پر چڑھائیں، تب بھی خود کو دکھ دینے اور غم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں بتایا گیا اور جب خدائی مشیت نے ایک ایسی شریعت قائم کرنی منظور تھی۔ جو شریعت موسوی کی ناسخ ہو تو یہودیوں کو ابدالآباد اس رسم کو جاری رکھنا۔ کیا توریت میں دوسرے صحف انبیاء کی طرح بعض آئندہ واقعات کی پیشین گوئی بھی کی گئی ہے باوجود تحریف و تبدل اب بھی متعدد آیات و احکام ایسے موجود ہیں جن کی تطبیق بعثت خاتم الانبیاء اور بعض اسلامی واقعات سے بآسانی ہو سکتی ہے اس لئے ہم غلطی پر نہ ہوں گے۔ اگر توریت کے مندرجہ بالا احکام کو ماہ محرم کی دسویں تاریخ سے مطابق سمجھ کر اس واقعہ کی جو حضرت خاتم الانبیاء کے فرزند سے متعلق ہے پیشین گوئی قرار دیں اور دسویں تاریخ کی تعیین تاکید اور تہدید کو عاشورہ محرم کے متعلق خیال کر لیں اور چونکہ حضرت موسی کے بعد تمام انبیاء یہاں تک کہ حضرت عیسے بھی شریعت موسوی کی تقلید و تاسی برابر

تھے اور توریت مقدس یہودیوں کے لئے ہی نہیں بلکہ عیسائی بھی اس کے ایسے ہی معتقد و مقلد ہیں جیسا کہ یہودی ان احکام کی پیروی کا سلسلہ مشیت الٰہی میں زمانۂ خاتم الانبیاء تک رکھنا منظور تھا اس لئے یہ حکم عام ہمیشہ کے لئے دیا گیا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ توریت کا حکم ہے اور توریت کے احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ ہم یہ کہیں گے کہ یہ حکم تو ابدالآباد تک کے لئے کیا گیا ہے۔ اور جس حکم کو قانون ابدی و دائمی فرمایا گیا ہو اسے کیونکر منسوخ مانا جاسکتا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ حکم تا قیام قیامت جاری و ساری رہے گا۔ اور اس فرمان خداوندی کی تعمیل اب امت محمدیہ کے ذمہ عائد ہے۔ ہمارے خیال میں توریت کے مندرجہ صدر حکم سے اہل بیت رسالت کے اس عدیم النظیر اور دردناک واقعہ سے تطبیق بے محل نہیں خصوصاً جب کہ اس تطبیق کے بعض قرائن بھی موجود ہوں اب دیکھنا یہ ہے کہ عبری ساتویں مہینے کی جس کا نام عبری کلینڈر میں ماہ نیسان ہے اور عربی پہلے مہینہ کی دس تاریخ کس طرح مطابق ہو سکتی ہے اگرچہ عبری مہینوں میں بھی شمسی مہینوں کی مطابقت کے لئے ایک مہینہ کبیسہ کا (ادار) بڑھایا جاتا ہے لیکن یہ حساب شریعت موسوی کے خلاف ہے توریت میں تیسرے سال ایک مہینہ شمسی قرار دیدینے کا حکم کہیں نہیں ہے جس طرح مسلمانوں میں قمری مہینوں کا حساب ہے اسی طرح حضرت موسیٰ کی شریعت میں بھی قمری مہینوں کا ہی استعمال تھا حقیقت بھی یہی ہے کہ دورۂ قمری سے مہینہ کا حساب وہ اصول ہے جسے نوع انسان نے سب سے اول دیکھا سمجھا اور قرار دیا تھا یہودیوں نے غالباً رومیوں کی تقلید سے لوند کا ایک مہینہ بڑھا کر اپنے سال کو شمسی سال سے مطابق کر لیا ممکن ہے کہ اس عمل سے الٹ پھیر ہو کر مہینوں کے ناموں میں بھی تقدم و تاخر ہو گیا ہو مگر آخری آسمانی کتاب (قرآن) میں یہودیوں کے اس فعل کی مذمت کی گئی ہے۔

انما النسی زیادۃ فی الکفر یضل به الذین کفروا۔

حقیقت یہ ہے کہ لوند کا شامل کرنا کفر کا بڑھانا ہے جس سے کفر والوں کو گمراہ کیا جاتا ہے

سنہ ہجری قائم کئے جانے کے وقت بھی محرم کو ہی سال کا پہلا ماہ قرار دیا گیا حالانکہ ہجرت کا واقعہ ۲۷ ماہ صفر کو ہوا اس موقعہ پر ہم کو ان بحثوں سے سروکار نہیں۔ صرف یہ امر قابلِ غور ہے کہ محرم سنہ ۶۱ ہجری کی دسویں تاریخ عبری ساتویں مہینہ کی دس تاریخ کو مطابق ہو سکتی ہے یا نہیں عبری بارہ مہینوں کے مع تعداد ایام یہ ہیں۔ (۱) تسری ۳۰۔ (۲) حسوان ۲۹ (۳) کسلیو ۳۰ (۴) تبت ۲۹ (۵) شبت ۳۰ (۶) ادر ۲۹ (لوند کا سال کبیسہ میں ۲۹ دن) (۷) نیسان ۳۰ (۸) ییار ۲۹ (۹) سوان ۳۰ (۱۰) تموز ۲۹ (۱۱) آب ۳۰ (۱۲) الول ۲۹۔ کل ۳۵۴ دن کبیسہ میں ۳۸۴ دن

ان میں تسری پہلا مہینہ اور نیسان ساتواں مہینہ ہے تاہم بعض شہادات سے یہ عبری ساتواں مہینہ فارسی ماہِ تسرین الاول اور انگریزی ماہ اکتوبر سے مطابق ہو جاتا ہے۔

کان فقتلہ لعشر لیال خلون من المحرم سنہ ۶۱ وکان من شہود العجم فی تشرین الاول

(حضرت کی شہادت محرم کی دس راتیں گزر جانے پر سنہ ۶۱ ہجری میں ہوئی اور وہ عجمی مہینوں میں تسرین الاول کا مہینہ تھا جس کو عوام تشری کہتے ہیں۔)

یہودیوں کی جنتری میں بھی ساتواں مہینہ تسرین الاول میں ہوتا ہے یہ ماہ اکتوبر سے مطابق ہے پروفیسر پولانو جو عبری زبان کا بڑا عالم تھا اس نے بھی ہیبریو اسٹیلر میں یہی لکھا ہے کہ ساتواں مہینہ تسری یعنی اکتوبر ہے۔ سید سلیمان ندوی نے سریانی لغات[1] کے تحت میں تسرین الاول کو ماہ اکتوبر بتایا ہے اور تاریخ ابن عربی مطبوعہ مصر کے انڈکس میں بھی سنہ ۶۱ ہجری کی ابتدا یکم تسری سنہ ۶۸۰ کو لکھی ہے محمد طلعت بے ترکی مورخ نے دول العرب والاسلام کے صفحہ ۲۳۱ میں لکھا ہے کہ یوم عاشورہ محرم کو تسری کی دس تاریخ تھی یعقوبی نے بحوالہ خوارزمی تحریر کیا ہے کہ روزِ عاشورہ آفتاب برج میزان سے سترہ درجہ ۲۰ دقیقہ پر اور قمر برج دلو سے ۲۰ درجہ پر تھا علامہ عبد العلی

[1] لغاتِ جدیدہ مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۴۷۵۔

ہردی طہرانی کا قول ہے کہ روزِ عاشورہ آفتاب درجۂ میزان میں تھا۔ اور ایسا اکتوبر کا مہینہ میں ہوتا ہے سید محسن علی سبزواری اپنی کتاب نور العین مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور کے صفحہ ۲۶ میں لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل کا قمری سال ماہ رجب سے شروع ہوتا ہے۔ اِس لئے اس کا ساتواں مہینہ محرم ہے عربی توریت میں سفینۂ نوحؑ کی نسبت لکھا ہے استقر الفلک فی الشھر السابع بعض مفسرین اسلام نے اس کی تائید کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ فاستقرت علیہ یوم العاشر محرم (دیکھو تفسیرِ مجمع البیان) یعنی کشتی کوہِ جودی پر دس محرم کو ٹھہری اس سے پایا گیا کہ یہودیوں کا ساتواں مہینہ محرم سے مطابق تھا اور توریت میں دس محرم کو غم کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ہمیشہ کے لئے دیا گیا ہے

(نوٹ) اس مبحث پر ہم کو خود کافی اطمینان نہیں کیونکہ حسبِ منشا مواد دستیاب نہیں ہوا جب تک وثوق کامل نہ ہو تا دلیلات سے تشفیِ قلب حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ دو سوال اور بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر توریت میں ایسا حکم ہے تو قرآن میں کیوں نہیں، دوسرے یہ کہ اگر یہ حکم دائمی اور ابدی ہے تو زمانۂ رسالت میں اس پر عمل کیوں نہیں ہوا۔ اس لئے یہ عرض کیا جاتا ہے کہ اگر اس کے متعلق کوئی ایسا مواد مل سکا جس پر جرح کی گنجائش نہ ہو تو انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں اضافہ کیا جائیگا۔

رسومِ عزاداری محرم میں ایک غیر متعلق طرزِ عمل کی آمیزش

عشرۂ محرم میں یا اسکے بعد اربعین تک جو مراسم عزاداری ادا کی جاتی ہیں ان کا مقصدِ اعظم یہ ہے کہ مصائبِ خاندانِ رسالت کی یاد کو ہر سال تازہ اور زندہ رکھا جائے اور ان کے ہر پہلو سے جو سبق آموز نتیجے بر آمد ہوتے ہیں۔ ان پر از سرِ نو غور و خوض کا موقعہ ملے

اور عام قلوب۔ ان کی تاسّی اور اقتدار کے جذبات سے متاثر ہو کر سرگرم عمل ہوں ۔ یہ عزاداری کی رسمیں اور طریقے جو مختلف شہروں میں سے مختلف صورتوں سے لائے ہیں ان کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ ان میں مسلمانوں کو کسی طبقہ یا فرد کی دل آزاری نہیں چنانچہ تعزیہ داری مجالس عزا اور نذر و نیاز اکثر اہل سنت بھی اسی طرح کرتے ہیں جس طرح شیعہ تاہم اس حقیقت حال پر جس قدر افسوس کیا جائے وہ کم ہے کہ شیعہ حضرات نے ایک ایسی رسم کو عزاداری کا جزو قرار دے لیا ہے جس کا رسوم محرم اور واقعاتِ کربلا سے کچھ بھی تعلق اور لگاؤ نہیں۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں لفظِ تبرا کے لغوی معنی ہیں کسی سے برأت یعنے بیزاری ظاہر کرنا اس کا مفہوم ایسا ہمہ گیر ہے کہ تمدن کی تمام شاخیں مذہبی ہوں یا معاشرتی یا سیاسی اس کے تحت میں آجاتی ہیں۔ مذہب کو لیجیے تو ہر شخص دوسرے مذاہب اُن کے پیشوایان ملت ان کے طُرق عبادت اور احکام سے بیزار ہے خواہ وہ کیسے ہی مستحسن اور عقل کے مطابق ہوں لیکن اس کے خیال میں وہ صداقت و حقانیت سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتے ہیں ان کے ہادیان طریقت گمراہ اور احکام ناقابلِ عمل ہیں مسلمان عیسائی ہندو پارسی بُدھ سکھ جین وغیرہ جتنے دنیا کے مذاہب ہیں ان کا عمل اسی عالمگیر قانون پر ہے تبرا اور بیزاری کا یہ عمل دوسرے مخالف مذاہب کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ ہر مذہب میں جو مختلف شاخیں پیدا ہوگئی ہیں وہ بھی باہم دست و گریباں اور ایک دوسرے کے خیالات و عملیات سے بیزار ہیں بلکہ نظر غور سے دیکھا جائے تو ہر مذہب کی بنیاد ہی تبرا پر ہے ہمارے مذہب اسلام کو ہی لے لیجیے اس کی عمارت کی خشتِ اول کلمہ لا الٰہ الا اللہ پر رکھی گئی ہے جس سے تمام فرضی معبودوں سے تبرا کا اظہار احکام اسلام کا رکن اعظم اور افضل عباداتِ نماز ہے اور اس کی ابتدا تبرا سے ہی کی جاتی ہے اور ہر نمازی نماز کی نیت باندھ کر سب سے اول اعوذ باللہ من الشیطان

الرجیم۔ پڑھنا اور شیطان سے بیزاری ظاہر کرکے نماز شروع کرتا ہے۔

معاشرتی نظام کو دیکھا جائے تو اس میں بھی تبرا اور منافرت کا سکہ جاری ہے۔ اصول زندگی لباس خوراک بلکہ سوسائٹی کے ہر شعبہ میں اس کا اثر نمایاں ہے داڑھی رکھنے والا داڑھی منڈے سے بیزار اور داڑھی منڈا داڑھی والے سے چھری کانٹے سے کھانے والا ہاتھ کے ذریعہ کھانے سے متنفر ہاتھ سے کھانے والا چھری کانٹے سے گریزاں ہیٹ اور کوٹ والا انگرکھے پاجامہ والے کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے تو انگرکھے پاجامہ والا ہیٹ اور کوٹ پر لاحول پڑھتا ہے وغیرہ وغیرہ اسی مخالفت اور منافرت کا نام تبرا اور بیزاری ہے یہی حال سیاسیات کا ہے ہر شخص اور ہر قوم کی ڈپلومیسی دوسرے کی ضد ہے اور یہی باہم... تبرا اور بیزاری کا باعث ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ رسم شیعوں کے مذہب میں اصولاً داخل نہیں نہ اس کا شیعیت سے کچھ واسطہ نہ عزاداری محرم سے کچھ تعلق ہے نہ پہلے جاری تھی اس کی ابتدا در اصل انتقامی جذبہ سے ہوئی بلکہ اس بدعت کے بانی خود اہل سنت کے پانچویں خلیفہ امیر المومنین حضرت معاویہ بن ابی سفیان صاحب ہیں جن کو خاندان رسالت سے دیرینہ اور قلبی عداوت تھی انہوں نے اپنی سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے جناب علی مرتضیٰ پر بذریعہ فرمان اپنے تمام قلمروِ سلطنت میں تبری کا حکم جاری کردیا جس سے ان کی مراد یہ تھی کہ عوام کی نظروں میں خاندانِ رسالت کی منقصت ہو اور عوام کی عقیدت اس جانب منحرف ہو کر سلاطینِ بنی امیہ کے حلقہ اثر میں آباؤ اور آئندہ نسلوں کی نشو و نما بغضِ اہل بیت پر منتج ہو چنانچہ اس بدعت پر تقریباً ساٹھ برس تک عمل رہا اور باستثنائے شیعیان علی تمام اسلامی دنیا جس کا دائرہ آبادی مغربی افریقہ سے ترکستان و ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا اسی معاویہ شاہی سنت پر کاربند رہے اور اس عہد کے صحابی تابعین تبع تابعین تک طوعاً و کرہاً اس آلودگی سے نہ بچ سکے۔ تمام مساجد میں واعظ اور

خطیب بر سر ممبر علانیہ اس کا اعادہ کرتے رہے یہاں تک کہ خلیفہ عمر ابن عبد العزیز نے ۹۹ھ ہجری میں اس ناشدنی بدعت کو بحکم شاہی مسدود موقوف کیا اس زمانہ کی تمام اسلامی تاریخیں ان واقعات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔

پہلے کوئی تفریق نہ تھی توحید کے نام لیوا سب مسلمان کہے جاتے تھے یہ شیعیت اور سنیت ۴۱ھ ہجری عہد امیر معاویہ سے شروع ہوئی علامہ جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں۔

اخرج معاویۃ علی علیؑ وتسمّی بالخلافۃ ثمّ خرج علی الحسن فنزل له الحسن عن الخلافۃ فاستقر فیها من ربیع الاٰخر او جمادی الاوّل سنۃ احدی و اربعین فسمّی هذا العام عام الجماعۃ لاجماع الامۃ علی خلیفۃ واحدۃ۔

معاویہ نے علی پر خروج کیا اور اس کا نام خلافت رکھا پھر حسن پر خروج کیا۔ امام حسن خلافت سے دستبردار ہوگئے۔ اور معاویہ پر خلافت کا استقرار ہوگیا۔ یہ واقعہ ماہ ربیع الثانی یا جمادی الاوّل ۴۱ھ ہجری کا ہے اس سنہ کا نام سال جماعت رکھا گیا کیونکہ امت کا اجماع ایک خلیفہ پر ہوگیا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ جنگ صفین اور محاکمہ دومۃ الجندل کے بعد ہی امیر شام نے امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ پر سبّ و تبرے کی کاروائی شروع کردی تھی اور اپنے زیر حکم تمام علاقوں میں اس ناپاک رسم کی اشاعت کا فرمان جاری کردیا تھا۔ اور جب حضرت امام حسنؑ سے معاہدۂ صلح ہوا تو آپ نے ایک دفعہ یہ بھی قائم کی تھی کہ سبّ امیر المومنین کی بدعت اُٹھادی جائے اور آئندہ کوئی آپ کی شان میں بے ادبانہ الفاظ استعمال نہ کرسکے لیکن باتفاق روضۃ الصفا روضۃ الاحباب ابوالفدا ابن اثیر ابن الوردی وغیرہ امیر معاویہ نے انسداد سبّ امیر المومنین کی شرط کو منظور نہ کیا جب

زیادہ اصرار ہوا تو بڑی رد و کد کے بعد قرار پایا کہ جس مجلس میں حضرت امام حسن موجود ہوں اس احتیاط کی جائے گی۔ مگر اس شرط کا ایفا بالکل نہ ہوا اور اس کے عامل امام عالی مقام کے روبرو سبّ و شتم کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے (دیکھو ابو الفدا المطبوعہ دہلی صفحہ ۳۴۴) یہی ابو الفدا اپنی تاریخ کے صفحہ ۲۰۱ پر لکھتے ہیں۔

کان خلفائے بنی امیۃ یسبّون علیًّا من سنۃ احدی واربعین وهی سنۃ التی خلع الحسن نفسہ من الخلافۃ الی اوّل سنۃ تسع و تسعین آخر ایام سلیمان ابن عبد الملک فلمّا ولی عمر ابطل ذالک وکتب الی نوابہ بابطالہ۔ ولمّا خطب یوم الجمعۃ عبدل السب فی آخر الخطبۃ۔

خلفائے بنی امیہ ۴۱ھ ہجری کی سنہ ۹۹ھ آخر عہد سلیمان عبد الملک تک امیر المومنین علی مرتضیٰ پر تبرا کرتے رہے۔ جب عمر ابن عبد العزیز خلیفہ ہوئے تو اونہوں نے اس رسم کو مٹایا اور اپنے نائبوں کو بھی مٹانے کا حکم بھیج دیا اور جب جمعہ کو خطبہ پڑھاتے تو خطبہ کے آخر میں جو تبرا تھا اسے بھی بدل دیا۔

ابن عبدربہ کتاب عقد الفرید میں کہتے ہیں۔

لمّا مات الحسن بن علی حج معاویۃ فدخل المدینۃ واراد ان یلعن علیا علی منبر رسول الله فقیل له ان هاهنا سعد لا نراه یرضی بهذا افابعث الیه وخذ رأیه

جب امام حسن کا انتقال ہوا تو معاویہ نے حج کیا اور مدینہ آیا اور چاہا کہ ممبر رسول پر جاکر علی ابن ابی طالب پر لعنت کرے۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ سعد مدینہ میں موجود ہیں وہ تمہاری اس حرکت پر راضی نہ ہوں گے پہلے ان سے رائے لے لو۔

مگر سعد نے اس کی مخالفت کی اور امیر کبیر کچھ عرصہ کے لئے خاموش ہوگیا۔

فلمّا مات سعد لعنہ علی المنابر وکتب الی عماله ان یلعنوه علی المنابر

جب سعد مرگئے تو معاویہ نے ممبر پر جاکر تبرا کہا اور اپنے عمال کو بھی لکھ دیا کہ وہ بھی

فضعلوا — ممبروں پر تبرا کہا کریں۔

امیر معاویہ نے جو کلمات خطبہ میں پڑھائے ان کو ابو عثمان حافظ نے کتاب الرد علی الامامیہ میں اس طرح نقل کیا ہے۔

کان یقول فی آخر خطبۃ اللّٰھم ان ابا تراب ملحد فی دینک وصد عن سبیلک فالعنہ لعناً وبیلاً وعذبہ عذاباً الیماً وکتب بذالک الی الآفاق فکانت ھذاہ الکلمات لیشاد بھا علی المنابر الی ایام عمر بن عبد العزیز۔

معاویہ اپنے خطبہ کے آخر میں کہا کرتا تھا کہ اے خدا ابو تراب (معاذ اللہ) ملحد ہو گئے۔ اور تیرے راستے سے منہ پھیر لیا تو ان پر اپنی لعنت و عذاب نازل کر ان ہی فقروں کو دنیا بھر میں لکھ بھیجا اور یہ فقرے خطبہ جمعہ میں عہد عمر ابن عبد العزیز تک ممبروں پر علی الاعلان کہے جاتے تھے۔

اسی کتاب میں علامہ جاحظ نے اس تبرا بازی کی حدیوں دکھائی ہے۔

ان قوماً من بنی امیۃ قالوا المعاویۃ یا امیر المومنین انک قد بلغت ما املت فلو کففت عن ھذا الرجل فقال لا واللّٰہ حتی یربو علیہ الصغیر ویھرم علیہ الکبیر ولا یذکر لہ ذاکر فضلاً

بنی امیہ کے ایک گروہ نے بعد مدت کہا اے معاویہ اب تو جو تیری مراد تھی وہ اس لعنت سے حاصل ہو گئی اب یہ سلسلہ موقوف کر دے تو اچھا ہے معاویہ نے کہا خدا کی قسم کبھی نہیں یہ سلسلہ اس وقت تک رہے گا جب تک بچے اسی آب و ہوا میں جوان اور جوان بوڑھے ہو جائیں یہاں تک کہ علی کی فضیلت کا بیان کرنے والا دنیا میں باقی نہ رہے۔

بہر حال یہ عمل ۴۱ھ سے ۹۹ھ تک تقریباً ساٹھ برس جاری رہا اور بڑے بڑے صحابی عمرو بن عاص گورنر مصر اور مغیرہ بن شعبہ حاکم عراق وغیرہ وغیرہ۔ جناب امیر پر بہ اعلان و اشتہار تبرا کہواتے رہے تاریخ ابو الفدا کے صفحہ ۱۹۶ پر درج ہے۔

وکان معاویۃ وعمالہ یدعون لعثمان فی الخطبۃ یوم الجمعۃ ویسبون علیاً ولما کان المغیرۃ متولی الکوفۃ کان یفعل ذالک لطاعۃ المعاویۃ

معاویہ اور اس کے عمال خطبہ جمعہ میں عثمان کے لئے دعا اور علی پر لعنت کیا کرتے تھے اور چونکہ مغیرہ بن شعبہ معاویہ کی طرف سے کوفہ کا حاکم تھا لہذا وہ معاویہ کی خوشی کے لئے ایسا ہی کرتا تھا۔

ابن اثیر نے تبرے بازی کے متعلق یہ عبارت لکھی ہے۔

ان معاویۃ اذا قنت سب علیاً و ابن عباس والحسن ویعلین و الاشتر۔

معاویہ قنوت میں علی حسن حسین۔ عبداللہ ابن عباس اور مالک اشتر کو گالیاں دیا کرتا تھا۔

اسی طرح تبرا بازی کے متعلق سیکڑوں شہادتیں تاریخوں میں بھری پڑی ہیں۔ حالانکہ حضرت علی مرتضیٰ کو تمام مسلمان رسول اللہ کا جانشین برحق اور خلیفہ راشد سمجھتے ہیں اگر وہ شیعوں کے خلیفہ اول ہیں تو سنیوں کے خلیفہ چہارم اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بنی امیہ کے زمانہ حکومت میں جو تمام اسلامی ممالک کے باشندے تبرا بازی کی بلا میں مبتلا تھے وہ لوگ کون تھے اور ان کو کیا کہنا چاہیئے اس سوال کے جواب کا اہل فہم خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں اسی سلسلہ سے تابعین عبداللہ بن وہب راسی یعنی خوارج کا کوئی تعلق نہیں ان کے معاملہ کی ایک جداگانہ صورت ہے خدا راضی ہو حضرت عمر ابن عبد العزیز سے کہ انہوں نے اس ناپاک بدعت کا انسداد کیا وہ بھی بڑی حکمت اور خوبی کے ساتھ یہ واقعہ تاریخ خمیس جلد دوم صفحہ ۳۱۷ پر اس طرح درج ہے۔

ان عمر امر یھودیاً ان یخطب الیہ ابنتہ فخطبھا الیھودی فقال لہ عمر ویحک کیف تخطب الی وانت یھودی

عمر ابن عبد العزیز نے ایک یہودی کو حکم دیا کہ وہ اپنے لئے میری لڑکی کی خواستگاری کرے چنانچہ یہودی نے ایسا ہی کیا عمر نے کہا

فقال الیھودی فکیف زوج بنیته کفوٗ ابنته من علی ابن ابی طالب فقال عمر ویحک ان علی ابن ابی طالب من عظماء الدین واکابر المسلمین فقال الیھودی فلم تلعنه علی المنابر فاقبل عمر الناس وقال لھم اجیبوہ فلما عجزوا عن الجواب امر بترک اللعن ۔

تجھ پر وائے ہو تو یہودی ہو کر میری بیٹی سے عقد چاہتا ہے۔ یہودی نے کہا کہ جب تمہارے پیغمبر نے اپنی بیٹی علیؑ ابن طالب کو بیاہ دی تو میری اس درخواست میں کیا قباحت ہے عمر نے کہا علی کی ہستی بہت بڑی تھی اور وہ عظمائے دین اور اکابر مسلمین میں سے تھے یہودی نے کہا تو پھر تم لوگ بر سر ممبر ان پر لعنت کیوں کرتے ہو یہ سن کر عمر حاضرین بنی امیہ کی طرف متوجہ ہوا اور کہا اس کا جواب دو یہ جواب سے عاجز ہوئے تو عمر نے احکام نافذ کرئے کہ اب کوئی لعنت نہ کرے۔

المختصر یہ ناشائستہ رسم جس کی بنیاد امیر معاویہ نے ڈالی اور جس کو عمر ابن عبد العزیز نے موقوف کیا اس کا کم و بیش سلسلہ آخر سلطنت بنی امیہ تک رہا کیونکہ علیؑ کے نام لیوا جو شیعہ علیؑ کہلاتے تھے ان کی حالت اس زمانہ میں نہایت کمزوری اور بے کسی کی تھی اور ہمیشہ امویوں اور عباسیوں کے عہد میں تختۂ مشق مظالم رہے اور سوائے صبر اور خاموشی کے کوئی چارہ کار نہ تھا مگر جب ان کو آزادی نصیب ہوئی فاطمی خلافت کی مصر میں بنیاد پڑی یا دیلمی خاندان کو بغداد میں عروج ہوا اس وقت شیعوں نے بطورِ انتقام یہ طریقہ اختیار کیا۔ پھر شیعوں میں اس کا رواج ایسا عام ہوا کہ جو آج تک کم و بیش جاری ہے حالانکہ یہ ان کے پیشوایانِ دین کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے ائمہ اہل بیتؑ نے اس مکروہ فعل سے منع فرمایا ہے۔ خود جناب امیر علیہ السلام سے اس کی شکایت کی گئی اور یہ بھی عرض کیا گیا کہ جواب اور ردِّ عمل کے طور پر ہم کو بھی اجازت دی جائے تو آپ نے سختی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی۔ قانونِ الٰہی قرآن مجید کے پارہ ہفتم سورہ انعام رکوع ۱۲ میں اس ممانعت کی بابت ایک دفعہ موجود ہے۔

لا تسبّوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبّوا اللہ عدواً بغیر علم
پارہ ۷ سورہ انعام رکوع ۱۲

(یہ مشرکین) جن کی اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں ان کو تم برا نہ کہو ورنہ یہ لوگ بھی خدا کو بے سمجھے عداوت سے برا کہہ بیٹھیں گے۔

اسی آیۂ مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے مولوی عمار علی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ بلند آواز سے کہنے کا حکم کسی روایت میں بھی ائمہ معصومین سے نہیں آیا ہے۔ سوائے اس کے موجب ہوا فزونی عداوت اور مانع ہدایت پھر اس کے ساتھ ہی ایک روایت یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت صادق علیہ السلام سے کسی نے عرض کیا کہ ہم ایک شخص کو مسجد میں دیکھتے ہیں کہ وہ آواز بلند تمہارے دشمنوں کو برا کہتا ہے کہ حضرت صادقؑ نے فرمایا کیا ہوا ہے اس ملعون کو کہ ہمارے درپے ہوتا ہے (دیکھو تفسیر عمدۃ البیان مولوی سید عمار علی صاحب مرحوم سونی پتی پارہ سات سورہ انعام جلد اول صفحہ ۲۷۳۔

ان کے علمائے حقیقی بھی روکتے ہیں مگر جہال اور جوشیلے جوانوں کو باوجود کثیر اتلاف جان و مال اس وقت تک اس سنت معاویہ کے اتباع پر اصرار ہے جس کو بجز قومی بدنصیبی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے یہ طریقہ جو شیعوں میں رسماً اور اتفاقاً رواج پا گیا ہے خود شیعوں کے قومی مفاد کے لئے سخت مضر بلکہ مہلک رہا ہے اور رہے گا۔ اس دل آزاری کی بدولت خواہ وہ عمل میں لائی جائے یا نہ لائی جائے شیعہ ایسے بدنام ہو چکے ہیں کہ اہلِ سنت کی بدگمانی گریز اور پرہیز لازمی و فطری امور ہیں اس باہمی کشیدگی اور بدگمانی کی وجہ سے فریقین کے درمیان عزاداری کے متعلق ایک بیّن تفریق پیدا ہو گئی اہل سنت مجالس میں کم شریک ہوتے ہیں۔ فریقین اپنے اپنے تعزیہ علیحدہ علیحدہ مختلف مقامات میں دفن کرتے ہیں اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو اس سے شیعہ مشن کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے کیونکہ در اصل سوادِ اعظم اہلِ سنت میں تعزیہ داری کا رواج شیعوں کی دیکھا دیکھی پیدا ہوا جو شیعوں کی بزرگوں کی عام رواداری اور خلوص و محبت کا نتیجہ تھا اب شیعوں کے اخلاق و ارتباط میں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہے

اسی نسبت سے سنّیوں کی عقیدت و ارادت میں فرق ہوتا جاتا ہے بلکہ بعض لوگوں کو اس کشیدگی کی آڑ میں اچھا حیلہ ہاتھ آگیا وہ اصل تعزیہ داری کو جڑ سے ہی مٹا دینے چاہتے ہیں۔ جس پر عہدِ موجودہ کا تو ہب اور سونے پر سہاگہ کا کام دیا ہے کیا یہ باتیں اور صورتیں اس مشن کے واسطے جس کے قیام کے لئے عزاداری کی سالانہ یادگار کا احیا ضروری سمجھا گیا ہے مہلک اور نقصان رساں نہیں۔

اس رسم کی بنیاد دراصل یہ ہے کہ شیعہ حضرات کہتے ہیں کہ اس غیر مستحق دراندازی سے خلافت اسلام میں رخنہ پڑ گیا اور اس میں بہت سے ایسے ذمائم پیدا ہو گئے۔ جو بصورت دیگر نہ ہوتے۔ مگر یہ ایسے واقعات ہیں جو موجودہ سنّی شیعہ نسلوں کی دسترس سے بالکل بالاتر ہیں وہ کیا ان کے آبا و اجداد کے معتقد دستہائے ما قبل پیدا بھی نہ ہوئی تھیں جب یہ واقعات ظہور میں آچکے تھے جو ہونا تھا ہو چکا تھا مشیت ایزدی بھی یوں ہی تھی وہ فعال لما یرید اور مسبب الاسباب ہے وہ جس کام کو جیسا کرنا چاہتا ہے ویسے ہی اس کے اسباب مہیا کر دیتا ہے اب تیرہ سو برس کے واقعاتِ ماضی کے لئے ہائے ہائے کرنا بے سود اور بے نتیجہ باتیں ہیں ہم اپنی قوم سے باادب عرض کرتے ہیں کہ اگر آپ سلسلۂ خلافت کی پہلی تین ہستیوں کو خلیفۂ رسول تسلیم نہیں کرتے نہ کیجئے اگر آپ کے عقیدے میں ان کا ایک مستحق کی حق تلفی کر کے خود اس منصب پر فائز ہونا غاصبانہ اور ناجائز تھا بہت بہتر یوں ہی سہی اگر وہ دشمن اہل بیت تھے اور آپ ان سے بیزار ہیں تو بیزار رہیئے اگر اہل بیت کی تولا کے ساتھ ان کے دشمنوں سے تبرا لازمی ہے تو اس سے کسی کو انکار نہیں مگر اس تبرا اور بیزاری کو اپنے دل تک رکھئے اور وہ رکیک حرکتیں نہ کیجئے جو آپ کے مذہب کے۔ آپ کے رسوم عزاداری کے حق میں بدنام کن باعثِ نفرت و حقارت اور موجبِ نقصان ہوں۔

اگر بہ زعم حضرات شیعہ اہل سنت اپنے پیش رووں کی تقلید و تائید کرنے

سے غلطی پر ہیں یا جماعت صحابہ کو اہلبیت اطہار پر ترجیح دے کر خاندان رسالت کی شان رفیع کی تنقیص کرتے ہیں یا ان کا دعوائے حب اہل بیت محض زبانی جمع خرچ ہے۔ یا ان کے خیال میں صحابہ کے مقابلہ میں اہل بیت کا درجہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے یا ان کا تمام صحابہ کو ایک ہی حیثیت سے عدول سمجھ لینا واقعات کے خلاف ہے وغیرہ وغیرہ اس لئے وہ صراطِ مستقیم پر نہیں تو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ سنیوں ہی پر کیا منحصر ہے۔ دنیا کی تمام قومیں اسی اصول پر کاربند ہیں کل حزب بما لدیہم فرحون

دنیا کا ہر متنفس اپنے اور صرف اپنے ہی مذہب کو صحیح راستہ اور ذریعہ نجات ابدی باور کرنے پر مجبور و مجبول ہے اپنے مذہب کو کوئی آدمی غلط نہیں کہہ سکتا ورنہ اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہے اور یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ میں غلط راستہ پر ہوں اسی غلطی کے چکر میں پھنسا ہوا ہے اس لئے کوئی بھی ایسا کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا بلکہ جہاں تک فطرت کا تعلق ہے ہر فرد بشر اس پر مجبور ہے کہ وہ اپنے مذہب کو صحیح سمجھے اور اس کے خلاف دنیا بھر کے مذاہب کو غلط خیال کرتا ہے شاذ و نادر ہی ایسی ہستیاں ہیں جو اپنے آبائی مذہب کو تنقید و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں ورنہ سب عالم و جاہل

اَنَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَائِنَا وَاَنَّا عَلٰى آثَارِهِمْ لَمُقْتَدُوْنَ ط

کے اصول پر مصر اور اپنے اجداد و اسلاف کی تقلید و تائید کو غلط یا صحیح حق و صداقت کا پورا مرقع اور حیاتِ ابدی اور نجاتِ آخرت کا حقیقی وسیلہ یقین کرنے پر ایمان لائے ہوئے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان کو اپنے خیال سے نہیں ہٹا سکتی۔ اگر آپ دنیا کے طول و عرض میں کسی شخص سے بھی دریافت کریں گے کہ اس کا مذہب صحیح ہے یا نہیں تو یقیناً اس کو اثبات میں ہی جواب دینا چاہیئے لیکن اگر دنیا بھر کے لوگوں کے مختلف اور منفرد خیالات بیک وقت تسلیم کر لئے جائیں اور کسی ایک کو بھی غلط نہ سمجھا جائے تو یقیناً یہ انسانیت کے خلاف بغاوت کے مرادف ہو گا راستہ مختلف ہوتے ہیں لیکن سب منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتے۔ بلکہ صرف

ایک ہی تعلیم ایسی ہو سکتی ہے جسے حق و صداقت کا راستہ اور نجات دہندہ کہا جا سکتا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ صانعِ مطلق نے تمام کائنات کی بنیاد ہی تخالف تضاد تنوع اور تصنع پر قائم کی ہے اگر وہ چاہتا تو ساری دنیا ایک مسلک اور ایک طریقہ پر ہوتی۔ وہ اپنی آخری آسمانی کتاب میں بکرات و مرات واضح کر چکا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو سب کو امت واحدہ کر دیتے اگر ہماری مرضی ہوتی تو ان میں اختلافات نہ ہوتے۔ ہم جس کو چاہیں ہدایت کریں اور جس کو چاہیں وہ گمراہ ہو جائے۔

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَاحِدَةً وَلٰكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا اٰتٰكُمْ (پارہ ۶ سورۂ مائدہ رکوع ۶)

اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ مگر اس کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہارا امتحان کرے۔

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (پارہ ۷ سورۂ انعام رکوع ۳)

اگر خدا چاہتا تو سب کو راہ راست پر اکٹھا کر دیتا (مگر وہ تو امتحان کرتا ہے) پس تم ہرگز جاہلوں میں شامل نہ ہو جانا۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَا اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ (پارہ ۸ سورۂ انعام آیہ اول رکوع ۱۴)

اگر ہم ان کے مشرکین کے پاس فرشتے بھی نازل کرتے اور ان سے مردے بھی باتیں کرنے لگتے اور تمام چیزیں (جیسے جنت و نار وغیرہ) ان کے سامنے لا کھڑی کرتے تب بھی یہ ایمان نہ لاتے مگر جب اللہ چاہے۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (پارہ ۸ سورۂ انعام رکوع ۱۷)

اے رسول کہہ دو کہ تمہارے پاس خدا تک پہنچانے والی دلیل نہیں اگر (خدا) چاہتا تم سب کو ہدایت کر دیتا۔

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَاءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ (پارہ ۲۵ سورہ حم عسق رکوع اول)

اگر خدا چاہتا تو ان سب (بندوں) کو ایک ہی امت بنا دیتا وہ تو جس کو چاہتا ہے ہدایت کرکے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (پارہ ۱۱ سورہ یونس رکوع ۹)

اے رسول اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں سب ایمان لے آتے کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو تاکہ سب کے سب ایماندار ہو جائیں حالانکہ کسی شخص کو یہ اختیار نہیں کہ بغیر اذن خدا ایمان لے آئے۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ (پارہ ۱۲ سورۂ ہود رکوع ۱۰)

اگر اللہ چاہتا تو بیشک تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ مگر اس نے نہ چاہا اسی وجہ سے) لوگ ہمیشہ آپس میں پھوٹ ڈالا کریں گے۔

کائنات کا کوئی ذرہ اختلاف سے خالی نہیں اور قانونی تنوع ایسا عالمگیر ہے جس سے کوئی بے مستثنیٰ نہیں کی جا سکتی

غنچہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن ٭ اے ذوق اس جہاں کو ہے رنگ اختلاف سے

عالم ثانی العالم کی اور تمام مخلوق کو چھوڑ کر صرف انسان کے چہرے کو ہی لیجئے جو دوسروں کے لئے ذریعہ امتیاز ہے۔ اس میں بھی دو آنکھیں دو کان ایک ناک ایک منہ ہے۔ طول ایک بالشت اور عرض اس کم ہے۔ پھر بھی ایک کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی۔

اس صانع و خالق کی صنعت پر غور فرمائے کہ پیدا ہونے کا اور مرنے کا لا متناہی سلسلہ بڑی تیزی اور سرعت سے جاری ہے لیکن ایک نقش دوسرے نقش سے نہیں ملتا۔ انسانی چہرہ تو پھر بھی بڑی چیز ہے ہاتھ کے ایک انگوٹھے پر ہی خیال کیجئے چند ٹیڑھی بانکی لکیریں ہیں لیکن لاکھوں آدمیوں کے انگوٹھے کے نشانات دیکھ لیجئے ان میں ضرور اختلاف اور فرق پایا جاتا ہے ایک ہی ماں باپ کی کئی اولادیں ہوتی ہیں ایک ہی ظرف سے ایک شے دوسری ظرف میں منتقل ہوتی ہے ایک ہی سانچہ میں ان کے چہرے ہاتھ پاؤں اور تمام جسم کی تشکیل و تکمیل کے مدارج طے ہوتے ہیں با این ہمہ یگانگت صورت سیرت رفتار و

گفتار علم و عقل تقدیر و تدبیر سب ایک دوسرے سے بیگانہ جب خالق کائنات اور قادر مطلق کی منشا اور مرضی یہی ہے اور اس کی صناعی اور قدرت کی گوناگوں اور لاتعد ولاتحصےٰ نیرنگیوں کا اظہار ہی اشتقاق افتراق اور اختلاف پر منحصر ہے تو مذہب کو بھی اس شق سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ایسی حالت میں کسی کو کیا حق ہے کہ دوسرے مذہب پر حملہ کر کے دل آزاری کرے یا یہ سودائے خام اس کے دماغ پر اپنا تسلط جمالے کہ ساری دنیا میری ہمخیال اور ہم مشرب ہو جائے ناممکن اور سراسر ناممکن۔ ع

این خیال است و محال است و جنوں

بڑے بڑے انبیاء و اولیاء مصلحین و مجددین الیسی کوششیں نہ کر سکے اور ان کا سلسلۂ تبلیغ و اصلاح ایک خاص ملک یا قوم تک محدود رہا اور اگر دوسرے ملکوں اور قوموں میں اشاعت بھی ہوئی تو تمام نسلِ انسانی کو اپنے حلقۂ اثر میں نہ لا سکے تو اب زید و بکر کا خیال کہ سب ایک مرکز پر آ جائیں قانون قدرت سے جنگ کرنا ہی یا نہیں۔

بندہ کو عبث دعوئے یکتائی ہے ؏ اللہ یہ اتفاق کل کا نہ ہوا

جو شخص جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اور آنکھیں کھول کر اپنے ماں باپ اور دوسرے سرپرستوں کو جو مذہبی رسوم ادا کرتے دیکھتا اور جس سوسائٹی میں نشوونما کے درجے طے کرتا ہے وہ اس کے قلب و دماغ پر ایسے چھا جاتے ہیں کہ گویا وہ اس کی فطرتِ ثانیہ ہیں کوئی شخص اپنے اختیار سے کسی گھر میں نہیں اترتا ایک مسلمان صرف اس وجہ سے مسلمان ہے کہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہے ایک شیعہ یا سنی محض اس سبب سے شیعہ یا سنی ہے کہ اس کی ولادت شیعہ یا سنی کے گھر میں ہوئی ہے حقیقت نفس الامری یہی ہے کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ اِلَّا اَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ وَیُنَصِّرَانِهٖ وَیُمَجِّسَانِهٖ ہر بچہ خالص فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے ماں باپ اس کو یہودی نصرانی اور مجوسی بنا لیتے ہیں اگر دو مختلف المذہب کے نومولود بچوں کو باہم بدل لیا جائے تو بچہ باوجودیکہ دوسرے مذہب والے کے

گھر میں پیدا ہوا تھا مگر دوسرے مذہب کے جس ماحول میں پرورش پائے گا اس کا پابند ہو گا اپنے اصلی باپ کے مذہب کو ہمیشہ حقارت و تعصب کی نظر سے دیکھے گا۔ عیسائی ہو یا موسائی ہندو ہو یا بدھ سب تقلیدِ آبائی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ تحقیق و تفتیش سے کوئی غرض نہیں۔

بے جانچے کوئی چیز خرد و نہیں لیتے ؏ جب تک بہو سو چیزوں سے بہتر نہیں لیتے
ہانڈی کو بھی سب ٹھوک بجا لیتے ہیں ؏ مذہب کو مگر ٹھوک بجا کر نہیں لیتے

اگر خود ان کے مذہب کی کمزوریاں دکھائی جائیں تو طرح طرح کی تاویلیں کرنے پر آمادہ ہیں مگر دوسرے مذہب میں اگر خوبیاں بھی ہیں تو عیب نظر آتی ہیں اس لئے یہ فیصلہ کرنا کہ زید ایسا اور بکر ویسا بے سود و بے نتیجہ ہے۔ پچھلے واقعات اچھے ہوں یا بُرے گزر چکے ان کے نتائج و اثرات مفید ہوں یا مضر داستانِ پارینہ بن چکے اب ان کو دُہرانا نکتہ چینیاں کرنا سب و شتم عمل میں لانا یا ان کے مناقب کی طومار بندی و قصیدہ خوانی کو کیا فائدہ رساں ہو سکتی ہے جن لوگوں نے نیکیاں یا برائیاں کیں ان کی جزا و سزا خدا کے ہاتھ ہے ہماری تحسین و نفرین نہ ان کو فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان اگر یہ تبرا بازی ردِ عمل کے طور پر صرف معاویہ یزید مروان عبدالملک اور ان کے اعوان و اتباع تک ہی محدود رہتی تب بھی شاید عام مسلمانوں پر اس کا بُرا اثر نہ پڑتا مگر وہ تو ضرورت سے زیادہ متجاوز ہو گئی صرف زبانی تبرہ بازی پر ہی منحصر نہیں شیعہ طبقہ کی عام تالیفات تصنیفات رسالہ جات اخبارات جو مذہبیات سے کچھ بھی تعلق رکھتے ہوں ان سب میں شانِ مناظرہ کی تلخی مشترک ہے گویا میدانِ صحافت میں شیعہ اہل قلم کو اور کوئی موضوع ہی نہیں ملتا۔ بہت سی دینی کتابوں پر آپ یہ الفاظ لکھے ہوئے پائیں گے "کوئی صاحب اہل سنت و جماعت اس کو ملاحظہ نہ فرمائیں" گویا ایسی کتابوں کے مؤلفین کی رائے میں مذہب شیعہ ایک ایسا مذہب ہے جس کی مزید اشاعت کی ضرورت ہی نہیں ان کی تحریرات کو

صرف وہ لوگ دیکھ سکتے ہیں جو پہلے سے شیعہ ہیں دوسرے عقیدے کے لوگوں کے لئے وہ اس درجہ دل آزار ہیں کہ ان کے مطالعہ کی ممانعت ان کی پیشانی پر بحروف جلی ثبت ہے۔ اس قسم کی ممنوعہ کتابیں آپ کو شاید ہی دنیا کے کسی اور مذہب میں دستیاب ہو سکیں۔ مجالس عزا تو اب اچھی خاصی محافل مناظرہ ہو ہی گئی ہیں خلاصہ یہ کہ تحریر تقریر قول و فعل ہر بات میں دل آزاری کا کوئی نہ کوئی پہلو نظر آتا ہے شیعہ عالم شیعہ مقرر شیعہ مبلغ شیعہ مصنف جب الجھیں گے تو سنیوں سے دوسرے مذاہب میں اپنی مذہب کی جیسے حقہ اور ناجیہ کہتے ہیں تبلیغ و اشاعت سے کوئی واسطہ نہیں افسوس ؎

سِرّ پنہاں کے شود بر تو جلی ؎ تو گرفتار ابابکر و علیؑ

ائمہ اہل بیت نے مجالس عزا کے قیام کا حکم ایک تبلیغی مشن کی حیثیت سے دیا ہے۔ اس میں فضائل و مصائب کو مناظرہ کی شان سے بیان کرنا قطعاً منشائے ائمہ معصومین سے روگردانی کرنا ہے تبلیغ دل آزاری طعن و تشنیع درشت بیانی اور سب و شتم سے نہیں ہوتی بلکہ نرمی شیریں زبانی ملاطفت رواداری تہذیب اور احترام باعث کامیابی ہو سکتے ہیں۔ خدائے جبار و قہار جب فرعون کی تنبیہ و تلقین کے لئے ایک نہیں بلکہ دو پیغمبروں کو بھیجتا ہے تو حکم دیتا ہے۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (پارہ ۱۶ سورۂ طٰہٰ رکوع اول) (فرعون سے جا کر) نرمی سے باتیں کرو تاکہ وہ نصیحت مان لے یا ڈر جائے۔

اسلام کی آسمانی کتاب کسی مذہب کے بزرگوں کو خواہ وہ کیسے ہی ہوں برا کہنے کی اجازت نہیں دیتی مذہبی احکام سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو عقلاً اور اخلاقاً بھی کوئی ضمیر دوسرے کی توہین کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ فریقین سنی و شیعہ کے درمیان نزاعی و اختلافی مسئلہ صرف خلافت کا ہے ورنہ دونوں اسلام کے ایک ہی جھنڈے کے نیچے ہیں دونوں کا خدا ایک رسول ایک کتاب ایک قبلہ ایک اسی طرح نماز روزہ

حج، زکوٰۃ قیامت، جنت دوزخ۔ صراط۔ میزان وغیرہم عقائد و مسائل کے دونوں یکساں قائل ما بہ النزاع صرف مسئلہ خلافت سمجھا جاتا ہے شیعوں کے اعتقاد میں خلافت رسول جیسے خلافت الٰہیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ صرف خاندانِ رسالت کے بارہ افراد تک محدود ہے سنیوں کے خیال میں حضرت ابوبکر صدیق سے عبدالمجید خاں دوم معزول سلطان ترکی تک جن کی مجموعی تعداد بہتر الوے ہوتی ہے۔ سب امیر المومنین و خلیفۃ المسلمین ہیں سنی سوائے حضرت علی مرتضیٰ کے ائمہ اہل بیت میں سے کسی کو خلیفہ رسول نہیں مانتے اور حضرت حسن مجتبیٰ کی خلافت کو صرف چھ مہینے۔ شیعہ سنیوں کے سارے سلسلۂ خلافت سے منکر ہیں۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ خلیفۂ رسول کے واسطے حکومت و سلطنت کی ضرورت نہیں۔ عام مسلمان اس کو مانیں یا نہ مانیں مگر اس کی خلافت حقہ برقرار رہے گی رسول اللہ کی خلافت ان کی نیابت ہے نائب میں بھی ان اوصاف کی ضرورت ہے جو منیب میں ہوں یعنی عصمت عبادت ریاضت طہارت زہد و تقویٰ علم وغیرہ وغیرہ مطلب یہ کہ وہ علمی اور عملی اوصاف میں آنحضرتؐ کا نمونہ ہوا۔ اہل سنت کے اعتقاد میں خلیفۂ رسول کے لئے ان اوصاف کا ہونا لازمی نہیں۔ البتہ غلبہ اور تسلط فی الارض ضروری ہے۔ سنی اگرچہ ائمہ اہل بیت کی خلافت کے قائل نہیں تاہم ان کا احترام کرتے ہیں۔ شیعہ بھی سنیوں کے خلفاء کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ ان کا احترام کیونکہ ان کو ملوک و سلاطین سے زیادہ نہیں سمجھتے خیر یہاں تک تو مضائقہ نہ تھا۔ نہ سنیوں کی دل آزاری تھی نہ ان کو وجہ شکایت مگر ان لوگوں نے تو وہ طریقہ اختیار کر لیا جو ان کے مذہب کے مصفا دامن کو بھی داغدار بنانے کی حد تک پہونچ گیا اور دشمنانِ خدا و رسول اور مخالفانِ اہل بیت سے اتنی کاوش نہیں جتنی خلفائے ثلاثہ سے جن کو مسلمانوں کا سواد اعظم رسول اللہ کے بعد تمام دنیا سے افضل و اشرف سمجھتا ہے اپنی اس غیر دانشمندانہ حرکت کی بدولت یہ لوگ ہمیشہ مغلوب و مقہور رہے۔ سیاسی و مذہبی نقصان اٹھائے طرح طرح کی تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلیں بلکہ اب تک بھی وہ طرح طرح کے خساروں میں مبتلا اور دوسروں

کی نظر میں حقیر و قابل نفرت ہی ہیں تاہم اپنی ضد پر جمے ہوئے ہیں اور خود کو مومن کہتے اور سمجھتے ہیں مگر یہ خبر نہیں کہ مومنین کی جو خاص صفات قرآن مجید میں بیان فرمائی گئی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے۔

هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ - وہ (یعنی مومن لوگ) بیہودہ باتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔

افسوس ہے کہ اس قوم میں قدامت پرستی اس درجہ سرایت کر گئی ہے کہ کسی قسم کی آزاد خیالی گناہِ کبیرہ کا مرادف ہو گئی ہے اگر کوئی شخص آزادانہ طریق پر بلا خوف لومۃ لائم ان خلافِ عقل و نقل حرکتوں کی طرف توجہ دلائے تو الٹا مورد الزام و ہدفِ ملامت بنے بلکہ بہت ممکن ہے کہ خارجی یا کافر قرار دیدیا جائے۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ اس قوم کو اپنے نقائص کا احساس باقی نہیں رہا کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اس طبقہ کے لوگ اس مسئلہ پر غور کریں اور ٹھنڈے دل سے غور کریں اس عمل کے حسن و قبح پر گہری اور سنجیدہ نظر ڈالیں اور امام مظلوم کی عزا داری کے مصفا دامن کو اس گندگی سے پاک کر دیں پھر اس کے نتیجے خود دیکھ لیں گے کہ یہ تبلیغی مشن کس قدر کامیاب ہوتا ہے ہم اپنے قومی اور مذہبی بھائیوں سے ادب کے ساتھ مکرر التجا کرتے ہیں کہ انصاف اور صداقت کو پیش نظر رکھتے ہی ضمیر کو رہنما بنائیں اور اس مذموم و مضر رواج کے رطب و یابس اور حسن و قبح کو جانچیں ایسا ہو تو یقین ہے کہ ہماری اس طولانی بکواس کی معقولیت و نامعقولیت کا اندازہ خود ہو جائے گا۔ زمانہ کی رفتار کو دیکھتے ہوئے بہت ممکن ہے کہ کسی آئندہ وقت میں شیعوں کی اس رسم کو جسے وہ اپنا مذہبی فریضہ اور حق سمجھتے ہیں دوسروں کے لئے مذہبی توہین اور باعثِ دل آزاری بلکہ موجب نقصِ امن قرار دیکر جبراً و حکماً رد کیا جائے، کیا اچھا ہو کہ یہ لوگ خود ہی اس ردیّہ کو ترک کرکے رواداری کی ایک یادگار مثال قائم کر دیں۔

ہم نے جو اوپر عرض کیا اس کے ایک اور پہلو پر بھی نظر ڈالنا اور اسے روشنی میں لانا

ضروری ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اہل سنت کا خیال ہے کہ صرف تبرا ہی نہیں بلکہ دشنام دہی تک کو شیعہ جزو مذہب سمجھتے ہیں چنانچہ اکثر حضرات کو یہ شعر پڑھتے سنا ہے۔

دشنام بہ مذہبے کہ جائز باشد ٭ مذہب معلوم و قدرِ مذہب معلوم

لیکن جن صاحبوں کا ایسا خیال ہے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں ناشائستہ و نامہذب الفاظ زبان پر لانا شیعہ مذہب میں اسی طرح معیوب و ممنوع ہے جس طرح دوسرے مہذب مذاہب میں۔ شیعوں نے سنتِ معاویہ کے جواب میں صرف لفظ لعنت کو جائز رکھا تھا وہ بھی فقط دشمنان اہل بیت کے لئے لفظ لعنت کو گالی یا دشنام کا مرادف سمجھ لینا محض سمجھ کی بات ہے لفظ لعنت اور بات ہے اور گالی یا دشنام اور چیز ہے آخری آسمانی کتاب (قرآن مجید) جو تہذیب اخلاق اور قولی و فعلی تمام بیہودگیوں سے اجتناب کی تعلیم کو نازل ہوئی ہے۔ اس کی نسبت مسلمان تو کیا کوئی غیر مسلم بھی نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس میں گالیاں بھری ہوئی ہیں۔ حالانکہ خدائے قدوس نے اپنے رسول خاتم الانبیا کو تبرے کا حکم دیا ہے دوسرے انبیا بھی اپنی امتوں کے مشرکین اور ان کے اعمال سے تبرا کرتے رہے ہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ مکتبِ لعن کا مدرس اول اور مدرسہ تبرا کا معلم مقدم خود جنابِ احدیت ہے کیونکہ سب سے پہلے اسی نے شیطان پر لعنت کی ابتدا فرمائی وہ بھی ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں قرآنی شہادت ہی غور کرنے والے کے لئے کافی ہیں اس لئے ان احادیث نبوی کو جن میں آنحضرتؐ نے لفظ لعنت کو استعمال فرمایا ہے۔ پیش کرنے کی ضرورت نہیں البتہ صرف ایک موقعہ صحیح بخاری کا دکھایا جاتا ہے۔

قال سالم عن ابیہ انہ سمع رسول اللہ اذا رفع راسہ عن الرکوع من رکعۃ الاخر من الفجر یقول اللّٰھم العن فلانا و فلانا و فلانا	سالم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول خدا کو سنا کہ جب آپ نماز صبح کی آخری رکعت کے رکوع سے سر اٹھاتے تو فرماتے اے خدا فلاں فلاں فلاں پر لعنت کر

دیکھو صحیح بخاری پارۂ سولہ صفحہ ۵۴ مطبوعہ دہلی۔

ایسے مکروہ یا ناشائستہ اور خلاف تہذیب الفاظ جنکو عرف عام میں گالی یا دشنام سے تعبیر کیا جاسکے یہ کہا جاتا ہے کہ کسی مذہب میں بھی جائز نہیں ہوسکتے مذہب کا کام تعلیم تہذیب ہے نہ کہ تلقین بد تہذیبی اور یہ تو ایسا مسئلہ ہے کہ مذہب سے قطع نظر اس کا تعلق عقل انسانیت اور ضمیر کے وجدان صحیح سے ہے دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کی زبان پر ایسے الفاظ کبھی نہ کبھی نہ آجاتے ہوں لاکھوں اہل سنت جہلا ایسے ہیں کہ فحش گوئی اور دشنام دہی ان کی عادت میں داخل اور روزمرہ کی گفتگو میں شامل ہیں تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذہب اہل سنت میں گالیاں جائز ہیں۔ لاکھوں مسلمان شراب خواری زناکاری۔ قماربازی وغیرہ وغیرہ محرمات کے مرتکب ہوتے ہیں تو کیا یہ سمجھ لینا چاہئیے کہ اسلام نے ان کے جواز کا فتوی دیدیا ہے اگر کوئی شخص قولاً و فعلاً ناشائستگی کی حد تک پہونچ جائے تو یہ اس کا ذاتی فعل ہوگا اس کی ذمہ داری اسی کے سر ہے نفس مذہب اس کا جواب دہ نہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا قرآن مجید میں بار بار لعنت کا اعادہ کیا گیا ہے ملاحظہ ہوں آیات مندرجہ ذیل

سب سے اول خود خدائے عز اسمہ ابلیس پر لعنت فرماتا ہے۔

فاخرج منها فانك رجيم وان عليك اللعنة الى يوم الدين (سورۂ حجر رکوع ۳۔ آیت پارہ ۱۴)

تو بہشت سے نکل جا (دور ہو) بے شک تو مردود ہے اور یقیناً تجھ پر لعنت (پھٹکار) قیامت کے دن تک رہے گی۔

اسی طرح سورہ صٓ میں اسی موقعہ کا ذکر کرتے ہوئے شیطان پر لعنت فرمائی گئی ہے۔

رسول اللہ کو تبرے (بیزاری) کا حکم ہوتا ہے۔

قل انما هو اله واحد واننی بریٓء مما تشرکون (سورۂ انعام پارہ ۷ رکوع ۲)

(اے رسول مشرکین سے کہدو بے شک وہ اللہ واحد ہے اور میں ان سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کا شریک بناتے ہو۔

وان کذبوك فقل لی عملی ولکم اعمالکم انتم بریئون مما اعمل وانا بریٓء مما تعملون (پارۂ ۱۱۔ سورۂ یونس رکوع ۴)

اور اگر وہ (کفار) تم کو جھٹلائیں تو تم کہدو کہ میرے عمل میرے لئے ہیں۔ اور تمہارے عمل تمہارے لئے اور تم جو کچھ کرتے اس سے میں بری (بیزار) ہوں۔

حضرت ابراہیم ستاروں کو دیکھ کر فرماتے ہیں۔

یقوم انی بریٓء مما تشرکون۔ (پارہ ۷ سورۂ انعام رکوع ۸)

اے میری قوم جن جن چیزوں کو تم خدا کا شریک بناتے ہو میں ان سے بیزار ہوں

حضرت ابراہیم نے اپنے چچا سے تبرا کیا۔

فلما تبین له انه عدو لله تبرا منه (پارہ ۷ سورۂ انعام)

جب ابراہیم پر ظاہر ہوگیا کہ وہ (اُن کا چچا) خدا کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے تبرا کیا۔

حضرت ہود اپنی قوم سے فرماتے ہیں۔

انی اشهد الله واشهدوا انی بریٓء مما تشرکون (پارۂ ۱۲ سورۂ ہود رکوع ۵)

بے شک میں خدا کو گواہ کرتا ہوں۔ تم بھی گواہ رہو کہ تم دوسروں کو جو خدا کا شریک بناتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔

ولکن لعنهم الله بکفرهم فلا یومنون الا قلیلا (پارۂ ۸ سورۂ نون رکوع ۴)

خدا نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے لعنت کی ہے اس لئے ان میں سے تھوڑے سے ایمان لائیں گے۔

اولئك الذین لعنهم الله ومن یلعن الله فلن تجد له نصیرا (ایضاً رکوع ۷)

یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور جس پر خدا نے لعنت کی ہے اس کا مددگار کسی کو نہ پاؤگے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (پارہ ۱۸ سورۂ نور رکوع ۲)

جو لوگ پاک دامن بے خبر اور ایمان والی عورتوں کو (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں خدا کی لعنت ہے۔ ان پر بڑا سخت عذاب ہوگا۔

اسی سورت کے پہلے رکوع میں ہے۔

وَالْخَامِسَۃُ اَنَّ لَعْنَۃَ اللّٰہِ عَلَیْہِ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ

پانچویں بار یوں کہے گا کہ اگر وہ جھوٹ بولتا ہوگا تو اس پر خدا کی لعنت ہے۔

فَلَمَّا جَآءَھُمْ مَّا عَرَفُوْا کَفَرُوْا بِہٖ فَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (پارہ ۱ سورۂ بقر رکوع ۱۰)

جب ان کے پاس وہ چیز جسے وہ پہچانتے تھے آگئی تو انکار کرنے لگے بس کافروں پر خدا کی لعنت ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ (پارہ ۲ سورۂ بقر رکوع ۲)

بے شک جو لوگ ہماری ان روشن دلیلوں اور ہدایتوں کو جن کو ہم نے نازل کیا اس کے بعد چھپاتے ہیں جب کہ ہم کتاب (توریت) میں لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کر چکے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ (پارہ ۲ سورۂ بقر رکوع ۱۹)

بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کفر کی حالت میں مر بھی گئے ان ہی پر خدا کے فرشتوں کی اور تمام آدمیوں کی لعنت ہے وہ ہمیشہ اسی پھٹکار میں رہیں گے نہ ان کے عذاب میں کمی ہوگی اور نہ ان کو

عذاب سے مہلت دی جائے گی

یَقُوْلُ الْاَشْھَادُ ھٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ کَذَبُوْا عَلٰی رَبِّھِمْ اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ (پارہ ۱۲ سورۂ ہود رکوع ۲)

اور گواہ لوگ اظہار کریں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر بہتان باندھا۔ سن رکھو کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔

اسی سورۃ کے رکوع ۵ میں خدا قوم عاد کی بابت فرماتا ہے۔

وَاُتْبِعُوْا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا لَعْنَۃً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔

اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی ہے اور قیامت کے روز بھی۔

سورۂ قصص میں فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دینے کے بعد فرماتا ہے۔

وَاَتْبَعْنٰھُمْ فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا لَعْنَۃً وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ھُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ (پارہ ۲۰ سورۂ قصص رکوع ۴)

اور ہم نے دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی ہے اور قیامت کے دن ان کے چہرے بگاڑ دیئے جائیں گے۔

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ الظّٰلِمِیْنَ مَعْذِرَتُھُمْ وَلَھُمُ اللَّعْنَۃُ وَلَھُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (پارہ ۲۴ سورۂ مومن رکوع ۶)

جس دن ظالموں کو ان کی معذرت کچھ نفع نہ دیگی اور ان پر پھٹکار برستی ہوگی اور ان کے لئے بہت برا گھر جہنم ہے

وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَھَنَّمُ خٰلِدًا فِیْھَا وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَلَعَنَہٗ وَاَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا (پارہ ۵ سورۂ نساء رکوع ۱۲)

اور جو شخص کسی مومن کو دانستہ مار ڈالے تو اس کی سزا دوزخ ہے وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور خدا نے اس پر اپنا غضب نازل کیا ہے اور اس پر لعنت کی ہے اور اس کے لئے بڑا سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ

بے شک جو لوگ خدا کو اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر خدا نے دنیا

وَاَعَدَّ لَھُمْ عَذَابًا مُّھِیْنًا۔ (پارہ ۲۲۔ سورۂ احزاب رکوع ۷)	اور آخرت میں لعنت کی ہے اور ان کے لئے رسوائی کا عذاب تیار کر رکھا ہے
فَھَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَکُمْ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَھُمُ اللہُ فَاَصَمَّھُمْ وَاَعْمٰٓی اَبْصَارَھُمْ (پارہ ۲۶۔ سورۂ محمد۔ رکوع ۲)	(منافقو) کیا تم سے کچھ دور ہے کہ اگر تم حاکم ہو تو روئے زمین میں فساد پھیلانے اور اپنے رشتہ ناتے توڑنے لگو یہ وہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور ان کے کانوں کو بہرا اور آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔

ان مذکورہ بالا آیات کے علاوہ اور بھی کئی جگہ قرآن مجید میں لفظ لعنت آیا ہے۔

توریت میں بھی لفظ لعنت متعدد مقامات پر آیا ہے بالخصوص کتاب استثناء میں درس ۱۵ تا ۲۶ تک بکرات و مرات اس لفظ کا اعادہ کیا گیا ہے اس لئے اصل عبارت بجنسہ نقل کی جاتی ہے۔

"پھر موسیٰ اور لاوی کاہنوں نے سارے اسرائیل سے کہا کہ اے اسرائیل ہوشیار ہو! اور سُن لے کہ تو آج کے دن خداوند اپنے خدا کا گروہ ہوا سو تو خداوند اپنے خدا کی آواز پر کان لگا اس کی شرعوں اور حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ پر جتاتا ہوں عمل کر اور موسیٰ نے اسی دن جماعت کو تاکید کر کے کہا کہ جب جرزیم کے پہاڑ پر کھڑی رہیں اور جب جماعت یردن پار اترے تو اسے برکت سنا دیں یعنی شمعون اور لاوی اور یہودا اور اشکار اور یوسف اور بنیمین اور ان کے مقابل یہ لینے روبن اور جد اور آشر اور زبلون اور دان اور نفتالی عیبال کے پہاڑ پر کھڑے ہو کر لعنت سنا دیں اور بنی لاوی مخاطب ہو کر بنی اسرائیل کے سارے مردوں کو بلند آواز سے کہیں کہ اس شخص پر جو اپنے ہاتھوں کی کاریگری سے کھود کے یا ڈھال کے بت بنائے جس سے خداوند کو نفرت ہے اور اسے پوشیدہ مکان میں

رکھے لعنت ہے تب ساری جماعت جواب دیکے کہے آمین۔ جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں کو حقیر جانے اس پر لعنت اور سب جماعت کہے آمین۔ جو کوئی اپنے ہمسائے کی سرحد کو سرکا دے اس پر لعنت اور سب جماعت کہے آمین۔ وہ جو اندھے کو راہ سے بہکا دے اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین جو پردیسی یا یتیم یا بیوہ کے مقدمہ کو بگاڑے اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین جو اپنے باپ کی جورو کے ساتھ ہم بستر ہو اس پر لعنت کیونکہ اس نے اپنے باپ کا دامن اُگھاڑا سب جماعت کہے آمین جو کوئی کسی قسم کے چارپائے کے ساتھ جماع کرے اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین۔ جو کوئی اپنی بہن کے ساتھ جو اپنی ماں کی بیٹی یا اپنے باپ کی بیٹی ہو ہم بستر ہووے اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین۔ جو کوئی اپنی ساس کے ہم بستر ہو اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین۔ جو کوئی اپنے ہمسائے کو چھپ کر مارے۔ اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین۔ جو کوئی رشوت لے تاکہ کسی بے گناہ کو قتل کرے۔ اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین جو کوئی اس شریعت کی سب باتوں پر قائم نہ رہے نہ ان پر عمل کرے اس پر لعنت سب جماعت کہے۔ آمین۔

(دیکھو توریت مقدس موسیٰ کی پانچویں کتاب مسمی بہ استثناء باب ۲۸۔ از درس (آیت) ۹ تا ۲۶ مطبوعہ امریکن مشن پریس لدھیانہ ۱۸۸۳ء صفحہ ۲۲۷ و ۲۲۸)

پھر اسی کتاب کے اس حصہ کو دیکھو جو موسیٰ کی چوتھی کتاب مسمی بہ گنتی (اعداد) کہلاتا ہے اس میں بار بار لفظ لعنت کو دہرایا گیا ہے۔

"پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا بنی اسرائیل کو حکم کر اور کہہ کہ اگر کسی کی جورو گمراہ ہو جائے اور اس سے بے وفائی کرے اور کوئی اس عورت کے ساتھ ہم بستر ہووے اور یہ اس کے شوہر سے پوشیدہ ہو اور پردے کی

بات رہے اور وہ ناپاک ہو جائے اور اس پر گواہ نہ ہو دے اور فعل کرتے ہوئے پکڑی نہ جاوے اور اس کے شوہر کے دل میں غیرت کا خیال آوے اور وہ اپنی جورو سے غیرت کھاوے اور وہ ناپاک ہو تو چاہیئے کہ وہ شخص اپنی جورو کو کاہن کے پاس حاضر کرے اور اس عورت کے لئے ایک ایفہ جَو کے آٹے کا دسواں حصّہ قربانی کے لئے لائے اور وہ اس پر تیل اور لوبان ڈالے کیونکہ وہ غیرت کا ہدیہ یعنی یادگاری کا ہدیہ ہے کہ گناہ کو یاد دلائے تب کاہن اس عورت کو نزدیک لاوے اور خداوند کے حضور اسے کھڑا کرے اور کاہن مٹی کے ایک باسن میں مقدس پانی لیوے اور مسکن کے فرش کی گرد لے کے اس پانی میں ملاوے پھر کاہن اس عورت کو خداوند کے حضور کھڑا کرے۔ اور اس کا سر ننگا کرے اور یادگاری کا ہدیہ اس کے ہاتھوں پر رکھے کہ یہ غیرت کا ہدیہ ہے اور کاہن اس کڑوے پانی کو جو لعنت کا باعث ہے اپنے ہاتھ میں لیوے اور اس عورت کو قسم دے کے کہے کہ اگر کوئی مرد تیرا ہم بستر نہیں ہوا اور تو اپنے شوہر کو چھوڑ کر دوسرے کے ساتھ ناپاک نہیں ہوئی تو تو اس کڑوے پانی کی تاثیر سے جو لعنت کا باعث ہے بچی رہ اور اگر تو اپنے شوہر کے سوا دوسرے پر مائل ہوئی ہے اور ناپاک ہوئی اور تیرے شوہر کے سوا کوئی دوسرا تجھ سے ہم بستر ہوا ہے تب کاہن اُس عورت سے کہے کہ خداوند تجھے ضرب المثل لعنت اور قسم کا کرے کہ خداوند تیری ران کو سڑاوے اور تیرے پیٹ کو سُجاوے اور یہ پانی جو لعنت کا سبب ہے تیری انتڑیوں میں جا کر تیرا پیٹ پُھلا دے اور تیری ران سڑا دے۔ ہر عورت آمین آمین کہے اور پھر کاہن ان لعنتوں کو ایک کتاب میں لکھے اور کڑوے پانی سے اُسے مٹا دے اور کاہن یہ کڑوا پانی جو لعنت کا سبب ہے

اس عورت کو پلاوے تب یہ پانی جو لعنت کا سبب ہے کڑوا کرنے کے لئے اس عورت کے جسم میں داخل ہوگا پھر کاہن اس عورت کے ہاتھ سے غیرت کا ہدیہ لے کے خداوند کے حضور میں عورت کو ہلاوے اور اس کو مذبح کے قریب لائے اور اس ہدیہ سے جو یادگاری کے لئے ہے ایک مٹھی لے کے کاہن مذبح پر جلاوے بعد اس کے وہ پانی اس عورت کو پلاوے اور جب وہ اسے یہ پانی پلاوے گا تب ایسا ہوگا کہ اگر وہ گنہگار ہوگی اور اس نے اپنے شوہر کے برخلاف خطا کی ہوگی تو وہ پانی جو لعنت کا سبب ہے اس کے جسم میں داخل ہو کر کڑوا ہو جائے گا اور اس کا پیٹ پھولے گا اور اس کی ران سڑ جائے گی اور وہ عورت اپنی قوم میں ملعون ہوگی۔ (دیکھو بائیبل مقدس کی کتاب اعداد باب ۵ از درس گیارہ تا درس ۲۸ صفحہ ۱۷۷ و ۱۷۸)

اگر یہ کہا جائے کہ لفظ لعنت عربی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو احکام نازل ہوئے وہ عبری زبان میں تھے تو ظاہر ہے کہ وہ عربی لفظ لعنت کا مرادف ہوگا جس کا ترجمہ لفظ لعنت کیا گیا ہے یہ اردو بائیبلیں جو زبانس عبری انگریزی عربی وغیرہ زبانوں سے مسیحی پادریوں ہے مسیحی پادریوں اور مشنریوں نے اپنے ہی پریسوں میں طبع کرائی ہیں اُن سب میں لفظ لعنت درج ہے سب سے اول خالقِ کائنات نے ہی اس کی ابتدا کی اور اپنی آسمانی کتابوں میں بسلسلہ احکام بار بار اس کا اعادہ فرمایا اگر لفظ لعنت گالی ہے تو کیا ایسے خدا کی نسبت اس کا منکر یہ خیال نہیں کر سکتا۔

دشنام بخالستے کہ عادت باشد ؎ خالق معلوم و قدر خالق معلوم

بہر حال جن اہلِ سنت حضرات کا یہ خیال ہو کہ گالیاں شیعہ مذہب میں جائز ہیں وہ بھی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں لعنت کا جواز شیعوں میں بھی اسی قدر اور اسی طرح ہے جس طرح سنیوں یا دوسرے مذاہب کے لوگوں میں اگر کوئی اس سے تجاوز کر کے بدزبانی پر اُتر

آئے یا فعلاً کسی ناشائستہ حرکت کا مرتکب ہو تو نفس مذہب (خواہ کوئی مذہب ہو) اس کا ذمہ دار نہیں۔

بعض شیعہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ہم دشمنان اہل بیت سے بالجہر (یعنی باعلان) اظہار بیزاری کرتے ہیں تو ہمیں استثنائی صورت حاصل ہے چونکہ ہمارے پیشوا اور ہم ہمیشہ مظلوم رہے ہیں اہل بیت رسول خدا پر اکابر و خلفائے اہل سنت کی طرف سے قرنہا قرن تک بالجہر ممبروں پر اور مجلسوں میں تبرا ہوتا رہا ہے۔ مدارس میں اس کی تعلیم دی جاتی رہی ہے اگر ہم بھی اسی سنت اہل سنت پر عمل کرتے ہوئے ایسا ہی کریں تو ہمیں اس کا حق حاصل ہے بلکہ قرآن مجید بھی ہم کو صاف اور صریح الفاظ میں اس کی اجازت دیتا ہے۔

چنانچہ چھٹے پارہ کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے:-

لا یحب اللہ الجہر بالسوء من القول الا من ظلم +	خدا کسی کے پکار کر برا کہنے کو پسند نہیں کرتا لیکن جو شخص ظلم کیا گیا ہے (یعنی مظلوم ہے)

یعنی مظلوم ظالم کی برائی کو پکار کر کہہ سکتا ہے یا اُسے برا کہہ سکتا ہے لہذا ہم معذور بل معفو اور مستثنیٰ ہیں اگر کسی کے پیشوا یا باپ دادا پر ظلم ہوا ہو اور وہ کسی کو ان پر ظلم کرنے والا جان کر کے ظالموں پر خفیہ یا علانیہ اظہار بیزاری کرے تو اخلاقاً و انصافاً کسی کو شکایت کا حق نہیں بعض شیعہ کہتے ہیں کہ لفظ لعنت کے سوا کوئی غیر مہذب جملہ زبان پر لانا مکروہ اور لغو سمجھتے ہیں چہ جائے کہ دشنام یا گالی اگر کوئی غلو یا جوش میں ایسا کہہ بھی بیٹھے تو اگرچہ وہ خود اپنے قول کا ذمہ دار ہے تاہم وہ ایک حد تک معذور بھی سمجھا جا سکتا ہے لفظ ولد الزنا یا حرام زادہ سے زیادہ بڑھ کر دشنامی صورت میں کوئی دوسرا لفظ نہیں ہو سکتا لیکن خدائے جل شانہ نے خود سورۂ نون میں لفظ زنیم ارشاد فرمایا ہے جس کا مفہوم ولد الزنا یا حرام زادہ ہے چنانچہ سورۂ مذکور میں ولید بن مغیرہ کی نسبت آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم

سے ارشاد فرماتا ہے:-

ولا تطع کل حلاف مھین ھماز مشاء بنمیم مناع للخیر معتد اثیم عتل بعد ذالک زنیم۔ (پارہ ۲۹ رکوع اول)	اے رسول، تم ایسے کے کہنے میں نہ آنا جو بہت قسمیں کھاتا ذلیل اوقات عیب جو اعلیٰ درجہ کا چغل خور مال کا بہت بخیل حد سے بڑھنے والا گنہگار تند مزاج اور

اس کے علاوہ بدذات (حرام زادہ) بھی ہے۔

لیکن جن لوگوں کے ایسے خیالات ہیں ہم اُن سے بہ ادب عرض کریں گے کہ خدارا اپنے اس عمل پر نظر ثانی کیجئے اور اپنے ہی اسلامی بھائیوں کے سواد اعظم کی دل آزاری کو ملحوظ رکھتے ہوئے خلق محمدی سے کام لیجئے۔ آپ کے گروہ کے اکثر افراد کو اس خلق عظیم کی اُمت ہونے کا فخر و اعزاز حاصل ہے جو "انک لعلی خلق عظیم" کا سچا مصداق تھا جس کے خلق عظیم نے اپنے شدید سے شدید دشمن اور توہین کرنے والے کی دل آزاری نہیں کی اور جس کے مقدس مشن کو اسی خلق عظیم کی وجہ سے زیادہ اور عدیم المثال کامیابی ہوئی ہے جس کا مخالف بھی اعتراف کرنے پر مجبور رہے ہے۔

لطیفہ:- ایک صاحب فرمانے لگے کہ ہمیں خدا کی طرف سے اجازت ہے۔ ہم معذور و مستثنیٰ ہیں اور حافظ کا یہ مقطع پڑھا۔

حافظ بخود نہ پوشید ایں خرقہ می آلود ۔ اے شیخ پاکدامن معذور دار ما را

میں نے عرض کیا کہ اسی غزل کا یہ شعر بھی تو پڑھئے جو باہمی رواداری اخلاق اور تمدنی مصالح کے لحاظ سے بہترین درس عمل ہے۔

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است ۔ با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

عزاداری کے متعلق چند شبہات اور انکے جوابات

شبہ اول :- آلام و مصائب میں جو خدا کی طرف سے آزمائش ہیں صبر کرنا ثابت قدم رہنا اور "اِنّا للّٰہ وَ اِنّا اِلَیہ رَاجِعُون" پڑھنا چاہیئے۔ گریہ وزاری اور اظہارِ بے صبری اور بے قراری نہایت خامی ہے۔ نوحہ و ماتم اور سینہ کوبی خلاف صبر اور اخلاق مومنین سے بعید ہیں۔

جواب :- بے شک ایسا ہی ہے اور ہم اس کی معقولیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ سینہ کوبی اور اسی طرح کی دوسری حرکات کو جو متانت اور استقلال کے خلاف ہیں۔ قابل تائید نہیں سمجھا جا سکتا اور ان کے فضول ہونے میں شبہ نہیں البتہ رونا اور غم کرنا صبر کے خلاف نہیں ہیں۔

جنابِ ختمی مآبؐ آپ کے اہل بیت کرام اور صحابۂ عظام سے زیادہ اور کون ثابت قدم ہو سکتا ہے۔ مگر یہ حضرات بھی روئے جس قدر انبیاء اور اوصیاء گذرے انہوں نے نزولِ بلا کے وقت گریہ بھی فرمایا حضرت آدم ۴۰ برس تک گریاں رہے۔ حضرت یعقوب فراقِ حضرت یوسف میں اس قدر روئے کہ آنکھیں سفید ہو گئیں۔

حاکم مستدرک میں کہتے ہیں کہ جب جناب رسولخدا حضرت حمزہ کی لاش پر آئے اور ان کو مُثلہ دیکھا تو چیخ مار مار کر رونے لگے۔ ابن مسعود بیان کرتے ہیں کہ آپ کو روتے روتے غش آ گیا۔ جب حضرت میدان احد سے تشریف لائے تو انصار کے گھروں سے (جن کے مرد میدانِ کارزار میں شہید ہوئے تھے) رونے کی آواز سُنی۔ مگر حمزہ کے گھر سے آواز نہیں آئی، تو فرمایا کیا حمزہ کی عورتیں یہاں نہیں ہیں۔ انصار نے یہ سن کر اپنی عورتوں کو ہدایت کی کہ پہلے حمزہ کے گھر جا کر ان کو رو دو اس کے بعد اپنے وارثوں کو رونا۔ زنانِ انصار حمزہ کے گھر آئیں اور آدھی رات تک روتی رہیں حضرت کی سونے

سے آنکھ کھلی دریافت فرمایا کہ یہ کیسی آواز ہے۔ عرض کیا گیا کہ آپ کے چچا پر انصار کی عورتیں رو رہی ہیں فرمایا خدا تم سے تمہاری اولاد سے اور تمہاری اولاد کی اولاد سے راضی ہو۔ خود جناب سرور کائنات نے ابھی انتقال نہ فرمایا تھا کہ رونا شروع ہو گیا۔ بلال ایسی حالت میں باہر آئے کہ ہاتھ سر پر مارتے تھے اور فریاد کرتے تھے بلال کو دیکھ کر سب اصحاب رونے لگے۔ بعض بے ہوش ہو گئے۔

مواہب قسطلانی میں تحریر ہے کہ آنحضرت کی رحلت کے وقت اصحاب نہایت شدت سے روتے تھے کسی کو مارے غم کے جنون ہو گیا بعض نابینا اور گونگے ہو گئے اور بعض روتے روتے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے بعض کا یہ حال تھا کہ اُٹھ نہ سکتے تھے جناب سیدہ تو اس قدر روتی تھیں کہ اہلِ محلہ تنگ آ گئے تھے یہاں تک کہ آپ کے رونے کے لئے بیرونِ شہر ایک علیحدہ مقام تجویز کرنا پڑا۔

صحیح ترمذی مشکوٰۃ صواعق محرقہ اور سرالشہادتین وغیرہ میں درج ہے کہ بعد شہادت حضرت امام حسینؑ ام المومنین ام سلمہ اور عبداللہ ابن عباس نے جناب رسولخدا کو خواب میں اس طرح دیکھا کہ آپ روتے ہیں سر اور ریش مبارک گرد آلود ہیں۔

غنیۃ الطالبین وغیرہ میں لکھا ہے کہ ستر ہزار فرشتے قبر حسین پر مقرر ہیں۔ جو قیامت تک روتے رہیں گے اسی طرح کل مورخوں کا اتفاق ہے کہ بعد شہادت سید الشہداء زمین و آسمان ملائکہ و جنات چرند و پرند سب روئے ہیں۔

صحیح مسلم کے جزو پنجم میں بہ ذیل تفسیر آیہ
فما بکت علیہم السماء والارض لکھا ہے لما قتل الحسین بکت السماء وبکائھا حمرتھا "جب حسین شہید ہوئے تو آسمان رویا اور اس کا رونا اس کی سرخی ہے"

علامہ ابن حجر مکی صواعق محرقہ میں اور جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفا میں لکھتے ہیں کہ آسمان سے خون برسا علامہ ابن جوزی تذکرہ خواص الامۃ میں جنات کا مصیبت

حسین پر رونا تحریر فرماتے ہیں شہادت یا وفات کے بعد رونا تو معمولی بات ہے مگر شہادت حسین وہ حادثہ ہے کہ ہزاروں برس پہلے اس کا حال سن کر حضرت آدم بے اختیار رونے لگے تھے۔

تفسیر در منثور میں آیۂ فَتَلَقّٰی آدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ کلمات کی تفسیر لکھتے ہوئے علامہ جلال الدین سیوطی ارشاد کرتے ہیں کہ وہ کلمات پنج تن پاک کے نام تھے جو آدم نے عرش پر لکھے ہوئے دیکھے تھے۔ اس وقت جبرئیل نے کہا کہ آپ ان ناموں کو یاد کر لیں چنانچہ چار نام یاد کئے تو آثار فرحت قلب پر پیدا ہوئی جب نام حسینؑ زبان پر آیا تو حضرت آدمؑ نے فرمایا جبرئیل اس پانچویں نام پر میرا دل مضطرب ہو کر بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ یہ کس کا نام ہے جبرئیلؑ نے کہا کہ یہ آپ کا فرزند ہے اس پر ایسی مصیبت پڑے گی کہ تمام مصیبتیں اس کے مقابلہ میں ہیچ ہوں گی اور واقعہ کربلا کا مختصر حال بیان کیا جن کی آدم و جبرئیل بکاء الثکلی آدم اور جبرئیل اس طرح روئے جس طرح ماں اپنے بیٹے کو روتی ہے۔

مسند امام احمد بن حنبل حلیۂ حافظ ابو نعیم سنن ابن داؤد مستدرک حاکم صواعق محرقہ سر الشہادتین تاریخ اعثم کوفی روضۃ الصفا روضۃ الشہدا وغیرہ میں جناب رسولخدا علی مرتضےٰ اور فاطمہ زہرا کا اس واقعہ کی خبر پا کر کئی بار رونا لکھا ہے۔ سید الساجدین اس غم میں ۴۰ برس تک روئے تو کیا جن نفوس قدسیہ کا ہم نے ذکر کیا سب آزمائش خدا میں ثابت قدم نہ تھے اور کیا ان کا رونا داخل بے صبری ہے نہیں ہرگز نہیں ان سے زیادہ ثابت قدم اور صابر کون ہو سکتا ہے۔ دوست کی مصیبت کا حال سن کر دوست روتا ہی ہے یہ انسانی فطرت کا ایک لازمی تقاضہ ہے اس لئے صرف رونا نہ خلاف صبر ہے اور نہ اخلاق مومنین سے بعید اس بحث کو بڑی گنجائش ہے مگر ہم بخوف طوالت اسی پر اکتفا کرتے ہیں فافہم وتدبر۔

شبہ دوم :- قرآن مجید میں ہے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

جو لوگ خدا کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو مُردہ مت سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے خدا کے پاس سے رزق پاتے ہیں اور خدا نے جو ان کو اپنے فضل سے دیا ہے اسی پر خوشی کرتے ہیں

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ

جو خدا کی راہ میں مارا جائے اس کو تم مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہے۔ مگر تم نہیں جانتے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے۔

اَبْشِرِ الصّٰبِرِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ

اُن صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دو کہ جس وقت ان پر کوئی مصیبت نازل ہو تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے صلوٰۃ اور رحمت ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

جناب سید الشہدا پر جو مصیبتیں نازل ہوئی ہیں وہ اپنی سختی اور شدت کے لحاظ سے عدیم المثال ہیں مگر آپ بڑی خوبی اور ثابت قدمی سے آزمائش خدا میں پورے اُترے اور اسی وجہ سے آپ کو شہادت عظمےٰ کا وہ درجہ حاصل ہوا جو اولین و آخرین میں سے کسی کو نہ ہوا ہے اور نہ ہو گا آپ کو بہشت میں وہ مدارج و مراتب عطا فرمائے گئے۔ جو خاص آپ ہی کا حصہ ہیں آپ اپنے رب کے پاس خوش و خرم ہیں آپ کے دشمن دائمی عذاب اور ابدی لعنت میں گرفتار ہوئے تو یہ موقعہ خوشی کا ہے نہ کہ رونے کا۔ دوست کی ترقی منصب

پر خوشی کرنا چاہیے نہ کہ غم والم

جواب:- یہ شبہ بادی النظر میں معقول مگر درحقیقت کمزور و بے اثر ہے کیونکہ یہ رونا صرف ہمدردی اور روحانی تعلق سے ہی نہیں بلکہ آنحضرت اور بزرگانِ اہل بیت کی تاسی بھی ہے ہم ابھی اوپر بیان کر چکے ہیں کہ حضرت سرورِ عالم جناب حمزہ کی لاش پر بے تاب ہو کر روئے تو کیا حضرت کو اس کا یقین نہ تھا کہ حمزہ کو سید الشہدا ہونے کا رفیع الشان درجہ ملا اور وہ داخل بہشت ہوئے اگر یقین تھا تو پھر آپ حمزہ کی لاش پر کیوں روئے چاہیے تھا کہ اپنے چچا کے اس منصب جلیل پر فائز ہونے سے آپ خوشی کرتے یا شہادتِ حسینؑ کا حال جبریل یا دیگر فرشتوں سے جتنی مرتبہ سنا آپ روئے درحالیکہ ابھی معرکۂ کربلا ہوا بھی نہ تھا۔ آپ کو اپنے فرزند حسینؑ کے ایسے مراتبِ عالی پر فائز ہونے کی خبر سے خوش ہونا چاہیے تھا یا جب خود آنحضرت نے وفات پائی تو اس وجہ سے کہ بہشت کو تشریف لے گئے نعمت ہائے جنت سے مستفیض ہوئے اپنے محبوب سے جا ملے اور مکروہاتِ دنیا سے نجات پائی اہل بیت رسالت اور اصحابِ کرام کو عید منانی چاہیے تھی۔ حالانکہ اس وفات کا ایسا نوحہ و ماتم ہوا کہ مدینہ میں قیامت برپا تھی۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ خود آنحضرت اہلبیت اطہار اور دوسرے بزرگانِ دین کے اس فعل کا معترضین کے پاس کیا جواب ہے اگر ہے تو اس کو اپنے اس شبہ کا جواب بھی لیں۔

شبہ سوم:- واقعاتِ کربلا خصوصاً ان روایات پر جن میں اہل حرم کے قید ہونے چادریں چھن جانے بے پردہ بازاروں اور شہروں میں پھرائے جانے کا ذکر ہو بیان کرنا اہل بیت رسالت کی توہین و تذلیل کا باعث ہے۔

جواب:- ہمارے خیال میں یہ اعتراض قابل تسلیم اور جزواً ناقابل تسلیم ہے قابل تسلیم جزو سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کسی صاحب احترام اور واجب التعظیم شخص کی نسبت کوئی ایسی خلاف بات بیان کرنا جو درحقیقت اس پر نہیں گزری ہو بے شک اس کی توہین اور کسر شان

ہے ان واقعات میں بہت سے قصے بے سروپا ہیں جن کی نہ کچھ اصلیت ہے نہ وجود بلکہ وہ محض رونے رُلانے کی غرض سے گھڑے گئے ہیں چنانچہ ایک موقعہ پر اس کے متعلق بحث کی جا چکی ہے۔ چادریں چھن جانا یا بے پردہ بازاروں اور شہروں میں پھرانا ہمارے خیال میں قابل وثوق نہیں ہے اور ان کا بیان کرنا سوءِ ادب ہی نہیں بلکہ بلاشبہ توہین کفر ہے... لیکن اگر یہ واقعات درحقیقت رُونما ہوئے تو نہ ان کا بیان کرنا داخل توہین ہے نہ دیگر واقعات کا ذکر باعثِ سوءِ ادب کیونکہ امر واقعی کا بیان باعثِ ذلت واہانت نہیں ہو سکتا انبیاء سلف کے کئی ایسے حالات قرآن مجید میں مذکور ہیں چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ سارہ زوجۂ حضرت ابراہیم کو بادشاہ مصر نے پکڑوا بلایا۔ حضرت مریم کے حال میں ہے

فاتت به قومها قالوا یا مریم لقد جئت شیئاً فریا یا اخت هارون ما کان ابوک امرء سوء وما کانت امک بغیا۔

(یعنی حضرت عیسےٰ پیدا ہو گئے تو مریم ان کو اپنی گود میں لئے ہوئے) اپنی قوم میں آئیں وہ لوگ کہنے لگے مریم تم یہ عجیب چیز لائیں (یعنی تمہارے شوہر نہیں ہے پھر بیٹا کیسے پیدا ہوا) اے ہارون کی بہن تمہارا باپ بدچلن اور تمہاری ماں آوارہ نہ تھیں (یعنے وہ تو ایسے نہ تھے تم نے یہ کیا کر لیا۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید میں اس قصہ کے ذکر سے حضرتِ مریم کی توہین و تذلیل ہے خود جناب ختمی مآب کے حالات تمام مورخین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ کفارِ قریش نے آنحضرت کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں کوئی کہتا تھا محمد جادوگر ہے کوئی کہتا کہ ان کو جنون ہو گیا ہے عقل جاتی رہی ہے راستوں میں لڑکے آپ پر پتھر پھینکتے۔ چال کی نقل کرتے چال پر ہنستے اور منہ چڑاتے تھے بعض نے خانہ کعبہ میں بحالت سجدہ آپ پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی تو کیا ان واقعات کے بیان کرنے سے یہ خیال کیا جائیگا کہ اس میں آنحضرتؐ کی توہین اور کسر شان ہوتی ہے خود واقعاتِ کربلا کے مجمل اور مفصل حالات صدہا کتب تاریخ

واحادیث و تواریخ میں قلمبند ہو رہے ہیں ہزار ہا سالوں میں کلّی اور جزوی حالات لکھے گئے ہیں جب ان حالات کا تاریخی کتابوں میں لکھنا جائز ہے اور باعث توہین نہیں تو ان کے بیان کرنے کو ناجائز اور وجہِ تذلیل سمجھ لینا کس قدر مہمل اور بے معنے خیال ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی سرالشہادتین میں لکھتے ہیں۔

ثم دخلوا علی الحرم والسرہ واثنا عشر غلاما من فتیٰ ومن کان من النساء ثم ارسلہ معہ رؤس الشہداء اسبایا اھل بیت الی یزید بن معاویۃ ط	شہادت کے بعد وہ لوگ حرم میں داخل ہوگئے بارہ لڑکوں اور چند عورتوں کو بنی ہاشم میں سے قید کر دیا پھر حضرت کے سر مبارک کو دوسرے شہدا کے سروں کے ساتھ معہ اسیران اہل بیت یزید ابن معاویہ کے پاس بھیج دیا۔

کیا کوئی معقول اور سمجھدار آدمی اس بات کو مان لیگا کہ شاہ عبدالعزیز جیسے جلیل القدر اور محتاط آدمی نے جو ہندوستان کے خاتم المحدثین ہیں ان فقرات کو جن میں حرم رسول میں نامحرموں کے گھس جانے اور اہل بیت کو قید کر لینے کا بیان ہے اپنی کتاب میں تحریر فرما کر اہل بیت رسول اللہ کے ازالۂ حیثیت کا ارتکاب، گزرے ہوئے۔ اور سچے واقعات کا بیان کرنا داخل توہین ہے نہ بیان کرنے والا جرم اہانت کا مجرم اور یہ ایک ایسی کھلی ہوئی اور واضح بات ہے کہ اس قدر زیادہ بحث کرنے اور دلائل پیش کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔

شبہ چہارم:۔ عزاداری اس طریقہ پر کیوں نہیں کی جاتی جس طرح ائمہ اہل بیت کرتے تھے۔ یہ ظاہری سامان یا رسمیں جو عقلاً اور نقلاً بے کار و فضول ہیں ان کو کیوں نہ داخل بدعت سمجھا جائے، تعزیہ بنانا، علم اٹھانا، تربت و تابوت اٹھانا ماتمی لباس پہننا۔ مہندی اٹھانا۔ فقیری پہنانا سقہ بنانا طوق و زنجیر و بیڑی پہنانا۔ حضرات کی فرضی شبیہیں

رکھنا تعزیوں اور علموں کی طرف اشارہ کرکے زیارت پڑھنا اور ان کو دیکھ کر تعظیماً کھڑا ہو جانا اور ان کے سامنے مرادیں طلب کرنا دُلدُل اور بُراق بنانا۔ کلاوہ پہننا لحن موسیقی میں سوزخوانی کرنا امام باڑوں کی ہانڈی جھاڑ فانوس وغیرہ تکلفات سے اس طرح آرائش کرنا جو عزاخانہ کے بجائے عشرت خانے کہلائے جاسکیں، شب دہم کو جو خاص غم کی رات ہے عزاخانوں کی اور بھی زیادہ زینت و زیبائش کی جاتی ہے۔ بلکہ چراغاں بھی کیا جاتا ہے، ڈھول تاشے نوبت نقارے بجانا وغیرہ وغیرہ جن کی بجا آوری عشرۂ محرم میں رسمیات سے بڑھ کر واجبات کی حد تک پہنچ گئی ہے کیا ان کو درحقیقت لوازم عزاداری کہا جاسکتا ہے کیا ان کے ثبوت کے لئے آئمہ اہل بیت کا کوئی قول یا کوئی عمل پیش کیا جاسکتا ہے اگر نہیں کیا جاسکتا ہے یہ تو ایک ڈرامہ یا تماشہ ہے جس کو نہ حسینی تعلیم سے لگاؤ نہ حسینی عزا سے کچھ سروکار بلکہ تماشہ سامانِ دل بستگی جہالت تو اہم پرستی اور اصراف ہے۔

جواب:۔ بے شک یہ اعتراض ایک بڑی حد تک بالکل درست اور بجا ہے اور اس کے بعض حصوں کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے اس لئے بلاشبہ بہ استثناء چند یہ تمام رسمیات بالکل فضول بعض سراسر لغو اور بعض انتہا سے زیادہ مذموم اور قابل ترک ہیں لیکن ان میں سے تعزیہ اگرچہ عزاء حسین کا جزو لاینفک نہیں اور نہ اس کے بغیر عزاداری ناقص و نامکمل کہی جاسکتی ہے۔ تاہم اس کی مخالفت صرف اس وجہ سے کہ یہ دین میں ایک جدت یا بدعت ہے قابل اعتنا نہیں ہو سکتی، اگر عزاخانوں میں ضریح مبارک کی نقل رکھی جائے تو اس میں شرعی یا اخلاقی یا تمدنی قباحت کیا عائد ہو سکتی ہے چونکہ حسیات کو ہیجان جو تباہی میں ایک خاص اثر ہے نہ یہ کسی نامشروع چیز کی نقل ہے اور نہ کسی جاندار کا مجسمہ۔ شرح صحیح مسلم اور کتاب الزواج میں لکھا ہے۔ اما التصویر صور الشجر ونحوھا وما لیس بحیوان فلیس بحرام درخت وغیرہ جو چیزیں جاندار نہ ہوں ان کی تصویر

بنانا حرام نہیں۔ کتاب ہدایا میں ہے لا یکرہ تمثال غیر ذی روح غیر جاندار کی صورت بنانا مکروہ نہیں ہے۔" شاہ عبدالحق محدث دہلوی کتاب ماثبت بالسنت اور کتاب دلائل الخیرات میں تصویر روضہ مقدسہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ممبر شریف وضریح وغیرہ بنانا درست لکھتے ہیں۔ ملا جامی نے فتوحات الناظرین میں صورت مکہ و مدینہ کوہ ابو قبیس کوہ صفا مروہ و بقیع کو جائز لکھا۔ مدینہ طیبہ میں باوجودیکہ روضہ مقدسہ جناب سیدہ جنت البقیع میں موجود ہے مگر اس روضہ کی نقل اور مصنوعی قبر جناب سیدہ قریب مزار جناب ختمی مآب بنائی گئی ہے اگر نقل روضہ بنانا جائز نہ ہوتا تو نقل قبر جناب فاطمہ کو علمائے مدینہ کیوں بنانے دیتے۔

بہت سے امور ایسے بھی ہیں کہ حسن عقیدت اور اظہار شوکت اسلام کے واسطے ان کا کرنا شرعاً ناجائز نہیں مانا گیا مثلاً حکم یہ ہے کہ قبر کو کچا رکھنا ہی اولیٰ اور انسب ہے لیکن جناب سید الانبیاء کے مزار پُر انوار پر وہ عمارات عالی شان اور شاہانہ ساز و سامان ہیں جن کے لئے شارع اسلام نے اجازت نہیں دی بلکہ اس کو اسراف و تبذیر سمجھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اگر سب نے نہیں تو اکثر علمائے اس کے جواز کے فتوے دے دئے ہیں چنانچہ مولوی عبدالواحد خاں نبیرۂ مولانا عبدالعلی صاحب مدراسی ازالۃ الاوہام میں لکھتے ہیں کہ:۔

"علمائے صالحین ایں عصر مراسیم مذکورہ راز شعائر اسلام تصور فرمودہ قطعاً فتویٰ برائے ترویج و جواز آں دادہ اند"

اس سے زیادہ خزینۃ المتقین میں صاف صاف تحریر ہے کہ

"مفتی را باید بہ نظر حال وعصر و زماں فتویٰ دہد پس دریں عصر و زماں علمائے صالحین فتویٰ بترویج و قیام تعزیۂ امام مظلوم کہ دادہ اند نہایت بجا و مناسب است و ترویج آں موجب ثواب و اجر عظیم است۔"

اگر ہندوستان کے سوا عرب و عراق و ایران شام اور مصر وغیرہ اسلامی ملکوں میں تعزیہ

نہیں بنایا جاتا تو اس سے یہ سمجھ لینا کہ تعزیہ بنانا حرام ہے درست نہیں ہو سکتا کیونکہ بمقابلہ ان ملکوں کے جہاں خالص اسلامی آبادی ہے اس ملک میں بوجہ اس کے کہ غیر مسلم قومیں بکثرت سکونت پذیر ہیں شوکت اسلام کے اظہار کی زیادہ ضرورت ہے۔ حافظ ابوعبدالرحمن کتاب غایۃ المرام میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جو لوگ تعزیہ کو بدعت سیئہ کہتے ہیں وہ اصل دین سے ناواقف ہیں اس واسطے کہ تمام امور میں اصل جائز اور مباح ہونا ہے جب تک کہ کوئی دلیل قطعی اس کی مانع نہ ہو بدعت حسنہ کے کرنے اور اس کے جائز و مستحب ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے"

شیخ عبدالحق محدث دہلوی سفر السعادۃ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

احادیث صحیحہ در نہی ازیں امور یعنی بنا کردن بر قبور یا چیزی براں نوشتن و چراغ برگور افروختن وارد شدہ و اصل سنت در زمان نبوت و خلفائے راشدین و صحابہ ہمیں بودہ ولیکن بعد ازاں تکلفات بر مقابر پیدا شدہ و مفاخرت و مباہات براں بہ اضافت و آخر زماں بجہت اقتصار نظر عوام برظاہر در تعمیر و ترویج مشاہد و مقابر مشائخ و عظماء دیدہ چیزہا فزودند تا ازاں جا ابہت و شوکت اسلام و ارباب صلاح پدید آید خصوصاً در دیار ہندوستان کہ مخالفان اسلام بسیار اند و ترویج و اعلائے ایں مقامات باعث رعب ایشان است و بسا اعمال و افعال و اوضاع کہ در زمان سلف از مکروہات بودہ و در آخر زماں از مستحبات و مستحسنات گشتند"

اب رہی اس کی تعظیم و تکریم چونکہ اس کو نقل روضہ مبارکہ سمجھا جاکر آپ کے اسم گرامی سے منسوب کیا جاتا ہے اس لئے اس کی عظمت و عزت اس حد تک کرتے ہیں جو نامشروع ہونے تک نہ پہنچے کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ ضروری ہے۔ اور یہ ایک عقلی فیصلہ ہے جس

برشرعی حجت لانے کی چنداں ضرورت نہیں اصل تعزیہ تو وہی ہو سکتا ہے جو ہو بہو روضۂ مبارکہ کی نقل ہو اور ایسا ہی ہونا چاہیئے تاہم گنبد دار تعزئے ہوں یا کسی اور طرح کے بظاہر اس میں شرعی قباحت نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کسی چیز کی نقل بنا کر اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا جو اصل کے ساتھ کیا جاتا ہے ایک بے معنے حرکت اور خفتِ عقل کی دلیل ہے گو یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے کہ نقل کا اصل کی مطابق احترام عقلاً و نقلاً ناقابلِ جواز ہے لیکن معترض کو چاہیئے کہ پہلے فتاوائے عالمگیری کو دیکھے جس میں درج ہے کہ

"ایک شخص خلافتِ جناب رسولخدا میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ جنت کی چوکھٹ اور حور کی پیشانی پر بوسہ دوں اور یہ ممکن نہیں اب اس کا عوض ارشاد ہو فرمایا اس کے عوض ماں باپ کے قدم اور پیشانی پر بوسہ دے۔ عرض کیا ماں باپ زندہ نہیں ہیں فرمایا ان کی قبروں پر بوسہ دے عرض کیا قبریں بھی مجھ کو معلوم نہیں فرمایا دو لکیریں قبر کی صورت زمین پر کھینچ اور ان کو ماں باپ کی قبریں تصور کر کے بوسہ دے۔ اور قسم کے خلاف نہ کر"

تعزیہ چونکہ نقلِ ضریح مبارک یا آپ کی طرف منسوب ہے اس کی حرمت اور عزت کی طرف سے لاپروائی نہیں کی جا سکتی یہی وجہ ہے کہ تمام بزرگانِ دین تعزیہ کی تعظیم و تکریم کرتے رہے چنانچہ صاحبِ ازالۃ اوہام کہتے ہیں کہ مولانا شاہ نظام الدین مولوی عبد العلی مولوی مجید الدین خاں اور مولوی انوار الحق قدس سرہم اور دوسرے علماء فرنگی محل اور کلکتہ و مدراس جب تعزیہ کو دیکھتے تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر تعزیہ کی طرف نہایت ادب سے فاتحہ پڑھتے جب کسی نے تعزیہ کے ساتھ گستاخی و بے ادبی کی فوراً سزا پائی چنانچہ ایسی صدہا روایتیں زبان زدِ خاص و عام ہیں ان ہی میں جادۂ

کا قصہ تمام ہندوستان میں مشہور ہو چکا ہے۔ البتہ تعزیوں کے آگے سر جھکانا منتیں مرادیں مانگنا ان پر عرضیاں آویزاں کرنا جہلا اور عورتوں کا فعل ہے جو خوش عقیدگی سہی مگر جہالت حماقت اور قابلِ انسداد ضرور ہے اسی طرح دوسری باتیں بھی مثلاً فقیری پہنانا۔ سقہ بنانا طوق و زنجیر و کلاوے پہنانا وغیرہ ان کی موجد بھی عورتیں یا جاہل مرد ہیں۔ لہذا یہ سب باتیں فضول و بے کار ہیں جن کو نہ عزاداری سے کچھ واسطہ ہے اور نہ اصولِ ماتم سے کچھ تعلق گو یہ سب باتیں بہ نیتِ برکت کی جاتی ہیں اور ان کا روپیہ مصرفِ خیر میں اٹھتا ہے تاہم خوش اعتقادی دوسری بات ہے۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جو چاہے فرض کرے مگر جہاں تک نظرِ غائر سے دیکھا جاتا ہے ان سب باتوں میں کسی ایک کو بھی خالص عزاداری سے لگاؤ نہیں سب فضول اور غیر ضروری ہیں۔ ان کے کرنے سے نہ کرنا اچھا ہے۔ پرانی لکیر کو پیٹنا اور اگلی مرجاؤ کو حکم خدا و رسول سمجھ کر سادھنا امر دیگر ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مجلس کے بعد تاشوں کے ساتھ ماتم کرنا تعزیوں کے آگے پھری گتکا کھیلتے اور باجے بجاتے ہوئے نکلنا وغیرہ وغیرہ اور بہت سے بیہودہ اور لغو حرکات دیکھنے میں آتی ہیں جن سے مسلمانوں کو شرم کرنی چاہیئے۔ تحت لفظ یا حدیث خوانی سے پہلے سوز خوانی ہر مجلس کے لازمی قرار دیدی گئی ہے۔ ہم حیران ہیں کہ مصلحانِ قوم اس بدعت سیئہ کا انسداد کیوں نہیں کرتے۔ سوز خوانی کیسی ہی بے اصول و بے قاعدہ یا سادہ طریقہ پر کی جائے۔ مگر وہ پردہ ہائے موسیقی کے دائرہ سے کسی طرح باہر نہیں ہو سکتی۔ لہذا ہم اس کو قطعاً حرام و ناجائز سمجھتے ہیں۔ نہ مجتہد ہیں نہ مولوی لیکن ہمارے خیال میں یہ مذہبی راگ کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا بلکہ اس متبرک اور مقدس ذکر کو نغمہ ہائے موسیقی میں ادا کرنا نہایت ہی افسوسناک غلطی اور سخت اہانت گستاخی اور بے ادبی ہے یہی وجہ ہے کہ خاندان اجتہاد لکھنؤ کے علاوہ دوسرے محتاط علماء سوز خوانی کو نہیں سنتے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ بعض عزا خانوں میں جنابِ رسول خدا جناب امیر حضرتِ حسین اور حضرت عباس کی شبیہیں رکھی جاتی ہیں جن کا رکھنا

قطعاً حرام ہے ہم کو سخت تعجب ہے کہ بعض علماء نے صرف اس بناء پر کہ یہ شبیہیں (خواہ فرضی اور خیالی ہی سہی) ان حضرات سے منسوب ہو کر لائقِ احترام ہو جاتی ہیں ان کے جواز کے فتوے دیدئے ہیں جیسا کہ ابھی اوپر لکھا گیا ہے ہم نہ عالم ہیں اور نہ صاحب اجتہاد۔ مگر ہم کو سخت افسوس ہے اور نہیں کہہ سکتے کہ اس سے بڑھ کر ان حضرات کی شان میں اور کیا سوء ادبی ہوگی۔ کسی نامشروع اور حرام شے کو ان کے اسماءِ پاک سے منسوب کرنا اس سے زیادہ بے ادبی اور کیا ہو سکتی ہے اسی طرح کاغذ یا لکڑی کا بُراق یا دلدل بنانا خواہ تعزیہ کے اندر ہو یا علیحدہ بوجہ اس کے ذی روح کا مجسمہ حرام ہے۔

جس طرح شمالی ہندوستان کے اکثر شہروں میں عَلم اُٹھائے جاتے ہیں اسی طرح جنوبی ہندوستان کے بعض شہروں خصوصاً حیدرآباد اور بھوپال وغیرہ میں نعل صاحب کی سواری نکالی جاتی ہے شاہانِ دکن میں سے کسی خوش اعتقاد نے اپنی قبر میں رکھوانے کے لئے کربلائے معلّٰے سے خاک پاک منگوائی تھی اتفاقاً اس میں گھوڑے کا ایک بوسیدہ نعل برآمد ہوا۔ اس وقت اس کی نسبت یہ مشہور کیا گیا کہ یہ حضرت سید الشہداء کے گھوڑے کا نعل ہے۔ اس لئے اس کا بڑا احترام کیا گیا۔ بعد ازاں اس کی زیارت ہونے لگی۔ جلوس کے ساتھ نکالا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ ایک نعل صاحب کے بدلے سیکڑوں نعل صاحب بن گئے۔ حیدرآباد میں نعل صاحب کی سواری کے ساتھ نہایت ہی مزخرف حرکتیں کی جاتی تھیں۔ بالکل ہولی کا سانگ بنا جاتا تھا کوئی ریچھ کوئی بندر بنتا۔ تخت رواں پر نوعمر لڑکے پر کما کا سانگ بنائے طبلہ سارنگی کے ساتھ ہوتے تھے جن کا ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست میں ہونا نہایت ہی افسوسناک بات تھی لیکن چند سال ہوئے کہ محی الملۃ والدین ہز اگزالٹڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں صاحب تاجدارِ دکن نے ان لغویات و خرافات کا قطعاً سدِ باب فرما دیا جس کا تمام مسلمانوں کو شکر گزار ہونا چاہیئے ایک افسوسناک بات یہ بھی ہے کہ تعزیوں کی زیارت کے بہانے مرد اور عورتیں راتوں کو جا بجا پڑے پھرتے ہیں جوان مرد اور عورت

ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں بدن سے بدن کندھے سے کندھے رگڑے جاتے ہیں نامحرموں کی نظر عورتوں پر پڑتی ہے۔ آپس میں تاک جھانک کا موقع ملتا ہے خصوصاً تعزئے کے پاس جہاں روشنی زیادہ ہوتی ہے آنکھ ناک اور بدن کی خوب صورتی بد صورتی اچھی طرح نظر آتی ہے بعض غیرت دار مرد اپنی عورتوں کو خود ہی ساتھ لئے پھرتے ہیں یہ حرکت نہایت ہی شرمناک اور قابل نفرین اور لائق انسداد ہے مصلحانِ قوم ادھر توجہ کریں۔ بہرحال ان اغراض میں جو باتیں درحقیقت نازیبا اور ناشائستہ ہیں ان کی اصلاح بلاشبہ ضروری اور واشد ضروری ہے۔ خدا مسلمانوں کو اس کی توفیق دے۔

یوم العاشورہ یوم العید ہے یا یوم الحزن

ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے جس قدر احادیث و روایات ہم تک پہنچی ہیں۔ اُن سب میں روزِ عاشورہ محرم کو یوم الحزن ہی قرار دیا گیا ہے اور اس کو یوم العید سمجھنے سے ممانعت کی گئی ہے اسی پر علمائے فریقین کا اتفاق ہے مگر افسوس ہے کہ اکثر شہروں میں عشرۂ محرم پر عوام اہل اسلام کا یہ طریقہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مرد عورت نہا دھو کر عمدہ لباس پہنتے ہیں تعزیوں اور علموں کی سیر کو ایک تماشہ یا میلہ سمجھ رکھا ہے۔

مفتی اکرام الدین خاں سعادۃ الکونین میں بحوالہ صواعق محرقہ ابن حجر اور کتاب سفر السعادت شاہ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ ایام محرم میں تلاوت قرآن و حدیث و وظیفہ و درود میں مشغول رہنا چاہیئے محتاجوں اور مسکینوں کو کھانا کھلانا اور خیرات و صدقات کا مشغلہ رکھنا چاہیئے پھر آگے لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ روز عاشورہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ زیادہ پڑھیں اس دن کو روز عید سمجھنا مسلمانی سے بعید ہے۔ اس روز زینت و آرائش کرنا بالوں پر خضاب لگانا نئے کپڑے پہننا سرمہ لگانا پر تکلف کھانے عید کی طرح پکا کر گھر گھر تقسیم کرنا خوشی اور سرور کے سامان مہیا کئے جانا نہایت ہی بے جا فعل ہے۔ بلکہ

یزید کی پیروی ہے جس حدیث میں روز عاشورہ سرمہ لگانا آیا ہے وہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

ہم حیران تھے کہ قدوۃ السالکین محی الدین حضرت عبدالقادر جیلانی قدس سرہ نے مشہور کتاب غنیۃ الطالبین میں یوم عاشورہ کو کس طرح یوم العید قرار دیدیا۔ چنانچہ اس کی تمام عبارت تحت ذیل درج کی جاتی ہے اس میں روز عاشورہ کے فضائل بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

ہم فضائل یوم عاشورہ میں سے یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس روز حسین ابن علی رضی اللہ عنہ شہید کئے گئے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلعم میرے گھر تشریف رکھتے تھے کہ یکایک آپ کے پاس حسینؑ آگئے میں نے دروازے سے جھانکا تو دیکھا کہ حسین آپ کے سینہ پر کھیل رہے ہیں آپ کے ہاتھ میں تھوڑی سی مٹی ہے اور آنسو چشم مبارک سے جاری ہیں۔ جب حسین چلے گئے میں آئی اور عرض کی کہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں میں نے دیکھا کہ آپ کے ہاتھ میں مٹی تھی اور آپ رو رہے تھے حضرت نے فرمایا جب میں حسین سے خوش ہوا اور وہ میرے سینہ پر کھیل رہا تھا میرے پاس جبرئیل آئے اور یہ مٹی دی جس پر حسین قتل کیا جائے گا اس لئے میں روتا ہوں

خواجہ حسن بصری سے روایت ہے کہ سلیمان ابن عبدالملک نے رسول خدا صلعم کو خواب میں دیکھا کہ آپ اس کو بشارت دیتے اور مہربانی فرماتے ہیں۔ جب صبح ہوئی تو اس نے حسن بصری سے تعبیر پوچھی حسن نے فرمایا شاید تو نے اہل بیت رسول اللہ کے ساتھ کوئی نیکی کی ہے سلیمان نے جواب دیا ہاں میں نے حسین ابن علیؑ کا سر خزانہ یزید ابن معاویہ میں رکھا ہوا پایا میں نے اس پر پانچ کفن دیباچہ کے پہنائے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی اور با اعزاز و احترام دفن کر دیا۔ یہ سن کر خواجہ حسن بصری نے سلیمان سے کہا کہ بے شک یہی وجہ

ہے کہ رسول خدا تجھ سے رضامند ہوئے اس جواب سے سلیمان بہت خوش ہوئے اور خواجہ کو انعام دیا۔

حمزہ بن زیات سے روایت ہے میں نے حضرت سرور عالم اور حضرت ابراہیم خلیل کو خواب میں دیکھا کہ دونوں حضرات قبر حسین پر نماز پڑھ رہے ہیں۔ ابو عمر نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ابی اسامہ سے اور انہوں نے جعفر بن محمد کی سند سے ہم کو خبر دی ہے کہ قبر حسین بن علی پر جب روز کہ وہ شہید ہوئے ستر ہزار فرشتے اترے۔ اور ان پر روز قیامت تک روتے رہیں گے۔

ایک گروہ نے ان بزرگوں پر اور جو کچھ اس کے بارہ میں وارد ہوا طعنہ زنی کی ہے اس کا خیال ہے کہ یوم عاشورہ کو روزہ رکھنا بوجہ شہادت حسینؑ جائز نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس روز بوجہ شہادت حسینؑ مسلمانوں میں عام رنج و غم ہونا چاہئے حالانکہ اس دن کو فرحت و سرور کا دن بناتے ہو عیال پر فراخی اور بہت کچھ خرچ کرنے فقیروں مسکینوں اور محتاجوں کو صدقہ دینے کا حکم دیتے ہو درآنحالیکہ یہ حسینؑ کے اس حق سے نہیں ہے۔ جو مسلمانوں پر ہے یہ کہنے والا خطاکار اور اس کا مذہب برا اور فاسق ہے۔ حالانکہ خدائے تعالےٰ نے اپنے نبی کے بیٹے کے لئے شہادت کے واسطے سب دنوں سے اشرف سب سے اجل اور سب سے ارفع دن اختیار فرمایا تاکہ حسینؑ کے درجوں اور بزرگیوں میں اس دن کی وجہ سے اور زیادتی و ترقی ہو اور ان کو ان خلفائے راشدین کے مرتبہ تک پہونچا دے جو شہادت کے ساتھ قتل کئے گئے ہیں اگر ایسا ہوتا کہ حسینؑ کا یوم رحلت یوم مصیبت مانا جاتا۔ تو دوشنبہ کا دن اس سے زیادہ لائق تھا کیونکہ آنحضرت صلعم اور حضرت ابوبکر صدیق

نے اسی روز رحلت فرمائی تھی۔ جناب رسولخدا اور حضرت ابو بکر کا دنیا سے اٹھ جانا بہتا دوسروں کے بہت زیادہ ہے حالانکہ دوشنبہ کے دن کی بزرگی اور اس دن کے روزہ کی فضیلت پر سب لوگوں نے اتفاق کر لیا ہے نیز یہ کہ اس روز بندوں کے عمل پیش کئے جاتے ہیں اور جمعرات کے روز اٹھائے جاتے ہیں اسی طرح یوم عاشورہ کو یوم غم نہ منانا چاہئیے اور جو دلیل ہم نے پیش کی ہے اس کی رُو سے تو یہی اولیٰ ہے کہ یوم عاشورہ کو یوم الحزن منانے کی جگہ یوم فرحت و سرور قرار دینا چاہیئے کیونکہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اسی دن خدا نے اپنے پیغمبروں کو ان کے دشمنوں سے نجات دی ہے اسی دن ان کے کافر دشمن فرعون وغیرہ کو ہلاک کیا ہے اسی روز آسمان و زمین اور دوسری اشیائے شریف پیدا ہوئی ہیں اسی دن حضرت آدم اور دوسرے ان کے سوا مخلوق کئے گئے اللہ تعالےٰ نے اس شخص کے لئے جو اس کا روزہ رکھے بڑا ثواب اور بڑی بخشش گناہوں کا کفارہ اور برائیوں کا دور کرنا تیار رکھا ہے اس لئے یوم عاشورہ بھی دوسرے ایام مبارک عیدین جمعہ اور عرفہ وغیرہ کی طرح بزرگ ہو گیا اگر یہ دن یوم مصیبت ہی ہوتا تو صحابہ اور تابعین ضرور اسکو اختیار کرتے کیونکہ وہ ہم سے بہت قریب اور زیادہ قربت خاص ہے حالانکہ ان سے عیال پر کھانے میں فراخی اور اس دن روزہ رکھنے کی ترغیب ہی وارد ہوئی ہے۔

اسی کتاب کے صفحہ ۹،۵ میں لکھا گیا ہے۔

"جو کوئی عاشورہ کے دن نہائے وہ سوائے مرض الموت کے اور کسی بیماری میں مبتلا نہو گا اور جو کوئی عاشورہ کے دن سُرمہ لگائے تو اس تمام سال اس کی آنکھ نہ دکھے گی اور جو کوئی عاشورہ کے دن کسی بیمار کی عیادت کرے تو گویا اس نے تمام اولادِ آدم کی عیادت کی"

پھر صفحہ ۵۸ میں ہے۔

"اس دن اپنے عیال پر فراخی کرو جو کوئی اس دن اپنے عیال پر اپنے مال سے فراخی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر تمام سال فراخی کریگا"

جب صاحب کتاب نے خود ہی تحریر کیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جبرئیل سے شہادت حسین کی خبر سُن کر گریاں ہوئے اور جب خود ان کا ہی بیان ہے کہ ستر ہزار فرشتے قبر حسین پر قیامت تک روتے رہیں گے تو پھر خود ہی یوم فرح و سرور کیونکر تسلیم کرتے ہیں بفرض محال یوم عاشورہ انبیائے سابق کے عظیم الشان واقعات کے باعث یوم برکت مان لیا جائے۔ حالانکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں لیکن پچھلے واقعات کی اہمیت پہلے واقعات کی عظمت کو ہمیشہ کھو دیتی ہے۔ بالفرض اگر دوسرے انبیا کو اس روز مصائب عظیمہ سے نجات ملے تو سید الانبیا کے گھرانے پر اس روز مصائب کا خاتمہ ہوا غنیہ کی اس طول طویل عبارت میں بہت کچھ جرح کی گنجائش ہے مگر ہم صرف اتنا لکھ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ صوفیا میں کسی بزرگ کی رحلت بوجہ وصال محبوب حقیقی باعث مسرت وابتہاج سمجھی جاتی ہے جیسا کہ عرسوں کے موقعہ پر دیکھا جاتا ہے یہ خیال بھی اسی نقطہ نگاہ سے ہو سکتا ہے ورنہ طبقہ علماء سے شاید ہی کسی محدث نے اس رائے سے اتفاق کیا ہو اور اس نحس روز کو جس دن خاندان رسالت کی تباہی و توہین انتہا کو پہنچ چکی تھی جو درحقیقت آنحضرت کی ہی تحقیر و تذلیل تھی یوم العید قرار دینے کی جرأت کی ہو۔

جو حدیثیں کتاب غنیہ میں فضائل عاشورہ کی تحریر ہوئی ہیں ان کو علمائے نقادین نے مکذوبات و موضوعات میں شمار کیا ہے صاحب لولوء المرصوع نے لکھا ہے۔

"روز عاشورہ سرمہ لگانے زینت کرنے اور خوشبو لگانے کی جتنی بھی حدیثیں ہیں وہ سب کذابوں کی گھڑی ہوئی ہیں"

(لولوء المرصوع مطبوعہ مصر صفحہ ۱۰۸)

امام عبدالرحمن شیبانی اپنی کتاب تمیز الطیب من الخبیث میں تحریر فرماتے ہیں حدیث :-
یعنی یہ حدیث کہ جو روز عاشورہ سرمہ لگائے تو اُسے کبھی آشوب چشم نہ ہو۔ حاکم کہتے ہیں کہ منکر ہے ہمارے شیخ فرماتے ہیں بلکہ موضوع ہے اور ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں وارد کیا ہے حاکم کہتے ہیں کہ سرمہ لگانے کی کوئی حدیث نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی نہیں ایسا کرنا بدعت جو قاتلان حسین علیہ السلام کی نکالی ہوئی ہے۔

پھر بھی امام شیبانی اپنی اسی کتاب کے صفحہ ۲۱۶ میں لکھتے ہیں کہ حدیث :-
یہ حدیث کہ جو روز عاشورہ اپنے عیال پر فراخی کرے خدا تمام سال اس پر فراخی رکھے گا اس کی تمام سندیں ضعیف ہیں اور ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے۔

صواعق محرقہ صفحہ ۱۱۰ میں ابن حجر مکی نے اور شرح سفر السعادت میں حمید الدین فیروز آبادی نے لکھا ہے کہ جتنی حدیثیں فضائل روز عاشورہ میں مشتمل ہیں کہ اس روز حضرت آدم کی توبہ قبول ہوئی۔ حضرت نوح کی کشتی نے کوہ جودی پر قرار پکڑا۔ حضرت ابراہیمؑ نے آگ سے نجات پائی حضرت اسمٰعیل کے لئے فدیہ آیا۔ حضرت یوسف نے قید سے نجات پائی وغیرہ وغیرہ بیان کی جاتی ہیں سب غلط ہیں کذابین نے وضع کی ہیں اسی طرح وہ تمام حدیثیں جو اس روز سرمہ لگانے غسل کرنے خوشبو لگانے یوم عید و سرور منانے اور اہل و عیال پر وسعت و فراخی کرنے کے بارہ میں بیان کی جاتی ہیں وہ سب گھڑی ہوئی ہیں۔ یہ حدیثیں قاتلانِ حسین کی ایجاد کی ہوئی ہیں ابن تیمیہ اور ابن قیم نے صراحت کے ساتھ ایسی حدیثوں کو موضوع بتایا ہے۔
دیکھو شرح سفر السعادت شاہ عبدالحق محدث دہلوی صفحہ ۵۴۲ و ۵۴۳ علامہ مقریزی اپنی کتاب المواعظ والاعتبار مطبوعہ مصر جلد دوم صفحہ ۳۸۵ میں تحریر فرماتے ہیں۔
مصر کے خلفاء بنی فاطمہ روز عاشورہ کو غم کیا کرتے تھے اور اس روز بازار بند

کر دئے جاتے تھے اور ایک بڑا دستر خوان تیار کیا جاتا تھا جس کو سماط الحزن کہتے تھے اس میں سے بہت کچھ لوگوں کو بٹتا تھا۔ جب دولت فاطمین پر زوال آیا اور صلاح الدین نے مصر پر قبضہ کیا تو اس نے اور اس کے خاندان بنی ایوب نے یوم عاشورہ کو خوشی منانی شروع کر دی اس روز وہ اپنے عیال پر فراخی اور اُن کے کھانے میں وسعت کرتے تھے حلوے مٹھائیاں بناتے تھے نئے نئے برتن خریدتے تھے سرمہ لگاتے اور حمام جاتے تھے جیسا کہ اہل شام کیا کرتے تھے اس سنت کے موافق جو ان میں حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان کے عہد میں جاری کی تھی جس کی غرض یہ تھی کہ شیعیان علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہ کو جلایا اور ذلیل کیا جائے جو یوم عاشورہ کو یوم عزا مانتے اور حسین پر جو اس روز شہید ہوئے غم کرتے تھے۔

علامہ نور الدین علی بن عبداللہ السمہودی المتوفی سنہ ۹۱۱ھ اپنی کتاب جواہر العقدین میں بحوالہ درر السمطین حافظ جمال الدین محمد بن یوسف الزرندی ۷۵۰ھ تحریر فرماتے ہیں۔
حافظ جمال الدین محمد بن یوسف الزرندی روز عاشورہ کو بعض لوگوں کے افعال جیسے اوروں کے تذکرے کے بعد کہتے ہیں کہ یہ اس پچھلی قوم کے معارضہ کے طور پر ہے جنہوں نے اس دن کو عید قرار دے لیا اور فرح و سرور میں مشغول ہو گئے یا تو اس وجہ سے کہ وہ نواصب میں سے اس جنہیں حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل بیت سے تعصب ہے یا ان جاہلوں میں سے ہیں جو فاسد کا فاسد سے اور شر کا شر اور بدعت سے تقابل کیا کرتے ہیں لہذا انہوں نے اس دن خضاب لگانے نئے کپڑے پہننے سرمہ لگانے نان نفقہ کی توسیع اور عادت سے خارج کھانے پکوانے وغیرہ جیسے چیزوں سے اظہار زینت کیا اور ایسے تمام مراسم ادا کرنے لگے جو عید کے موقعوں پر کرتے ہیں اور گمان کرنے لگے کہ یہ

سنت جاریہ ہے حالانکہ سنت اس کا ترک کرنا ہے کیونکہ اس معاملہ میں قابل اعتماد نہ کوئی خبر وارد ہوئی ہے اور نہ کوئی اثر و خبر صحیح ہے جس پر رجوع کیا جائے (علامہ موصوف نے یہ بھی کہا کہ بعض اکابر علماء سے جو علم حدیث میں ممتاز اور علم ادیان کے عالم تھے ان افعال سے سوال کیا گیا۔ جو لوگ عاشورہ کے روز سرمہ لگانے غسل کرنے مہندی لگائے حلوے کھانے نئے لباس پہننے اور اظہار مسرت وغیرہ سے عمل میں لاتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث اس بارہ میں وارد نہیں ہوئی نہ ان کے اصحاب سے نہ آئمہ مسلمین نہ ائمہ اربعہ وغیرہ میں سے کسی نے ان افعال کو مستحب قرار دیا ہے نہ کسی معتمد کتاب کے مصنف نے رسولخدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صحابہ نہ تابعین سے کوئی صحیح یا ضعیف حدیث روایت کی ہے اور بعض متاخرین سے جو یہ روایت کی گئی ہے کہ جو شخص یوم عاشورہ کو سرمہ لگائے اس کی آنکھ اس سال نہ دکھے گی جو غسل کرے گا وہ اس سال بیمار نہ ہوگا۔ اور جو اپنے عیال کے اخراجات میں اس دن کشائش اختیار کرے گا اللہ اس سال اسے کشائش رزق عطا کرے گا اور اسی قسم کی باتیں جن سے یوم عاشورہ کی فضیلت معلوم ہو جیسے حضرت آدم کی توبہ کی قبولیت کوہ جودی پر کشتی نوح کا استقرار آگ سے ابراہیم کی نجات ذبیح اللہ کے عوض مینڈھے کا فدیہ یعقوب سے یوسف کا پھر ملاقات کرنا اسی روز عاشورہ کو ہی تھا۔ یہ سب جھوٹ اور موضوع ہیں۔

علمائے عظام اہل سنت کی ہی ان تصریحات سے ثابت ہوگیا کہ یوم عاشورہ کو یوم عید قرار دینے کے متعلق تمام حدیثیں وضعی ہیں اور روز زیب و زینت بنی امیہ کی تقلید ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ تصوف و طریقت کا سلسلہ شیعوں میں نہیں ہے وہ صرف اہل بیت رسالت

کے ائمہ اثنا عشر کے تولا اور ان کے احکام کی تابعی کو اپنی نجات کے لئے کافی سمجھتے ہیں وہ بمفحوائے حدیث علماءُ اُمّتِی کَاَنْبِیَاءِ بَنِی اِسْرَائِیْلَ فقراء پر علماء کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں مجتہدین نائبان آئمہ ہیں اس لئے ان کی تقلید کو ضروری جانتے ہیں وہ مجاہدہ سے علم کو افضل سمجھتے ہیں۔ سعدی شیرازی نے بھی باوجودیکہ وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے اپنی مشہور کتاب گلستاں میں ایک مقام پر لکھا ہے۔

صاحبدلے بمدرسہ آمد ز خانقاہ — بشکست عہدِ صحبتِ اہل طریق را
گفتم میانِ عالم و عابد چہ فرق بود — تا کردی اختیار ازاں ایں فریق را
گفت او گلیمِ خویش بدر میبرد زِ موج — ویں جہد می کند کہ بگیرد غریق را

شیعہ اگرچہ اہل سنت کی طرح اہل سلوک کے معتقد نہیں لیکن ان کو اس طبقہ کے کسی بزرگ سے کاوش بھی نہیں ہے اگر ہے تو صرف حضرت عبد القادر جیلانی البغدادی سے ہے۔ حتےٰ کہ ان کے نسب میں بھی گفتگو کی جاتی ہے۔ صوفیائے کرام اور اہلِ سنت کے خواص و عوام میں جس قدر ان کو وقار حاصل ہے اسی قدر شیعوں کو ان سے بیزاری ہے اس کے برعکس وہ سب بزرگان طریقت کا احترام کرتے ہیں خصوصاً حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی عزت و وقعت ان کے دلوں میں بہت ہے حالانکہ قادریہ ہوں یا چشتیہ مسلک طریقت و تصوف میں دونوں مساوی ہیں سلسلہ قادریہ کا ایک عمل برخلاف اہلِ چشتیہ شیعوں کے مطابق بھی ہے یعنی جس طرح سماع شیعوں میں حرام ہے اسی طرح جماعت قادریہ میں بھی ہے ہم جہاں تک غور کرتے ہیں خواجہ صاحب اجمیری کی صرف ایک رباعی

شاہ است حسینؑ و بادشاہ است حسینؑ — دین است حسینؑ دیں پناہ است حسینؑ
سر داد و نداد دست در دست یزید — حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

نے ان کو شیعوں میں محبوب اور حضرت عبد القادر جیلانی کی فقط مندرجۂ بالا تحریر نے مغضوب بنا دیا ہے اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں پائی جاتی اس لئے دیکھنا یہ ہے کہ کتاب غنیۃ الطالبین

جس میں ماہ محرم کے فضائل بیان کرتے ہوئے یوم عاشورہ کو یوم فرح و سرور قرار دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانی ثم بغدادی کی تالیف ہے بھی یا نہیں۔

شہرت عامہ کی بنا پر اب تک ہم بھی یہی سمجھتے تھے کہ یہ کتاب ان ہی جناب کی تصنیف ہے۔ لیکن حال میں علمائے عراق و شام و مصر نے ایک مبسوط رسالہ لکھ کر اس امر کا اعلان کیا ہے کہ غنیۃ الطالبین آپکی تصنیف نہیں ہے اور بہ کثرت داخلی و خارجی شہادتیں درج کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ حضرت کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ اس رسالہ کو ہمارے ایک عزیز سید نہال احمد ایم اے ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) نے فی الحال عالم پور ضلع رائچور وغیرہ مملکت محروسہ آصفیہ میں منصف و مجسٹریٹ ہیں حیدرآباد میں سید امیر حسن برادر نواب محسن الملک مہدی علی خاں کے کتب خانہ کے اندر بچشم خود دیکھا ہے اور اپنی کتاب تاریخ السادات امروہہ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس بلدۂ حیدرآباد دکن میں اس کا حوالہ دیا ہے وہ تاریخ سادات امروہہ جلد اول کے صفحہ ۸۴۳ میں لکھتے ہیں کہ "اس رسالہ میں صدہا علمائے عراق و عرب وغیرہ کے دستخط اس امر کی تصدیق کے لئے دکھائے گئے ہیں کہ غنیۃ الطالبین حضرت غوث پاک کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ اور اس میں بعض وہ مضامین درج ہیں جو واضح طریقے سے حضرتِ غوثِ پاک کے مسلک اور ارشادات کے مخالف ہیں متقدمین میں بھی اکابر نے بعض بعض مقامات پر غنیۃ الطالبین کو ان کی تصنیف تسلیم نہیں کیا اور عصر حاضرہ کے علماء میں اکثر تعداد ان کی ہے جو اس کتاب کو ان جناب کی تصنیف نہیں مانتے مولانا عبدالماجد دریا آبادی وغیرہ نے حال میں اسی خیال کی تائید کی ہے۔

مولانا شاہ مراد صاحب مارہروی ماہواری رسالہ مولوی میں جو بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۳ ہجری دہلی سے شائع ہوا تھا حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و تصنیفات کو لکھتے ہوئے غنیۃ الطالبین کی نسبت حسب ذیل ریمارک کیا۔

"کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب حضرت غوث اعظم کی تصنیف ہے مگر بعض اکابر

دو واقفانِ اسرار نے اسے حضور کی تصنیف قرار دینے میں تامل کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ صرف نام یک رنگی و یکسانی نے اس کتاب کو حضور غوثِ اعظم کی طرف منسوب کر دیا ورنہ یہ ایک اور شخص عبدالقادر جیلی کی تصنیف ہے۔ اور جہاں تک ہمارا خیال پہنچ چکا ہے اور ہماری نظر کام کر سکی وہاں تک تو ہمارا خیال بھی یہی ہے کہ یہ تصنیف حضرت غوث اعظم کی تصنیف نہیں دقیقہ سنج اور باریک بین اصحاب اسلوبِ بیاں اور طرزِ عبارت سے ہی بیک نظر اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ غیر مقلدین نے اس کتاب کو بہت اہمیت دی ہے ہم نے غور کیا تو ہمیں بھی یہ شک گزرا اور ہمارا شبہ اس سے اور قوی ہو گیا کہ فتوح الغیب اور اس کتاب کی عبارت میں بعد المشرقین نظر آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غوث اعظم کا اسے ہاتھ بھی نہیں لگا۔ ہمارے نزدیک کتاب غُنی کی نہیں اگرچہ اس میں چند امور مابہ النزاع درج ہیں تاہم حضورِ غوث اعظم کا منصب بہت بلند تھا اور یہ کتاب ان کی لکھی ہوئی ہرگز نہیں ہو سکتی اس لئے ہم اِس کتاب کو غوثِ اعظم کی تصنیف لکھنے کے لئے تیار نہیں اور جنھوں نے اس کتاب کو حضور کے نام سے منسوب بھی کیا ہے ہمارے نزدیک انہوں نے غلطی کی ہے اور یہ ان کی تحقیق و کاوش کی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔"

ان تمام اقتباسات سے پایا جاتا ہے کہ یہ کتاب جس میں یوم عزا کو یوم مسرت قرار دیا گیا ہے اور وضعی حدیثیں بھر دی گئی ہیں جس کی وجہ سے شبہ اس قدر نا خوش اور مخالف ہیں۔ اُن بزرگوار کی مرتبہ نہیں ہے جن کی طرف اس کو منسوب کیا جاتا ہے یہ تو ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ متن عبارت میں ہی نمایاں تضاد و تبائن موجود ہے یوم عاشورہ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے شروع میں کہا گیا ہے کہ جبریلؑ نے مقتلِ حسینؑ کی مٹی آنحضرتؐ کو لا کر دی تو آپ روئے پھر چند سطر آگے بڑھ کر لکھا ہے کہ ستر ہزار فرشتے قبر حسینؑ پر قیامت تک رونے

کے لئے مامور کئے گئے ہیں اس کے بعد یہ بیان کہ یوم عاشورہ کو یوم مصیبت بنانے کی جگہ یوم فرحت وسرور قرار دینا چاہیئے کس قدر عجیب اور حیرت افزا ہے اس لئے ایسی تحریر ایسے بزرگ سے جس کا پایہ صوفیائے کرام اور اولیاء عظام میں سب سے بلند اور ارفع ہو بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ کتاب کسی معمولی شخص کی ہے۔

حضرتِ غوث اعظم کے نام سے ایک فارسی دیوان بھی مشہور ہے لیکن درحقیقت وہ آپ کا نہیں ہے کسی دوسرے کا کلام ہے۔ صرف حضرت کے نام پر منسوب کر دینے سے آپ کا ہی دیوان سمجھا جانے لگا ہے۔ مولوی عبدالحق بی۔اے سکرٹری انجمن ترقی اردو جو اس زمانہ میں تصانیف کے بہترین اور مسلمہ نقاد ہیں۔ انہوں نے رسالہ معراج العاشقین مرتبہ حضرت مخدوم سید محمد صاحب حسینی گیسو دراز پر جو دیباچہ لکھا ہے اس کے صفحہ ۵ پر صاف لکھتے ہیں:-

"قدیم سے یہ دستور رہا ہے کہ لوگ اپنی تصانیف کو بعض مشاہیر اور نامور بزرگان دین سے منسوب کر دیتے ہیں چنانچہ حضرت معین الدین چشتی اجمیری اور غوث الاعظم جیلانی کے نام سے فارسی دو دیوان شائع اور رائج ہیں اسی طرح اور بزرگوں سے مختلف قسم کی کتابیں اور رسالے لکھ کر منسوب کر دئے گئے ہیں"

اس طرح معاملہ صاف ہے جس طرح کسی نے فارسی دیوان لکھ کر آپ کی طرف منسوب کر دیا ہے یہی حالت غنیۃ الطالبین کی بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ کسی اور نے لکھ کر آپ کے نام پر شایع کر دی ہے۔

عزاداری محرم اور اسکے فروعات پر آزادانہ رائے

دنیا کے عقلانے قدیم زمانہ سے بنی نوع انسان کی تہذیب اخلاق و تمدن کے لئے ایک ضروری امر خیال کرکے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا ہے اس بارے میں جو ان کے زریں اقوال ہیں ان کو ہم اس جگہ نقل نہیں کر سکتے مگر ان عظیم الشان اقوام کے حالات پر غور کرنے

سے بھی جن کو تاریخی شہرت حاصل ہے یہ امر خود بخود واضح ہو جاتا ہے بے شک ان قوموں کے اخلاق و تمدن پر سرسری نگاہ ڈالنے اور ان کی رغبتوں کا ٹھیک رُخ دریافت کرنے سے ہم کو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیڈر تہذیب طبائع کے بنیادی اصول سے پورے واقف ہوئے تھے جس سے ہماری مراد اصول اعتدال ہے بلکہ ان میں سے بعض نے اخلاقِ حمیدہ کے استعمال کو صرف اپنی قوم کے ساتھ مخصوص رکھا اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں رذائل کا ارتکاب جائز قرار دیا۔ اس اصول کی جھلک ان قوموں میں نہایت وضاحت کے ساتھ نظر آتی ہے جن کو دوسری قوموں پر تسلط واقتدار قائم رہا ہے اس دعوے کی تائید میں ہمارے پاس ایسے دلائل موجود ہیں جن کی کسی صورت سے تردید نہیں ہو سکتی چنانچہ اب بھی وہ قومیں جن کو تہذیب و شائستگی پر بڑا ناز ہے اسی بلا میں مبتلا ہیں ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے اخلاقی کمالات کی نسبت تفریط کو جائز رکھا جس سے نہ دل کو سکون ہوتا ہے نہ وجدان کو طمانیت حاصل ہوتی ہے اور نفوس اپنے فطری کمال کی طرف اپنی رفتار کا سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتے۔ بعض نے نفس کا زور توڑنے میں افراط سے کام لیا ہے اور اکثر رغبتوں اور خواہشوں کا فنا کر دینا لازمی قرار دیا ہے اس بارہ میں افراط کے نتائج بھی اسی طرح تفریط سے کم ضرر رساں نہیں ہوتے۔ جس قوم کے افراد میں یہ مرض پھیل جاتا ہے اس کا نظام تمدن مختل اور اس کی شائستگی کی عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔

بے شک اعتدال کا اصول وہ عظیم الشان اصول ہے جس پر ہر چیز کا قوام اور ہر شے کی ہستی منحصر ہے اگر اس دعوے کی تائید میں کسی دلیل کی ضرورت ہو تو تمام علوی اور سفلی کائنات پر نظر کرنا چاہیئے زمین کے بسیط مادی ذرات سے لے کر آسمان کے بڑے اور نورانی کُروں تک زبانِ حال سے پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ان کا وجود صرف اعتدال پر قائم ہے جس طرح ہر اک چیز کا کمال صرف اعتدال کی طرف منسوب ہوتا ہے اسی طرح اس کا اختلال سوائے عدم اعتدال کے اور کسی طرف منسوب نہیں ہو سکتا مذہبی اور دنیاوی معاملات میں

افراط و تفریط کے لحاظ سے تمام قوموں کی یہی حالت تھی کہ سب شاہراہ اعتدال سے بھٹکے ہوئے تھے کہ یکایک حقانیت کے آسمان سے اسلام کی روشنی نمودار ہوئی تاریکی کا وہ پردہ جو کمالات و فضائل کے چہرہ پر پڑا ہوا تھا دور ہوا قرآن مجید کی تعلیم سے افراط و تفریط کرنے والوں کو ملامت کی اور ان کو دنیا و آخرت میں انجام کی خرابی سے ڈرایا اور اس بارہ میں نہایت حکمت کے ساتھ اعتدال کے اصول کو قائم کیا۔ اسلام نے ہم کو بالکل اجازت نہیں دی کہ مذہب کے غلو میں جو چاہیں گھٹا بڑھا لیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ غلوئے مذہبی سے بچتے رہو کیونکہ تم سے پیشتر بہت سی قومیں اس کی بدولت ہلاک ہو چکی ہیں اس لئے ہم کو اپنی خوشی سے اس میں افراط و تفریط کر لینا کسی طرح جائز نہیں۔ اسلام نے ہم کو اخلاقی و مذہبی معاملات میں ٹھیک اندازہ کی تعلیم دے کر ان کا حقیقی راستہ بتایا۔ تاکہ انسان نہ تو ایسا میٹھا ہو کہ لوگ اس کو کھا جائیں اور نہ ایسا کڑوا ہو کہ اُسے تھوک دیں نہ اپنے خالق کو بھول کر دُنیا کا ہی بندہ ہو جائے نہ عبادت کرنے میں رہبانیت و تبتل اختیار کر لے۔ یا اپنی خوشی و مرضی سے جس امر کو چاہیے مذہبی رسم قرار دیکر ما فوق احکام خدا و رسول سمجھنے لگے۔

ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کے حسِ مشترکہ پر بہ مقابلہ ذہنیات کے مشاہدات و بدیہات کا قوی اثر پڑتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں کچھ نہ کچھ ظاہری اسباب جو ان کی پرستش و عبادت میں معین و محرک ہوں پائے جاتے ہیں اور کوئی مذہب خواہ وہ کیسی ہی سادگی پر مبنی ہو اس سے خالی نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم کو یہ بھی باور کر لینے میں تامل نہ ہوگا کہ اِس قسم کے سامان ہمیشہ بعد کو زیادہ کئے گئے ہیں۔ ہر مذہب کی ابتدائی بنیاد جو اس کی حقیقت کی حقیقی رُوح تھی نہایت ہی سادہ دیواروں پر قائم ہوئی اور پھر بتدریج اس کے متبعین و مقلدین کی خوش اعتقادی نے اس سادگی کو رنگا رنگ کے نقش و نگار سے ڈھک دیا۔ اس قلبِ ماہیت نے اگر چند خوبیوں کا اضافہ کیا تو اس کے پردہ میں چند قباحتیں بھی پیدا ہو گئیں بعض تمدنی اور اخلاقی اوصاف کو نقصان پہونچا۔

اس کلیہ سے مذہب اسلام بھی جسے اپنے بے نظیر سادگی پر سب سے زیادہ ناز ہے نہیں بچ سکا اور وقتاً فوقتاً اس میں جو جو تکلفات و اختراعات اضافہ کئے گئے ان کا اعادہ تحصیل حاصل ہے اسلام کے اور فروعاتِ مخترعہ سے ہم کو اس وقت بحث کرنا منظور نہیں۔ صرف عزاداری کے متعلق چند ضروری باتوں کا اظہار مقصود ہے۔

ہماری اس تحریر سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم مصائبِ مظلوم کربلا (روحی لہ الفدا) پر حزن و اندوہ اور گریہ و بکا کو مکروہ جانتے ہیں گفتگو اس میں ہے کہ جن رسوم و اختراعات کو ہم نے داخل عزاداری کر دیا ہے اور ان ہی کا عمل میں لانا ہم اور حقیقی عزاداری سمجھے ہوئے ہیں کیا فی الواقع یہی ایک جانِ عزاداری ہے اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں کہ یہ سب باتیں رفتہ رفتہ ایجاد ہو کر بتدریج جزوِ عزاداری ہوئی ہیں، ہر صوبہ بلکہ ہر شہر و قریہ میں اپنے اپنے مزاج کے موافق عزاداری میں تفرقہ ہوتا گیا۔ تکلفات کے ساتھ نمود اور نمود کے ساتھ اسراف بڑھتا گیا عزاداری کی اصلی سادگی اور سچی خوش اعتقادی مردہ نہ سہی تو نیم مردہ ضرور ہو گئی عزاداری کی یہ رسمیں جو وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتی رہیں ممکن ہے کہ پچھلی پاکیزہ خیال اور خوش اعتقاد نسلوں پر حزن و ملال کا اثر ڈالتی ہوں اور اس اضافہ کی جو علتِ غائی تھی وہ پوری ہو جاتی ہو مگر اب زمانہ دوسری رَوش پر چل رہا ہے۔ مذہب اسلام کی تمام اعتقادی اخلاقی، علمی اور عملی خوبیاں پچھلے پاؤں ہٹ رہی ہیں۔ حریت اور دہریت کا بھوت سروں پر سوار ہے۔ اسلام کے قدم سے مقدم رکن سبک ہوتے جاتے ہیں۔ ایسے پرآشوب زمانہ میں عزاداری کی یہ رسمیں صرف ایک کھیل اور تماشہ رہ گئی ہیں جن سے وہ اصلی مقصود جو اُن کے اجراء کے وقت ملحوظ رکھا گیا تھا جیسا کہ چاہیئے حاصل نہیں ہوتا گویا مرجاؤ سادھنا اور پرانی لکیر کو پیٹنا رہ گیا ہے پھر کیوں نہ اصولِ اعتدال کو قائم کیا جائے اور عزاداری کو اُن طریقوں سے جو ائمہؑ اطہار کے معمول تھے اور وہی اس غم کی حقیقی روح ہیں عمل میں لایا جائے۔ اگر ذاکر اہل بیتِ نبوت کے سچے حالاتِ مصائب بلا تکلف و تصنع بیان کرے اور سامعین

خلوصِ دل سے سماعت فرمائیں تو کیا اس سے وہ اصلی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا کیا جب تک آنکھوں کے سامنے تعزیہ علم ضریح ممبر اور جھاڑ فانوس نہوں رقّت نہیں ہو سکتی۔ کیا جب تک نوبت نقارہ ڈھول تاشہ نہو قلب پر چوٹ نہیں لگتی۔ واقعۂ ہائلہ کربلا اور سانحۂ شہادت مظلومِ نینوا بجائے خود ایسا رقّت خیز حادثہ ہے جس کی دردانگیز کیفیت اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اور جو حزنی اثر اور دل ہلا دینے والا جذبہ قدرت نے اس کو بخشا ہے وہ ایک ایسا معجزہ ہے کہ جب تک دنیا میں دینِ محمدی ہے اس کا اثر باقی رہے گا۔ ممکن ہی نہیں کہ جس دل میں محبتِ اہل بیت ہو واقعۂ کربلا کو سُن کر اُس پر چوٹ نہ لگے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ سچے مسلمانوں کی آنکھ ان مصائب پر اشک نہ بہائے۔ پھر ان تکلفات و رسمیات کی ضرورت ہی کیا ہے نام کو تو عزاداری کرنا اور اس کے پردہ میں فضول و نامشروع حرکات کا عمل میں لانا بالکل اس مصرعہ کا مصداق بنتا ہے ؎

ماتم کریں حسینؑ کا لوٹیں حسن پورہ

امام باڑوں کی زیبائش و آرائش ہانڈی جھاڑ فانوس آئینہ وغیرہ آلات شیشہ سے اس طرح کی جاتی ہے کہ ان کو عزاخانہ یا غم کدہ کہنے کے بجائے محفل۔خانہ یا عشرت کدہ سمجھا جاسکتا ہے روشنی کا انتظام خاص طور پر ضروری ہے اور تکلفات میں ایسے اہتمام کئے جاتے ہیں جس طرح خوشی و مسرت کے بڑے جشن پر عمل میں لائے جاتے ہیں۔ گایا بھی جاتا ہے مٹھائیاں بھی تقسیم کی جاتی ہیں بعض مقامات پر امام باڑوں میں نوبت کا بجنا بھی لازمی ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان اسبابِ مسرت و سرور کو عزا سے کیا تعلق ہوا اگر کسی کا کوئی عزیز مرتا ہے تو کیا وہ اظہارِ رنج و غم کی نمائش تکلفات کے سامانوں سے اپنے گھر کو سجانے مجلس سماع قائم کرنے مٹھائیاں بانٹنے اور نوبتیں بجوانے سے کرتا ہے یہ سب باتیں تو خوشی کی تقریبات پر دیکھنے میں آتی ہیں عزاخانہ تو درحقیقت اسی کو کہا اور سمجھا جاسکتا ہے جہاں یہ سامان جو خوشی سے مخصوص ہیں موجود نہوں اور سادگی و حزن و ملال کے وہ اسباب مہیا کئے جائیں

جو قلوب پر اثرانداز سمجھے جائیں نہ حقہ ہو نہ پان نہ شیرینی نہ نوبت نقارہ سامعین اگر باادب بیٹھیں (جوتیاں بغل میں دبائے ہوئے امام باڑہ میں نہ آئیں) حتی الوسع سر برہنہ ہوں۔ ذاکر بیانِ مصائب کے وقت افراط و تفریط کو کام میں نہ لائے اور اس اجتماع کا مآل کار حاصل ہو۔

اصل محرم دس تاریخ سے شروع ہوتا ہے کہ اس روز اور اس کے بعد اہل بیت پر جو مصائب کوفہ اور دمشق میں گزرے وہ تاریخِ عالم کے نہایت دردانگیز واقعات ہیں۔ مراسم عزاداری سات محرم سے شروع ہو کر کم سے کم ۱۷ محرم تک ہونی چاہیئے تھیں۔ مگر حساب برعکس ہے کہ یکم محرم سے شروع ہو کر دس کو ختم اور تعزیہ خوانی بند۔

۱۰ تاریخ جو اس عزا اور مصیبت کا خاص دن ہے تعزیہ اٹھائے تربتیں اور تابوت نکالے اور بس حالانکہ یہی دن اہل بیت کے لئے نمونۂ قیامت تھا لازم تو یہ ہے کہ اس روز طلوعِ آفتاب سے غروب کے وقت تک مجالسِ غم برپا ہوں تمام واقعات کو مسلسل از اول تا آخر بیان کرتے ہوئے عصر کے وقت جو حضرت کی خاص شہادت کا وقت ہے ختم کیا جائے تاکہ حاضرین و سامعین ان تمام غم انگیز واقعات کی یاد تازہ کر لیا کریں جو اس روز ظہور میں آئے۔

محرم کی دسویں شب اہل بیت کے لئے سخت مصیبت کی رات تھی صلح و آشتی کی تمام امیدیں منقطع ہو چکی تھیں مرد اپنی جانوں سے مایوس ہو چکے تھے عورتوں میں کہرام برپا تھا۔ صبح کو ان کے وارث میدان کارزار میں تلواروں سے ٹکڑے ہونے والے تھے۔ اور آئندہ جو مصیبتیں پیش آنی والی تھیں ان کا خوفناک منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ تمام رات مردوں نے عبادت میں اور عورتوں نے بحالت مایوسی گریہ و بکا دعاؤں اور مناجاتوں میں گزاری۔ مگر ان کے نام لیوا کیا کرتے ہیں امام باڑوں کی جنہیں حسینؑ کا عزاخانہ کہا جاتا ہے خوب تزئین اور آرائش کی جاتی ہے چراغاں اور روشنی کا اہتمام کیا جاتا ہے مرد عورت بے حیلہ

زیارت اِدھر اُدھر پڑے پھرتے ہیں ناشائستہ حرکات بھی عمل میں آتی ہیں نہ مجلسیں ہیں نہ عبادت اب کچھ عرصہ سے ۱۰ تاریخ کا دن گزر کر گیارہویں شب کو شام غریباں کے نام سے مجالس کا اضافہ ہوتا ہے۔ سامعین سروپا برہنہ آتے ہیں نہ فرش ہوتا ہے نہ روشنی۔ گیارہ کی شب کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں مگر افراط سے یہ بھی خالی نہیں مجلس کو زیادہ مؤثر بنانے کے لئے اہل بیت کے واسطے کھانا اور پانی لانے کا منظر دکھایا جاتا ہے۔ زوجہ حُر کھانا لاتی ہے۔ حالانکہ زوجہ حُر کا کربلا میں وجود ہی نہ تھا۔ حر بہ حیثیت ایک رسالہ کے افسر کے راستہ روکنے کے لئے اثناء راہ سے ہی حضرت کے ساتھ تھے اور دس محرم کو فوج مخالف سے جدا ہو کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہو گئے تھے عورتوں کا وہاں کام کیا ہے۔

اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ خصوصاً عورتیں اپنے بود و باش کے ہی مکان میں امام باڑہ کے نام سے ایک مختصر حصّہ مخصوص کر کے وہاں علم رکھ لیتے اور عزاداری کرتے ہیں۔ باقی سب گھر یا دہ حصّہ بھی بارہ مہینہ سب ضروریات کے لئے وقف ہے۔ اس میں خرابی یہ ہے کہ نہ ادب ہے نہ احترام جو مکان عزاخانہ کے طور پر مخصوص کر دئے گئے۔ وہاں تو ذکر حسین کے سوا دنیا کا کوئی کام ہی نہ ہونا چاہیئے۔ اس کا احترام اسی طرح لازم ہے جیساکہ مسجدوں کا کیا جاتا ہے۔ مسجدوں کی حرمت کیوں ہے صرف خدا کے نام پر منسوب ہو جانے سے وہاں فقط نماز پڑھنے کا حکم ہے اور کسی کام کی اجازت نہیں اسی طرح امام باڑہ بھی جب حسینؑ کے نام سے منسوب ہے تو اس کا ادب واحترام بھی بارہ مہینہ ضرور ہے حسینؑ کے عزاخانہ اور عام لوگوں کی سکونت کے مقاموں پر جن میں ہر طرح کے دنیادی بُرے بھلے کام ہوں رتبہ یکساں کیونکر ہو سکتا ہے۔ ایسے مقاموں پر امام باڑہ کا اطلاق ہونا ہی نہ چاہیئے۔ امام باڑہ وہی ہو سکتا ہے جو محدود محفوظ اور الگ مقام ہو۔

ہم اپنی اس آزادانہ رائے کا بھی اظہار ضروری خیال کرتے ہیں کہ اب مجالس عزاء الشہداء کی اصلاح کی جائے اور ان کو ان مقاصد کی صحیح تبلیغ کا ذریعہ بنایا جائے جن کے لئے سید

الشہداء نے عدیم النظیر قربانیاں کیں ان اصول کو مد نظر رکھا جائے تو نہ صرف یہ کہ تعلقات بین المسلمین کی بہت بدمزگیوں کی سوتیں بند ہو جائیں بلکہ دنیا میں اسلام کے اہم اصول کی نشر واشاعت کے لئے راستے کھلنے لگیں جو واعظین مجلس عزا کو مجلس مناظرہ کر دیتے ہیں اور مسلمانوں کے فرقوں کے مابین کراہت و نفرت کے جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں وہ حضرت کے مقصد کی ہر دلعزیزی کو صدمہ پہنچاتے ہیں۔

اب مجلسوں کو مذہبی مناظروں کا اکھاڑہ اور شاعرانہ محفلوں کی حیثیت سے بزم مشاعرہ کا نمونہ ہونا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ مجالس عزا اخلاقی ادارے ہیں نہ مناظروں کے دنگل اور مشاعروں کے جلسے۔

ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے جس طرح آج کل کے مقررین و ذاکرین نے ان مجالس مقدسہ میں دوسرے اسلامی فرقوں کے دل آزار اور غیر ضروری مباحث کو تقریباً لزوم کی صورت میں اختیار کر لیا ہے اسی کے ساتھ اب عام طور پر ایسے موقعوں میں خواہ وہ مجالس عزا ہوں یا محافل میلاد درود شریف کے نعرے لگائے جاتے ہیں اور ذاکرین کی بار بار فرمائش ہوتی ہے مومنین نعرۂ صلوٰۃ۔ پھر تاکید ہوتی ہے باآواز بلند نعرۂ صلوٰۃ اور پھر فرمایا جاتا ہے اور زیادہ بلند آواز سے حاضرین و سامعین خود بھی اور ان کی فرمائش سے بھی نعرہائے درود کا اعادہ کرتے ہیں اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ یہ عمل بہترین حسنہ موجب جزائے عظیم اور فرمان ایزدی اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" کی تعمیل ہے اور ایسے مواقع پر یہ عمل اور اس کی تکرار ضرور ہونی چاہیئے اور جس قدر زیادہ ہو بہتر اور باعث ثواب عظیم ہے لیکن یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ معاملہ ایسا سہل اور معمولی نہیں جیساکہ عام طور پر لوگوں نے خیال کر لیا ہے بلکہ نہایت اہم اور شدید ترین نزاکت کا حامل ہے درود شریف کا مختصر جملہ برزخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اسے صحیح طور پر ادا کیا جائے تو قبالۂ بہشت

اگر غلط طور پر استعمال کیا جائے تو دستاویز جہنم صرف ایک حرف "ص" کے ادائے تلفظ کا پھیر ہے اگر ٹھیک طریقے سے پڑھو تو روح ایمان اگر "س" کے لہجہ سے کہا جائے تو کفر بلکہ شدید ترین کفر اگر لفظ "صل" کی صاد کو قاعدہ مقررۂ قرأت سے ادا کیا جائے تو معنے ہوں گے۔ اے خدا درود بھیج محمد و آل محمد پر اگر (س) کے تلفظ سے بجائے "صَل" کے "سَل" کے زبان سے نکلے تو اس کے معنے ہوں گے اے خدا تلوار کھینچ...... معاذ اللہ بتایئے اس سے زیادہ گستاخانہ بے ادبانہ اور صریح کافر و جہنمی بنانے والا کلمہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اب غور طلب یہ بات ہے کہ ایسے موقعوں پر جو لوگ درود شریف کو آہستہ یا بالجہر پڑھتے ہیں۔ اُن میں مذکورۂ بالا اہم حالت کو جاننے والے اور سمجھنے والے کتنے ہوتے ہیں۔ ہمارے خیال میں زیادہ تعداد تو ایسے سامعین ہی کی ہوتی ہے جن کو اُس کی صحت و غیر صحت "ص" اور "س" کے ادا کرنے کا فرق معلوم ہی نہیں نہ ان کو اس کا احساس ہے کہ ہماری زبان سے کیا ادا ہو رہا ہے اور کس خطرناک گستاخی کا ارتکاب کیا جاتا ہے خصوصاً جاہل ناواقف لڑکے اور بچے زیادہ شور مچاتے ہیں اور مجمع میں لفظ "صل" کا "ص" کے ساتھ صحیح تلفظ ادا کرنے والے (جس قدر ہوتے ہیں اسی قدر "س" کے ساتھ تلفظ زبان سے نکالنے والے بلکہ زیادہ جس وقت "صل" کے ساتھ ہی "سل" کے شور کی آوازیں ہمارے کان میں آتی ہیں تو بدن کانپنے لگتا ہے کس قدر حیرت کی بات کہ جو لوگ اس امر کو سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ ناواقفوں کو اس نزاکت سے متنبہ کیوں نہیں کرتے واعظین و ذاکرین تاکیداً درود شریف کا حکم تو دیتے ہیں لیکن اس فرض کو ادا نہیں کرتے کہ ناواقف لوگوں کو آگاہ کر دیا کریں اور بچوں کو شور نہ مچانے دیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ جو سامعین اور بچے اس باریک نکتہ کو نہیں سمجھتے۔ وہ عند اللہ قابلِ مواخذہ نہیں تو ہم عرض کریں گے کہ کیا اس طرح درود مقدس کو کلمہ توحید و کفر بنا دینا جائز ہو سکتا ہے یہ بات کوئی معمولی نہیں اور اس کو سرسری اور ناقابل اعتنا نہ سمجھئے۔

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

جو لوگ نماز کے ایک جملہ اور قرآن مجید کی ایک آیت کے بھی معنی اور مفہوم کو بھی نہیں سمجھ سکتے لیکن نمازیں پڑھتے کلام خدا کی تلاوت کرتے اور دعاہائے ماثورہ کا وِرد رکھتے ہیں تو کیا نہ سمجھنے کی صورت میں ان کے یہ اعمال بے سود بے معنے اٹھک بیٹھک کی ورزش اور بے نتیجہ تضیع اوقات سمجھے جا سکتے ہیں نہیں وہ سمجھیں یا نہ سمجھیں ان کے معنے و مطالب کا اثر اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔

آخر میں ہماری ایک گذارش اور سُن لیجئے جو بڑی حد تک ضرور قابل توجہ ہے۔ ہندوستان میں جس طرح مساجد۔ منادر۔ مقابر۔ مدارس وغیرہ کے مصارف کے لئے اوقاف ہیں اسی طرح عزاخانوں اور رسوم عزاداری ادا کرنے کے لئے بھی چھوٹی بڑی صدہا جائدادیں ہیں۔ جو نیک نیت واقفین نے حصول ثواب کی غرض سے وقف کی ہیں لیکن یہ حقیقت عالم آشکارا ہے کہ محدود دو محدود حضرات کے سوا اکثر و بیشتر متولی صاحبان اوقاف کی جائدادوں کو موروثی ترکہ اور ذاتی ملکیت سمجھ کر اسے بھی اپنی ضرورتیں پوری کرنے میں دلیر اور بیباک ہیں درحالیکہ وقف کا ایک پیسہ بھی اس کی ضروریات کے سوا حرام مطلق اور باعثِ وبالِ آخرت ہے یہ کام سخت ذمہ داری اور جوابدہی کا ہے۔ اس خدمت کے لئے خلوص صدق نیک نیتی ایمان داری اور ایثار کی سخت ضرورت ہے ذراسی لغزش و سہل انگاری اور فتور نیت مواخذۂ آخرت کے لئے کافی ہے۔ سرکاری عدالتوں میں (جن کے کنٹرول میں یہ اوقاف ہیں) حسابات اکثر فرضی داخل ہوتے ہیں لیکن اس طرح عالم الغیب محاسب حقیقی کی بازپرس سے بچاؤ نہیں ہو سکتا یہ بھی واضح رہے کہ ذمہ داری صرف متولی صاحبان تک ہی محدود نہیں بلکہ اس مقام کے تمام مسلمان خصوصاً شیعہ حضرات بھی ذمہ دار اور عند اللہ جوابدہ ہیں کیونکہ غیر محتاط متولیوں کے ناجائز دست بُرد سے حسین کے مال کی نگرانی و حفاظت کا فریضہ فرداً فرداً سب پر یکساں عائد ہوتا ہے اس ذمہ داری کو

معمولی اور سہل نہ سمجھنا چاہیے بلکہ جہاں جہاں اوقاف ہیں وہاں انجمنیں قائم ہو کر مداخل و مخارج کی نگرانی اور سامان اور حسابات کی جانچ پڑتال رہنی چاہیے۔ صرف ایک فرد یا چند اشخاص کو ہی برائی بھلائی کا ذمہ دار اور جوابدہ سمجھ کر اور ان کا اپنے دامنوں کو بچانا یا رشتہ داری یا دوسرے تعلقات کی بناء پر چشم پوشی کرنا یا اس کو بے گار اور درد سری جان کر گریز کرنا اعانت مجرم کی برابر خدائی عدالت میں مستلزم السزا ہے۔ دیکھو قانون الٰہی کی دفعہ مندرجہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ ایک شخص یا چند کارکن حسینی مال میں خیانت مجرمانہ کی مرتکب ہوں یا وقف کی رقم کو کسی غیر متعلق یا غیر ضروری کام میں صرف کریں اور دوسرے حسینؑ کے نام لیوا صرف تماشہ دیکھیں اور دانستہ اغماض کر جائیں یا ہاں میں ہاں ملا کر عملاً و قولاً اُن کا ساتھ دیں تو یہ اعانت جرم نہیں تو کیا ہے۔

یزید کی بابت اسلامی دنیا کی رائے

یزید کی نسبت دنیائے اسلام کے خیالات مختلف ہیں اگرچہ عموماً علما و محدثین اس کو فاسق و فاجر بلکہ زندیق و مرتد اور بعض اس کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ تاہم کچھ ایسے حضرات بھی ہیں جنہوں نے باوجود ان ملعونانہ حرکات کے جو اس سے سرزد ہوئی ہیں اس کو نہ صرف مسلمان بلکہ جائز جانشین رسول اللہ تسلیم کر کے اس کے ڈیفنس میں سرگرمی سے حصہ لیا خصوصاً علامہ ابن تیمیہ نے تو یزید کی حمایت کرتے ہوئے اپنی کتاب منہاج السنۃ کے بہت سے ورق سیاہ کر ڈالے۔

لا یجوز لعن یزید ولا تکفیرہ فانہ جملۃ المومنین وامرہ الیٰ مشیتہ اللہ۔

یزید پر لعنت کرنی اور اس کی تکفیر جائز نہیں کیونکہ وہ مومنین میں داخل ہے اور اس کا امر مشیت ایزدی سے متعلق ہے۔

ملا علی قاری شرح بدء الآمال میں تحریر کرتے ہیں۔

اِنَّ الامر بقتل الحسین بَلْ قتلہٗ لیس موجب اللعنۃ علٰی مقتضی مذھب اھل لسنۃ

امام حسین کے قتل کا حکم دینا بلکہ ان کا قتل ہی موافق مذہب اہل سنت لعن کا موجب نہیں ہے۔

علامہ ابن حجر منبج کمیہ شرح قصیدۂ ہمزیہ میں لکھتے ہیں۔

قال لا بن العربی المالکی لم یقتل یزید الحسین الا بسیف جدہٖ

ابن عربی مالکی کا قول ہے کہ یزید نے حسین کو ان ہی جد کی تلوار سے قتل کیا ہے۔

پھر آگے چل کر اسی کتاب میں لکھتے ہیں۔

قول بعضھم لا الزام علیٰ قتلۃ الحسین لانھم قتلوا بسیف جدہ الآمر بسلہ علی البغاۃ وقتالھم۔

بعض علماء کا قول ہے کہ قاتلانِ حسینؑ کو سرزنش و ملامت درست نہیں کیونکہ قاتلین نے امام حسینؑ کو اُن ہی کے جد کی تلوار سے قتل کیا جو اس بات کے آمر تھے کہ باغیوں پر تیغ کشی اور ان سے جنگ کی جائے۔

انہ کان مسلماً ولم یثبت عنہ ما تخرجہ عن کونہ مومناً۔

یزید مسلمان تھا اور اس کی نسبت کوئی بات ایسی ثابت نہیں ہوئی جو اس کو دائرۂ ایمان سے خارج کر دے۔

پھر آگے ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

ولا یخفٰی ان ایمان یزید محقق ولا یثبت کفرہٗ۔

ظاہر ہے کہ یزید کا ایمان ثابت ہے اور اس کا کفر پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا۔

صرف یہی نہیں بلکہ بعض ائمہ مذہب نے یزید کو خلفاءِ اثنا عشر منصوص علیہم میں داخل کیا ہے۔ چنانچہ ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں امام جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء میں اور حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں صاف صاف لکھتے ہیں کہ جناب ختمی مآب صلعم کے

بارہ (۱۲،۵) خلفاء یہ حضرات ہیں۔
ابوبکر بن قحافہ۔ عمر بن خطاب، عثمان بن عفان۔ علی ابن ابی طالب۔ معاویہ بن ابی سفیان۔ یزید ابن معاویہ۔ عبدالملک بن مروان۔ ولید ابن عبدالملک سلیمان ابن عبدالملک۔ ہشام بن عبدالملک۔ یزید ابن عبدالملک اور عمر ابن عبدالعزیز۔

مولوی محمد حسن سنبھلی حاشیۂ عقائد نسفی میں تحریر فرماتے ہیں۔

لحصر صحة خلافة یزید ابن معاویة علی ما اختارہ البعض علی تواتر استخلافه امام عدل له فلو فرض عند انعقاد امامته له یضرہ فضلا عما بعدہ۔

خلافت یزید ابن معاویہ کی صحت جیسا کہ بعض کی رائے ہے اس تواتر سے ظاہر ہے کہ امام برحق معاویہ ابن ابی سفیان نے اس کو اپنا ولی عہد مقرر کیا لہذا اگر یہ بھی فرض کیا جائے کہ یزید انعقاد بیعت کے وقت فاسق تھا۔ تب بھی امامتِ یزید کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا چہ جائیکہ بعد خلیفہ ہونے کے اس کا فسق ظاہر و ثابت ہو تو اس کی امامت و خلافت کو کیا نقصان پہونچ سکتا ہے۔

اِس زمانہ کے سب سے بڑے خیر خواہ یزید مرزا حیرتؔ دہلوی کا قول بھی سنئے۔ آپ فرماتے ہیں۔

"یزید کی معاشرت پر اسلامی دنیا میں بالکل پردہ ہے شیعہ علمائے چند بے جوڑ باتیں اس کی نسبت مشہور کردی ہیں جس پر تمام دنیا نے اتفاق کرلیا ہے"

عہد حاضرہ میں بعض ایسے نیک گماں حضرات بھی موجود ہیں جو حضرت یزید رحمۃ اللہ علیہ یا حضرت یزید رضی اللہ تعالےٰ عنہ یا حضرت یزید علیہ السلام فرمایا کرتے ہیں اور ان کا اسلامی جذبہ اور دینی حرارت اس بات کو گوارا کر نا پسند نہیں کرتی کہ یزید جیسے مقدس اور نیک اعمال شخص کے متبرک نام کو بغیر کسی تعظیمی لفظ کے زبان پر لائیں۔

اب ہم اُن علمائے کرام کے اقوال کو نقل کرتے ہیں جنہوں کے یزید کے معائب و مذائم کی

قلعی کھولی۔ سب سے اول خود یزید کے بیٹے معاویہ کا وہ خطبہ ہی لیجیے جس میں اس نے اپنے پدر ناستودہ سیر کے معائب علے الاعلان بیان کرکے کاروبارِ سلطنت سے کنارہ کشی اختیار کی تھی چنانچہ علامہ ابن حجر نے صواعق محرقہ میں معاویہ ابن یزید کا جو خطبہ نقل کیا ہے اس میں ذیل کے فقرے قابل غور ہیں۔

ثم قلد ابی الامر وکان غیر اهله ونازع ابن بنت رسول اللہ ص فقصفت عمرہ وابتر عقبه وصار فی قبرہ رهینا بذنوبه ومن اعظم الامور خسارة علینا۔ بسوء مصرعه وبئس منقلبه وقد قتل عترة رسول اللہ واباح الخمر وحزب الکعبة ولم اذق حلاوة الخلافة۔

اس کے بعد میرے باپ نے یہ امر اختیار کیا۔ اور اس نے بنت رسول اللہ کے فرزند کے ساتھ نزاع کی اور ان کی حیات کو منقطع کردیا اور ان کے تمام اعقاب کو مستاصل کر ڈالا وہ اپنی قبر میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے اس سے زیادہ ہمارے خسارہ کا اور کیا امر ہوگا اور اس کی پاداش اور بری سزا سے بڑھ کر اور کس کی سزا ہوگی کہ اس نے عترت رسول اللہ کو قتل کیا۔ شراب کو مباح کیا خانۂ خدا کو غارت کیا اور اس خلافت کا کوئی مزا نہ اُٹھایا۔

امام سیوطی تاریخ الخلفا میں لکھتے ہیں:-

وکان سبب خلع اهل المدینة ان یزید اسرف فی المعاصی واخرج الواقدی من طرق ان عبداللہ بن حنظلة الغسیل قال واللہ ما خرجنا علی یزید حتی خفنا ان نرمی بالحجارة من السماء ان رجلا

اہل مدینہ کی وجہ خلع بیعت یہ تھی کہ یزید نے معاصی میں بڑی کثرت کردی تھی واقدی نے سعد طرق سے بیان کیا ہے کہ عبداللہ ابنِ حنظلہ غسیل الملائکہ فرماتے تھے خدا کی قسم ہم لوگوں نے اس وقت یزید پر خروج کیا۔ جب ہم کو یہ خوف پیدا ہوگیا کہ ہم پر آسمان سے

ینکح امہات والاولاد والبنات و الاخوات ویشرب الخمر ویدع الصلوٰۃ

سے پتھر نہ برسنے لگیں وہ ایسا شخص ہے جو ماؤں بیٹیوں اور بہنوں کی اولاد سے نکاح کو جائز سمجھتا اور شراب پیتا ہے اور نماز چھوڑے ہوئے ہے۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز جو بنی امیہ کے سلسلہ میں آٹھویں خلیفہ ہیں وہ یزید کو جیسا کچھ سمجھتے تھے وہ ذیل کے واقعہ سے ظاہر ہوگا جس کو ابن حجر نے صواعق محرقہ میں تحریر کیا ہے۔

قال نوفل بن ابی الفرات کنت عند عمر ابن عبدالعزیز فقال رجل امیر المومنین یزید فقال لا تقلہ امیر المومنین وامر بہ فضربہ عشرین سوطاً

نوفل بن ابی فرات ناقل ہیں کہ ایک شخص نے عمر ابن عبدالعزیز کے سامنے یزید کو امیر المومنین کہا عمر نے فرمایا اس کو امیر المومنین نہ کہو اور پھر اس شخص کو اس بات کے کہنے پر بیس کوڑے لگوائے۔

سید آلوسی بغدادی اپنی تفسیر روح المعانی کی آٹھویں جلد میں سبط ابن جوزی کی کتاب سر المصئون کی عبارت سے بیعت یزید کی نسبت لکھتے ہیں۔

قال الجوزی فی کتابہ السر المصئون من الاعتقادات العامۃ التی غلبت جماعۃ منتمین الی السنۃ ان یقول ان یزید کان علی الصواب و ان الحسین اخطاء بالخروج علیہ ولو نظروا فی سیر العلماء اعلموا کیف عقدت لہ البیعت والزم الناس بھا ولقد فعل فی ذالک کل قبیح

علامہ ابن جوزی اپنی کتاب سر المصئون میں لکھتے ہیں کہ ایک عام خیال جو ایک فرقہ میں غالب ہوگیا ہے اور وہ فرقہ اہل سنت کی طرف منسوب ہے یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یزید برسر حق تھا اور حسینؑ نے غلطی کی جو اس پر خروج کیا لیکن اگر یہ لوگ تاریخ وسیر پر نظر ڈالتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یزید کی بیعت کس طرح منعقد ہوئی اور کن کن مجبوریوں سے لوگوں نے اس کی بیعت کی اور اس کی بیعت لوگوں سے کرانے میں

کیسی کیسی قبیح کارروائیاں کی گئیں۔ (تفسیر روح المعانی جلد ہشتم صفحہ ۱۳۶)

مامون رشید نے اپنے زمانہ میں بنی امیہ خصوصاً یزید کے معائب میں ایک کتاب لکھوائی اور اس کو مشتہر کرانا چاہتا تھا مگر پھر بخوف فساد اس کو شائع نہ کرا سکا وہ کتاب خزانہ شاہی میں رکھی رہی معتضد باللہ کے زمانہ میں پھر اس کے اعلان کی ضرورت پیش آئی تو یہ کتاب نکلوائی گئی اور اس سے انتخاب کرکے ایک چھوٹا رسالہ تیار کیا گیا۔ جو تمام بلاد اسلامی میں سلطنت کی طرف سے مشتہر کیا گیا۔ اس ملخص کو ابن اثیر نے اپنی تاریخ جلد ہفتم صفحہ ۱۹۰ میں علامہ حسین دیار بکری نے تاریخ الخمیس جلد دوئم صفحہ ۱۸۳ مطبوعہ مصر میں۔ ابن الوردی نے اپنی تاریخ کی جلد اول صفحہ ۲۳۳ مطبوعہ مصر میں۔ ابوالفداء نے تاریخ المختصر جلد سوئم صفحہ ۲۷۸ مطبوعہ لندن میں تحریر کیا ہے اور امام سیوطی بھی اپنی تاریخ الخلفاء صفحہ ۲۵۳ مطبوعہ محمدی پریس لاہور میں مجملاً اس قصہ کا ذکر کرتے ہیں علامہ ابن جوزی اپنی کتاب الرد علی المتعصب العنید المانع لعن الیزید میں (جو بالتخصیص جواز لعن یزید میں لکھی گئی ہے) تحریر فرماتے ہیں کہ ایک سائل نے مجھ سے یزید ابن معاویہ کے لعن کی بابت سوال کیا۔ میں نے کہا کہ اس کے بارے میں جو کچھ کہا جائے کہو اس نے پوچھا کیا ہم اس پر لعن بھی کر سکتے ہیں میں نے کہا تمام علماء متورعین و مقدسین نے اس پر لعنت کی اجازت دی ہے اور ان ہی لوگوں میں امام احمد ابن حنبل بھی ہیں کیونکہ انہوں نے یزید کے حق میں لعنت سے زیادہ باتوں کا اضافہ کیا ہے۔ پھر علامہ ابن جوزی نے فرمایا کہ قاضی ابویعلیٰ نے اپنی کتاب معتمد الاصول میں صالح ابن احمد ابن حنبل رحمہما اللہ سے روایت کی ہے کہ میں نے اپنے والد (احمد ابن حنبل) سے پوچھا کہ بعض لوگ مجھ کو یزید کے ساتھ محبت کرنے کی فرمائش کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ جو شخص خدا پر ایمان لایا وہ کس طرح یزید جیسے شخص سے محبت کر سکتا ہے جس پر خدا نے خود لعنت کی ہو میں نے پوچھا کہ وہ کونسی آیت ہے تو انہوں نے آیہ وَھَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فی الارض وتقطعوا ارحامکم اولئک الذین لعنھم اللہ فاصمھم و

اعمٰے ابصارھم کی تلاوت فرمائی اور کہا کہ قتل حسین سے بڑھ کر اور کون سا فساد عظیم ہو گا۔

علامہ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ قاضی ابو یعلی نے ایک کتاب یزید کی جواز لعن میں لکھی ہے۔ جس میں اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے۔ من اخاف اھل المدینۃ ظلماً اخافہ اللہ وعلیہ اللعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین اسی قول کو علامہ ابن حجر نے بھی صواعق محرقہ میں تحریر کیا اور صواعق محرقہ کی سند سے امام سلیمان قندوزی بھی اپنی کتاب ینابیع المودۃ مطبوعہ بمبئی کے صفحہ ۲۸۱ میں ارقام فرماتے ہیں۔

علامہ ذہبی جن کی وفات ۷۴۳ ہجری میں ہوئی ارشاد کرتے ہیں۔

فقد فعل یزید باھل المدینۃ ما فعل فی شربہ الخمر واتیانہ المنکرات اشتد علیہ الناس	یزید نے جو کچھ اہل مدینہ کے ساتھ کیا اور اس کی شراب خوری اور منہیات شرعی پر اصرار تمام امت پر شاق گذرتا تھا۔

علامہ کیا ہراسی فقیہ شافعی سے پوچھا گیا کہ یزید صحابی تھا یا نہیں اور اس پر لعن کرنا درست ہے یا نہیں انہوں نے جواب دیا کہ وہ صحابی نہیں تھا۔ وہ حضرت عثمان کے وقت میں پیدا ہوا۔ اور اس پر لعن کرنے میں دو قول امام ابو حنیفہ کے مشہور ہیں تصریح وتلویح تصریح لعنت کرنے کے بارے میں اور تلویح اس کے عدم میں ایسا ہی مالک اور امام احمد سے منقول ہے مگر میرا ایک ہی قول یعنی اس پر لعنت کرنا ابن خلکان نے بھی علامہ موصوف کی سند سے یہی اقوال درج کئے ہیں (شہادت حسین صفحہ ۵۱)

علامہ سعد الدین تفتازانی بھی یزید پر لعنت کی صریح اجازت دیتے ہیں چنانچہ وہ شرح عقائد نسفی میں لکھتے ہیں۔

فنحن لانتوقف فی شانہ بل فی ایمانہ لعنۃ اللہ علیہ وعلی انصارہ وعلی اعوانہ	ہم اس پر لعنت بھیجنے کے بارہ میں ذرا توقف نہیں کرتے بلکہ اس کے بے دین و بے ایمان ہونے میں بھی شبہ نہیں کرتے اس پر اور

اس کے انصار و اعوان پر خدا کی لعنت (شرح عقائد صفحہ ۱۷۱) پھر آگے چل کر فرماتے ہیں۔

واتفقوا علی جواز اللعن علی من قتلہ او امر بہ او اجازہ اورضی بہ	علماء کا اتفاق ہے کہ اس پر جس نے حسینؑ کو قتل کیا یا ان کے قتل کا حکم دیا یا اجازت دی یا اس پر راضی ہوا لعنت کرنا جائز ہے۔

امام سمہودی بھی جواہر العقد میں یہی الفاظ تحریر فرماتے ہیں۔

علامۂ زرندی علامہ ابن حجر عسقلانی اور علامۂ دمیری نے بھی یزید پر لعنت کی اجازت لکھی ہے۔

امام جلال الدین سیوطی باوجودیکہ یزید کو خلفا اثنا عشر میں شمار کرتے ہیں۔ تاہم اس پر لعنت کی صریح اجازت دیتے ہیں وہ واقعات کربلا کو بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں

لعن اللہ قاتلہ وابن زیاد معہ و یزید ایضاً	خدا حسینؑ کے قاتل اور ابن زیاد اور یزید سب پر لعنت کرے۔

ملک العلماء دولت آبادی مناقب السادات میں نہایت واضح طور پر فرماتے ہیں۔

الامۃ اجتمعت والائمۃ اتفقت علی الکفر واللعن قاتل الحسینؑ	امت اسلام نے اس پر اجماع اور آئمہ اسلام نے یزید قاتل حسینؑ کے کفر اور اس کے جواز لعن پر اتفاق کر لیا ہے۔

شیخ الاسلام امام قندوزی ینابیع المودۃ میں لکھتے ہیں کہ اہل سنت کے عقائد میں یزید کی بابت جو امیر معاویہ کے بعد ان کا قائم مقام ہوا اختلاف ہے۔ ایک گروہ اس کو کافر کہتا ہے جس میں سبط ابن جوزی وغیرہ ہیں ان کا استدلال یزید کے ان اشعار پر ہے۔ جو اس نے حضرت کے سر مبارک پر چوب خیزران لگائے پڑھے تھے "لیت اشیاخی ببدر شہدوا الخ" یہ ابیات مشہور و معروف اور اس کے صریح کفر پر دال

ہیں۔ ؎۱

مولوی محمد حسین فرنگی محلی کتاب وسیلۃ النجاۃ میں بذیل تذکرہ یزید جو تحریر ہیں درج ذیل ہے۔

"چنانچہ یزید بدبخت ستون دین و بنیاد خانہ جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ و اجمعین را برانداخت و عمارت ایمانی و قصر امن و امان را منہدم ساخت بزرگی نوشتہ کہ کاری کہ یزید کرد کسے کافر فرنگ ہم نہ کردہ باشد و بعد شہادت آنحضرت خانہ کعبہ را نیز خراب کردہ و در آنجا بدعتہا پدید آوردہ و مدینہ منورہ بحکم دار الحرب داد و در مسجد نبوی اسپہا بست و صحابہ سید الوریٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم را کہ آنجا بودند ہمہ را بے عزت و بے حرمت کردہ زنان آنہا را مباح گردانید" ؎۲

اسی طرح یزید کی نسبت مولوی عبدالحی صاحب فرنگی محلی بھی اپنے فتاوی میں تحریر فرماتے ہیں "مولانا نے یزید کی خوب خبر لی ہے اور صاف لکھ دیا ہے کہ ازروئے تحقیق و انصاف اِس خبیث کا درجہ کفر سے بھی بڑھا ہوا ہے ہرگز اس کو مغفرت و ترحم سے یاد نہ کرنا چاہیے اگرچہ ازروئے اجتہاد جس طرح ابلیس کی لعن سے زبان روکنے میں کچھ مضائقہ نہیں اسی طرح اسکی لعن سے بھی زبان کو آلودہ نہ کرنا چاہیئے" ممدوح کے اس فتویٰ کو مولوی شاہ حسن میاں سجادہ نشین پھلواری نے اپنی کتاب شہادت حسین مطبوعہ لاہور صفحہ ۵۳ میں نقل کیا ہے جو بالفاظ حسب ذیل ہے۔

"در شان وے (یزید) برادہ افراط و مولات رفتہ می گویند کہ وی بعد ازاں کہ باتفاق مسلمانان امیر شد اطاعتش بر امام حسین علیہ السلام واجب شد و بدانستند

؎۱ ینابیع المودۃ صفحہ ۳۸۰

؎۲ وسیلۃ النجاۃ مطبوعہ مطبع گلشن فیض لکھنؤ صفحہ ۲۹۳

کہ وے باوجود امام حسینؑ امیر شود؟ باتفاق مسلمانان کے باشد جماعتے از صحابہ و از اولاد صحابہ خارج از و بودند و برخے کہ حلقۂ اطاعت او بگردن انداختند چوں حالِ او بہ شربِ خمر و ترکِ صلوٰۃ و زنا و استحلالِ محارم معائنہ کردند بہ مدینہ منورہ باز آمدند و خلعِ بیعت کردند و بعضے گویند کہ وی امر بقتلِ امام حسین نہ کردہ نہ بداں راضی بود و نہ بعد ازان بقتلِ امام حسین علیہ السلام و اہل بیتِ آنحضرت مستبشر شد۔ ایں سخن نیز باطل است۔ چنانچہ قال العلامہ التفتازانی فی شرح عقائد النسفیہ" والحق ان رضا بقتل الحسین علیہ السلام الی قولہ مما تواتر معناہ و ان کان تفاصیلہ احاد" بعضے دیگر گویند کہ قتل امام حسینؑ گناہ کبیرہ است نہ کفر، لعنت مخصوص است بکفار۔ نازم بر فطانتِ ایشاں ندانستند کہ کفر یک طرف خود ایذائے جناب رسول الثقلین چہ ثمرہ دارد و قال اللہ تعالےٰ "اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ" و بعضے دیگر گویند کہ حالِ خاتمہ وی معلوم نیست شاید کہ وے بعدِ ارتکاب این کفر و معصیت توبہ کردہ باشد و میل غزالی در احیاء العلوم باین طرف است مخفی مباد کہ احتمال توبہ و رجوع از معاصی احتمالی است و الا آں بے سعادت انچہ درین امت کردہ ہیچ کس نکردہ باشد و لپسرش معاویہ بر سر ممبر زشتی حالِ پدر خود بیان کرد و بعضے بے باکانہ بہ لعنِ آں شقی تجویز می سازند و از سلف و اعلامِ امت احمد و امثالِ ایشاں بر وی لعنت کردہ اند و بعضے توقف کردہ اند و ابن جوزی کہ کمال عصبیت در حفظ سنت و شریعت می دارد در کتابِ خود لعنِ وی را از سلف منقول کردہ و علامہ تفتازانی بکمالِ جوش و خروش بروئے انصار و اعوانِ وی لعنت کردہ اند و بعضے توقف کردہ بر دائرۂ سکوت رفتہ اند مسلکِ اسلم آن ست کہ آں شقی را بہ مغفرت و

ترحم ہرگز یاد نباید کرد و در کف لسان از لعن ابلیس ہم خطرے نیست. نفضلا من
یزید علیہ"۔

اگر مولوی صاحب کی نسبت یہ خیال کیا جائے کہ ہندوستان کے رہنے والے ہیں خصوصاً لکھنؤ کے بزرگ ہیں ہزاروں شیعوں کے میل جول ربط ضبط ممکن ہے کہ رورعایت کی وجہ سے شیعوں کے ہمزبان ہوگئے ہوں تو مولانا ممدوح سے قطع نظر کرکے خود مولوی شاہ حسن میاں صاحب پھلواری کو ہی لیجئے جو عالم علم شریعت ہونے کے علاوہ سالکِ مسلک طریقت اور صاحب اعزاز و امتیاز ہیں آپ اپنی کتاب شہادت حسینؑ میں فرماتے ہیں۔

"اختلاف اس میں ہے بسکہ خاص کر یزید کا نام لے کر اس پر لعنت کرنا درست ہے یا نہیں۔ اکثر اکابر محدثین و بزرگانِ دین مثل امام احمد ابن حنبل و علامہ ابن جوزی و جلال الدین سیوطی و علامہ سعد الدین تفتازانی و سید آلوسی بغدادی و علامہ کیا ہرالسی و ملک العلماء دولت آبادی وغیرہم یزید کے کفر کے قائل ہیں۔ اور بہتیرے سے اسے مسلمان ہی نہیں جانتے بنابرایں اس پر بہ تخصیص اسم لعنت بھیجنے میں کوئی کلام نہیں کرتے۔ مگر بعض علماء کا قول ہے کہ وہ مسلم ہے مگر فاسق اور سلبیس دلیل اس کے کفر کی نہیں معلوم ہوتی اور کسی مسلمان پر اگرچہ وہ فاسق و فاجر بھی ہو لعنت کرنا درست نہیں لہذا یزید پر بہ تخصیص اسم لعنت بھیجنا نادرست ہے اور بعضوں کا گمان ہے کہ یزید کا امام حسین علیہ السلام کا قاتل ہونا قطعی اور یقینی طور پر ثابت نہیں لہذا اس پر لعنت کرنا روا نہیں ان سب کا جواب یہ ہے کہ یہ بات مسلم ہے اور پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے اور بہ تواتر ثابت ہے کہ یزید نے جناب حسین علیہ السلام کو شہید کر دیا اسی نے ابن زیاد وغیرہ کو اس کا حکم دیا اور آپ کی شہادت اس کا عین مطلوب تھا اور آپ کے قتل سے اُسے کمال مسرت اور خوشی ہوئی جس پر کتب عام شاہد ہیں، الخ

میں ہے:"

وَلَا یشك عاقل ان یزید ابن معاویۃ هو القاتل الحسینؑ لانه الذی ندب عبید الله ابن زیاد یقتل الحسین علیه السلام	کوئی عاقل اس میں شک نہ کرے گا کہ یزید ابن معاویہ قاتل جناب امام حسین ہے۔ کیونکہ اسی نے عبید اللہ ابن زیاد کو آپ کے قتل کا حکم دیا تھا۔

علامہ سعد الدین تفتازانی شرح عقائد نسفیہ میں تحریر کرتے ہیں۔

والحق ان رضا یزید بقتل الحسین علیه السلام واستبشاره بذالك واهانة اهل البیت صلی الله علیه و آله وسلم مما تواتر معناه وان كان تفاصیله احاد (شرح عقائد صفحہ ۱۱۷)	حق یہ ہے کہ یزید کا امام حسینؑ کے قتل پر راضی ہونا اور آپ کے قتل کئے جانے سے خوش ہونا اور اہلِ بیتِ رسول اللہ کی بے حرمتی کرنا بتواتر معنوی ثابت ہے گو اس کی تفصیلیں خبر احاد سے ہوں۔

ایسا ہی مفتی شہاب الدین سید محمود آلوسی بغدادی تفسیر روح المعانی جلد ہفتم صفحہ ۱۲۵ میں فرماتے ہیں:-

جب یہ ثابت ہو گیا کہ یزید بے شک قاتل جناب امام حسین علیہ السلام اور دشمنِ اہل بیتِ نبوت ہے تو یہی بڑی دلیل اس کے کفر کی ہے اہل بیتِ طہارت کی اہانت و بے حرمتی ان کو ستانا اور سید ناشباب اہل الجنۃ مولانا حضرت امام ہمام کو اس ظلم و جفا اور اس بے حرمتی سے قتل کرنا خود کفر ہے جناب امام حسینؑ حضرتِ رسولخدا کے لاڈلے نواسے تھے، ان کے ذرا سے رونے سے آنحضرتؐ کو تکلیف ہوتی تھی اب غور کیا جا سکتا ہے کہ حسین مظلوم کی اس بیکسی اور مصیبت میں ایسی بے حرمتی کے ساتھ قتل کئے جانے سے روحِ رسول اللہؐ کو کیسی کچھ اذیت پہونچی ہوگی جس کا ایک شمہ ابن عباس اور ام سلمہ کا خواب ہے

پس امام حسین علیہ السلام کی بے حرمتی ایذا دہی اہانت اور ان کے اہل بیت پر ظلم علین جناب رسولخدا پر ظلم ہے اور آپ کی اہانت و ایذا دہی ہی کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت رسولخدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایذا دہی اور اہانت بہت ہی بڑا کفر اور بے دینی نہیں ہے (نعوذ باللہ من ذالک) اسی لئے اکثر محققین کہتے ہیں" انہ کفر حین امر بقتل الحسین"۔ (شرح عقائد صفحہ ۱۱۷)

یزید ٹھیک اسی وقت کافر ہو گیا جس وقت اس نے جناب امام حسینؑ کے قتل کا حکم دیا۔ علامہ تفتازانی پھر لکھتے ہیں" فنحن لا نتوقف فی شانہ بل فی ایمانہ۔ (شرح عقائد صفحہ ۱۱۷) ہم اس پر لعنت کرنے میں ذرا توقف نہیں بلکہ اس کے بے دین و بے ایمان ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں"۔

صاحبو! جناب رسولخدا نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں میں دو بڑی چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ میرے بعد تم ان ہی سے تمسک کرنا اگر تم ان کا خیال رکھو گے قدر کرو گے اور ان کے ساتھ متمسک ہو گے تو گمراہی اور ضلالت سے بچو گے۔ وہ دو چیزیں کیا ہیں۔ کلام اللہ و عترتی قرآن پاک اور میری عترت اور اولاد اطہار گویا آپ نے تمسک و عظمت میں قرآن اور اہلبیت کو برابر کیا تھا تو اگر قرآن کی کوئی توہین کرے اُسے پائمال اور اس کے اوراق کو بے حرمتی سے تذلیل کے لئے منتشر کرے اور خوب جان بوجھ کر علانیہ اس کی اہانت کرے۔ یا ان امور پر وہ راضی اور خوش ہو تو کیا وہ مسلمان رہ سکتا ہے اور کیا کلام اللہ کی اہانت کفر نہیں ہے۔ ضرور ہے اسی طرح سمجھ لو کہ اہل بیت اطہار قرآنِ ناطق شانِ نزول آیہ تطہیر کی اہانت بھی لاریب کفر ہے اور جس نے اہل بیت اطہارؑ خصوصاً سیدنا امام حسین علیہ السلام کی بے حرمتی کی ان کے قتل سے خوش اور راضی یا اس میں شریک ہوا۔ یا اسے گوارا کیا وہ ہرگز مسلمان نہیں ہے بلکہ فی الدرک الاسفل من النار۔ اب ناظرین خود انصاف فرمائیں کہ یزید اور یزیدیوں پر لعنت بھیجنا جائز ہے یا ناجائز۔ جب ایمان ہی ندارد ہے تو پھر

لعنت کیوں ناجائز ہو گی، بزرگان دین اور علمائے متورعین نے یزید اور یزیدیوں پر لعنت کی ہے اور اس کو مطابق حکم خدا و رسول فرمایا ہے اور قرآن مجید اور حدیث سے اس پر استدلال کیا ہے، تفسیر روح المعانی جلد ہشتم صفحہ ۷۲ میں زیر تفسیر آیہ" فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ الخ" یہ ہے کہ

والستدل بہا ایضا جواز لعن یزید علیہ من اللہ تعالیٰ ما یستحقہ فقال لبرزنجی فی اشاعۃ والھیثمی فی لصواعق ان الامام احمد سالہ ولدہ عبداللہ عن لعن یزید قالَ کیف لا یلعن من لعنہ اللہ تعالےٰ فی کتابہ فقال عبداللہ قد قرأت کتابُ اللہ عزّ وجلّ فلم اجد فیہ لعن یزید فقال الامام انَّ اللہ تعالیٰ یقولُ فھل عسیتم اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوا اَرْحَامَكُمْ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللہ الخ وای فساد و قطیعۃ

اس آیت سے لعن یزید پر استدلال کیا گیا ہے برزنجی نے اشاعت میں اور ہیثمی نے صواعق میں نقل کیا ہے کہ امام احمد سے ان کے صاحبزادہ عبداللہ نے پوچھا یزید پر لعنت کرنے کے بارے میں تو امام احمد نے فرمایا جس پر خدا نے قرآن میں لعنت کی ہے اس پر کیونکر لعنت نہ کی جائے گی۔ عبداللہ نے کہا میں نے قرآن میں یزید پر کہیں لعنت نہیں پائی آپ نے فرمایا خدائے تعالےٰ قرآن میں فرماتا ہے۔ فَهَلْ عَسَيْتُمْ الخ یعنے اگر تم پیٹھ پھیرو گے تو زمین پر فساد پھیلاؤ گے معاصی و کفر سے اور قطع رحم کرو گے۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور کون سا فساد

اور قطع رحم اس سے بڑھ کر ہے جو کچھ یزید نے کیا۔

صواعق محرقہ صفحہ ۱۵۹ مطبوعہ مصر میں ابن حجر مکی یہ عبارت تحریر فرماتے ہیں۔

وَبعد اتفاقہم علی فسقہ اختلفوا فی جواز لعنہ بخصوص اسم فاجاز

یزید کے فاسق ہونے پر اتفاق علماء ہونے کے بعد لعنت کرنے خصوصاً اُس کے

قوم منہم ابن الجوزی ونقل عن احمد وغیرہ فانہ قال فی کتابہ المسمّے مالبرّ وعلی المتعصّب العنید لمانع من ذم الیزید سالنی سائل عَنْ یزید بن المعاویۃ فقلت لہ یَکْفِیہِ مابہ فقال یجوز لعنہ فقلت قد اجازہ العلماء المتورّعون منہم احمد ابن حنبل انہ ذکر فی حقّ یزید مایزید علی اللعنۃ

نام کے ساتھ لعنت بھیجنے میں اختلاف ہے ایک گروہ نے اس کو جائز رکھا ان مجوزین میں ایک ابن جوزی ہیں انہوں نے جواز لعن کو احمد بن حنبل وغیرہ سے نقل کیا ہے اور اپنی کتاب میں فرماتے ہیں کہ مجھ سے کسی نے جواز لعن یزید کے متعلق سوال کیا میں نے کہا یزید پر لعنت کرنے کو علمائے متورعین نے جائز رکھا ہے ان میں سے امام احمد بھی ہیں انہوں نے یزید کے حق میں سب سے بڑھ کر کہا ہے۔

اور اتحاف لحب الاشراف صفحہ ۶۳ و ۶۴ میں ہے کہ علامہ جوزی نے قاضی ابو یعلی سے بالاسناد روایت کی ہے کہ صالح ابن امام احمد نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد ماجد سے لعن یزید کو پوچھا فرمایا جس پر خدا نے لعنت کی ہے اس پر کیوں نہ لعنت کی جائے دیکھو خدائے عزوجل نے فرمایا ہے فَهَلْ عَسَيْتُمْ ..... الخ یعنے کیا تم اے منافقو پیٹھ پھیروگے تو زمین میں فتنہ و فساد برپا کروگے اور قطع رحم کروگے یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا کی لعنت ہے۔ پس (جان پدر) قتل جناب امام حسینؑ سے بڑھ کر روئے زمین پر کون سا فساد ہوگا اور سنو خدا نے فرمایا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ جو لوگ خدا اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں بے شک ان پر خدا نے دونوں جہان میں لعنت کی ہے اور جناب امام حسین جگر گوشہ رسول کے قتل سے بڑھ کر جناب رسولخدا صؐ کی کون سی ایذا رسانی ہے۔ تفسیر روح المعانی کے اس ہی صفحہ میں ہے۔

وعلی ھذا القول لایتوقف فی لعن

بنابریں قول لعن یزید میں کوئی توقف نہیں ہے

یزید وتکفیرہ بکثرۃ اوصافہ الخبیثۃ وارتکابہ الکبائر فی جمیع ایّام تکلیفہ ویکفی مافعلہ ایّام استیلائہ باھل المدینۃ ومکّۃ فقد روی الطبرانی بسند حسن اَللّٰھُمَّ مَنْ ظَلَمَ اَھْلَ المدینۃ واخافھم فاخفہ علیہ لعنۃ اللّٰہ والملٰئکۃ والنّاس اجمعین لا یقبل منہ صرف ولا عدل والطّامۃ الکبریٰ فاقعہ باھل البیت

بہ سبب اس کی کثرت اوصاف خبیثہ اور ارتکاب کبائر کے اور اس کی لعنت کے لئے کافی ہیں۔ وہ مظالم جو اس نے اپنے غلبہ کے زمانہ میں اہل مکہ اور اہل مدینہ پر کئے کیونکہ امام طبری نے بسندِ حسن روایت کی ہے کہ جناب رسولخدا نے فرمایا۔ خدایا جو اہل مدینہ پر ظلم کرے اور ان کو خوفزدہ کرے اس پر خدا اور ملائکہ اور تمام لوگوں کی لعنت ہو اور اس شخص سے نہ صرف نہ عدل (کوئی نیکی) قبول ہوگی اور

اور بڑی قیامت اس نے یہ برپا کی کہ اہل بیت رسالت کے ساتھ (سخت سے سخت ظلم وستم سے) پیش آیا۔ (اور انہیں ایذا دی اور سیدنا امام حسین کو قتل کیا جو تواتر معنی ثابت ہے)

وفی الحدیث ستۃ لعنھم وفی روایۃ لعنھم اللّٰہ وکلّ نبی مجاب الدعوات

اور حدیث شریف میں ہے کہ چھ شخص ہیں جن پر (اور ایک روایت میں ہے کہ ان پر خدا نے لعنت کی اور ہر نبی مستجاب الدعوۃ نے لعنت کی (وہ چھ شخص یہ ہیں)

المحرّف لکتاب اللّٰہ وفی روایۃ الزّائد فی کتاب اللّٰہ

(۱) خدا کی کتاب میں تحریف اور اس میں کمی بیشی کرنے والا

والمکذّب بقدر اللّٰہ

(۲) قضا و قدر کا منکر اور ان کا مکذب

والمتسلط بالجبر لیعزّ من اذلّ اللّٰہ

(۳) جو شخص لوگوں پر بہ غلبہ مسلط ہو جسے خدا نے ذلت دی ہے اسے وہ عزت دے اور جس کو خدا نے عزت دی ہو اسے وہ ذلت دے۔

والمستحل لعترتی

(۴) میری عترت اور اولاد کی بےحرمتی کرنے والا

والمستحل لحرم الله	(۵) خدا کے حرم کی بے حرمتی کرنے والا۔
والتارك لسنتي	(۶) میری روش کو چھوڑنے والا۔

یہ دونوں حدیثیں یزید پر لعنت کرنے کی سوند ہیں کیونکہ اہل مدینہ پر اس نے سخت ظلم کیا اور خوفزدہ کیا اور وہ مسلط بالجبر بھی تھا۔ خدا کے معزز بندوں کو ذلیل اور ذلیلوں کو معزز بنایا اور حرم بلکہ حرمین کی سخت بے حرمتی اور اہانت کی اور گرائی اور عترت رسول اللہ کی سخت بے حرمتی اور اہانت کی۔ (یہ کہہ کر صاحب تفسیر روح المعانی فرماتے ہیں)

وقد جزم بكفره وصرح بلعنه جماعة من العلماء منهم الحافظ ناصر السنة ابن الجوزي وسبقه القاضي ابو يعلى وقال العلامة التفتازاني لا نتوقف في شانه بل في ايمانه لعنة الله عليه وعلى انصاره واعوانه وممن صرح بلعنه الجلال السيوطي كما قال في كتاب تاريخ الخلفاء لعن الله قاتله وابن زياد معه ويزيد ايضا۔

علما کی ایک جماعت نے یزید کے کفر کا یقین کیا اور اس پر لعنت بھیجنے کی تصریح فرمائی ہے مثل حافظ ابن جوزی و قاضی ابو یعلی وغیرہم کے اور علامہ تفتازانی کہتے ہیں کہ ہم لوگ اس پر لعنت کرنے بلکہ اس کے کفر کے بارہ میں بھی کچھ توقف نہیں کرتے۔ اس پر اور اس کے اعوان و انصار پر خدا کی لعنت ہو اور جلال الدین سیوطی نے بھی تاریخ الخلفا میں واقعہ کربلا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے "خدا امام حسینؑ کے قاتل اور زیاد و یزید سب پر لعنت کرے"۔

سید آلوسی بغدادی نے اس کے بعد تاریخ ابن الوردی اور کتاب الوافی بالوفیات سے نقل کیا ہے کہ جب اسیرانِ اہل بیت دمشق سے قریب ہوئے اور مقام جرون کے ٹیلہ پر چڑھے تو شہیدوں کے سر بلند ہوئے اور کوے کائیں کائیں کرنے لگے اس وقت یزید نے دو شعر پڑھے جن کا آخری مصرعہ یہ ہے ؎

فقد اقتضيت من الرسول ديوني

میں نے رسول اللہ سے اپنا بدلہ لے لیا اور پھر ان اشعار کا بھی ذکر کیا ہے جو اتحاف بحب الاشراف وسیلۃ النجاۃ و مفتاح النجا اور دوسری کتب میں منقول ہیں کہ "لیت اشیاخی ببدر شہدوا" جس کا مطلب یہ ہے کہ جناب سولخدا نے جنگ بدر میں میری آبا کو قتل کیا تھا اس کے بدلہ میں میں نے آج ان کی اولاد کو قتل کیا اور خوب ہی بدلہ لیا کاش وہ میرے بزرگ جو بدر میں قتل کئے گئے زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ میں نے کیسا بدلہ لیا۔ اور آخر میں دو شعر اور بھی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ محمد (صلعم) کے پاس کوئی وحی نازل ہوئی نہ فرشتہ آیا۔ یہ سب بنی ہاشم نے ملک گیری کے ڈھنگ نکالے تھے۔

یہ پُر از کفر اشعار یزید کے زبان سے نکلے ہیں جیسا کہ علما نے لکھا ہے تو بے شک اس کے کافر اور مردود ہونے میں ذرا بھی شبہ باقی نہیں جیسا کہ صاحب تفسیر روح المعانی صاحب اتحاف بحب الاشراف صاحب تاریخ وردی صاحب کتاب الوافی بالوفیات وغیرہم من العلماء نے فرمایا ہے۔ سید آلوسی بغدادی اپنی تفسیر جلد ہشتم ص۷۳ میں اس کی نسبت علماء کا بیان کر کے فرماتے ہیں کہ

"میرے گمان غالب میں بھی یہی ہے کہ وہ خبیث ہرگز مسلمان اور مصدق رسالت ہرگز نہیں تھا"۔

جب کہ اس کی تمام حرکات و افعال پر نظر کرتے ہیں اور دوسرے قرائن و دلائل سے واضح ہوتا ہے اور اگر بالفرض تسلیم کر لیا جائے کہ وہ کافر نہیں ہوا تو اس میں کوئی شبہ اور اختلاف نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک مسلم ہے جس نے یہ بے شمار فواحش اور کبائر غیر محیط کو جمع کیا ہے اور ایسا ہی علامہ ابن حجر صواعق محرقہ میں فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو صواعق محرقہ صفحہ ۱۳۲ "وعلی القول فانه مسلم فهو فاسق شریر متکبر" اس قول کی رُو سے کہ وہ مسلم ہے مسلم فاسق۔ شریر متکبر۔

سید آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم اس کی لعنت کے جواز میں تامل نہیں کرتے نیز ابن زیاد ابن سعد اور اس کی جماعت پر لعنت کرنے میں ہمیں شبہ نہیں۔ یہ لوگ یزید سے ملحق ہیں۔

لعنۃ اللہ عزوجل علیہم اجمعین	خدا کی لعنت ہو یزید ابن زیاد۔ ابن
وعلی انصارھم واعوانہم وشیعتہم	سعد اور اس کی جماعت پر اور ان لوگوں
ومن مال الیہم الی یوم الدین ما	کے اعوان وانصار اور ان کے پاسداروں
دمعت عین علی ابن عبد اللہ الحسین	پر جو ان لوگوں کی طرف مائل ہو قیامت

تک جب تک کہ آنکھیں جناب امام حسین کو روئیں۔

اور آخر میں لکھتے ہیں کہ جو اسطرح یزید اور یزیدیوں پر بوجہ احتیاط لعنت کرنے میں مضائقہ کرے وہ یوں کہے کہ خدا اس پر لعنت کرے جو قتل امام حسین سے راضی ہوا جس نے اہلبیت کو بلا قصور ایذا دی ستایا اور جسنے انکا حق غصب کر لیا۔ اسطرح لعنت کرنیکا کوئی بھی مخالف نہیں ہے۔ شاید اس شخص پر بھی جو قتل امام حسین سے راضی اور خوش ہوا جائز ہے۔

مسند امام احمد ابن حنبل کی اسناد سے اوپر لکھا جا چکا ہے کہ جناب ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بھی قاتلان حسین پر لعنت کی اور ان کا ارشاد مشہور ہے کہ جن لوگوں نے حسین کو قتل کیا اور ان کے ساتھ جنگ کی ان کی تحقیر کے مرتکب ہوئے، ان پر خدا اپنی لعنت کرے ان کے علاوہ حضرت امام احمد ابن حنبل حضرت امام مالک اور بروایتے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ علامہ کیاہراسی قاضی ابو یعلی۔ علامہ ابن جوزی۔ علامہ اسفرائنی۔ علامہ سمہودی علامہ برزنجی۔ علامہ رزندی۔ علامہ سعد الدین تفتازانی۔ علامہ جلال الدین سیوطی علامہ سید آلوسی بغدادی، مولوی حیدر علی فیض آبادی۔ مولوی محمد مبین لکھنوی اور ملک العلماء دولت آبادی وغیرہم من العلماء المحققین المتورعین سب کے سب یزید پر لعنت کرنے کی پوری اجازت دیتے ہیں [2]

[1] تفسیر روح المعانی جلد ہشتم صفحہ ۱۲۹ [2] شہادت حسین صفحہ ۶۹ تا ۷۱

اسی طرح میرزا حیرت کے اس حیرت افزا اور مہمل ادعا کا "کہ یزید کی معاشرت پر اسلامی دنیا میں بالکل پردہ ہے"۔ حضرت شاہ محمد حسن صاحب کتاب شہادت حسین صفحہ ۴۸ تا ۵۱ میں دندان شکن جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"واقعی مرزا صاحب صحیح فرماتے ہیں کہ ہم سنیوں کو یزید کی اصلی حالت کی کیا خبر اس کے اصلی حالات مثل تہجد گذاری پرہیزگاری، عبادت۔ خدا پرستی۔ صلاح وتقوی، درویشی، بزرگی اور عرفان وغیرہ سے تو جناب مرزا صاحب ہی خوب واقف ہوں گے، جو تمام کتب معتبرہ تواریخ وسیر وغیرہ میں موجود ہیں۔ ہم تو یہی جانتے ہیں کہ آپکی معاشرت ایسی پاکیزہ تھی اور ان کے حالات شریفہ ایسے اچھے تھے کہ حج وغیرہ کے لئے اپنے پدر بزرگوار کے وقت میں جب وہ مکہ اور مدینہ میں آئے تو وہاں بھی شراب و کباب سے باز نہ رہے۔ پس ہم سنیوں کو جہاں تک معلوم ہے اور جہاں تک تواریخ وسیر و دیگر کتب سے پتہ ملتا ہے وہ مردود انتہا درجہ کا متمسک بالمعاصی تھا اور یہی وجہ تھی کہ عبد اللہ ابن زبیر عبد اللہ ابن عباس، عبد اللہ ابن عمر اور ابو عبد اللہ الحسین علیہ السلام نے اسے خلافت کے لائق نہ جانا اور یہی سبب ہوا کہ اہل مدینہ نے خلع بیعت کی اور اس پر خروج کیا۔ یہ ہیں یزید کے حالات کا مشتے نمونہ از خروارے جس کے ذہبی جیسے محقق ومعتمد گواہ ہیں۔ اور تاریخی واقعات شاہد ہیں۔ اب مجھے اس سے بحث نہیں کہ آپ (مرزا حیرت) یزید کو کیسا سمجھتے ہیں اگر واقعی یہ تواریخ وسیر غلط ہیں۔ اور ذہبی واقدی ابن حجر سیوطی، دمیری ابن کثیر ابن خلکان اور دوسری تمام محققین وعلماء اہل سنت یزید پر بہتان کرتے ہیں۔ جو اسے ایسا بتاتے ہیں بلکہ اس کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے اور یزید درحقیقت بہت ہی پارسا برگزیدہ۔ خدا رسیدہ۔ متقی اور بزرگ تھا تو بہت بہتر تھا۔ خدا آپ کا حساب یزید کے ساتھ کرے اور ہم لوگوں کا حشر سید الشہدا سید الشباب اہل الجنۃ امام حسین ع کے ساتھ۔

بعض لوگوں کا گمان ہے کہ یزید کا قاتل یا آمر قتل حسین ہونا یقینی اور قطعی طور پر ثابت نہیں لہذا اس کو اس حرکت کا ملزم کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ یا اس پر لعن کرنا کس طرح جائز اور درست ہو سکتا ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس عجیب منطق اور مہمل ادعا کا مفہوم کیا ہے۔ مانا کہ یزید نے حضرت کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا مگر اس نے ولید بن عتبہ حاکم مدینہ کو یہ حکم نہیں بھیجا کہ حسینؑ سے فی الفور بیعت لے لینا ضرور ہے اگر وہ انکار کریں تو ان کا سر قلم کر کے ہمارے پاس بھیج دیا جائے اور کیا اس نے ابن زیاد کو پے در پے نہیں لکھا کہ جب تک حسین سے بیعت نہ لے یا اُن کو قتل نہ کر ڈالے اس وقت تک آرام کا خواب و خور اپنے اوپر حرام سمجھے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ حکم قتل نہیں تو کیا ہے اور اگر یزید اس قتل کا ذمہ دار نہیں تو اور کون ہے۔ ابن زیاد عمر سعد شمر خولی سنان اور شیث وغیرہم کو حضرت سے قدرتی کاوش کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی وہ سلطنت کے شریک اور حصہ دار نہ تھے۔ المامور مجبور ابن زیاد نوکر تھا جو اس کے آقا اور بادشاہ نے حکم دیا اس نے اس کی تعمیل کی۔ دنیا کے تمام شاہانِ جبار نے قتل و غارت اور ظلم و جور کی جو مثالیں تاریخ میں چھوڑی ہیں کیا وہ بذات خود اور بدست خود ان مظالم کے مرتکب ہوئے تھے۔ کیا خود چنگیز خاں نے صدہا شہروں اور قصبوں کو خاکِ سیاہ اور لاکھوں انسانی ہستیوں کو آغشتۂ خاک و خون اپنے ہاتھ سے کیا تھا۔ کیا ہلاکو خاں بغداد میں اور نادر شاہ دہلی میں بازاروں اور کوچوں کے اندر خود اپنے ہاتھ سے قتل عام کرتے پھرتے تھے نہیں ان لوگوں کا فقط حکم مرضی اور اشارہ تھا تعمیل کرنے والے اور تھے۔ با ایں ہمہ ہر شخص ان ہی حکم دینے والوں کو ان تمام خوں ریزیوں بربادیوں تباہیوں اور ظلم آرائیوں کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ بادشاہ کا کام صرف حکم دیدینا ہے تعمیل کرنا زیردستوں سپاہ سالاروں اور افسروں کا کام ہے۔ ایسی ہی ہزاروں مثالوں سے تاریخیں بھری پڑی ہیں یہ خیال کس قدر بے رکا لغو جاہلانہ اور متعصبانہ ہے کہ یزید قتل حسینؑ کا ذمہ دار نہیں اور اس کا مظلمہ ابن زیاد اور عمر سعد کے سر تھوپنے کے قابل ہے قتل فرزند رسول

اہانت اہل بیت رسول خوں ریزی صحابۂ رسول ہتک ناموس صحابہ رسول، توہین مسجد رسول احراقِ خانہ کعبہ اگر یزید کے حکم سے عمل میں نہیں آئے تو پھر کس کی مرضی اور حکم سے ایسا ہوا۔ تمام تاریخیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ جو کچھ کیا اس ..... نے کیا عام علماء اور مورخین کا اتفاق ہوتے ہوئے یہ گمان باطل کہ یزید قاتل یا آمر قتل حسین نہیں ہے۔ ایک جاہلانہ ضد اور کورانہ تعصب کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے اور جب وہ قاتل حسینؑ ہے تو اس کے ملعون ہونے میں کیا شبہ باقی رہا خدائے تعالے اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے۔

عن یقتل مومنًا متعمدًا فجزآئه جهنم خالدًا فیها وغضب اللّٰه علیه ولعنه داعدله عذ ابًا عظیمًا

جو شخص کسی مومن کو دیدہ و دانستہ قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر خدا کا غضب اور لعنت ہے اور اس کے لئے سخت عذاب مہیا کیا گیا ہے۔

جب عام مومن کے قتل کی وجہ سے اس کے قاتل پر خدا کا غضب اور لعنت ہے اور اس کو ابدی جہنمی فرمایا گیا ہے تو فرزند رسول سرتاج مومنین اور سردار جوانان بہشت کا قاتل یا وہ شخص جس کو حکم قتل دینے کی وجہ سے حقیقی قاتل کہنا چاہیئے خدا کے غضب اور لعنت اور خلود فی النار سے کیونکر بچ سکتا ہے (فافہم وتدبر)

ایک سچے مسلمان اور منصف مزاج کے لئے کس قدر افسوس اور حیرت کی بات ہے کہ یزید کے بعض ایسے خیر خواہ بھی پائے جاتے ہیں جو یزید جیسے فاسق، فاجر، زنا کار، شرابخوار منہمک فی المعاصی، حرام کو حلال، فرزند رسولؐ اللہ کو قتل۔ اہل بیتِ نبوت کو ذلیل و حقیر، مکہ اور مدینہ پر لشکر بھیج کر صحابہ کو قتل اور ان کی عورتوں کو بے حرمت، خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کی بے ادبی کرانے والے کے مقابلہ میں حضرت امام حسینؑ جیسے معصوم عن الخطا کو جنہیں آنحضرت صلعم نے الحسینؑ منی وانا من الحسین فرمایا جو سید المرسلین

کی آغوش مبارک میں پلا اور دوشِ اقدس پر سوار رہا جس کے فضائل و مناقب سے تمام اسلامی تاریخیں بھری پڑی ہیں بر سر خطا بتاتے ہیں۔ چنانچہ ابوبکر ابن العربی مالکی کا گمان بھی یہی ہے وہ کہتے ہیں کہ "ان الحسین قتل بسیفِ جدہ" بے شک حسین اپنے نانا کی تلوار سے قتل کئے گئے مطلب یہ ہے کہ شریعتِ اسلامی سے بغاوت کی جو سزا مقرر ہو چکی تھی اسی کی تعمیل کی گئی انہوں نے خلیفۂ وقت پر خروج کیا اس لئے واجب القتل ٹھہرے۔ اور موافق حکم رسول اللہ ان کا قتل عمل میں آیا پھر اعتراض کیا ہے (استغفر اللہ ربی و اتوب الیہ)

ہم ایسے توہمات کا کوئی جواب نہ دیں گے۔ ان جہلات کی تردید میں سید آلوسی بغدادی نے جو تحریر فرمایا ہے اسی کا لکھ دینا کافی ہے چنانچہ علامہ موصوف ابن العربی کی تردید میں ذیل کی عبارت تحریر فرماتے ہیں۔

وابوبکر ابن العربی المالکی علیہ من اللہ تعالیٰ ما یستحق خزعم ان الحسین علیہ السلام قتل بسیف جدہ ولہ من الجہال موافقون علی ذالک وکبرت کلمة تخرج من افواههم ان یقولون الا کذبا قال ابن الجوزی فی کتابہ سر المصئون من الاعتقادات العامة التی غلبت علی جماعة منتسبین الی السنة ان یقولون ان یزید کان علی الصواب وان الحسین اخطا بالخروج علیہ ولو نظروا فی سیر تعلموا کیف عقدت

ابوبکر بن عربی المالکی نے اس پر خدا کی طرف سے وہ نازل ہو جس کا وہ مستحق ہے سخت بہتان و افترا کیا ہے جو اس نے یہ گمان کیا کہ حسین علیہ السلام اپنے نانا کی تلوار سے قتل کئے گئے (یعنے بغاوت کی تھی اس وجہ سے ان کی گردن ماری گئی) اور بعض جہلا اس ابن عربی کے ہم خیال ہیں لیکن یہ بہت بڑی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے نرا جھوٹ بکتے ہیں علامہ ابن جوزی اپنی کتاب سر المصئون میں تحریر فرماتے ہیں ایک عام خیال و اعتقاد جو ایک فرقہ میں غالب ہو گیا ہے اور وہ فرقہ اہلسنت کی

البیعة والزم الناس بها ولقد فعل فی ذالک کل قبیح ثم لو قدرنا صحة عقد البیعة فقد مذ ب منہ بوادر کلها توجب فسخ العقد ولا یمیل الی ذالک الا جاهل عامی المذهب یظن بہ انہ یغیظ بذالک الرافضة۔

طرف منسوب ہے یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یزید بر سر حق تھا اور امام حسینؑ نے غلطی کی۔ جو اس پر خروج کیا لیکن اگر کاش لوگ تاریخ و سیر پر انصاف کی نظر ڈالتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یزید کی بیعت کس طرح منعقد ہوئی اور کن مجبوریوں سے لوگوں نے اس کی بیعت اختیار کی اس کی بیعت لوگوں سے زبردستی لی گئی اور اس بیعت کے قبول کرانے میں کیسی کیسی ناسزا اور قبیح کارروائیاں کی گئیں پھر اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اس کی صحت عقد بیعت کو مان بھی لیں تو یزید سے علانیہ ایسی برائیاں سرزد ہوئیں جس سے لوگوں پر اس کی بیعت کا فسخ واجب و ضروری ہو گیا۔ ایسی حالت میں امام حسینؑ معاذ اللہ کیونکر باغی ہو سکتے ہیں اس خیال فاسد کی طرف کوئی مائل نہیں ہو سکتا سوائے ان عامی المذہب جاہلوں کے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان باتوں سے رافضیوں کو غضب میں لاتے اور چڑاتے ہیں۔

اس کے بعد "شہادت حسینؑ" کا جواب بھی سن لیجئے جس میں انہوں نے اپنی حق پسندی عدالت اور بے تعصبی کا پورا ثبوت دیا ہے ان کا ارشاد ہے۔

"سیدنا و مولانا امیر المومنین حضرت امام حسین علیہ السلام نے ہرگز بغاوت نہیں کی آپ ہرگز باغی نہیں تھے بلکہ مظلوم شہید ہوئے۔ خوارج و نواصب اور بعض چھپے ناصبی نعوذ باللہ من ذالک آپ پر بغاوت کا الزام لگاتے ہیں۔ اور ان کے زعم باطل اور عقائد فاسد میں یہ ہے کہ یزید خلیفہ وقت تھا۔ اور خلیفۂ وقت سے مخالفت و سرکشی بغاوت ہے اسی بناء پر امام حسینؑ باغی ہوئے لیکن یزید کسی طرح خلافت کا مستحق نہیں تھا نہ ہرگز ہرگز خلیفہ ہونے کے قابل تھا

نہ کسی طرح اس کی خلافت ثابت ہوتی ہے کیونکہ امیر المومنین سیدنا امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ کو خلافت سپرد کرتے ہوئے یہ شرط کر دی تھی کہ تمہارے بعد پھر خلافت ہماری ہی طرف لوٹ آئے گی (دیکھو کتاب استیعاب ابن عبد البر اور کتاب الامامت والسیاست ابن قتیبہ) اور تمہیں کسی کو اپنا خلیفہ اور ولی عہد بنانے کا ہرگز حق نہ ہوگا مگر ہمارے معظم اور مکرم امیر معاویہ نے بالکل خلاف معاہدہ یزید کو خلیفہ و ولی عہد کیا۔ اس بحث میں امام المتکلمین مولانا حیدر علی لکھنوی کی کتاب بصارت العین فی ازالۃ الغین نہایت عمدہ کتاب ہے جس میں پُر زور دلائل سے شہادتِ امام حسین علیہ السلام ثابت کی گئی ہے اور یزید کا اہل سنت وجماعت کے نزدیک کفر وفسق ولعن محقق مسئلہ بتایا گیا ہے۔"

اس کے بعد شاہ صاحب ممدوح ایک لطیف سوال کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

ناظرین! یہاں پر ہمیں اپنے مبحث سے کسی قدر الگ ہو کر یہ دریافت کرنا ہے کہ سید الشہدا سیدنا حضرت امام حسینؑ تو باغی ہوئے مگر نہیں معلوم کہ جناب عبداللہ ابن زبیر جو خلیفہ اول المومنین جناب ابو بکر صدیق کے نواسے اور سید المرسلین سرور عالم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیر کے (جو جنگ جمل میں امیر المومنین علی مرتضیٰ علیہ السلام کے مدمقابل تھے) صاحبزادے اور جو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی گودوں میں پلے تھے وہ آپ کے نزدیک کیا ہیں وہ بھی آپ کے نزدیک باغی وطاغی معاذاللہ ہیں یا نہیں کیونکہ وہ تو آپ کے امیر المومنین حضرت امیر معاویہ کے صاحبزادے یزید کے پورے حریف اور مدمقابل تھے۔ پھر انہیں آپ کیا فرماتے ہیں بینوا وتوجروا۔ (شہادت حسینؑ صفحہ ۱۷ و ۲۷)"

نہایت افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ اہل اسلام نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ثقلین کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ اگر اسی اصول بغاوت پر غور کیا جائے تو یزید کے قبل جو حکومت تھی اس کے ساتھ مقابلہ اور اس کے ساتھ کوشش کرنے والوں کو کوئی جھوٹوں بھی باغی نہیں کہتا۔ نہ ان پر کسی قسم کی بغاوت کا شبہ کرتا ہے۔

سنہ ۳۶ ہجری سے سنہ ۴۰ ہجری تک خلافتِ علی کے زمانہ میں چاروں طرف سے بغاوتوں کے کیسے کیسے طوفان اُٹھے۔ بڑی بڑی خوں ریزیاں ہوئیں۔ ہزاروں مسلمانوں کا خون ہوگیا۔ با ایں ہمہ ان باغیوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ مگر فرزند رسول اللہ کے اس طرز کو جو مسلمانوں کی ہی استدعا پر ان کی ہدایت اور تحفظ عن الضلالت کے خیال سے اختیار کیا گیا تھا خروج بتایا جاتا ہے اور دشمن کے مظالم کے مقابلہ میں آپ کی مدافعت کو بغاوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ابن العربی سے بڑھ کر اسلام میں دوسرا احسان فراموش نہیں ہو سکتا۔ حیرت ہے کہ وہ دوسری بغاوتوں کی نسبت یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ خطائے اجتہادی تھی اور فرزند رسول اللہ صلعم کے لئے اس حیلۂ شرعی کی آڑ رکھنے کے بھی روادار نہیں اور کھلم کھلا آپ کی ذاتِ قدسی صفات پر بغاوت کا الزام لگاتے ہیں۔ آج کسی مخالف اسلام نے ایسا اعتراض کیا ہوتا تو ہم کو کوئی شکایت نہیں تھی مگر حیرت اور افسوس ہے کہ ابن عربی جو مسلمانوں میں ایک بڑی پایہ اور درجہ کے بزرگوار شمار کئے جاتے ہیں۔ ایک عامی المذہب فاسق فاجر اور بدترین امت محمدیہ کی حمایت و مروت میں اہل بیت رسالت کے حقوق اور ان کے محاسن ذاتی کی کوئی رعایت نہ کر سکے اور قُل لَّآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا ٱلْمَوَدَّةَ فِى ٱلْقُرْبَىٰ کے حکم محکم کی تعمیل تو درکنار ان کا ادب بھی پس پشت ڈال دیا۔

ابن العربی اور ان کے ہم خیال حضرات کا استدلال وتمسک مندرجہ ذیل تین حدیثوں پر ہے۔

اذا بویع للخلیفتان فاقتلوا آخرھما۔	جس وقت دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو

جس کی آخر میں بیعت ہوئی ہو اس کو قتل کر ڈالو

فمن اراد ان یفرق امر ھذہ الامۃ وھی مجتمعۃ فاضربوہ بالسیف

جو شخص اس امت کے کام میں جس پر اجماع ہو چکا ہو تفرقہ ڈالے اسے تلوار سے قتل کر ڈالو۔

من اراد ان یشق عصاکم او یفرق جماعتکم فاقتلوہ

جو شخص تمہاری جماعت سے مخالفت اور اس میں تفرقہ کا ارادہ کرے اس کی گردن مار دو

یہ حدیثیں کیسی اور کس پایہ کی ہیں ہم اس پر بحث کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ اس حیرت اور تعجب کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ امام غزالی جیسے بزرگ بھی ابن العربی کے ہمزبان ہو گئے۔ چنانچہ آپ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں۔

مَاقتل الیزید الحسین اِلَّابسیفِ جَدِّہٖ لِاَنَّ یَزِیدُ الْخَلِیْفَۃ وَالحسین بَاغٍ عَلَیْہِ۔

یزید نے حسینؑ کو قتل نہیں کیا بلکہ وہ اپنے جدؑ رسولخدا کی تلوار سے قتل ہوئے اس لئے کہ یزید خلیفہ تھا اور حسینؑ نے اس سے بغاوت کی تھی۔

شیخ ابن حجر مکی شرح قصیدہ ہمزیہ میں قول ابن عربی کی تائید تو کرتے ہیں لیکن خطائے اجتہادی کی آڑ سے بھی کام لیتے ہیں آپ کا ارشاد بھی ملاحظہ ہو۔

لانّ یزید الْخَلِیْفَۃ وَالحسین بَاغٍ علیہ وَالبیعۃ سبقت لیزید وَ یَکْفِیْ فِیْہَا معظم اھل الحل وَالعقد وبیعۃ کذالِکَ لانّ کثیرین اقدموا علیہ مختارین ھٰذا مع عدم النظر الیٰ ذالِکَ فلا یشترط موافقۃ اَحَد مِنْ اَھْل الحلّ وَالعقد علیٰ ذٰلِکَ دَیُوئدہ الیضاً ماقبل فی نظیر ذٰلِکَ

یزید نے حسینؑ کو رسولخدا کی تلوار سے قتل کیا۔ کیونکہ یزید خلیفہ تھا اور حسینؑ نے اس سے بغاوت کی تھی درحالیکہ امت نے یزید کی بیعت ان کی بغاوت سے پہلے کر لی تھی اور اس امت کے اہل حل وعقد نے یزید کی بیعت کو تحقیق خلافت کے لئے کافی سمجھا اور گروہِ کثیر نے بلا جبر واکراہ قطع نظر معاویہ کے اس کو خلیفہ کرنے کے اس کی بیعت پر اقدام کیا۔

حال معاویۃ مع الحسن وَمع علی فانہ کان متغلبا باغیا علیھما لکنّہ غیر آثم لاجتہادہٖ فالحسین کذالِکَ

اور اگر ہم اس کے استخلاف پر نظر کریں تو تحقیقِ خلافت یزید کے واسطے اہل حل وعقد میں سے کسی شخص کی موافقت کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور اس کا مؤید یہ قول ہے کہ خلافت یزید میں امیر معاویہ کی نظیر حسنؑ مجتبیٰ اور علیؑ مرتضیٰ کے ساتھ سمجھ لینی چاہیئے کہ معاویہ ان دونوں کے مقابلہ میں متغلب اور باغی تھے۔ لیکن بوجہ خطائے اجتہادی کے گنہ گار نہیں ہوئے۔ اس ہی طرح حسینؑ بھی یزید سے بغاوت کرنے میں بوجہ اجتہاد گنہ گار نہیں ہیں۔

مولوی رشید الدین خاں صاحب غرۃ الراشدین میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اہل سنت کا یزید کے ایمان پر اجماع محض غلط اور افترا ہے کیونکہ اکابرِ اہل سنت جو جامع علوم ظاہری و باطنی تھے یزید کے کفر اور اس پر لعنت کے بصراحت قائل ہوئے ہیں۔ مثلاً امام احمد ابن حنبل ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی۔ ابن جوزی اور علامہ تفتازانی علاء الدین حلبی وغیرہ وغیرہ ملک العلما دولت آبادی نے مناقب السادات میں لکھا ہے کہ "میں نے کتابوں میں بہت تلاش کیا۔ مگر یزید پر لعنت کے امتناع کی بابت ائمہ مذاہب اربعہ یا ان کے شاگردوں کا کوئی قول مجھ کو نہیں ملا۔ بلکہ جواز لعن میں بزرگان سلف کے اقوال موجود ہیں"۔ ملک العلماء اسی کتاب میں اس سوال کے جواب میں کہ جب مومن کا قتل اہل سنت کے مذہب میں فسق ہے تو قتل حسینؑ کیونکر کفر ہو سکتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ایذا و اہانت حسینؑ جناب رسولخدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا تک پہنچتی ہے اور ایذا و اہانت رسولخدا بالاتفاق کفر ہے۔ کتاب ایضاح میں ہے کہ ہمارے علماء کبار نے سیدنا حسینؑ کے نام اور ان پر خروج کے حرام ہونے کو بصراحت

مانا ہے اور یہ بھی صراحت کی ہے کہ ملعون معلوم نے امام پر خروج کیا۔ اور ملک العلماء نے رسالہ مناقب السادات میں صاف لکھا ہے کہ یزید باغی متغلب اور خروجی تھا جملہ مذاہب میں امام پر خروج حرام ہے۔ یزید لعین نے حسینؑ پر بلا تاویل خروج کیا اور لڑائی کر کے ان کو قتل کر دیا ملک العلماء نے اسی کتاب میں ایک خاص باب اثبات لعن یزید پر قائم کیا ہے اسی طرح ابن جوزی نے ایک خاص رسالہ اسی باب میں لکھ کر اس کا نام ردعلی المتعصب العنید من منع ذم یزید رکھا ہے"۔

اس میں شک نہیں کہ مذہب اہل سنت میں کسی پر لعنت کرنا جائز نہیں حتیٰ کہ بعض علماء یزید پر بھی لعنت کو منع کرتے ہیں یہ بات بظاہر بڑی تہذیب اور متانت کی ہے لیکن درحقیقت اس میں ایک اور پیچ ہے وہ یہ کہ یزید اپنے افعال میں منفرد نہیں اگر اس پر وہ لعنت کریں تو اس کے والد بزرگوار بھی اس زد میں آتے ہیں اس طرح یہ لعنت یزید سے متعدی ہو کر ہیضہ یا طاعون کی طرح ساری خاندان کے اگلے پچھلوں کو بھی چمٹے گی اس لئے مصلحت بھی یہی سمجھی گئی کہ یزید سے ہی روکو جو دوسرے بدرجہ اولی بچیں۔ حالانکہ ترکِ لعنت قرآن کے خلاف ہے رسول اللہ نے نماز میں دشمنوں پر لعنت کی ہے بہت سے گناہوں کے مرتکبوں کو ملعون فرمایا ہے پھر خلیفہ برحق اور امام مطلق حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے تو شدت سے خلاف ہے۔ جنہوں نے علیؑ و فاطمہ حسنؑ و حسینؑ پر تبرا کہا اور کرایا اور کئی پشت کے لئے یادگار چھوڑ گئے ان کا نام بھی بغیر رضی اللہ عنہ کے لکھا جانا بے ادبی ہے۔ یہ طرفہ تماشا اور اجتماع ضدین ہے کہ حسینؑ کی عزت بھی اور یزید کی محبت بھی۔

کیوں نہ ہو حضرت کے قاتل بھی تو نمازوں میں اللھم صل علی محمد و آلِ محمد پڑھتے درحالیکہ ان کی تلواروں سے آلِ محمد کا خون ٹپکتا تھا کیا ایسے خوش فہم علماء نمازمیں درود پڑھتے ہوئے آل محمد کو مستثنے کر دیتے ہیں حرام کا حلال کرنے والا خاندانِ رسالت کے افراد کو قتل کرانے والا

مکہ اور مدینہ میں خونریزی کا حکم دینے والا مسلمان ہی رہے اور اس کی مسلمانی میں فرق نہ آئے۔ ایسے اسلام سے تو کفر ہی لاکھ درجہ اچھا ہے۔

شاہ عبدالحق صاحب نے تکمیل الایمان میں صاف تحریر فرمایا ہے کہ اہل سنت لعنت میں ایسے محتاط ہیں اور برا کہنے سے ایسے نافر ہیں کہ بعض یزید شقی کے باب میں بھی خاموشی کا حکم دیتے ہیں۔ اور بعض اس کی محبت و خیر خواہی یا پاسداری کی وجہ سے کہتے ہیں کہ جب وہ مسلمانوں کے اتفاق سے امیر ہو چکا تو حضرت امام حسین پر اس کی اطاعت واجب تھی اس عقیدہ اور اس قول سے خدا کی پناہ وہ باوجود امام حسین کے امام کیونکر ہو سکتا تھا اور مسلمانوں کا اتفاق اس پر کیونکر ہوا۔ اس کے زمانہ کے صحابہ اور صحابہ کی اولاد بھی منکر تھی۔ البتہ مدینہ سے صحابہ کی ایک جماعت جبراً و کرہاً شام میں گئی یزید نے ان کی خوب دعوتیں کیں۔ خوب انعام دئے جب کہ ان کو اس کا حال معلوم ہوا تو مدینہ میں پلٹ آئے اس کی بیعت توڑ دی اور کہا کہ وہ خدا کا دشمن شراب خوار اور تارک الصلوٰۃ زانی فاسق حرام کا حلال کرنے والا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اس نے حضرت کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا اور اس امر پر راضی نہ تھا۔ اور ان کے اور ان کے اہل بیت کے قتل سے خوش نہ ہوا۔ یہ بات بھی مردود اور باطل ہے کیونکہ اس ناسعادت کی عداوت اور حضرت کے قتل پر شادمانی اور اہل بیت کی اہانت و تذلیل کی خبریں حد تواتر کو پہنچ گئی ہیں اور ان خبروں کا انکار کرنا بناوٹ اور ہٹ دھرمی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ امام حسینؑ کا قتل گناہ کبیرہ ہے نہ کفر۔ لہذا لعنت کا مستحق نہیں۔ کیونکہ لعنت کافروں سے مخصوص ہے۔ کاش یہ معلوم ہوتا کہ ان قولوں کے معتقد رسول اللہ ص کی ان احادیث کے بارہ میں کیا کہتے ہیں جن سے صاف پایا جاتا ہے کہ فاطمہ اور فاطمہ کی اولاد کی اہانت بغض اور ایذا رسول اللہ کی عداوت اہانت بغض اور ایذا کا موجب ہے اور وہ کفر لعنت اور ہمیشہ کے عذاب جہنم کا باعث ہے۔ بلاشک اس آیت کے مطابق اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاَعَدَّلَھُمْ عَذَابًا

معصیتاً۔ بعض کہتے ہیں اس کے انجام کی خبر نہیں۔ ممکن ہے کہ کفر وعصیاں کے بعد توبہ کرلی ہو۔ اور آخر وقت توبہ کے ساتھ گزرا ہو۔ اور امام غزالی کا میلان بھی احیاء العلوم میں اسی طرف ہے۔ اور بعض علمائے سلف اور اعلام امت جیسے امام احمد بن حنبل اور مثل ان کے اوروں نے یزید پر لعنت کی اور ابن جوزی نے کہ لعنت کی حفاظت میں کمال شدت اور تعصب رکھتا تھا اور شریعت کا نہایت پابند تھا اپنی کتاب میں یزید پر اکابر سلف کی لعنت نقل کی ہے۔ بہر حال بعض نے منع کیا ہے۔ اور بعض نے توقف۔ خلاصہ یہ ہے کہ یزید سب سے بدتر آدمی تھا۔ ہمارے نزدیک اس امت میں جو کام اس بدبخت ناسعادت نے کئے ہیں کسی نے نہیں کئے جو حضرت امام حسینؑ کے قتل اور اہانت اہلبیت کے مدینہ منورہ کی بربادی کے لئے اس نے لشکر بھیجا اور وہاں قتل عام کرایا۔ پھر مکہ معظمہ کے ڈہانے اور عبداللہ ابن زبیر کے قتل اور اہانت اہل بیت کے مدینہ منورہ کی بربادی کے لئے اس نے لشکر بھیجا اور وہاں قتل عام کرایا۔ پھر مکہ معظمہ کے ڈھانے اور عبداللہ ابن زبیر کے قتل اور بقیہ اصحاب و تابعین کے قتل کا حکم دیا اور اسی حالت میں واصل جہنم ہوا۔ اس لئے توبہ کا کیا احتمال ہو سکتا ہے حق تعالے ہمارے اور تمام مسلمانوں کے دل کو اور اس کے دوستوں کی محبت سے اور جنہوں نے کہ اہل بیت نبوی سے برائی کی اور برا چاہا اور ان کے حق کو پائمال کیا ہو اور ان سے محبت اور صدق عقیدت نہ رکھی ہو، ان کی محبت سے بچائے رکھے اور ہم کو اور ہمارے دوستوں کو اہل بیت کے دوستوں کے زمرہ میں محشور کرے اور اللہ دنیا اور آخرت میں ان کے دین اور مذہب پر قائم رکھے بطفیل نبی وآل امجاد۔

ایک خاص یزیدی گروہ

یوں تو دنیا کے مختلف ملکوں میں ہر طرح کے مختلف الخیال اور مختلف العقائد انسان آباد ہیں لیکن عراق کے علاقہ موصل میں ایک ایسا بھی گروہ ہے جو یزید جیسے ننگِ انسانیت کو انبیاء سے افضل مانتا ہے۔ اس یزیدی فرقہ کو یہاں عرف عام میں عَبدَۃُ الشَّیطان

یعنی شیطان کے پجاری کہتے ہیں یہ لوگ اُموی النسل ہیں اور ممکن ہے کہ یزیدی کی اولاد ہوں کہا جاتا ہے کہ عراق کے غالی شیعوں کے مقابلہ میں عدی بن ساخر اموی نے یہ جماعت بنائی تھی اس کے بعض اعمال و عقائد کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) قرآن کو مانتے اور پڑھتے ہیں لیکن احکام قرآنی کے پابند نہیں۔

(۲) انبیاء کے منکر نہیں لیکن یزید بن معاویہ کو اپنا پیغمبر بلکہ افضل الانبیاء سمجھتے ہیں۔

(۳) یہ لوگ ابلیس کی عبادت کرتے ہیں مور کی شکل میں اس کا بت بناتے ہیں اور اس کے سامنے اپنی مقدس کتاب کے اشعار مدحیہ اور قصائد پڑھتے ہیں۔

(۴) ان کا ایک شیخ ہوتا ہے جس کا کام لکھنا پڑھنا اور اس گروہ کی مذہبی کتابوں کی حفاظت کرنا ہے اس شیخ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو لکھنا پڑھنا حرام ہے۔ شیخ اپنے صرف ایک بیٹے کو تعلیم دے سکتا ہے تاکہ وہ اس کا جانشین ہو سکے۔

(۵) ایک امیر ہوتا ہے جو ان لوگوں پر خود مختارانہ حکومت کر سکتا ہے۔ سلطنت ان کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دیتی۔

(۶) ایک قوال ہوتا ہے جو امام نماز کے فرائض انجام دیتا ہے یعنے قصیدے پڑھتا ہے اور نماز میں گانے والی جماعت کی امامت کرتا ہے۔

عراق میں ان لوگوں کی تعداد کئی ہزار کے قریب ہے۔ بعض اطراف شام میں بھی ان کی ایک جماعت پائی جاتی ہے اور ان کے خیال میں دنیا کے اور حصوں میں بھی ان کے ہم مشرب موجود ہیں۔

انڈکس

اسمائے مصنفین

ب

پ

انڈکس

اسماء کتب

انڈکس کتب